خدا کی بستی

خدا کی بستی

(ناول)

شوکت صدیقی

خدا کی بستی

مکتبۂ نیا راہی

پوسٹ بکس ۴۹۲۹، کراچی ۲

(جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں)

ہندوستان میں جملہ حقوق بحق — چودھری ادیس احمد
ردولی ضلع بارہ بنکی۔ یو۔پی محفوظ ہیں۔

پہلا ایڈیشن ● ایک ہزار
تاریخ اشاعت ● فروری سنہ ۱۹۵۹ء
کتابت ● انوری بیگم
طباعت ● انٹرنیشنل پریس کراچی
قیمت ● دس روپئے

ناشرین

مکتبہ نیا راہی

۲۶- اورنٹیل چیمبرز، ساؤتھ نیپیر روڈ
پوسٹ بکس ۴۹۲۹، کراچی نمبر ۲

ڈاکٹر عبدالعلیم کے نام ——

فصل اَوَّل

۱

گلی کے نکڑ پر میونسپلٹی کی لالٹین جل رہی تھی، جس کی دھندلی روشنی میں محلے کے کچھ لڑکے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ان میں سب سے بڑا راجہ تھا۔ اُس کا حلیہ فلم ایکٹروں سے ملتا جلتا تھا۔ بڑے بڑے اُلجھے ہوئے بال پھٹی ہوئی قمیص، تو سیدھ تپلون اور گلے میں ریشمی رومال بندھا تھا۔ ملی جُلی آوازوں کے شور میں وہ بار بار چیخ کرتا تھا

"کہو اُستاد کیسا بیمہ کیا۔"

"ابے یہ رہی بیگی۔ واہ میری جان میں تیرے قربان"

"سالوں آج تم کو پیدا ماروں گا"

اور یہ واقعہ ہے کہ وہ برابر جیت رہا تھا! اُس کے مقابلہ پر شامی تھا۔ وہ دُبلا پتلا منحنی جسم کا لڑکا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت تھی اور مزاج کا بھی تیز تھا۔ ایک بار جب راجہ سب کی نظریں بچا کر پیر کے نیچے چھپا ہوا تاش کا پتّا نکال رہا تھا تو شامی کی نگاہ وہاں پہنچ گئی۔ وہ فوراً چلّایا۔

"دیکھ لیا، دیکھ لیا۔ سالے بے ایمانیاں کرتے ہو"

راجہ کھسیانہ ہو کر ہنسنے لگا۔ "ابے کچھ دماغ خراب ہو گیا ہے"

شامی آنکھیں نکال کر بولا "تم نے ابھی پیر کے نیچے سے پتا نکالا ہے۔"

راجہ نے دھاندلی کرنا چاہی تو شامی نے جل کر ہاتھ میں دبے ہوئے تاش کے سارے پتے پھینک دیے

اور رُوٹھ کر بیٹھ گیا۔ راجہ اُس کو چھیڑنے لگا۔

"سالا ہارنے لگا تو رونے بیٹھ گیا"

شامی کہنے لگا۔"تم ایک نمبر بے ایمان ہو۔ میں اب کبھی تمھارے ساتھ نہیں کھیلوں گا"

راجہ کہنے لگا"کھیلو گے کیوں نہیں داؤں دے کر جانا پڑے گا"

شامی اکڑ کر بولا۔"دیکھیں کون سالا ہم سے داؤں لیتا ہے"

راجہ کو غصّہ آ گیا۔ اُس نے گھور کر دُبلے پتلے شامی کو دیکھا اور کڑک کر بولا۔"اچھا تو یہ بات ہے" اور اُس نے جھپٹ کر شامی کا گریبان پکڑ لیا۔ شامی نے جھٹکا دے کر گریبان چھڑانا چاہا تو وہ جھر سے پھٹ گیا۔ ایکبارگی شامی کو تاؤ آ گیا۔ اُس نے منہ بسور کر راجہ کی جانب دیکھا اور زنّاٹے کا ایک ایسا ہاتھ راجہ کے گال پر دیا کہ اُس کے کان جھنجھنا اٹھے۔ راجہ تلملا کر اُس پر جھپٹا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

لڑکوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ اور اُنھوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اب وہ دو ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک ٹولی راجہ کی حمایت میں تھی اور دوسری شامی کو للکار للکار کر اُس کی ہمت بڑھا رہی تھی۔ شامی تھا تو مریل سا مگر اُس کے جسم میں بڑا کس بل تھا۔ پہلے راجہ نے ٹنگڑی لگا کر اُس کو پٹخنی دی۔ مگر ایک بار شامی نے نیچے سے لچک کر زور لگایا تو راجہ سے سنبھلا نہ گیا اور وہ دھڑام سے نیچے آ گیا۔ شامی جھٹ اُس کے سینہ پر چڑھ بیٹھا اور گردن پر گھٹنا رکھ کر دو تین گھسے جو دیئے تو راجہ چیں بول گیا۔ لگا نیں نیں کرنے۔

اُسی وقت گلی کے اندر ایک سایہ نمودار ہوا۔ جب وہ روشنی میں آیا تو لڑکوں نے دیکھا کہ کالے صاحب آ رہا تھا۔ اُس کی کمر جھکی ہوئی تھی اور چلتے وقت اُس کے قدم بوجھل معلوم ہو رہے تھے۔ اُس کو دیکھتے ہی لڑکوں نے نعرہ لگایا۔

"کالے صاحب"

اُس نے سب کو گھور کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُن کے قریب پہنچ گیا۔ راجہ اور شامی ابھی تک گتھم گتھا تھے۔ کالے صاحب کی جو اُن پر نظر پڑی تو وہ دونوں کو ڈانٹنے لگا۔ بڑی مشکل سے اُس نے اُن کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرایا۔ اُن کی قمیضیں جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھیں، چہرے خاک میں لتھڑے ہوئے تھے اور سانس

دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ دھندلی روشنی میں دونوں کا حلیہ بھوتوں کی طرح خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ کالے صاحب نے اُن کو گہری نظروں سے دیکھا، اور آنکھیں نکال کر غصّہ سے دونوں پر جھپٹا۔ اُنھوں نے جو کالے صاحب کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھا تو گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کالے صاحب کو ہنسی آ گئی۔ اُس نے بغل میں دبا ہوا چمڑے کا بیگ سنبھالا اور آگے بڑھ گیا۔ لڑکے تالیاں بجا بجا کر چیخنے لگے۔

"کالے صاحب۔ ٹوٹ گئی بوتل اُڑ گیا کاگ۔"

"کالے صاحب……"

وہ چلتے چلتے ٹھہر جاتا۔ بار بار لڑکوں کو ڈانٹتا کبھی اُن کو دھمکانے کے لئے جھپٹتا۔ لڑکے اُس کو پلٹتے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے، پھر اکٹھا ہوتے اور تالیاں بجا بجا کر اُس کو چھیڑتے۔ وہ دُور تک اُس کے پیچھے شور مچاتے چلے گئے۔

لالٹین کے نیچے اب صرف راجہ، شامی اور نوشا رہ گئے تھے۔ راجہ کھسیانا دکھائی پڑ رہا تھا۔ وہ محلّے کے سارے لڑکوں کا سرغنہ تھا اور اُس وقت شامی کے ہاتھوں سب کے سامنے اُس کی کرکری ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو دُرست کیا۔ جیب سے ایک مڑی تڑی سگریٹ نکال کر سلگائی۔ دو تین لمبے لمبے کش لگائے اور ایک روپیہ نکال کر نوشا سے بولا۔

"ابے سینما چلتا ہے"

نوشا کی خوشی سے باچھیں کھِل گئیں۔ کہنے لگا۔ "کون سی پکچر دیکھو گے؟"

راجہ، جواب شامی سے انتقام لے رہا تھا، اُس کی جانب دیکھ کر بولا۔

"آج تو یار لوگ 'بغداد کا چور' دیکھیں گے۔ باپ قسم وہ فسٹ کلاس پکچر ہے کہ لطف آجائے گا"

نوشا نے شامی کی سفارش کی۔ "اور شامی کو نہیں لے چلوگے؟"

راجہ بگڑ کر بولا۔ "دیکھ بے چلنا ہے تو سیدھی بات کر ورنہ جا اپنی ایسی کی تیسی میں۔ شامی نوشا پر غرّانے لگا۔

"دیکھو جی تم کو سینما جانا ہو تو جاؤ، میرا نام مت لو۔ میں تو گھر جاؤں گا۔ میں تمھاری طرح رات رات بھر آوارہ گردی نہیں کرتا" اتنا کہہ کر وہ تو وہاں سے چل دیا۔

نوشا کہنے لگا - ابے سن تو "

راجہ نے ڈانٹ کر کہا " جانے دے سالے کو۔ دیکھ لینا اب کبھی اس کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ ایک نمبر کی ہے۔ لے کے سالے نے گردن جھپیل ڈالی" وہ آہستہ آہستہ اپنی گردن سہلانے لگا، جس پر خراش پڑ گئی تھی۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے سینما ہاؤس کی طرف چل دیے۔

آدھی رات کے قریب جب دونوں "بغداد کا چور" دیکھ کر لوٹے تو گلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے دھندلی روشنی میں ایک خارش زدہ کتا بیٹھا اپنی پیٹھ کھجا رہا تھا۔ جب دونوں اس کے قریب سے گذرے تو راجہ نے ایک ایسی زوردار لات ماری کہ وہ ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا ہوا بھاگا۔ اس کی چیخوں سے ساری گلی گونج اٹھی۔ نوشا جو پہلے ہی سہما ہوا نظر آ رہا تھا اس شور سے اور بھی خوف زدہ ہو گیا۔ مگر راجہ بڑے کھلنڈرے موڈ میں تھا۔ پکچر اُس کو پسند آئی تھی۔ بار بار کہہ رہا تھا۔

"یار بڑی زوردار پکچر تھی۔ کیا سالا اسٹائل سے مکہ مارتا تھا" راجہ نے مٹھی بھینچ کر اپنا ہاتھ بڑے پینترے کے ساتھ ہوا میں لہرایا اور حلق سے آواز نکالی۔ "ڈھم" اُس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور نوشا کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر بولا " باپ قسم مزا آگیا آج تو "

نوشا جل کر بولا " ابے تجھکو تو مزا آ رہا ہے۔ کہیں اپنا سینما نہ ہو جائے "

راجہ اُس کو چھیڑنے لگا " جب اتنا ہی ڈر ہے تو سالے خاں پھر سینما کیوں جاتے ہو "

نوشا کہنے لگا " یار اب نہیں جاؤں گا۔ بہت رات ہو جاتی ہے "

" ابے تو روز یوں ہی کہتا ہے۔ کل پھر جائے گا۔ دیکھ لینا "

دونوں اندھیرے میں باتیں کرتے ہوئے گلی کے اندر چلتے رہے۔ جب نوشا کا گھر قریب آگیا تو اُس نے راجہ کو ٹھہرا لیا اور خود آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے پر گیا۔ کان لگا کر اندر کی آہٹ لی۔ سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے ہلایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ نوشا اُلٹے قدموں راجہ کے پاس واپس آگیا۔

راجہ نے پوچھا " سب ٹھیک ٹھاک ہے ؟ "

نوشا نے جواب دیا" دروازہ تو بند ہے ۔" اُس کی آواز میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔

راجہ کہنے لگا" ابے تو پھر انتظار کس بات کا ہے"؟

دونوں دبے دبے قدموں سے چلتے ہوئے گھر کی پچھلی دیواری کے نیچے پہنچ گئے۔

نوشا کا گھر محلّہ کے عام مکانوں کی طرح کھپریل کی چھت والا پُرانی وضع کا مکان تھا۔ اُس کی دیواریں زیادہ اونچی نہ تھیں۔ راجہ دیوار سے ہاتھ لگا کر گھوڑا بن گیا اور نوشا سے بولا۔

"آجا میرے شیر"

نوشا چُپ چاپ اُس کی پیٹھ پر چڑھ گیا۔ اُس نے کھڑے ہو کر گھر کی دیوار کو مضبوطی سے پکڑا اور بندر کی طرح اُچک کر دیوار پر پہنچ گیا۔ نیچے سے راجہ نے سرگوشی کے سے لہجہ میں کہا۔

"میں تو اب چلا"

نوشا نے دبی زبان سے کہا "اچھا"

راجہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ لیکن نوشا دیوار پر خاموش بیٹھا رہا۔ جب دیر تک کوئی آواز سُنائی نہ دی تو وہ دھم سے صحن کے اندر کود گیا۔ وہاں ٹین کا ایک ڈبہ پڑا تھا، جو اُس کے پیروں کے نیچے آکر زور سے بج اٹھا۔ اُسی وقت کمرے کے اندر نوشا کی ماں کی آواز اُبھری۔

"کون؟"

نوشا دیوار سے چپٹ کر بیٹھ گیا اور منہ سے بلّی کی طرح آواز نکالی "میاؤں، میاؤں"۔ ماں کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز پھر اُبھری۔

"ہش، بِل بِل بلّی ہش!"

نوشا دیوار کے پاس سہما ہوا بیٹھا رہا۔ اُس نے سوچا اگر اس وقت اماں نے باہر آکر کہیں اُس کو دیکھ لیا تو پھر اُس کی اچھی خاصی مرمت ہو جائے گی۔ جاڑوں کی رات تھی۔ ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ سردی کے مارے نوشا کے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ سارا بدن برف کی مانند سرد پڑ گیا تھا۔ مگر وہ دبکا ہوا وہیں بیٹھا رہا۔ جب دیر تک کمرے کے اندر کوئی آہٹ نہ ہوئی تو اُس نے احتیاط کے طور پر دو تین بار بلّی کی آواز نکالی

مگر کوئی نہ بولا۔

وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا۔ کونے میں لیمپ جل رہا تھا اور اس کی دھندلی روشنی میں سامنے فرش پر اس کا چھوٹا بھائی انو لیٹا تھا۔ اس سے ذرا فاصلہ پر ماں لیٹی تھی اور اس کے قریب ہی اس کی بڑی بہن سلطانہ لحاف میں دبکی ہوئی پڑی تھی۔

نوشا چوروں کی طرح چپکے سے کمرے کے اندر گیا اور انو کے برابر لیٹ گیا۔ اسی وقت ماں نے کروٹ بدلی۔ ڈر کے مارے اس نے انو کی رضائی کو ہاتھ بھی نہ لگایا، جس کو اوڑھ کر دونوں سویا کرتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ نیند میں ذرا بھی انو کے ہاتھ لگا تو وہ گھبرا کر اس طرح چیختا تھا کہ سوتوں کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ وہ سردی سے کانپتا ہوا اسکڑا سکڑایا لیٹا رہا۔

ذرا دیر بعد سلطانہ کے کھانسنے کی آواز کمرے کی خاموشی میں ابھری۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے گھوم کر نوشا کو دیکھا جو جھوٹ موٹ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئی اور رضائی اس کے جسم پر ڈال کر سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگی۔

"او موٹے بلّے، رضائی تو اوڑھ لے۔ تجھے تو سردی بھی نہیں لگتی۔"

نوشا نے آنکھیں کھول دیں اور گھور کر سلطانہ کو دیکھا۔ وہ اس کو چھیڑنے لگی۔

"آنکھیں نکالیں تو ابھی جگاتی ہوں اماں کو۔"

نوشا نے زبان سے تو کچھ نہ کہا البتہ اس کی ران میں زور سے چٹکی بھر لی۔ وہ بلبلا کر بولی: "ہائے اماں مری۔ ایک تو کمبخت کے ساتھ نیکی کرو، اوپر سے چٹکیاں بھر رہا ہے۔"

اس دفعہ سلطانہ کی آواز کسی قدر اونچی تھی مگر ماں گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے کروٹ تک نہ بدلی۔ نوشا نے ڈر کے مارے چوں تک نہ کی۔ آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑا رہا۔ جب سلطانہ اٹھ کر جانے لگی تو وہ جل کر بڑبڑایا۔

"حرامزادی"

سلطانہ نے اُس کی گالی سن لی تھی۔ مگر اب وہ اُس سے اُلجھنا نہیں چاہتی تھی۔ خاموشی سے اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔ نوشا ذرا دیر تک پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر گہری نیند سو گیا۔ اور دن چڑھے تک پڑا سوتا رہا۔

اُس روز جب وہ کارخانے پہنچا تو دیر ہو گئی۔ پھاٹک پر چوکیدار گل خاں بیٹھا ناک میں نسوار چڑھا رہا تھا۔ اُس کو دیکھتے ہی بولا "خو تم اتنی دیری سے آتا ہے۔ سیٹھ بوت گرم ہوتا ہے۔ جاؤ جلدی جاؤ ہم تو ......" فوراً ہی اُس کو چھینک آ گئی۔ پھر کئی چھینکیں آئیں۔ اُس کی بقیہ بات چھینکوں کی نظر ہو گئی اور نوشا لپک کر احاطہ میں داخل ہو گیا۔

اندر پہنچتے ہی اُس نے چاروں طرف چوروں کی طرح چوکنا نظروں سے عبداللہ مستری کو دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہ پڑا۔ وہ موٹروں کی مرمت کرنے والے اس کارخانے کا مالک تھا اور کاریگروں کو سزا دینے کے معاملہ میں دُور دور تک اس کا شہرہ تھا۔ نوشا چاروں طرف دیکھتا بھالتا "شیڈ" کے نیچے پہنچ گیا۔ جہاں دوسرے کاریگر لڑکے بیٹھے کام کر رہے تھے۔ اُس کے پہنچتے ہی ایک لڑکا زور سے کھنکار کر بولا۔

"دیر سے آنا تھا تو سہرے تو باندھ کر آتے"

دوسری طرف سے آواز آئی "ارے یار یہ تو بڑا پکا ہے۔ ابے رات کونسی فلم دیکھی تھی"

"سالا روز سنیما جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی شوقین سے ٹکر گیا۔"

"ارے اس کی کیا پوچھتے ہو اس پر تو چاقو چلتے ہیں، چاقو"

نوشا بگڑ کر بولا "دیکھو جی، مجھے یہ مذاق اچھا نہیں لگتا"

ابھی اس پر ایک آدھ فقرہ اور چست ہوتا کہ اسی وقت عبداللہ مستری کی آواز سنائی دی۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ نوشا نے جلدی سے ایک پیچ اٹھایا اور قریب کھڑی ہوئی موٹر کے نیچے گھس گیا اور خواہ مخواہ کھٹر پٹر کرنے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد عبداللہ مستری وہاں آ گیا۔ کاریگروں کی روح فنا ہو گئی۔ سب کے ہاتھ جلدی جلدی چلنے لگے۔ نوشا موٹر کے نیچے گھسا ہوا کھٹر پٹر کئے جا رہا تھا۔ اُس کا آدھا دھڑ باہر نکلا تھا اور برابر جنبش کر رہا تھا۔ وہ تو صاف بچ گیا۔ ساری آ گئی ایک اور کاریگر کے سر گئی، وہ بھی دیر سے پہنچا تھا۔ اُس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ عبداللہ نے پہلی ہی نظر میں اُس کو بھانپ لیا۔ گردن ہلا کر بولا۔

"کیوں بے دیر سے آیا تھا؟"

ڈر کے مارے لڑکے کے منہ سے آواز نہ نکلی۔ اس دفعہ عبداللہ نے گرج کر پوچھا: "ابے کیا منہ پھوٹ گیا، بولتا کیوں نہیں"؟

وہ گھبرا کر بولا "اماں نے روک لیا تھا"

عبداللہ نے ایک ٹیڑھی سی گالی دے کر کہا "اماں نے کیا اپنے کسی یار کے پاس بھیجا تھا"۔

اس بات کا وہ بے چارہ کیا جواب دیتا۔ صرف عبداللہ کے منہ کو ٹکر ٹکر تکنے لگا۔

عبداللہ غضبناک ہو کر چلایا: "سالوں کو کام بھی سکھاؤ اور اوپر سے تنخواہ بھی دو اور یہ حرام کے تخم اس کا یہ صلہ دیتے ہیں کہ گھر سے نواب بن کر چلتے ہیں"۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک کاریگر کے ہاتھ سے پلاس چھینا اور اُس لڑکے کی ناک اس میں رکھ کر زور سے بھینچ دی۔ وہ بلبلا کر چیخنے لگا۔

"ہائے مر گیا مستری جی"

"تمھارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ اب کبھی دیر سے نہیں آؤں گا"

وہ برابر چیختا رہا، گڑگڑاتا رہا مگر عبداللہ نے اُس کی ناک نہ چھوڑی۔ جب وہ تکلیف سے بے قابو ہو کر فرش پر ہاتھ پاؤں پٹکنے لگا تو عبداللہ نے اُس کو ڈانٹا۔

"سالے یہ ایکٹنگ ہو رہا ہے"

وہ چیخا "ارے مر گیا مستری جی۔ اب کبھی نہیں کروں گا"

مستری زور سے گرجا "سیدھا بیٹھ" لڑکا ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔

ذرا دیر بعد عبداللہ نے پلاس کے شکنجہ سے اُس کی ناک آزاد کی، جو اب ٹماٹر کی طرح سُرخ نظر آ رہی تھی لڑکا بار بار ناک کو چھوتا اور زور زور سے سسکیاں بھرنے لگتا۔ عبداللہ نے اس کی تکلیف پر توجہ دیئے بغیر اونچی آواز میں پکارا۔

"منشی جی۔ اے منشی، ذرا یہاں تو آؤ"

فوراً ہی ایک سوکھا پتلا، ادھیڑ عمر کا آدمی، ناک کی پھنگی پر عینک کو درست کرتا ہوا، وہاں آ گیا۔

عبداللہ نے اس لڑکے کی جانب اشارہ کر کے کہا: "دیکھو جی۔ آج کی اس حرام کے جنے کی تنخواہ نہیں لگے گی۔ سمجھ گئے"

منشی جی فوراً سمجھ گئے۔ جھٹ سے جواب دیا "بہت بہتر، بہت بہتر۔ میں ابھی جا کر رجسٹر میں اس کی غیر حاضری لگائے دیتا ہوں۔"

لڑکے نے اطمینان کی سانس لی کہ اب تو اُس کی جان بچ جائے گی۔ لیکن عبداللہ مستری اتنی آسانی سے کاریگروں کی خطا معاف کر دیا کرتا تو پھر اُس کی شہرت کیوں ہوتی۔ کہنے لگا

"اچھا جی اب تم سارے کپڑے اُتارو اور نلکے کے نیچے جا کر بیٹھ جاؤ۔ فی الحال تمہاری یہی سزا ہے۔"

کاریگر لڑکا گڑگڑانے لگا۔ مگر عبداللہ ایسی خوشامدوں سے کہاں پسیجنے والا تھا۔

ڈانٹ کر بولا "ابے اُتارتا ہے کپڑے یا پھر دکھاؤں کال کوٹھری کا راستہ"

کال کوٹھری کا نام سُنتے ہی لڑکے کے اوسان خطا ہو گئے۔ اُس نے گھبرا کر جلدی جلدی سارے کپڑے اُتارے اور مادر زاد برہنہ ہو گیا۔

اُس روز آسمان پر ابر چھایا تھا۔ ہوا بھی سنکی ہوئی چل رہی تھی۔ جاڑوں کی سردی تھی۔ خود عبداللہ موٹے اونی کپڑے کا اوورکوٹ پہنے تھا اور اپنے سر اور کانوں کو مفلر سے ڈھکے ہوئے تھا۔ لڑکے کا برہنہ جسم سردی سے بید مجنوں کی شاخوں کی طرح کپکپانے لگا۔ عبداللہ نے اس کو اس طرح خاموش کھڑا دیکھ کر کہا۔

"ابے اس طرح کب تک چوتڑ کھولے کھڑا رہے گا۔ اب نلکے تلے جاتا ہے کہ نہیں۔"

نو دس برس کے نوعمر کاریگر لڑکے نے بے بسی سے عبداللہ کی جانب دیکھا اور نظریں شرم سے نیچی کیے ہوئے شیڈ کے اندر سے نکل کر پانی کے نل کے نیچے جا کر بیٹھ گیا، جس کی ٹونٹی کھلی ہوئی تھی اور پانی موٹی سی دھار بن کر گر رہا تھا۔

جب عبداللہ وہاں سے چلا گیا تو نوشا نے چوہے کی طرح موٹر کے نیچے سے گردن نکالی اور باہر آ گیا۔ اُس کے کپڑے گرد سے اٹ گئے تھے اور چہرے پر سیاہی کے جگہ جگہ دھبے نظر آ رہے تھے۔ پاس بیٹھے ہوئے ایک کاریگر نے جو اس سے عمر میں دو تین سال بڑا ہو گا، کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔

"اُستاد اب رشوت میں ایک پیار دلواؤ نہیں تو ابھی تم کو بھی نلکے کے نیچے بھجواتا ہوں"

نوشا اس کے تصور ہی سے کانپ اٹھا۔ اُس نے چپ چاپ چہرہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اس لڑکے نے اُس کے گالوں کا ایک بوسہ لیا اور پھر بُرا سا منہ بنا کر فرش پر تھوک دیا۔

"سالے نے منہ کڑوا کر دیا۔ ابے یہ منہ پر موبل آئیل کہاں سے چپڑ لیا"

سب کاریگر اُس کی اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ نوشا کھسیانا ہو کر سر کے بال کریدنے لگا

●

۲

کمرے کے اندر لیمپ جل رہا تھا، جس کی دھندلی روشنی میں سلطانہ چپ چاپ بیٹھی قینچی سے بیڑی کے پتے کاٹ رہی تھی۔ اس کے برابر ہی ماں بیٹھی تھی، جو کٹے ہوئے پتوں میں تمبا کو بھر بھر کر بیڑیاں بنا رہی تھی ان دونوں سے ذرا ہٹ کر انو ایک کاپی پر جھکا ہوا لکھنے میں منہمک تھا۔ نوشا سب سے الگ تھلگ کونے میں پڑا کروٹیں بدل رہا تھا۔ کمرے میں دیر سے خاموشی چھائی تھی آخر ماں نے اس سکوت کو توڑا۔ وہ انو کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"دیکھ کل سویرے ہی سویرے اٹھکر کارخانے چلے جانا اور ملک جی سے کہنا کہ سارا پچھلا حساب صاف کر دو۔"

انو نے ماں کی جانب دیکھے بغیر، بے نیازی سے جواب دیا "اچھا، اچھا"

ماں نے پھر کہا: "دیکھ بھولنا مت۔ پورا حساب لیکر آنا۔ نہیں تو گھر میں فاقہ پڑ جائے گا۔ میرے پاس اب ایک دھیلا نہیں رہا۔ اور ہاں ان سے یہ بھی کہہ دینا کہ شام تک ہزار بیڑیاں پہنچ جائیں گی۔ سمجھ گیا"

اُس کے ہاتھ برابر تیزی سے چلتے رہے اور وہ رک رک کر اپنی بات کہتی رہی۔ ذرا دیر وہ خاموش رہی، پھر نہ جانے کیا سوچ کر بولی۔

"ذرا اِدھر تو آ۔ بیڑیوں کے بنڈل بنا بنا کر تاگہ لپیٹتا جا"

انو نے احتجاج کیا: "میں اسکول کا کام کر رہا ہوں۔ کام پورا نہیں ہوا تو کل ماسٹر صاحب بنچ پر

کھڑا کردیں گے:

مگر ماں نے اُس کی ایک نہ سنی۔ ڈانٹ کر بولی: "چل چل باتیں نہ بنا۔ بڑا آیا پڑھنے والا۔ بس ہو چکی پڑھائی۔ پہلے پیٹ کا دھندا کر۔ کھانے کو نہیں ہوگا تو سب سے زیادہ تو ہی فیل مچائے گا۔"

اُلو بادل ناخواستہ اٹھکر ماں کے پاس جاکر بیٹھ گیا اور بیڑیوں کے بنڈل تیار کرنے لگا۔ اسی وقت باہر گلی میں گیدڑ کے بولنے کی آواز اُبھری۔ نوشا جو ابھی تک تھکا ہوا سا لیٹا تھا! چانک اُٹھکر بیٹھ گیا۔ سلطانہ نے اُس کی جانب مُسکرا کر دیکھا اور ماں سے کہنے لگی۔

"اماں آج تو سرِ شام ہی گیدڑ بولنے لگے۔"

ماں لاپرواہی سے بولی: "توبہ کر دھیا! اس وقت کہاں سے گیدڑ آگئے۔"

نوشا فوراً بیچ میں بول اٹھا: "نہیں اماں آواز تو گیدڑ کی معلوم پڑتی ہے۔ جاکر بھگا آؤں۔" ماں نے ڈانٹ کر کہا۔

"چل بیٹھ بڑا آیا گیدڑ بھگانے والا۔ یہ کیوں نہیں کہتا کہ وہ تیرا سگا باہر کھڑا بلا رہا ہے۔ دیکھ میں تجھ سے ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ اس حرامی راجہ کی صحبت چھوڑ دے نہیں تو سر پہ ہاتھ دھر کر روئے گا۔"

نوشا کھسیانا ہو کر رہ گیا اور دیر تک بڑا سلطانہ کو کوستا رہا، جو شوخی سے بار بار اُس کی جانب دیکھ کر مُسکرا رہی تھی۔ نوشا کا بس چلتا تو وہ اُس کے منہ پر ایسا تناٹے کا تھپڑ رسید کرتا کہ ساری ہنسی نکل جاتی۔

نوشا جھنجھلا جھنجھلا کر سلطانہ کو کوستا رہا اور باہر گلی میں راجہ بار بار حلق کے اندر سے گیدڑ کی آواز نکالتا رہا۔ ہر بار وہ دروازے کی جانب دیکھتا مگر اُس روز دروازہ نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ وہ کتنی ہی دیر تک نوشا کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخر مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

راجہ وہاں سے میونسپلٹی کی لالٹین کے پاس آیا۔ یہاں بھی سناٹا پڑا تھا۔ محلہ کے کسی لڑکے کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ سردی کڑاکے کی پڑ رہی تھی۔ دن بھر بادل گھرے رہے شام کو بوندا باندی بھی ہوتی تھی اور اب ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ راجہ کے پاس اُس روز پیسے بھی زیادہ نہیں تھے، ورنہ وہ سینما ہی چلا جاتا۔ سوچا تھا کہ نوشا مل جائے گا تو دونوں بیٹھ کر مسلم ہوٹل کے اندر ایک ایک کڑک چائے پئیں گے اور ریڈیو سے

فلمی گانے سنیں گے۔

راجہ نے لالٹین کے نیچے کھڑے ہو کر زور زور سے گیدڑ کی آواز نکالی،

ہکا ہوا ہکا ہوا ویران سنسان گلی کے اندر آواز گونجتی رہی مگر کوئی دروازہ نہ کھلا کوئی باہر نکلا

وہ جل کر بڑبڑانے لگا۔ "آج سب سالے مر گئے" اسی جھنجھلاہٹ کے عالم میں وہ مسلم ہوٹل کی طرف

چل دیا۔ مگر اس وقت ریڈیو پر خبریں سنائی جا رہی تھیں۔ اس نے سوچا جب تک خبریں چلیں اتنی دیر میں

کیوں نہ چمپی کرالی جائے۔ سر میں کچھ درد بھی ہو رہا تھا۔ چمپی کرنے والا ایک لڑکا ہوٹل کے باہر ہی بیٹھا تھا۔ راجہ

نے اُس کے قریب جا کر کہا۔

"ابے کچھ ہوتی ہے چمپی دمپی"

وہ جھٹ سے بولا "ابھی لو" اور تیل کی شیشیاں سنبھال کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ راجہ نے پوچھا۔

"مگر یہ تو بتا کرے گا کیا؟"

وہ کہنے لگا۔ "ابے یار جو جی چاہے دیدینا"

راجہ بولا "میرے پاس تو ایک دونی ہے بول کیا کہتا ہے؟"

اُس نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا "اچھا چل یار تو بھی کیا یاد کرے گا۔"

راجہ وہیں ہوٹل کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ چمپی والے نے شیشی سے تیل نکال کر راجہ کے سر میں ڈالا اور

مالش شروع کر دی۔ اس کی انگلیاں نرم تھیں اور ہاتھ بڑی پھرتی سے چل رہے تھے۔ راجہ چمپی کراتے کراتے

پوچھ بیٹھا۔

"کیوں بے روزانہ تم لوگ کیا مل جاتا ہوگا؟"

وہ بولا "بس یار کچھ پوچھ نہ کیا مل جاتا ہے"

راجہ اصرار کرنے لگا "پھر بھی"

"کبھی روپیہ ڈیڑھ روپیہ۔ وہ پیٹ لیتا ہوں"

راجہ نے حیرت سے کہا "ابے تو یہ کچھ کم ہے۔ کیا کسی کا گھر لوٹنے کا ارادہ ہے"

وہ کہنے لگا "کم تو نہیں پر محنت بڑی ہے۔"

راجہ بولا: "ابے کیا محنت ہے۔ میں سیکھوں تو مجھکو یہ کام سکھا دے گا۔"

واقعی وہ اس کے لئے آمادہ بھی تھا۔ چپی کرنے والا کہنے لگا۔

"یار کیا کرے گا یہ کام سیکھ کر۔ سالا بڑا واہیات دھندا ہے۔"

"واہیات کی اس میں کونسی بات ہے۔"

وہ کہنے لگا "بس کہدیا کہ ہے۔"

راجہ نے ڈانٹ کر کہا "ابے صاف صاف بتا۔ آخر بات کیا ہے؟"

لڑکا مسکرانے لگا "تو پھر اس آدمی سے پوچھ لو۔"

راجہ نے اس شخص کی جانب دیکھا، جو ایک دوکان کے تختے پر بیٹھا اپنی ران کھجا رہا تھا۔ راجہ اس سے تو کوئی بات نہیں کی۔ البتہ چپی والے سے بولا۔

"ابے اس سے کیوں پوچھوں تو کیوں نہیں بتاتا؟"

وہ کہنے لگا "وہ بالکل ٹھیک ٹھیک بتا سکتا ہے" اس کے بعد وہ اس آدمی کو مخاطب کرکے کہنے لگا

"اماں خاں صاحب یہ راجہ تم کو پوچھ رہا ہے۔"

خاں صاحب نے ران کھجاتے کھجاتے راجہ کی جانب دیکھا اور ہنس کر بولا "بیٹا ایک مدد کلدار ملے گا۔ بول چلتا ہے۔"

راجہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا "کہاں؟"

اس نے بدمعاشی سے آنکھ مار کر کہا: "راجہ جان من، اب یہ بھی بتانا پڑے گا" اور جیسے ایک بارگی راجہ کی سمجھ میں ساری بات آگئی۔ اس نے زمین سے اس کو ایک موٹی سی گالی دی اور لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"سالے حرامی پن کرتا ہے ابھی ساری بدمعاشی نکال کر رکھ دونگا۔"

وہ گھبرا کر بولا: "ابے تو میں نے تجھ سے کہا بھی کیا۔"

راجہ نے اسی طرح کڑک کے کہا۔ سالے یہاں بدمعاشی کرنے آتے ہو۔"

وہ بولا "ابے جائے گا یا کچھ ہے گا۔ خواہ مخواہ سر ہوتے جا رہا ہے۔" اس نے راجہ کو دھمکی دی۔ مگر راجہ ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔ اُس نے خاں صاحب کو سیکڑوں گالیاں دے ڈالیں۔

شامت اعمال چمپی کرنے والا لڑکا خاں صاحب کی حمایت میں بول اُٹھا۔ راجہ اُس کے سر ہو گیا۔ غصہ کے مارے اُس نے تیل کی شیشیاں توڑ ڈالیں۔ اچھا خاصہ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خاں صاحب بہت سٹ پٹائے بڑی مشکل سے راجہ کو منانا پڑا۔ خوشامد بھی کی اور گالیاں گھاتے میں کھائیں۔

راجہ نے جھنجھلاہٹ میں چائے بھی نہیں پی اور اپنی کھولی کی جانب چل دیا۔ کھولی کا دروازہ کُھلا تھا اور اندر گھُپ اندھیرا تھا۔ یہ کھولی ایک شکستہ عمارت کا ایک حصہ تھی، جو پچھلی برسات میں منہدم ہو گئی تھی۔ راجہ کے قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی بوڑھے گداگر نے کھانسنا شروع کر دیا۔

راجہ نے پوچھا "اماں اُستاد تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

وہ کھانستے کھانستے بولا "باپ رے باپ آج تو غضب کی سردی پڑ رہی ہے۔ ذرا دروازہ تو بند کر دے اور دیکھ وہ کونے میں چادر پڑی ہے، وہ مجھے اُڑھا دے۔"

اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ راجہ نے ماچس جلائی تو سامنے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا بوڑھا، فرش پر گٹھری بنا ہوا نظر آیا۔ روشنی کے ساتھ ہی ایک چمگادڑ کھولی کے اندر اپنے پر پھڑپھڑا کر تیزی کے ساتھ چکر کاٹنے لگی۔ راجہ نے کونے میں پڑی ہوئی چادر اٹھائی اور گداگر کے اوپر ڈال دی۔ گداگر اپنے کوڑھ کے زخموں کو کھجا کھجا کر کھجاتے ہوئے بولا۔

"آج تو تو جلدی آ گیا۔ سردی لگی ہو گی۔ باہر جھکڑ چل رہے ہیں۔"

راجہ نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کھولی کا دروازہ بند کیا اور اپنی گدڑی کے اندر گھُس گیا۔ اُس وقت غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ راجہ کو محسوس ہوا کہ گدڑی پانی میں بھیگ گئی ہے اور اس کا سارا بدن منجمد ہوتا جا رہا ہے۔ اُس نے بچوں کی طرح ٹھنڈ سے ہُن ہُن کر کے حلق کے اندر سے بے ہنگم سی آوازیں نکالیں اور گھٹنوں کو سکیڑ کر سینے سے لگا لیا۔

بڑی دیر بعد راجہ کو نیند آئی۔

سویرے ہی سویرے گداگر نے کمر پر زور کی ایک لات مار کر راجہ کو جگا دیا۔ اس کی آنکھ تو کھل گئی مگر وہ دم سادھے خاموش پڑا رہا۔ گداگر کی دوسری لات اس کے کندھے پر آکر لگی۔ اب لیٹے رہنا مشکل تھا۔ بوڑھا بخشنے والا نہیں تھا۔ لاتیں بھی مارتا اور شام کو اٹھنی دینے میں نخرے الگ کرتا۔ آخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بوڑھے گداگر نے کھولا تھا یا رات کو ہوا کے جھکڑوں سے بھڑ ہٹ گیا تھا۔ باہر ہر طرف کہرہ چھایا ہوا تھا۔ اس دھندلی دھندلی نیلگوں روشنی میں گداگر بھوتوں کی طرح کریہہ المنظر نظر آرہا تھا۔ اس کی گندی داڑھی بکھری ہوئی تھی اور سر کے بال جھک کر آنکھوں پر آگئے تھے۔ وہ اس کے سہرے پر بکھرا ہوا ہے رستے ہوئے زخموں کو تیزی کے ساتھ کھجا رہا تھا۔

راجہ نے کھڑے ہو کر کھولی کے اندر سے لکڑی کی چھوٹی سی گاڑی باہر نکالی۔ گداگر کو اس میں سوار کرایا اور گاڑی دھکیل کر کھینچتا ہوا آگے چل دیا۔ بوڑھا اپنی چادر اوڑھ کر مزے سے گاڑی کے اندر بیٹھا رہا مگر راجہ جو صرف ایک پھٹی ہوئی قمیص پہنے تھا اس کا جسم صبح کی ٹھنڈی ہوا سے لرز رہا تھا۔ اس کو سردی سے ٹھٹھرتے دیکھ کر، بوڑھا گداگر کہنے لگا

"ابے یہ روز روز جو تو سینما دیکھنے جاتا ہے کیوں بے فضول پیسہ برباد کرتا ہے ایک پرانا کوٹ کسی کباڑیے سے کیوں نہیں خرید لیتا۔ دیکھ تو کیسی ٹھنڈ بڑھ رہی ہے"

راجہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ گاڑی کو دھکیل کر چلاتا رہا اور سردی سے کپکپاتا رہا۔ سارا شہر نیلگوں کہرے کے دھندلے جال میں الجھا ہوا ابھی تک سو رہا تھا۔ ہر طرف دھند ہی دھند تھی۔ سناٹا تھا، خاموشی تھی اور اس گہرے سکوت میں آہستہ آہستہ ابھرتی ہوئی آمد صبح کی پہلی آوازیں کھیوں کے پیوں کی طرح بھبھا رہی تھیں۔ گداگر نے اپنی مخصوص صدا لگائی ؎

جاگنا ہے جاگ لے افلاک کے سائے تلے
حشر تک سوتا رہے گا خاک کے سائے تلے

اس کی آواز میں بلا کا سوز تھا۔ صبح کی گہری خاموشی میں اس کی صدا کسی اور دنیا سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی کی سرحدیں ختم ہو چکی ہیں اور ہر طرف موت کا سایہ پھیلتا جا رہا ہے آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے اب ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔

مگر راجہ پر اس دردناک صدا کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔ اس کو کوئی احساس تھا تو صرف سردی کا۔ وہ گاڑی کو کھینچتا ہوا اللہ دیا کے چائے خانہ کے پاس پہنچ گیا۔ اندر بھٹی میں انگارے دہک رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی کوئلہ زور سے چٹختا تو سرخ روشنی کی لکیر دور تک لہرا جاتی۔ بھٹی کے اوپر بڑا سا سماوار رکھا تھا، جس کے اندر سے ہلکی ہلکی بھاپ نکل رہی تھی۔

راجہ نے گاڑی کی رفتار سست کر دی۔ گداگر اللہ دیا کو مخاطب کر کے دعائیں دینے لگا۔ "اللہ کا دیا ہی برکت ہے۔" مگر اللہ دیا، جس کو اس وقت گاہکوں کی ضرورت تھی، بڑی بے رخی سے بولا "بابا آگے جاؤ۔"

راجہ نے ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی آگے بڑھا دی۔ اندر چائے خانے میں اللہ دیا بڑبڑا رہا تھا۔

"سالے صبح ہی صبح نازل ہو گئے۔ بھٹی نہ جلا پہلے اُن کو دیدو۔"

گداگر نے اس کی بڑبڑاہٹ سن کر راجہ سے کہا "ابے تو نے بھی کس سالے نیچے کے پاس گاڑی روکی۔"

راجہ نے بیزاری سے جواب دیا "میں نے سوچا تھا، سالا ایک چائے تو پلا ہی دے گا۔"

گداگر نے فوراً کہا "ابے تو تو نے یہ بات پہلے کیوں نہ کہی۔ پیسے دیتے تو اس کا باپ چائے پلاتا۔ چل تجھے ابھی چائے پلواتا ہوں۔ واہو ہو بڑی زبردست سردی ہے۔" اس کے دانت سردی سے بجنے لگے۔

وہاں سے آگے بڑھ کر وہ ایک اور چائے خانے کے قریب پہنچے۔ دونوں نے ایک ایک پیالی چائے کی چڑھائی اور پھر اپنی راہ پر چل دیے۔ دونوں تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک راہگیر نے قریب سے گذرتے ہوئے ایک سکہ گداگر کے پیالے میں ڈالا۔ ٹن سے آواز ابھری۔ بوڑھے نے ٹٹول کر اس کو اٹھایا اور خوش ہو کر بولا۔

"اکنی جان پڑتی ہے"

اُس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اکنی اُٹھا کر دیکھی اور بڑبڑانے لگا "مجھے تو کچھ کھوٹی لگتی ہے۔"

ذرا تو دیکھ راجہ "۔

راجہ نے اکنی اُس کے ہاتھ سے لیکر غور سے دیکھی اور اُس کو واپس دے کر بولا "ایک دم کنڈم ہے"

گداگر جل کر بولا "یار کیا زمانہ آگیا ہے۔ اب تو پبلک اللہ میاں کو بھی دھوکا دینے لگی"

اس کے بعد وہ دیر تک بڑبڑاتا رہا "آج کا دن تو بڑا منحوس لگے ہے سالی سویرے سے نسیٹ پر نسیٹ ہو رہی ہے۔ خدا خیر کرے"۔

مگر وہ دن دونوں کے لئے منحوس ثابت نہ ہوا کچھ ایسے بھی اللہ کے بندے مل گئے جن کے دل میں خوف خدا تھا اور جو اپنی عاقبت سنوارنا چاہتے تھے۔ دوپہر تک روپے سوا روپے کی ریزگاری اکٹھا ہوگئی ایک محلہ میں کسی مرنے والے کا چالیسواں تھا۔ دونوں نے ٹھاٹھ سے خمیری روٹیاں اور سالن کھایا۔ ذرا دیر سقوے میں بیٹھ کر آرام کیا اور آگے بڑھ گئے۔

دونوں جب شہر کی ایک صاف ستھری سڑک سے گذر رہے تھے تو ایک شخص نے جو وضع قطع سے ڈاکٹر معلوم ہوتا تھا، راجہ کے برابر لمحے بھر کے لئے رُک کر کہا "اے بچے تم اس بوڑھے کے ساتھ کب سے ہو؟" اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اُس نے بوڑھے کوڑھی کو دیکھا جو آنکھیں بند کئے مردوں کی طرح نڈھال پڑا تھا اور اپنے زخموں کو ننجی ننجی انگلیوں سے کھجا رہا تھا۔

"تم اس بوڑھے کا ساتھ چھوڑ دو۔ یہ بڑی خطرناک بیماری ہے"۔

یہ کہکر اس آدمی نے نزدیک کھڑی ہوئی کار کا دروازہ کھولا اور اسٹرنگ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کر دی۔

جب موٹر آگے بڑھ گئی تو گداگر نے اس کو ایک گندی سی گالی دی اور راجہ سے کہنے لگا۔

"سالے نے پیسہ ایک نہیں دیا نصیحت ڈھیر بھر کر ڈالی۔ اب اس مرغی کے بچے سے پوچھو کہ خالی نصیحت سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔ دھت تیرے کی"

گداگر نے پھر گالی دی۔ راجہ نے سوچا بوڑھا ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ خالی نصیحت سے پیٹ تو نہیں بھرتا جب اُسے کوئی کام نہیں ملا تھا تب ہی اُس نے گداگری کی نوکری کی تھی، اب اس کو دونوں وقت پیٹ بھرنے کو کھانا ملتا تھا اور روزانہ اکنی جیب خرچ کو اس کے علاوہ گداگر کی نظر بچا کر جو پیسے بھیک سے اڑا لیتا تھا،

وہ آمدنی الگ رہی۔

دن بھر راجہ بوڑھے گداگر کو گاڑی میں ڈال کر شہر کے گلی کوچوں میں گھومتا پھرا اور بوڑھا اپنی دردناک صدا بلند کرتا رہا۔ گاڑی کے پہیے اونچے نیچے راستوں پر کھڑکھڑاتے رہے۔ گداگر جب ایک کروٹ پڑے پڑے تھک جاتا تو دوسرا پہلو بدلتا۔ کوئی سنسان جگہ ملتی تو راجہ دم لینے کو ٹھہر جاتا۔ سگرٹ سلگا کر دو چار کش لگا کر تازہ دم ہو جاتا۔ صبح تڑکے کے نکلے ہوئے دونوں جب تھکے ہارے کھولی میں واپس پہنچے تو ایک پہر رات گذر چکی تھی۔ بازاروں کی رونق اجڑنے لگی تھی اور گلی کوچوں میں سناٹا پڑ گیا تھا۔

کھولی میں پہنچتے ہی راجہ نے پیسے مانگے۔ بوڑھا حسبِ معمول ٹال مٹول کرنے لگا "ابے تو جا کر ان پیسوں کو برباد کردے گا۔ میرے پاس پڑے رہنے دے۔ تیرے ہی بھلے کی کہتا ہوں۔"

راجہ ضد کرنے لگا: "نہیں میں تو ابھی لوں گا۔"

گداگر جل کر کہنے لگا "سالے مرے گا تو کفن بھی ٹھیک ہی کا پڑے گا۔"

راجہ بولا "دیکھو استاد اب زیادہ باتیں نہ کرو۔ سیدھے ہاتھ سے اٹھنی نکال کر دو۔"

آخر اُس نے ٹول ٹول کے آٹھ آنے کی ریزگاری گنی اور راجہ کے ہاتھ میں رکھ کر اس کو ایک گالی دے ڈالی۔ پیسے ملتے ہی راجہ نے ایک زوردار چھلانگ لگائی اور کھولی سے باہر چلا گیا۔

●

۳

میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے صرف شامی بیٹھا تھا۔ محلّہ کے اور لڑکے بجانے کہاں تھے۔ راجہ اس کے قریب سے گذرا مگر دونوں میں سے کوئی بھی نہ بولا۔ اُس روز کے جھگڑے کے بعد سے اب تک دونوں میں بات چیت بند تھی۔ راجہ ٹہلتا ہوا گلی کے دوسرے نکڑ تک چلا گیا۔ چلتے چلتے اُس نے سوچا کہ شامی سے اب صلح کر لینی چاہیے۔ لہٰذا واپسی پر جب وہ لالٹین کے پاس آیا تو اُس نے بڑی بے باکی سے کہا۔

"ابے شامی! یہ سالا نوشا آج کہاں مر گیا"

شامی بھی شاید اسی انتظار میں تھا۔ اُس نے جھٹ سے جواب دیا "اُس کی اماں نے پکڑ کر بٹھا لیا ہوگا"۔

راجہ اُس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور بے تکلفی سے بولا "یار اس کی ماں سالی ایک نمبر بدمعاش عورت ہے۔ باپ رے باپ اس زور سے چلاتی ہے کہ اُس سے تو ڈر لگتا ہے"۔

شامی نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے کہا "یار تاش ہو تو نکال ذرا دو چار ہاتھ ہو جائیں"

راجہ نے فوراً پتلون کی جیب سے تاش کی گڈی نکالی اور تاشوں کو پھینٹنے لگا۔

شامی بولا "دیکھو استاد ٹرک بازی نہیں چلے گی۔ نہیں تو ہم نہیں کھیلوں گا۔ بیکار میں جھگڑا ٹنٹا ہو جاتا ہے"۔

راجہ اپنے گندے دانت نکال کر ہنسنے لگا "نہیں بے۔ اُس روز تو میں مذاق کر رہا تھا"۔

دونوں اطمینان سے بیٹھکر تاش کھیلنے لگے۔ ایک بار شامی نے جھک کر زور سے پتا مارا اور جھوم کے بولا "کہو استاد کیسی رہی" اسی وقت اُس کے سر پر دھڑسے جوتا پڑا اور گرج دار بھاری آواز اُبھری۔

"اور یہ کیسی رہی!"

شامی نے گھبرا کر دیکھا۔ اس کا باپ سر پر کھڑا خونخوار آنکھوں سے اُس کو گھور رہا تھا۔

اس کے ہاتھ میں جوتا تھا اور چہرہ غصہ سے ڈراونا نظر آ رہا تھا۔ شامی کی سٹی گم ہو گئی۔

باپ نے جوتے کا دوسرا ہاتھ گھمایا مگر شامی گردن جھٹکا کر، سر کو صاف بچا گیا اور تاش چھوڑ کر ایک دم بھاگا۔ باپ نے چیخ کر کہا۔

"ٹھہر جا حرامی نہیں تو کھال اُدھیڑ ڈالوں گا"

مگر شامی اب کہاں ٹھہرنے والا تھا۔ اُس نے ایک زقند بھری اور آنکھ جھپکتے ہی دُور جا پہنچا۔ اور گلی کا چکر کاٹ کر سیدھا گھر گیا۔ باپ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ماں نے اس کو دیکھا تو سمجھ گئی کہ باپ سے مڈبھیڑ ہو گئی، جب ہی اتنا خوف زدہ نظر آ رہا ہے اس نے شامی کو دو چار کوسنے دیئے اور کوٹھری کی جانب دھکیل کر بولی۔

"اب منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ جا جلدی سے چھپ جا ورنہ تیرا باوا آج ہڈی پسلی توڑے بغیر نہیں چھوڑے گا"

شامی جلدی سے کوٹھری کے اندر گھس گیا اور دروازہ اندر سے بند کر کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد، باپ گھر کے اندر آیا اور شامی کو ادھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔ اُس کی گالیوں کی آواز گھر کے سناٹے میں اُبھرتی رہی۔ ہر شخص سہما ہوا تھا، کسی نے چوں تک نہ کی۔

شامی کا خوف کے مارے بُرا حال تھا۔ وہ سہما ہوا کوٹھری کے اندر بیٹھا رہا۔ دروازے پر ذرا بھی آہٹ ہوتی تو اُس کا دل اچھل پڑتا۔ بہت دیر بعد کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ماں سرگوشی کے لہجہ میں اس کو آواز دے رہی تھی۔ شامی نے دروازہ کھولا۔ ماں اس کو اپنے ہمراہ لے کر باورچی خانے میں پہنچی اور کمر میں زور کی چٹکی بھر کر بولی۔

"نِے کچھ کھوس ہے صبح کا بھوکا پیاسا پھر رہا ہے کمبختوں نے میری زندگی حرام کر دی"۔

وہ بھی اپنی قسمت کو کوستی رہتی اور شامی لمبے لمبے لقمے حلق کے نیچے سے جلدی جلدی اتارتا رہا۔ بار بار اس کی سہمی ہوئی نظریں کمرے کی جانب اُٹھ جاتیں۔ وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتا تھا۔ ڈرنے کی بات ہی تھی۔ مارنے کے معاملہ میں وہ بڑا جلاد تھا، جو چیز ہاتھ میں آجاتی وہی اٹھا کر کھینچ مارتا۔ کئی دفعہ اس مار سے شامی کا سر اور پیشانی لہو لہان ہو چکے تھے۔

اُس روز وہ خوف کے مارے باپ کے کمرے میں جاکر نہیں سویا بلکہ ماں سے رضائی لے کر کوٹھری کے اندر جاکر پڑ گیا۔

سویرے کسی کے اُٹھنے سے پہلے ہی وہ گھر سے باہر نکل گیا بغلوں میں ہاتھ دبائے سردی سے ٹھٹھرتا، اخبار کے دفتر پر پہنچا۔ اس وقت تک ایک آدھ ہی ہاکر پہنچ چکا تھا مگر اخبار ابھی چھپ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے اخبار لئے اور سڑکوں پر آواز لگانے لگا۔

"آگیا آگیا، آج کا تازہ اخبار آگیا"

سنسنی خیز خبروں کی سرخیاں چیخ چیخ کر سناتا ہوا وہ تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا ابھی اس کو بہت سے ٹھکانوں پر اخبار لگانا تھا۔ ہر گھر پر وہ اخبار کھڑکی کے راستے یا دروازہ کی درزوں سے اندر پھینک دیتا اور جلدی سے آگے بڑھ جاتا۔ جہاں دروازہ کھلوائے بغیر چارہ کار نہ ہوتا، وہاں وہ آواز لگاتا۔

"اخبار والا"

اسی طرح گھروں پر اخبار پہنچاتا ہوا جب وہ ایک مکان پر پہنچا تو آواز لگاتے ہی ایک شخص دروازے سے نمودار ہوا اُس وقت وہ تولئے سے چہرہ پونچھ رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

"تم اتنی دیر سے اخبار کیوں لاتے ہو"؟

شامی معذرت کرنے لگا "آئندہ جلدی لاؤں گا۔ آج ذرا اخبار دیر سے چھپا تھا" وہ صاف جھوٹ بول گیا لیکن اُس شخص نے اخبار اٹھا کر اُس کے منہ پر پھینک دیا۔

"لے جاؤ اپنا اخبار مجھے نہیں چاہیے"

"کہہ تو رہا ہوں کہ اب دیر نہیں ہوگی"۔

وہ بگڑ کر بولا۔ بس کہہ دیا کہ اخبار نہیں چاہیے کیوں بیکار میں دماغ کھائے جا رہا ہے''

شامی ملزموں کی طرح گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ جب وہ شخص دروازہ بند کرنے لگا تو نتائی نے دبی زبان سے کہا۔ "صاب پچھلے مہینہ کا پیمنٹ ابھی تک نہیں ہوا۔"

وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ "جاؤ کوئی پیمنٹ ویمنٹ نہیں ملے گا، الو کے پٹھے" یہ کہہ کر اُس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ شامی کو غصہ تو بہت آیا مگر اُس نے سوچا کہ اگر کوئی جھگڑا ٹنٹا ہو گیا تو دوسری جگہ بھی اخبار دیر سے پہنچے گا اور وہاں بھی "ڈانٹ پڑے گی۔ ورنہ وہ اپنا پیمنٹ تو اسی وقت وصول کر لیتا۔

وہاں سے نکل کر وہ اپنے اور ٹھکانوں کی جانب چل دیا۔ لیکن اُس کے لئے سب سے بڑا مرحلہ اُس انگریز انجنیئر کا بنگلہ تھا، جہاں ایک خطرناک کتا پلا تھا، جو اس کو دیکھتے کے ساتھ ہی غرا کر بھونکنا شروع کر دیتا۔ اس کی آواز اس طرح نکلتی گویا کسی گنبد کے اندر بول رہا ہو۔ جیسے ہی شامی پھاٹک پر پہنچتا وہ اندر سے بھونکتا ہوا اس کی جانب جھپٹتا۔ ایک بار تو وہ اس پر اس طرح جھپٹ کر سوار ہو گیا کہ خوف کے مارے شامی کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ شاید اس بنگلے پر کبھی بھی اخبار نہ لگاتا مگر بات یہ تھی کہ بل ادا کرنے کے معاملے میں انجنیئر بڑا کھرا آدمی تھا۔ کبھی اُس کے یہاں پیمنٹ نہیں رُکا۔ اسی لئے وہ کتے کے خوف کے باوجود پابندی سے اب تک اس کو اخبار سپلائی کر رہا تھا۔

نو بجے کے قریب جب وہ اخبار بیچ کر تھکا ہارا گھر پہنچا تو ماں نے کمر بھی سیدھی نہ کرنے دی کہنے لگی "جا جلدی سے دوکان چلا جا۔ آج تیرے باپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

شامی چپ چاپ دوکان کی طرف چل دیا۔ اُس کے باپ کی بازار میں چھوٹی سی بساط خانے کی دوکان تھی۔ اِس وقت وہ دوکان پر بیٹھا کھانس رہا تھا۔ اُس نے شامی کو صرف گھور کر دیکھا مگر کوئی بات نہیں کی۔ شامی نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ مصیبت اُس کے سر سے صاف ٹل گئی۔

وہ چپ چاپ دوکان پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت دکان پر کوئی گاہک نہیں تھا۔ ذرا دیر بعد ۱۰ سال کی ایک لڑکی سیپ کے بٹن خریدنے آئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ واپس آ گئی۔ کہنے لگی سیپ کے نہیں پلاسٹک کے بٹن چاہئے ہیں۔ شامی نے پلاسٹک کے بٹن دے دیئے۔ مگر چند ہی منٹ بعد لڑکی پھر دوکان پر موجود تھی۔

اس دفعہ اُس کو بڑے بٹن درکار تھے۔ شامی نے بٹن تو اُس کو دیدیے مگر چل کر اُس کی کمر میں چٹکی بھرلی۔ وہ تلملا کر چیخی تو باپ کو بھی اُس کی حرکت کا پتہ چل گیا۔ اُس نے فوراً کہا۔

"ابے او حرام کے تخم تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔"

اس کے بعد وہ دیر تک اُس کو گالیاں دیتا رہا اور شامی بیٹھا اس طرح گالیاں سنتا رہا جیسے وہ گالیاں نہیں تھیں، ڈھولک بج رہا تھا۔ اُس کا باپ دمہ کا پرانا مریض تھا۔ وہ دوکان پر بیٹھا تمام دن کھانسا کرتا یا شامی کو گالیاں دیا کرتا۔ زیادہ غصہ آتا تو دو چار تھپڑ رسید کر دیتے، ایک آدھ لات لگادی۔

دوپہر کا سناٹا رفتہ رفتہ بازار پہ پھیلنے لگا تھا۔ گاہکوں کی آمدورفت کم ہوگئی اور دکان والے بے دلی سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اونگھ رہے تھے۔ شامی کا باپ تو یوں ہی ہر وقت مجہولوں کی طرح پڑا رہتا تھا اس وقت بھی آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ اسی اثنا میں برابر والی دوکان کے بساطی نے اُس سے کہا۔

"اماں دلاور خاں جمتی ہے۔"

یہ جوا کھیلنے کی دعوت تھی۔ شامی کے باپ نے فوراً جواب دیا۔ "یہاں کب انکار ہے۔"

وہ بولا "تو پھر نکالو رقم۔"

شامی کے باپ نے ٹین کے ڈبے سے روپیہ نکالا۔ "لو یہ رہی رقم۔"

دونوں نے ایک ایک روپیہ نکالا۔ اُس کو صابن سے اچھی طرح دھو کر صاف کیا گیا اور دوکان کی گدی کے سامنے ایک صاف جگہ پر رکھ دیا گیا۔ دونوں ذرا ہٹ کر پاس پاس بیٹھ گئے اور پوری توجہ سے روپوں کو دیکھنے لگے کہ مکھی کس کے روپے پر بیٹھتی ہے۔ داؤں کی شرط یہ تھی کہ جس کے روپے پر مکھی پہلے بیٹھ جائے، وہ دونوں روپے اٹھالے۔

ذرا دیر بعد ایک مکھی اڑتی ہوئی آئی۔ شامی کا باپ گردن ہلا ہلا کر کہنے لگا۔

"آ آ آ، رانی ادھر آ۔"

دوسری طرف سے وہ آدمی بھی بولا۔ "ادھر کہاں چلیں چھبیلی۔ ادھر آ۔ ادھر۔ اے اے۔"

مکھی اس وقت شامی کے باپ کے روپے پر منڈلا رہی تھی۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا "وہ آئی شیخ جی۔"

آج تو دونوں روپے اپنی جیب میں گئے۔"

شیخ جی نے فوراً کہا "ذرا نیل دیکھو نیل کی دھار دیکھو" مگر اس کا چہرہ فق ہوتا جا رہا تھا اس لئے کہ مکھی نے اس کے روپے کی جانب رخ ہی نہیں کیا۔

لیکن مکھی بھی بڑی ستم ظریف تھی۔ کئی بار شامی کے باپ کے روپے پر بھنبھنائی مگر اس پہ بیٹھنے کے بجائے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ شامی کے باپ کے دل کی دھڑکن کئی بار تیز ہوئی کئی بار مسرت سے اس کی آنکھیں چمکیں۔ مگر بات نہ بنی۔

ادھر شیخ جی کی حالت دگرگوں تھی۔ مکھی دوسری ہی طرف چکر کاٹ رہی تھی۔ ایک بار بھی ادھر کا رخ نہ کیا مگر وہ برابر اپنے دل کو ڈھارس دیتا رہا۔

"بھائی وہ بیٹھے گی تو اسی روپے پر۔ بڑی کھری کمائی کا روپیہ ہے"

شامی کا باپ بگڑ کر بولا "اور یہاں تو حرام کی رقم آئی ہے؟"

وہ کہنے لگا "اس کا پتہ تو ابھی چل جائے گا"

شامی کا باپ کہنے لگا "اس طرح شیخی بگھارنے سے کام نہیں چلے گا۔ گدی والے شاہ صاحب سے روپیہ پڑھوا کر لاؤ تب شاید کچھ ہوگا۔ یہ روپیہ تو سمجھ لو بس اپنی جیب میں گیا۔"

مگر اس کی باتوں کا سارا طنطنہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ مکھی ایک بار پھر سے اڑ گئی۔ شامی کا باپ جل کر بولا "دھت تیری کی" اس نے مکھی کی ماں کو ایک عدد گالی دے ڈالی۔

شیخ جی نے فوراً جلتی آگ پر تیل چھڑکا "بھائی میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔ اب چاہے تم گالی دو یا آنسو بہاؤ، وہ تمہارے روپے پر بیٹھنے کے لئے آئی ہی نہیں تھی"۔

دونوں بچوں کی طرح چہلیں کر رہے تھے۔ ایک دوسرے پر چوٹیں کس رہے تھے۔ ابھی اتنا میں مکھی پھر جھنجھناتی ہوئی آ گئی۔ وہی تھی یا کوئی دوسری۔ یہ پتہ چلانا مشکل تھا لیکن اس دفعہ جو آئی تو سیدھی شیخ جی کے روپے کی طرف۔ وہ اس کو اس طرح چمکارنے لگا۔ جیسے واقعی وہ اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

"آ آ پچ پچ۔ میری جان ایک بار تو کلیجہ ٹھنڈا کر دے۔"

مکھی واقعی اس کے چمکارنے پر آگئی۔ اُس نے ایک بار پر بیٹھے اور عین اُس کے روپے کے اوپر آگئی! اسی وقت شامی کے باپ کو کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ کھوں کھوں کرکے زور زور سے کھانسنے لگا۔ مکھی فوراً اڑ گئی۔ شیخ جی بگڑ کر بولے۔

"لگے تم چوٹاپن کرنے۔ اڑا دیا نہ کھانس کر۔"

شامی کا باپ مسکرا کر بولا۔ "اماں کھانسی آگئی تو میں کیا کروں۔"

شیخ جی آنکھیں نکال کر بولے۔ "کچھ خدا کے خوف سے ڈرو۔ جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی۔ تم جان بوجھ کر کھانسے تھے۔"

بات بھی دراصل یہی تھی کہ نوشا کا باپ مکھی کو بھگانے کے لئے کھانسا تھا مگر وہ اُس کو تسلیم کیسے کرتا۔ کہنے لگا۔

"کھانسی کا تو بہانہ ہو گیا۔ وہ تمھارے روپے پر بیٹھنے والی ہی کب تھی۔"

دونوں بڈھوں میں ایک بار پھر نوک جھونک شروع ہوگئی۔ شامی ان کی حرکتوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ روزانہ دوپہر کو اسی طرح جوا ہوتا اور بہت کم ایسا ہوتا کہ کوئی جیت جاتا۔ البتہ دونوں میں تکرار روزانہ ہوتی۔ اکثر گالی گلوچ تک کی نوبت آجاتی۔ مگر دوسرے دن جہاں دوپہر ہوئی۔ دونوں کو ٹھرک اٹھتی۔ روپے نکالے جاتے اور صابن سے دھوکر دونوں پنسل سے اپنے اپنے نشان بنا کر رکھ دیتے۔

مکھی شیخ جی کے روپے سے اُڑ کر ایسی گئی کہ پھر دہ لوٹی۔ کسی دوسری مکھی نے بھی ادھر کا رخ نہ کیا۔ دوپہر کا سناٹا اور بڑھ گیا تھا۔ بازار کی رونق مضمحل ہو گئی تھی۔ دونوں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے۔ پھر انھوں نے اپنے اپنے روپے اٹھائے اور آنکھیں بند کرکے تھکے ہوئے سے لیٹ گئے۔

دھوپ اب سامنے کے رُخ پر آگئی تھی۔ شامی کا باپ آنکھیں بند کئے سو رہا تھا۔ دوپہر کے سناٹے میں کبھی کبھی کوئی گاڑی پہیئے کھڑکھڑاتی ہوئی گزر جاتی۔ بازار پر ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ صرف ٹرنک بنانے والے کارخانے میں دھڑا دھڑ ٹین کی چادروں کے پٹنے کی آواز اُبھر رہی تھی۔ خالی بیٹھے بیٹھے شامی کا جی اُکتا گیا۔ اُس نے باپ کی جانب دیکھا۔ وہ بے خبر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔

شامی آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا اور چپکے سے دوکان کے باہر آگیا۔ باہر تیز دھوپ پھیلی تھی۔ موسم کچھ اس طرح کا تھا کہ سائے میں بیٹھنے سے سردی معلوم ہوتی تھی اور دھوپ میں سورج کی سُلگتی ہوئی کرنیں جسم میں سوئیوں کی طرح چبھتی تھیں۔ دوکان سے نکل کر وہ ٹہلتا ہوا بازار کے دوسرے نکڑ کی جانب چل دیا۔ وہاں نیم کا ایک گھنا پیڑ تھا، جس کے نیچے اکثر دوپہر کو راجہ گداگر کی گاڑی لاکر ٹھہراتا تھا اور دونوں دھوپ میں بیٹھکر کپڑوں سے جوئیں نکالا کرتے تھے۔ راجہ اس وقت مل جاتا تو وہ اس کے ساتھ بیٹھکر سگرٹ کے دو چار کش لگا لیتا۔

ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ اچانک بازار کے درمیان سے مڑنے والی گلی کے اندر ملی جلی آوازوں کا شور اُبھرا۔ راجہ لپک کر گلی کے اندر گھس گیا۔ اس نے دیکھا کہ مسجد کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم تھا اور سب اکٹھا بول رہے تھے۔ اس نے ایک شخص سے پوچھا "کیا ہو گیا؟"

وہ بولا "چور پکڑا گیا ہے"

شامی نے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا چرایا تھا؟"

وہ ہنس کر بولا۔ "سالا مسجد سے جوتے چرا رہا تھا"

شامی نے حیرت زدہ ہو کر کہا "اچھا!"

"ہاں جی۔ نمازی بے چارے تو ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے اور یہ سالا اُن کے جوتوں کی تاک میں لگا تھا"

شامی نے اُس شخص سے پھر اور کوئی بات نہ کی اور لپک کر مجمع میں گھس گیا۔

اُس نے دیکھا کہ ایک لمبے سے قد کا آدمی لوگوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس کا سر ننگا تھا اور وہ ایک گندی سی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ دیکھنے میں وہ بالکل سیدھا سادھا سا لگ رہا تھا۔

شامی اس کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اس لیے کہ وہ صرف چور ہی نہیں تھا بلکہ اُس نے اللہ میاں کے گھر میں چوری کی تھی۔ ابھی وہ چور کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ ہجوم میں سے ایک ٹھگنا سا آدمی تہبند سنبھالتا ہوا نکلا اور اُس نے چور کے منہ پر کس کے تھپڑ رسید کیا۔ یہ گویا ابتدا تھی۔ پھر تو ہر طرف

سے چور پر مار پڑنے لگی طمانچے، گھونسے، لاتیں۔ ہر شخص بھر بھر کر اُس کو مار رہا تھا، گالیاں دے رہا تھا اور چور بالکل خاموش کھڑا مار سہ رہا تھا۔ نہ اُس نے اپنے بچاؤ کی کوشش کی، نہ فریاد کے لئے گڑگڑایا۔ منہ سے کھڑا مار کھاتا رہا۔

اتنے میں ایک بوڑھا آدمی وہاں آگیا۔ اُس کی لمبی سفید ڈاڑھی تھی۔ اُس نے ہاتھ اٹھا کر سب کو روکا اور اونچی آواز سے بولنے لگا "اس طرح مارنے سے کیا ہوگا، اس کو تو ایسی سزا ملنا چاہیے کہ ہر ایک کو عبرت حاصل ہو" اُس نے سزا کے لئے جو اسکیم بتائی وہ شور میں شامی سُن نہ سکا۔ البتہ اُس نے یہ ضرور دیکھا کہ ایک آدمی ہاتھوں میں کالک بھرے ہوئے آیا اور اُس نے چور کا سارا چہرہ سیاہ کردیا۔ اب وہ واقعی کچھ عجیب ہونق لگ رہا تھا۔ سیاہی کے اندر سے اُس کی چمکتی ہوئی آنکھیں ڈراونی معلوم ہو رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد کہیں سے ایک گدھا بھی آگیا۔ چور کو گدھے کے اوپر سوار کرایا گیا۔ اُس کے گلے میں پرانے جوتوں کا ہار ڈالا گیا اور گدھے کو ہانک کر آگے بڑھا دیا گیا۔

پیچھے پیچھے لوگوں کا غول تھا۔ کچھ لڑکے ٹین کا ایک پیپا اٹھا لائے اور اُس کو زور زور سے بجانے لگے۔ شامی بھی اس جلوس میں شامل ہوگیا۔ اُس نے کئی بار لڑکوں سے پیپا چھین کر زور زور سے اُس کو بجایا اور سب کے ساتھ مل کر نعرے لگائے۔ نعرے لگانے والے دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ گلا پھاڑ کر کہتا۔

"جوتے چور کا"

دوسرا گروہ جواب دیتا "منہ کالا"

جلوس گلی سے نکل کر بازار میں آگیا۔ دوکان دار دوکانوں پر سے اٹھ اٹھ کر چور کو دیکھ رہے تھے۔ جو ذرا زندہ دل تھے وہ دوکانوں سے نیچے اُتر کر جلوس میں شامل ہو گئے تھے۔ ہر شخص ہنس رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا۔ شامی کو بڑا لطف آرہا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ قہقہہ لگاتے ہی اُس کی گدی پر زناٹے کا ہاتھ پڑا۔ شامی چکرا کر گرتے گرتے بچا۔ پلٹ کر دیکھا تو باپ بھوت کی طرح سر پہ سوار تھا۔

جوتے چور کا جلوس تو پیپا بجاتا، شور مچاتا آگے بڑھ گیا مگر شامی کے بیچ بازار میں دھڑا دھڑ جوتے پڑنے لگے۔ نہ جانے اُس کے باپ کے مریل ہاتھوں میں کہاں سے قوت آگئی تھی۔ ایسے کس کس کے جوتے مار رہا تھا کہ

شامی بلبلا کر سڑک پر لوٹنے لگا۔

دو ایک دوکاندار لپک کر اُس کے پاس پہنچ گئے اور اُس کے باپ سے کہنے لگے۔

"اماں خاں صاحب جانے دو۔ بچہ ہے اب ایسی حرکت نہیں کرے گا"

ایک نے بڑھ کر اُس کے باپ کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ مگر وہ بار بار ہاتھ چھڑا کر شامی پر جھپٹتا۔ "چھوڑو جی میں اس حرامی کی ہڈی پسلی برابر کر دوں گا۔ اماں ذرا آنکھ بچی اور یہ سالا دوکان سے رفو چکر ہوا۔ حال یہ ہے کہ لوگ خدا کے گھر کو تو چھوڑتے نہیں۔ دوکان تو پھر دوکان ٹھیری۔ میاں سویا مرا برابر ہوتا ہے۔ کوئی اُٹھا کر لے جائے تو اس سالے کی گرہ سے کیا جائے گا" وہ چیخ چیخ کر بول رہا تھا اور ساتھ ہی گالیاں بھی دیتا جا رہا تھا۔

آخر دوکانداروں نے شامی کو اپنی حفاظت میں لے کر دوکان پر پہنچایا اور اُس کے باپ کو قسمیں دیں کہ اب نہ مارنا۔ باپ نے اس کے بعد اُس کو مارا تو نہیں، البتہ کئی بار جھنجھلا جھنجھلا کر مارنے کے لئے ضرور اٹھا۔ جب بھی شامی سسکی بھرتا تو وہ ایک کراری گالی دے ڈالتا۔

شامی دیر تک بیٹھا سسکیاں بھرتا رہا اور باپ کی گالیاں سنتا رہا۔ سہ پہر ہو گئی۔ بازار کی گہما گہمی بیدار ہو گئی۔ گاہک دوکانوں پر منڈلانے لگے۔ ملی جلی آوازوں کا شور بڑھنے لگا۔ گاڑیوں کے پہیے کولتار کی پختہ سڑک پر کھڑکھڑانے لگے۔ اس شور و غل میں، اس ہنگامے میں، وہ سب کچھ بھول گیا اور دوکانداری میں الجھ کر رہ گیا۔

شام کو اُس کے باپ نے دوکان بند کی۔ اور اُس سے کہنے لگا "میں ایک جگہ کام سے جا رہا ہوں تو سیدھا گھر جانا"

شامی دوکان سے نکل کر گھر کی جانب چل دیا۔ راستہ میں نوشا مل گیا۔ اس وقت وہ بڑا اِترا اِترا کر چل رہا تھا۔ شامی کو دیکھتے ہی اُس نے قمیص کی جیب سے دس دس کے دو کرارے کرارے نوٹ نکالے اور گردن اکڑا کر بولا۔

"آج تو اپنے ٹھاٹھ ہیں"

شامی نے حیرت سے اس کو دیکھا "ابے کہاں سے مار لایا"

نوشا نے تیزی سے کہا "مار کہاں سے لاتا مجھے ملے ہیں"

شامی ابھی تک حیرت زدہ تھا "کہاں سے مل گئے یا بے اکھٹے بتیس روپے"

نوشا پھر اترایا "بس مل گئے"

شامی نے فوراً گھر جانے کا ارادہ تبدیل کر دیا اور سامنے والے چائے خانہ کی طرف اشارہ کرکے بولا "تو پھر ہو جائے کچھ چائے پانی"

"نہیں یار آج نہیں پھر کسی دن"

شامی جل کر بولا "لگے سالے سیان پن کرنے۔ ابے تو تو ایک نمبر کنجوس ہے"

نوشا زور سے قہقہہ لگا کر بولا "چائے تو بھی یونہی رہا۔ یہ میرے روپے کب ہیں۔ مکان کا کرایہ دینے نیاز کی دوکان پر جا رہا ہوں"

شامی کہنے لگا "جب ہی تو میں سوچ رہا تھا کہ ایک نہ دو اکھٹے اتنے روپے کہاں سے جھاڑ دیئے"

نوشا نے اس سے کہا "ابے چلتا ہے ذرا نیاز کی دوکان تک، ذرا دیر کی تو بات ہے"

شامی کہنے لگا "چائے پلاؤ تو چلتا ہوں"

مگر نوشا کے پاس چائے پلانے کے لئے پیسے نہیں تھے اس لئے شامی اس کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ نوشا نیاز کی دوکان کی جانب چلا گیا۔

●

۴

نیاز کی دوکان بازار سے ذرا ہٹ کر اندر کی جانب تھی۔ پہلے وہ فرنیچر کے ایک کارخانے میں ملازم تھا مگر اب اُس نے کباڑ خانے کی دوکان کھول لی تھی۔ دوکان کے پچھلے حصے میں ایک کمرہ تھا جس میں اس کی رہائش تھی۔ بیوی اُس کی عرصہ ہوا فوت ہو چکی تھی۔ اولاد بھی اُس نے کوئی نہ چھوڑی۔ شادی کے کوئی دو سال بعد اُس کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی، جو ۶ ماہ بعد نمونیہ میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ اُس کی بیوی شادی کے بعد ۸ سال تک زندہ رہی اور اولاد کی حسرت لئے ہوئے ایک روز اللہ کو پیاری ہو گئی۔

نیاز نے اب تک دوسری شادی نہیں کی تھی اور کنواروں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یوں وہ ابھی جوان تھا۔ اس کی عمر اس وقت ۳۵ سے کچھ اوپر تھی۔ البتہ جسم میں چربی بڑھ جانے کے باعث، وہ اب کسی قدر بھدا ہو گیا تھا۔ کام بھی اُس کا کچھ ایسا تھا کہ زیادہ جسمانی مشقت نہ کرنا پڑتی۔ تمام دن دوکان پر بیٹھے بیٹھے گذر جاتا۔ صرف اتوار کے دن وہ نیلام میں جاتا تھا یا کوئی اتفاقیہ سودا آ جاتا۔ مگر ایسا کبھی کبھار ہوتا تھا۔

کہنے کو تو وہ کباڑیہ تھا مگر دراصل کام کرتا تھا وہ چوری کا مال فروخت کرنے کا۔

اس وقت نیاز کی دوکان میں لالٹین جل رہی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں بیٹھا تھا۔ اتنے میں دوکان کے اندر نوشا داخل ہوا۔ نیاز نے اُس کو دیکھتے ہی پوچھا۔

"کیسے آنا ہوا؟"

نوشا نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ قمیص کی جیب سے دونوں نوٹ نکالے اور اُس کو دے کر بولا "اماں نے دو مہینے کا کرایہ بھیجا ہے۔"

نیاز نے ناگواری سے کہا "دو مہینے کا کیوں۔ سارا حساب کیوں نہیں ادا کیا؟"

نوشا نے ماں کی ہدایت کے مطابق جواب دیا "انھوں نے کہا ہے کہ بقیہ دو ماہ کا کرایہ جلد ہی آجائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

نیاز کہنے لگا "ان سے کہہ دینا کہ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ کرایہ وقت پر ملنا چاہیے۔ ورنہ رہنے کا کہیں اور بندوبست کرلیں۔"

نیاز چاہتا بھی یہی تھا کہ کسی طرح مکان خالی ہو جائے تو اچھا ہے۔ اس لیے کہ اُس کے پاس کئی ایسے کرایہ دار آچکے تھے، جو زیادہ کرایہ دینے کے علاوہ ہزار بارہ سو پگڑی کے بھی دینے کو تیار تھے۔ نیاز ایسے سودے کو ہاتھ سے نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ محلّے میں اُس کے دو مکان تھے، جو اُس نے ایک ہندو دکان دار سے سستے داموں پر خریدے تھے۔ اس لیے کہ فسادات کی خبروں سے وہ ہندو بہت سہما ہوا تھا اور کسی نہ کسی طرح ساری جائداد اونے پونے بیچ کر بمبئی جانا چاہتا تھا، جہاں اُس کے بال بچے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔

نوشا واپس جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ نیاز نے پوچھ لیا "آج کل تم کیا کر رہے ہو؟"

نوشا نے جواب دیا "عبداللہ مستری کے کارخانے میں کام سیکھ رہا ہوں۔"

نیاز نے مصنوعی حیرت سے کہا "اچھا کب سے؟"

"۶، مہینے ہو گئے اب تو ۲۰ روپے مہینہ تنخواہ بھی ملنے لگی ہے۔"

نیاز کہنے لگا "یہ بہت اچھا ہوا۔ مگر وہ عبداللہ تو ایک نمبر بدمعاش ہے۔ سنا ہے کاریگروں کو بہت مارتا ہے۔ لیکن اب اُس نے کاروبار اچھا جما لیا ہے۔ جب یہاں آیا تھا تو ڈپٹی صاحب کی موٹر پر کلینر تھا۔ سالا پاس کھڑا ہو جاتا تھا تو بو آتی تھی۔"

نوشا چپ چاپ اُس کی باتیں سنتا رہا نیاز کچھ دیر تک عبداللہ مستری اور اُس کے کاروبار کے

بارے میں بات کرتا رہا۔ پھر ایکا ایکی اُس نے رازدارانہ لہجہ میں آہستہ سے کہا۔

"موقعہ لگے تو کبھی کبھار کوئی پُرزہ یا اوزار اڑا دیا کرو۔ اس سالے پاپی کا مال کھانا تو ثواب ہے۔"

نوشا اس کی بات سُن کر چونک پڑا اور گھبرائی ہوئی نظروں سے اُس کا منہ تکنے لگا۔

نیاز کہتا رہا۔ "کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں، بس سیدھے یہاں آجایا کرو۔ چائے پانی کا خرچہ نکل آئے گا اور میں نے تو سُنا ہے کہ تم کو تو سینما کا بھی بہت شوق ہے۔" لمحہ بھر رُک کر اُس نے سوال کیا۔ "بولو کیا کہتے ہو۔؟"

نوشا سے پھر بھی کچھ نہ کہا گیا۔

نیاز نے اس دفعہ اصرار کر کے پوچھا۔ "تو پھر کیا ارادہ ہے؟"

نوشا سہما ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ "کہیں مستری جی کو پتہ چل گیا تو میری شامت آجائے گی۔"

نیاز اس کو پھسلانے لگا۔ "ابے جب اس سالے کو پتہ لگے تب نا۔ بس ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ دیکھ میں تجھے ترکیب بتادوں۔" اور اس کے بعد اُس نے پُرزے چُرانے کی نوشا کو کئی ترکیبیں بتائیں مگر نوشا کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔

لیکن نیاز نے اس کو اپنے پھندے سے نکلنے نہ دیا۔ جب نوشا جانے لگا تو اُس نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کو دیا اور مسکرا کر بولا۔ "لو آج میری طرف سے جا کر سینما دیکھو۔"

نوشا روپیہ لینے سے انکار کرنے لگا تو اُس نے اصرار کر کے اس کی جیب میں ڈال دیا۔ "دیکھو زیادہ ضد نہیں کیا کرتے۔ میرے کہنے پر چلوگے تو عیش کروگے۔"

نوشا نے اُس کی باتیں خاموشی سے سُنیں اور شرمایا ہوا سا دکان کے باہر آگیا۔

بازار سے گزر کر جب وہ گلی میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے محلے کے لڑکے جمع تھے۔ ممدو جو ہوٹل میں بیراگیری کرتا تھا، مزے سے بیٹھا ماؤتھ آرگن بجا رہا تھا۔ راجہ بھی وہاں موجود تھا اور منہ سے طبلہ بجا بجا کر تھاپ دے رہا تھا۔

نوشا پر ممدو کا بڑا رعب پڑا۔ وہ بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ ممدو اس وقت ایک فلمی دھن بجا رہا

تھا، جس کے بول باجے کے سروں میں سے صاف نکل رہے تھے۔ ذرا دیر بعد اُس نے ماؤتھ آرگن بجانا بند کردیا اور منہ صاف کرکے بولا۔

"کھیل ختم پیسہ ہضم"

سب لڑکے اصرار کرنے لگے مگر ممد کو اُن کے اصرار میں مزا آرہا تھا۔ نوشا نے اُس سے پوچھا "اماں کتنے کا خریدا تم نے یہ باجا"

وہ ہنس کر بولا "کیا کروگے جان کر۔ تمھارا پاجامہ بھی بک جائے گا تب بھی خرید نہیں سکو گے۔ نقد ۶ روپے خرچہ ہوتے ہیں، کیا سمجھے؟ ہے ہمت خریدنے کی؟"

چھ روپے کا نام سُن کر نوشا خاموش ہوگیا۔

جب لڑکوں نے بہت اصرار کیا تو ممد نے ایک نئی دُھن شروع کردی۔ سب مزے میں آکر گردن ہلانے لگے۔ ممد باجا بجاتے بجاتے ایک دم اٹھ کر بھاگ گیا۔ سب اس کو دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ راجہ نے جل کر اُس کو ایک موٹی سی گالی دی اور نوشا سے کہنے لگا۔

"ابے کھیتھر چلتا ہے؟"

نوشا حسب معمول فوراً تیار ہوگیا "ہاں ہاں چلو"

راجہ ہنس پڑا "پہلے ایک روپیہ تو لے کر آؤ"

نوشا نے روپیہ جیب سے نکال کر سامنے کردیا "یہ لو"

راجہ چونک پڑا "ابے یہ ٹھاٹھ۔ آج کہاں ہاتھ مار دیا"

نوشا نے کہا "تو پھر چلو۔ کے بجے کھیتھر شروع ہوتا ہے"

"کل چلیں گے۔ وہ بھی اگر ایک روپیہ کہیں سے ہاتھ لگ گیا۔ اپنی تو گاڑی ٹوٹی پڑی ہے۔ ایک حرام کے جنے نے موٹر چڑھادی۔ یار اللہ نے بال بال بچادیا"

راجہ اپنی پریشانی بیان کرنے لگا۔ نوشا نے اُس سے کہا

"کون سا کھیل ہے؟"

راجہ جھوٹ سے بولا "کل تو شیریں فرہاد ہوگا۔ دیکھے گا تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ ابے جب فرہاد 'شیریں میری پیاری شیریں' کہہ کے بیلچہ مارتا ہے اور گر کر مرجاتا ہے تو سچ جان آنسو نکل پڑتے ہیں۔"

راجہ نے سارا منظر کچھ ایسی اداکاری کے ساتھ بیان کیا کہ نوشا حیرت زدہ ہوگیا۔ پوچھنے لگا۔

"تو کیا وہ سچ مچ مرجاتا ہے؟"

راجہ نے ہنس کر جواب دیا "تو بھی بس یونہی رہا کہیں وہ سچ مچ مر سکتا ہے ابے یہ تو ایکٹنگ ہے ایکٹنگ۔"

نوشا ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ "کمال ہے بھئی!"

راجہ کہنے لگا "یہی نہیں، پتلی جان کا ڈانس دیکھے گا تو مزا آجائے گا۔ سالی بالکل ننگی ناچتی ہے۔"

نوشا چونک کر بولا "ننگی ناچتی ہے۔ سچ؟"

راجہ نے بتایا "بس ذرا سا جانگیہ پہن لیتی ہے۔ سالی کی گوری گوری رانیں روشنی میں ایسی چمکتی ہیں کہ یار طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔"

نوشا شرما کر رہ گیا "سالے تو ایک نمبر بدمعاش ہے۔" مگر پتلی جان کی ننگی ننگی رانیں دیکھنے کے لئے اس کا بھی دل تڑپ رہا تھا۔ ذرا دیر رک کر بولا۔

"تو پھر کل کی پکی رہی"

"ہاں جی کل ضرور چلیں گے۔ اب اسی بات پر ایک ایک چائے ہوجائے۔"

نوشا اس کے لئے تیار تو نہیں تھا مگر وہ راجہ سے انکار بھی نہ کرسکا اس لئے کہ وہ روز راجہ سے چائے پیا کرتا تھا سینما دیکھتا تھا۔ وہ اس کو چائے خانہ میں لے گیا۔ راجہ اس کو تھیٹر کی ایک ایک تفصیل اس دلچسپی کے ساتھ بتاتا رہا کہ نوشا کا شوق اور بڑھ گیا۔ مگر جب دونوں چائے خانے سے باہر نکلے تو نوشا کے پاس کل ۴ آنے رہ گئے تھے۔

راستے بھر وہ سوچتا رہا کہ اب تھیٹر کا پروگرام کیسے بنے گا۔ دوسرے دن کارخانے گیا تو وہاں بھی اس کو بار بار اس بات کا خیال آتا رہا۔ شام کو جب کارخانے میں چھٹی ہوئی تو اتفاق ایسا ہوا کہ جس شیڈ

میں وہ کام کر رہا تھا، وہاں وہ اکیلا رہ گیا۔ اُس نے ایک پرزہ اٹھایا اور پھر رکھدیا۔ ہمت نہ پڑی۔ جاتے جاتے پھر دل نہ مانا۔ وہ واپس آیا، پرزہ اٹھایا، چاروں طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور جلدی سے اُس کو ٹین کے اس ڈبے میں رکھ لیا، جس میں وہ اپنا کھانا لے کر آیا کرتا تھا۔ مگر اس کو لیکر چلا تو اُس کے قدم کانپ رہے تھے اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ گیٹ پر پہنچا تو چوکیدار کسی سے بات کر رہا تھا وہ اس کی جانب دیکھے بغیر جھٹ سے باہر نکل گیا۔ مگر گھبراہٹ کے مارے اُس کے قدم کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے۔

کارخانے سے نکل کر وہ سیدھا نیاز کی دوکان پہنچا اور جاتے ہی پرزہ نکال کر اُس کے سامنے ڈال دیا۔ نیاز نے اُس کو الٹ پلٹ کے دیکھا اور کہنے لگا۔

"ابے یہ کیا کھٹ راگ اٹھا لایا۔ کسی اچھے مال پر ہاتھ ڈالا ہوتا۔"

نوشا بجھ کے رہ گیا۔ مگر نیاز نے اس کو زیادہ دیر نا امیدی میں مبتلا نہ رکھا اور ڈیڑھ روپیہ گن کر دیدیا۔ خوشی کے مارے نوشا کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ نیاز نے پیٹھ ٹھونک کر اس کو شاباشی دی اور اُس بات پر آمادہ کیا کہ آئندہ وہ کوئی قیمتی پرزہ چرا کر لائے۔

نیاز کی دوکان سے باہر آکر نوشا آج بھی گھر جانے کے بجائے گلی میں پہنچا۔ راجہ پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ اُس نے بھی کچھ رقم کا بندوبست کر لیا تھا۔ اب شامی کا انتظار تھا مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دونوں اُس کے گھر کی جانب چل دیئے۔ قریب پہنچے تو گھر کے اندر اُدھم مچا ہوا تھا۔ شامی چیخ چیخ کر رو رہا تھا اور اُس کا باپ گالیاں بک رہا تھا۔

راجہ نے آہستہ سے کہا "معلوم ہوتا ہے شامی سالا پکڑا گیا۔"

نوشا بولا "چلو یار اس کے ابا نے دیکھ لیا تو ہم دونوں پر بھی گالیاں پڑیں گی"۔

دونوں چپ چاپ لوٹ آئے اور تیلی جان کی ننگی رانیں دیکھنے تھیٹر کی جانب چل دیئے۔

تھیٹر سے واپسی پر صبح ہو گئی۔ جیسے ہی دونوں گلی کے اندر داخل ہوئے کہیں نزدیک ہی مرغ نے بانگ دی۔ نوشا سہم کر رہ گیا۔ ڈرتے ڈرتے وہ دیوار پر چڑھا اور جیسے ہی کود کر گھر کے اندر پہنچا ماں کی آنکھ

کھل گئی ۔ اُس نے نوشا کو کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ اُس نے اُسی وقت اٹھکر اُس کی پیٹھ پر ایک ایسا زوردار دوہتڑ مارا کہ نوشا فرش پر گر پڑا ۔ وہ اُس کو زور زور سے کوسنے لگی ۔ اس ہنگامہ سے سب کی آنکھ کھل گئی ۔ نوشا مجرموں کی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا اور اس پر پھٹکار پڑ رہی تھی ۔

لیکن دوسرے دن نوشا نے کارخانے سے پھر ایک پرزہ اڑا دیا اور اُس کو لئے ہوئے نیاز کے پاس گیا۔ روپیہ دھیلی جو کچھ اُس نے دیا، اس کو جیب میں ڈالا اور راجہ کو ساتھ لے کر مسلم ہوٹل میں جا کر چائے پی، بسکٹ کھائے اور فلمی ریکارڈ سنے ۔

پھر تو اس کا یہ معمول ہو گیا کہ جہاں موقعہ لگا، وہ کوئی پرزہ یا اوزار کارخانے سے چرا لاتا اور نیاز کے ہاتھ فروخت کر دیتا۔ اس رقم سے روزانہ نئے نئے پروگرام بنتے اور رات بھر آوارہ گردی ہوتی ۔ نوشا نے غور کیا کہ جب سے اس کی جیب میں رقم رہنے لگی تھی شامی اور راجہ دونوں کے انداز میں خوشامد آ گئی تھی اب وہ اُس کی ہر بات مان لیا کرتے تھے ۔ رفتہ رفتہ وہ ان کا سرغنہ بنتا جا رہا تھا ۔

۵

نوشا کارخانے سے ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا پہر رات گذر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا یہ پہلا موقعہ نہیں تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ نوشا صبح کا نکلا ہوا رات کے پچھلے پہر اس وقت لوٹتا تھا جب گھر والے سو جاتے تھے۔ ماں اس وقت بیٹھی نوشا کو کوسنے دے رہی تھی کہ اچانک دروازہ پر کسی نے دستک دی ۔ اتو نے باہر جا کر دیکھا دروازے پر نیاز کھڑا تھا اس نے ماں کو نیاز کی آمد کی اطلاع دی۔

ماں نے کہا "اندر بلالو"

ذرا دیر بعد نیاز گھر کے اندر آ گیا۔ اس نے نوشا کی ماں کو سلام کیا اور اس کے قریب ہی فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گیا۔ یوں نیاز کا نوشا کی ماں سے کوئی سگا رشتہ نہیں تھا۔ نیاز کی بیوی سلطانہ کی ماموں زاد بہن تھی ۔ اس رشتے سے وہ نوشا کی ماں کا بھتیجا داماد لگتا تھا۔

نیاز کو ابھی آئے ہوئے چند ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ کمرے کے اندر سلطانہ داخل ہوئی۔ اس نے دوپٹے کو سر سے ڈھلک کر شرماتے ہوئے کہا۔

"دولہا بھائی سلام"

نیاز نے اُس کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہت عرصہ بعد اس گھر میں آیا تھا۔ وہی سوکھی مریل سی لڑکی، جو بال بکھرائے گھر بھر میں دھڑ دھڑ کرتی کدکڑیاں بھرتی پھرتی تھی اب چھٹ چھٹا کر نکھرے مجسمہ کی طرح سڈول ہو گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ستاروں کی جھلملاہٹ اور چہرے پر چاندنی کی چھوٹ پڑ رہی تھی۔

اُس نے دل ہی دل میں سوچا "یار یہ لڑکی تو اب قیامت بن گئی ہے" اُس روز وہ اپنا سیکنڈ ہینڈ امریکن کوٹ پہنے تھا جس کی شکنیں صاف چغلی کھا رہی تھیں کہ اس کو وہ ہی ایک دن پہلے خرید اگیا ہے سر پر سیاہ اُون کی جناح کیپ تھی اور گلے میں گلوبند لپٹا ہوا تھا کباڑیوں کی اصطلاح میں وہ اس وقت بالکل "مناٹن" نظر آرہا تھا۔

نیاز آیا تو مکان کے کرائے کا تقاضہ کرنے کی غرض سے تھا مگر سلطانہ اُس کی نظروں میں ایسی کھب گئی کہ وہ کرائے کا سوال تک زبان پر نہ لایا۔ بلکہ جب نوشا کی ماں نے دو ماہ کا کرایہ بر وقت نہ پہنچنے پر شرمندگی کا اظہار کیا تو وہ ہنس کر بولا۔

"جب جی چاہے بھیج دیجئے گا۔ میں اس ارادے سے تو آیا نہیں تھا۔ اس طرف سے گذر رہا تھا سوچا آپ کی خیریت معلوم کرلوں۔"

نوشا کی ماں اپنی پریشانیوں کا دکھڑا رونے لگی۔ نیاز نے فوراً کہا "آپ پریشان نہ ہوں جس بات کی تکلیف ہو مجھ سے کہلوا دیا کریں، بشرطیکہ آپ مجھکو اپنا سمجھیں، ورنہ مرنے والی کے ساتھ، سب ہی نے مجھ سے آنکھیں پھیر لیں۔ حالانکہ میں تو آپ لوگوں کو آج بھی ویسا ہی مانتا ہوں۔"

نوشا کی ماں بولی "یہ تمھاری سعادت مندی ہے کہ تم اب بھی سب کو اس طرح سمجھتے ہو، ورنہ پاکستان میں بھائی کہاں کی عزیزداری، کہاں کی رشتہ داری، جس کو دیکھو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔"

دونوں دیر تک ایسی ہی گھر بلو باتیں کرتے رہے۔ نیاز دوران گفتگو میں بار بار سلطانہ کی جانب چور نظروں سے دیکھتا رہا، جو ماں کے برابر خاموش بیٹھی تھی۔ ایک بار جب سلطانہ نے بھی شرمائی ہوئی نظروں سے اُس کی جانب دیکھا تو نیاز کا سارا جسم سن سے ہو گیا۔ اُس نے کوٹ کے بٹن کھول دیئے اور سینہ تان کر جوان پٹھوں کی طرح ذرا ترچھا ہو کر اکڑ کے بیٹھ گیا۔ کسی شوقین مزاج سے اُس نے سن رکھا تھا کہ عورت پیسے کوڑی پر اتنا نہیں رجھتی، جتنا مرد کے جسم پر مرتی ہے۔

دوکان سے وہ یہ سوچ کر چلا تھا کہ کھڑے کھڑے دو باتیں کرکے واپس لوٹ آئے گا۔ مگر اُس کا

وہاں ایسا دل لگا کہ اُٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔

اُس روز جب وہ نوشا کے گھر سے نکلا تو رات خاصی بھیگ چکی تھی ہر طرف سناٹے کا راج تھا اور سنسان گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے۔ اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کو تنہائی کا شدت سے احساس ہوا۔

ایک روز ناغہ کرکے تیسرے دن وہ پھر نوشا کے گھر جا پہنچا اُس روز وہ اپنے ہمراہ جھوٹے موتیوں کا ایک ہار بھی لیتا گیا۔ ہار بڑی نفاست سے تیار کیا گیا تھا، جس کو نیاز نے انگلستان واپس لوٹنے والے کسی انگریز خاندان کے سامان سے نیلام میں خریدا تھا اور عرصہ سے کباڑ خانے کی الماری میں پڑا تھا۔

نیاز نے ڈبا کھول کر ہار نوشا کی ماں کے سامنے ڈال دیا اور جھجکتے ہوئے بولا "آج ایک شخص زبردستی یہ ہار میرے سر چپکا گیا، دیکھئے کیسا ہے؟"

نوشا کی ماں نے ہار ہاتھ میں لے کر دیکھا اور اس کی تعریف کرنے لگی "بڑا خوبصورت بنا ہے۔"

سلطانہ تھوڑا دیر تک اس کو بے چینی کے ساتھ دیکھتی رہی مگر آخر لڑکی سے زیادہ دیر ضبط نہ ہوسکا اُس نے ماں کے ہاتھ سے ہار لیا، نظر بھر کر اس کو دیکھا اور گلے میں پہن کر ماں سے پوچھنے لگی۔

"کیوں اماں کیسا لگ رہا ہے؟"

ماں نے اس کو فوراً ڈانٹا "اے ہے سلطانہ تجھکو تو کسی آئے گئے کی بھی غیرت نہیں۔ کیسے جلدی ہار مٹکا کر بیٹھ گئی۔ اتار کمبخت آنکھیں نکالے کیا دیکھ رہی ہے۔"

نیاز کو تو ایسے ہی موقعہ کی تلاش تھی۔ کہنے لگا "پہنے رہنے دیجئے۔"

مگر سلطانہ نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ ہار اُتار کر ڈبے میں ڈال دیا اور منہ لٹکا کر خاموش بیٹھ گئی۔ نوشا کی ماں نے نیاز سے کہا "تمھاری بات دوسری ہے تم ٹھیرے گھر کے آدمی، مگر لڑکیوں میں یہ عادت نہیں ہونا چاہیئے۔ کسی اور کے سامنے یہ ایسی حرکت کر بیٹھی تو وہ اُس کے جنم پر کیا تھوکے گا میں لڑکیوں کو سر پر چڑھا نے کی قائل نہیں ہوں۔ اولاد کو نوالہ کھلائے سونے کا مگر دیکھے ہمیشہ قہر کی نظر۔ تب ہی وہ دبے دبائے رہتے ہیں، ورنہ یہ آج کل کی اولادیں تو آفت کی پرکالہ ہیں۔"

نوشا کی ماں نے اولاد کی تربیت پر اپنا لکچر ختم کیا تو نیاز نے کہا۔ "اب اس نے پہن لیا ہے تو اسی کو دے دیجئے۔"

وہ پوچھنے لگی "کتنے کا لیا تم نے؟"

نیاز نے ہنس کر کہا "کیا کیجئے گا پوچھ کر۔ میں اب اس کی قیمت تو آپ سے لینے سے رہا۔"

وہ ذرا دیر اصرار کر کے خاموش ہو گئی۔

اس کے بعد دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اُس روز بھی وہ رات گئے واپس گیا۔

اب اس کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ رات کا کھانا ہوٹل سے کھا کر، ہر دوسرے تیسرے دن نوشا کے گھر پہنچ جاتا اور گھنٹوں بیٹھا اس کی ماں سے دنیا جہان کی باتیں کیا کرتا۔

ایک روز جو وہ آیا تو نوشا کی ماں پڑوس میں کسی کے یہاں گئی تھی۔ نوشا حسب معمول گھر سے غائب تھا۔ گھر میں صرف سلطانہ تھی اور انو جو لیمپ کے پاس پڑھتے پڑھتے وہیں لڑھک کر سو گیا تھا۔ سلطانہ نے نیاز سے زیادہ بات نہ کی اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیاز نے پوچھا۔

"کہاں چلیں؟"

وہ بولی "اماں کو بلانے جا رہی ہوں، سامنے والے گھر میں تو گئی ہیں۔"

وہ باہر جانے کے لئے مڑی تو نیاز نے ہاتھ بڑھا کر اُس کی کلائی پکڑ لی۔ ہاتھ کچھ ایسا بے ڈھب پڑا کہ کلائی میں پڑی ہوئی تمام چوڑیاں چھن چھنا کے ٹوٹ گئیں۔ وہ منہ بسور کر بولی۔

"لیجئے آپ نے ساری چوڑیاں توڑ ڈالیں کل ہی تو پہنی تھیں"

نیاز ہنس کر بولا "اور پہن لینا"

وہ آہستہ سے بولی "بڑی مشکل سے تو اماں نے اب کی چوڑیاں پہنائی تھیں۔ آپ نے میرا پورا ہاتھ ننگا کر دیا۔ اماں دیکھیں گی تو میرا فضیحتہ کر کے رکھ دیں گی" اُس کا چہرہ ایک بارگی افسردہ ہو گیا۔

نیاز کی جیب میں اس وقت کئی سو کے نوٹ موجود تھے اُس نے نوٹوں کی گڈی نکال کر

سامنے کردی "تم اتنا پریشان کیوں کررہی ہو۔ لو کتنے کی چوڑیاں پہنو گی"

سلطانہ نے کبھی اتنے بہت سے روپے نہیں دیکھے تھے۔ اس کی آنکھوں میں حیرت چھلکنے لگی۔ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولی "جی نہیں مجھے آپ کے روپے نہیں چاہئے"

نیاز نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا" مگر تم بیٹھو تو، میں تمھیں کاٹ تو نہیں کھاؤں گا"

وہ شرمائی ہوئی سی، اُس سے ذرا ہٹ کر، وہیں دری پر بیٹھ گئی۔ لیمپ کی گہری بسنتی روشنی میں وہ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ آنکھوں پر جھکی ہوئی لانبی پلکیں، رخساروں پر کندن کی سی چمک، سمٹتا اور پھیلتا ہوا سڈول جسم۔ نیاز نے اُس کو اس عالم میں دیکھا تو بے قابو ہوگیا۔ کہنے لگا

"ایک بات کہوں؟"

وہ بولی "کہیے"

نیاز جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اُس سے کہا نہ گیا! اُلجھی ہوئی سانس بھر کر صرف اُس نے اِس قدر کہا۔

"تمھاری اماں سے بات کروں گا"

سلطانہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکی۔ کہنے لگی "مجھ سے کہنے میں کوئی ہرج ہے"

نیاز نے گہری نظروں سے اس کو دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا "سلطانہ تم مجھ کو بہت اچھی لگتی ہو" اُس نے بڑی سادگی کے ساتھ اپنی بات کہہ ڈالی۔

سلطانہ خاموش بیٹھی پیروں کے ناخن توڑتی رہی۔ نیاز کہنے لگا "تمھیں معلوم ہے میں روز روز کیوں آتا ہوں" وہ اس وقت سب کچھ کہدینا چاہتا تھا۔

وہ بے نیازی سے بولی "مجھے کیا معلوم؟"

"اور جو میں یہ کہوں کہ میں صرف تمھاری خاطر یہاں آتا ہوں"

سلطانہ نے تڑاخ سے جواب دیا "بالکل جھوٹ"

نیاز ہنس پڑا "اب تم کو کیسے یقین دلاؤں"

وہ دیدے مٹکا کر بولی "واہ! بیٹھے اماں سے باتیں کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرے لئے آتے ہیں۔ میرے

لئے کیوں آنے لگے"۔

نیاز برابر مسکراتا رہا۔ "لیکن میری آنکھیں تو برابر تم کو ڈھونڈا کرتی ہیں" وہ اس وقت بڑے شاعرانہ موڈ میں تھا۔

سلطانہ نے بڑی سادگی کے ساتھ جواب دیا "کیوں؟"

"میرے قریب آکر بیٹھو تو بتاؤں"

اُس نے گردن ہلا دی "بس یہیں ٹھیک ہوں"

سلطانہ کی ایک ایک ادا نیاز کو ڈسے جا رہی تھی۔ خوشامد کرنے کے سے لہجہ میں بولا۔ "تو پھر میں تمہارے پاس آجاؤں"۔

وہ اسی تیزی کے ساتھ بولی "آپ وہاں بیٹھے کیا بُرے لگ رہے ہیں"۔

نیاز نے اس کو پھر چھیڑا "اچھا ذرا میری طرف تو دیکھو"

وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی "یہ لیجئے"

نیاز اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی بے صبری سے بولا۔ "ہائے" دل کی بات ٹھنڈی سانس کے ساتھ بہہ گئی۔ سلطانہ کے لئے نیاز کی یہ تمام حرکتیں کچھ عجیب سی تھیں۔ بہت سی باتیں اُس کی سمجھ میں آگئیں اور بہت سی وہ بالکل نہ سمجھ سکی۔

نیاز کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ اسی وقت ماں دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہوئی۔ نیاز سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سلطانہ کی ماں نے اُس کو دیکھتے ہی پوچھا۔

"ارے تم کب آئے؟ میں تو برابر والے مکان میں کمیٹی ڈلوا رہی تھی"

وہ صاف جھوٹ بول گیا۔

"آئے ہوئے ذرا ہی دیر ہوئی تھی"

ماں کہنے لگی "ارے سلطانہ تم نے نیاز کو پان بھی کھلایا"

یہ کہکر اُس نے پاندان کھولا اور پان بنانے لگی۔

پان کھا کر ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔

سلطانہ ذرا دیر تک وہاں بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر اپنے بستر میں جا کر دبک گئی۔

نیاز اس روز بڑا خوش تھا۔ بات بات پہ ہنس پڑتا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر چلا گیا۔

●

۶

شام ہو چکی تھی۔ نیاز کی دوکان میں لالٹین جل رہی تھی۔ وہ اس وقت ایک آدمی کے ساتھ رازدارانہ انداز میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا۔ کسی مال کا سودا ہو رہا تھا، جو کسی طرح طے ہی نہ ہوتا۔ نیاز نثو روپے سے آگے نہیں بڑھ رہا تھا اور وہ شخص بضد تھا کہ ایک سو دس سے کم نہ لوں گا۔

نیاز نے آخری دام لگاتے ہوئے کہا "پانچ اور بڑھالو۔ پسند آئے تو دیدو، نہیں تو دوسری جگہ دکھا دو۔ مگر ایک بات یاد رکھنا اگر دوسری جگہ بھی یہی دام لگیں تو یہیں دیدینا"

وہ آدمی بولا "بیچوں گا تو تمھارے ہی ہاتھ اور پورے ایک سو دس لوں گا۔ لو یہ سنبھالو اپنا مال۔" اس نے دونوں گھڑیاں نیاز کے سامنے ڈال دیں۔

نیاز آمادہ نہ ہوا "نہیں جی اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔"

وہ شخص بولا "خدا قسم بازار میں صرف ایک کی قیمت دو سو سے زیادہ ہے۔ روز ہم تمھاری بات مان لیتے ہیں آج تم کو ہماری بات ماننا پڑے گی۔"

نیاز بولا "دیکھنے میں تو دونوں اچھی گھڑیاں لگتی ہیں مگر ان کا نکالنا کتنا جوکھوں کا کام ہے۔ ہر وقت پولس کا خطرہ۔ چوری کا مال بیچنا تم کوئی آسان کام سمجھتے ہو"

وہ کہنے لگا "نیاز بھائی تم زیادہ دوکانداری نہ کیا کرو۔ تمھارے ساتھ کوئی آج پہلا معاملہ کر رہا ہوں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ان ہاتھوں سے تم کو ہزاروں کا مال دے چکا ہوں۔ ہر وقت کی بزنس اچھی نہیں ہوتی۔ لاؤ نکالو سیدھے

ہاتھ سے روپے۔"

وہ اپنی بات پر اڑا رہا "ہوں گے وہی ایک سو پانچ"

"لا یار نکال جو تیرا جی چاہے"

نیاز نے جیب کے اندر سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور ایک سو پانچ روپے گن کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔

وہ آدمی بولا "اماں چائے پانی کو تو کچھ دیدو" نیاز نے اٹھنی اور دیدی جل کر بولا۔

"لو یہ بھی لو، تمہارے اسی لیچڑپن سے مجھے چڑھ ہے"

وہ شخص بے حیائی سے ہنسنے لگا اُس نے نوٹ گن کر کوٹ کی جیب میں رکھے اور مسکراتا ہوا دکان سے باہر چلا گیا۔ نیاز نے دونوں گھڑیوں کو لالٹین کی روشنی میں غور سے دیکھا۔ بالکل نئی تھیں۔ پھر اُس نے اُن کو لے جا کر کمرے کے اندر الماری میں ڈال کر تالا لگا دیا۔

کمرے سے نکل کر باہر آیا تو اس نے دیکھا نوشا بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس روز موٹر سائیکل کے انجن کا کوئی پرزہ لایا تھا۔ نیاز نے پرزے کو صرف ایک نظر دیکھا اور جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر نوشا کو دیا۔

"جاؤ عیش کرو"

نوشا کے ہاتھ میں پورا دس روپے کا نوٹ آیا تو وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ نیاز اس وقت بڑے شاہانہ موڈ میں تھا "ابے میرا منہ کیا تک رہا ہے، اسے جیب میں ڈال لے"۔

نوشا نے جلدی سے نوٹ کو جیب میں ڈال لیا۔ اس وقت اُس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ اُس روز دونوں میں زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ نوشا دکان سے نکل کر راجہ کی تلاش میں چل دیا۔ گلی میں صرف شامی موجود تھا مگر راجہ کا پتہ نہیں تھا۔ نوشا کو سخت کوفت ہوئی۔ وہ جلد سے جلد راجہ کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے بے چین تھا کہ اس کی جیب میں پورے دس کا کرارا کرارا نوٹ موجود ہے۔

شامی نے بتایا کہ راجہ کالے صاحب کے گھر تمبولا کھیلنے گیا ہے اور یہ کہہ گیا ہے کہ نوشا آئے تو اس کو وہیں لیتے آنا۔ نوشا نے سوچا آج تو ٹھاٹھ سے تمبولا ہو گا۔ وہ شامی کے ساتھ اسی طرف چل دیا۔

کالے صاحب کا گھر وہاں سے کوئی فرلانگ، سوا فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ بیچ میں دو گلیاں پڑتی تھیں۔ اس کے بعد عیسائیوں کا محلہ شروع ہوتا تھا، وہیں کالے صاحب کا گھر تھا۔ دونوں جب وہاں پہنچے تو سرنگ کی طرح لمبے کمرے میں، بوسیدہ بنچوں پر بہت سے آدمی بیٹھے تھے۔ کمرے کے اندر ایک بڑا سا گیس کا ہنڈا جل رہا تھا۔ ہر طرف تمباکو کا دھواں منڈلا رہا تھا۔ سامنے چبوترے پر کالے صاحب، اونچی باڑھ کی ہیٹ لگائے، ہاتھ میں جادوگروں کی طرح ایک سیاہ چھڑی لئے کھڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک چوکور میز رکھی تھی، جس پر ایک تھیلا پڑا تھا۔ چار پانچ سال کا ایک گول مٹول سا بچہ تھیلے کے اندر سے ٹکٹ نکال نکال کر دیتا جا رہا تھا، جن پر لکھے ہوئے نمبروں کو کالے صاحب سرکس کے مسخروں کی طرح گردن مٹکا مٹکا کر اونچی آواز سے بول رہا تھا۔

کمرے کے اندر ایک طرف بنچ پر راجہ بھی بیٹھا تھا۔ کالے صاحب نمبر بولتا جا رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگ ہاتھوں میں دبے ہوئے کاغذوں پر پنسل سے جلدی جلدی نمبر کاٹتے جا رہے تھے۔ کسی کو تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ ہر شخص کے کان کالے صاحب کی آواز پر لگے تھے، جو دھڑا دھڑ نمبر بول رہا تھا۔ اتنے میں ایک موٹے تگڑے سیاہ فام آدمی نے ہاتھ اٹھا دیا۔ کسی دل جلے نے چیخ کر کہا۔

"دہت تیرے کی"

کمرے کے اندر اس کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔

شامی نے راجہ کو آواز دی۔ اُس نے پلٹ کر دونوں کی جانب دیکھا اور اٹھ کر اُن کے پاس آگیا۔ نوشا نے تمبولا کھیلنے کا ارادہ ظاہر کیا تو راجہ نے اس کو ڈانٹ دیا۔

"یار یہ کالے صاحب ایک نمبر بے ایمان ہے۔ سالا ضرور گڑبڑ کرتا ہے"

اُس دن راجہ شام سے بیٹھا تمبولا کھیل رہا تھا اور برابر ہار رہا تھا۔

کالے صاحب کے مکان پر ہر سنیچر کی شام کو تمبولا ہوتا تھا۔ راجہ کئی ہفتوں سے وہاں جا رہا تھا اور ہر بار ہار کر آتا تھا۔ تمبولا کھیلنے کے لئے وہ ہفتہ بھر تک پیسے اکٹھا کرتا اور سب وہاں جا کر ہار آتا اور اس کے بعد کالے صاحب کو گالیاں دیتا۔

نوشا کا دل تمبولا کھیلنے کو پھڑک رہا تھا۔ اُس نے دبی زبان سے کئی بار اس بات کے لئے اصرار کیا مگر راجہ نے ایک نہ سُنی۔ وہاں سے نکل کر جب تینوں باہر آئے تو نوشا نے دس روپے کا نوٹ نکال کر راجہ کو دکھایا۔ راجہ پر بڑا رعب پڑا۔ ذرا دیر کے لئے تو وہ چکرا گیا۔ پھر حسرت زدہ ہو کر بولا۔

"ابے آج تو تو بڑی لمبی رقم مار لایا"

نوشا نے کہا "اسی لئے تو تمبولا کھیلنے کو کہہ رہا ہوں"

راجہ نے اس دفعہ بھی اس کی خواہش کا گلا گھونٹ ڈالا "ابے تمبولا میں کیا رکھا ہے۔ میں تو پکچر دیکھنے چلا آیا۔ پر سالی وہ آج آئی نہیں"

نوشا نے کہا "یار تو تعریف تو اس کی بہت کرتا ہے، کسی دن اس کو دکھا تو دے"

شامی بیچ میں بول اٹھا "ابے کیا کرے گا دیکھ کر میری دوکان پر سالی روز سودا خریدنے آتی ہے۔ ایک دم واہیات ہے۔ بالکل کالی کلوٹی" راجہ کو اُس کی بات سخت ناگوار گذری اُس نے گھور کر شامی کو دیکھا اور جل کر بولا۔

"سالے وہ تمھاری عشو تو جیسے اپنے وقت کی مدھو بالا ہے۔ سالی بھنگی کہیں کی"

اُن کی باتیں سن کر نوشا کو شدید احساس کمتری ہوا۔ بڑی بے چارگی سے بولا "یار تم دونوں نے تو ایک ایک معشوق چھانٹ لیا۔ یہاں تو سالی کوئی کلوٹی کبھی نہیں ملتی"

دونوں اس کی سادگی پر بے ساختہ ہنس پڑے۔ شامی کہنے لگا "استاد اس کے لئے بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے تب جا کر کہیں لونڈیا پھنستی ہے"

راجہ کہنے لگا "سالا یہ دوکان پر بیٹھا دن بھر یہی تو کام کیا کرتا ہے"

شامی نے جھٹکا دے کر اپنے بڑے بڑے بالوں کو ایکٹروں کی طرح پیچھے پلٹا اور فخریہ انداز میں مسکرانے لگا۔ راجہ بولا۔

"ابے نوشا میں تجھے ایک تدبیر بتاؤں۔ وہ جو اُدھر سیدھے ہاتھ۔ وہی جس کا چوراہے پر پکا مکان ہے تو اُس کی لونڈیا کا تعقد ہے۔ روز اسکول پڑھنے جاتی ہے۔ باپ قسم بڑی زوردار لونڈیا ہے۔ میں نے تو اُس کے

بھائی سے یارا کرلیا ہے۔ چاہے تو تو بھی ساجھا کرلے بٹ گئی تو موج کریں گے۔ لا ملا پلاؤ والا ہاتھ" راجہ اور نوشا نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔

تینوں دیر تک محلّے کی لڑکیوں کی باتیں کرتے رہے۔ راجہ اور شامی جو لگ بھگ نوشا ہی کے ہم عمر تھے اور کسی کا بھی سن ۱۴، ۱۵ سال سے زائد نہ ہوگا اس انداز سے ایک ایک بات بیان کر رہے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔

کمبولا کھیلنے کا پروگرام منسوخ ہوا تو راجہ نے ایک نیا پروگرام بنایا مگر اس کی تفصیل نہ بتائی۔ شامی نے ضد کی تو اُس نے ڈانٹ دیا۔

"بس کہہ دیا کہ ایک جگہ چلیں گے تجھے چلنا ہو تو چل"

شامی نے پوچھا "کب تک واپسی ہوگی؟"

راجہ بولا "کوئی ٹھیک نہیں۔ گیارہ تو بج ہی جائیں گے"

شامی نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے "نا بابا میں اتنی دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ ابا مولانا قدوس کا وعظ سننے گئے ہیں۔ دس بجے لوٹ آئیں گے۔ مجھکو گھر میں نہیں دیکھا تو اودھم مچا دیں گے۔ میں تو کبھی چلا"

یہ کہہ کر وہ تو اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ راجہ اور نوشا باتیں کرتے ہوئے بازار کی جانب مڑ گئے۔ بازار کی چہل پہل اب اُجڑ چکی تھی۔ کہیں کہیں اکّا دکّا دوکانیں کھلی تھیں۔ چوکیداروں نے گشت لگانا شروع کر دیا تھا اور دوکانوں کے تالے ہلا ہلا کر دیکھ رہے تھے۔ راجہ اور نوشا نے بازار کو عبور کیا اور ایک پتلی سی گلی میں داخل ہو گئے۔

گلی کے اندر گھُپ اندھیرا تھا۔ آگے آگے راجہ تھا اور اُس کے پیچھے نوشا آ رہا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ایک موڑ پر روشنی دکھائی پڑی، قریب ہی ملی جلی آوازوں کا شور اُبھر رہا تھا۔ دونوں اسی طرف مُڑ گئے جس قدر وہ آگے بڑھتے گئے، شور نزدیک آتا گیا۔ آخر راجہ ایک اونچی دیواروں والی حویلی نما عمارت کے پاس جا کر ٹھیر گیا۔

بڑا پھاٹک بند تھا اور اندر خوب شور ہو رہا تھا۔ راجہ نے کھڑکی نما دروازے کو کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی نوشا بھی چلا گیا۔ دروازے کے سامنے بڑا سا صحن تھا۔ اُس کے بعد لمبی لمبی محرابوں والا طویل دالان تھا۔ جس میں گیس کی بتیاں جل رہی تھیں۔ جگہ جگہ ٹین کی کرسیاں اور لکڑی کی بھدی میزیں پڑی تھیں۔ میزوں پر شراب کی بوتلیں اور گلاس رکھے تھے۔

اس شراب خانے میں دیسی شراب ملتی تھی۔ دالان کے اندر شرابیوں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ وہ شراب پی رہے تھے۔ چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔ راجہ اور نوشا کرسیاں کھینچ کر ایک میز کے پاس بیٹھ گئے۔ پھر راجہ نے نوشا سے دس روپے کا نوٹ لیا اور کاؤنٹر پر جا کر ٹھرے کی ایک بوتل لے آیا۔ اس نے بوتل کھول کر میز پر رکھی۔ اپنے گلاس میں شراب اُنڈیلی لیکن جب وہ دوسرے گلاس میں شراب ڈالنے لگا تو نوشا گھبرا کر بولا۔

"یار یہ تو کس کے لئے اُونڈیل رہا ہے"

وہ ہنس کر بولا "ابے تیرے لئے اور کس کے لئے"؟

نوشا سہمی ہوئی آواز سے بولا "نہیں یار مجھکو نہ پلا"

راجہ اصرار کرنے لگا مگر نوشا برابر انکار کرتا رہا۔ اُسی وقت دالان کے اندر ڈھول ٹھکنے لگی اور ایک ہیجڑا لہک لہک کر گانے لگا۔

بریلی کی باجار میں جھمکا گرا رے،

او جھمکا گرا رے!

گانے کے ساتھ ساتھ وہ کمر ہلا کر ناچنے بھی لگا۔ ایک شرابی جھومتا ہوا اٹھا اور ہیجڑے کے ساتھ ناچنے لگا۔ وہ آدمی بھاری بھرکم جسم کا تھا۔ دھم دھم کرکے ناچتا تو چھت تک ہل جاتی۔ دالان میں بیٹھے ہوئے لوگ اس کو ناچتے دیکھ کر زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔

شراب خانے میں دونوں کے ناچ نے ایک نئی فضا پیدا کر دی تھی۔ نوشا بھی اس تماشے میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ بار بار کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے ان دونوں کے قریب آکر پوچھا۔

"کھانے کو کچھ لاؤں"؟

راجہ نے کہا "کباب ہوں گے ؟"

وہ بولا "کباب تو ابھی ابھی ختم ہو گئے"۔

راجہ بولا "اچھا تو آلو لے آؤ مگر خوب چٹ پٹے ہوں"

"ابھی لو جی، ابھی"

یہ کہکر وہ آدمی چلا گیا اور ذرا دیر بعد المونیم کی ایک گندی سی پلیٹ میں آلو لے آیا جن پر بہت سی لال لال مرچیں پڑی تھیں۔

بھاری بھرکم جسم والا شرابی ابھی تک ہیجڑے کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ وہ اپنے چوڑے چوڑے کولہے مٹکا کر ناچتا تو نوشا کو بڑا لطف آتا۔ راجہ نے کہا "ابے ذرا سی لگائے بغیر کیا مزا آئے گا" یہ کہکر اُس نے گلاس نوشا کے منہ سے لگا دیا۔ نوشا نے ایک گھونٹ پی کر بُرا سا منہ بنایا۔

"یار یہ تو بہت کڑوی ہے"

راجہ نے آلو کی پلیٹ سامنے کر دی "لے ایک قتلہ آلو کا کھالے"

نوشا نے پلیٹ سے آلو کے کئی قتلے اٹھا کر کھالئے۔ راجہ نے گلاس اٹھا کر عین آنکھوں کے سامنے کیا گہری گلابی شراب کو روشنی میں دیکھا اُس کو بوسہ دیا اور غٹاغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ نوشا نے بھی گلاس اٹھا کر تھوڑی سی پی اور راجہ سے کہنے لگا۔

"یار تو تو بڑا چھپا رستم نکلا"

راجہ بولا "نہیں بے بس دو تین بار اس سے پہلے ادر پی تھی اور یہاں تو دوسری دفعہ آیا ہوں"۔

نوشا نے کہا "لگے سالے جھوٹ بولنے۔ تو پکا شرابی معلوم ہوتا ہے"

"نہیں یار قسم لے لے"

دونوں باتیں کرتے رہے اور تھرّے کے گھونٹ چڑھاتے رہے۔ جب گلاس ختم ہو جاتا تو راجہ اور اونڈیل دیتا۔

نوشا پیتے پیتے ذرا دیر بعد بولا "یار راجہ مجھکو تو کچھ عجیب سا لگ رہا ہے"۔

راجہ ہنس کر بولا۔ "ابے ابھی سے چڑھنے لگی۔ چل تھوڑی سی اور لگا۔"

نوشا نے تھوڑی سی اور پی اور خواہ مخواہ ہنسنے لگا۔ یہ ہنسی بڑی بے ڈھنگی سی تھی۔ اس نے گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ کئی گھونٹ پی گیا۔ بھاری بھرکم جسم والا شرابی ناچتے ناچتے لڑکھڑا کر گر پڑا اور اب چاروں خانے چت فرش پر لیٹا بھینس کی طرح ڈکرا رہا تھا۔ والان کے اندر بیٹھے ہوئے شرابی ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے۔

ہیجڑے نے گانا بند کر دیا تھا۔ وہ ہر میز پر جاتا ایک آدھ گندا سا مذاق کرتا، دو چار بازاری فقرے سنتا اور دُوّنی چوّنی وصول کرکے دوسری میز پر چلا جاتا۔ وہ باری باری ہر میز پر جا رہا تھا۔ جب وہ راجہ کے پاس آیا تو ان دونوں کو دیکھ کر اس نے ہاتھ مٹکا مٹکا کر تالیاں بجائیں اور زور سے تان لگائی۔

چھوٹے سے بلما مورے آنگنا میں گلی کھیلیں۔

نوشا تو اس کی حرکتوں پر شرما گیا۔ مگر راجہ نے بڑی بے باکی کے ساتھ اٹھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور چٹاخ سے اس کے گال کو چوم لیا۔ ہیجڑا ہاتھ پھیلا کر بولا۔

"اسی بات پر ایک چوّنی دلاؤ"

راجہ نے فوراً جیب سے چوّنی نکال کر اس کو دیدی۔ وہ کولھے مٹکاتا آگے بڑھ گیا۔

دونوں دیر تک بیٹھے ٹھرا پیتے رہے اور ٹھرے کی خاصیت ہے کہ اس کا نشہ طوفان کی طرح چڑھتا ہے راجہ نے غضب یہ کیا کہ بوتل ختم ہونے کے بعد ایک اَدّھا اور لے آیا۔ اَدّھا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ راجہ بہکنے لگا۔ اب وہ خواہ مخواہ ہنس رہا تھا۔ بات کہتے کہتے بھول جاتا، دوسری شروع کر دیتا۔ کبھی نوشا کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا۔ کبھی اس طرح چہرہ بگاڑتا جیسے رو پڑے گا۔

ایکا ایکی نوشا کرسی پر سے لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا۔ اٹھ کر اس نے میز کا سہارا لیا تو میز الٹ گئی گلاس اور بوتل چکنا چور ہو گئی۔ راجہ نے اس کو ایک گندی سی گالی دی اور اس کے ساتھ ہی ایک زناٹے کا ہاتھ نوشا کے گال پر پڑا۔ نوشا نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو راجہ خونخوار نظروں سے اس کو گھور رہا تھا۔ پھر ایکا ایکی اس کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ والان سے نکل کر صحن میں آ گیا۔ پیچھے سے راجہ نے آواز دی۔ نوشا کو ایسا محسوس ہوا

کہ جیسے راجہ کنویں کے اندر بول رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں اور پھاٹک کی کھڑکی سے نکل کر باہر گلی میں آگیا۔

اسی عالم میں وہ ڈگمگاتا ہوا ایک طرف چل دیا اس کو مطلق علم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، کدھر جا رہا ہے۔

کوئی آدھ گھنٹے تک سنسان گلیوں میں ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ ایک کشادہ سڑک پر آگیا۔ لیکن وہ سڑک پر کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ ایکبارگی اس کا جی متلانے لگا۔ اس نے وہیں سڑک پر قے کر دی۔ اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا چند قدم گیا۔ ہر چیز اس کے سامنے گردش کر رہی تھی۔ مکانوں کے دریچوں پر کہیں کہیں جھلکتی ہوئی روشنیاں جگنو کی مانند اس کی نظروں کے سامنے جلنے اور بجھنے لگیں۔ ایکبارگی وہ سپیرے کی بین پر جھومنے والے ناگ کی طرح لہرایا اور چکرا کر گر پڑا۔

سڑک ٹھنڈی تھی اور خنک ہوا چل رہی تھی۔ نوشا کو بڑا سکون ملا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور بے خبر سو گیا۔

سڑک کے بیچوں بیچ وہ ہاتھ پاؤں پھیلائے لاش کی طرح بے جان پڑا تھا۔ اچانک ایک موڑ سے ایک کار بڑی تیز رفتار کے ساتھ نکلی اور آناً فاناً نوشا کے سر پر پہنچ گئی۔ نوشا پہیے کی جھپیٹ میں آکر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ایک بار وہ کلیجہ پھاڑ کر چیخا "ہائے" اور پھر خاموش ہو گیا ڈرائیور نے بریک لگائے، کار شور کرتی ہوئی زور سے اچھل کر رک گئی کسی نے موٹر کے اندر سے جھانک کر نوشا کو دیکھا جو دھندلی روشنی میں مردے کی طرح خاموش پڑا تھا۔ وہ گھبرا کر بولا۔

"مر گیا؟"

لمحہ بھر خاموشی رہی۔ نوشا کے جسم کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔

موٹر کے اندر سے آواز ابھری "کار اسٹارٹ کرو"

موٹر کا انجن گھڑگھڑایا اور کار تیزی سے سڑک پر دوڑتی ہوئی اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

بہت دیر بعد ایک راہگیر ادھر سے گذرا، یہ سلمان تھا۔ جو ایک مقامی کالج کا طالب علم تھا اور اس وقت

سینما دیکھکر واپس لوٹ رہا تھا۔ اُس نے نوشا کو دیکھا تو ٹھٹک کر رک گیا اور جھجکتا ہوا اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت نوشا نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔ سلمان جُھک کر اُس کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے تمام جسم پر خاک ہی خاک تھی۔ اُس نے نوشا کو ہر طرف سے دیکھا، چوٹ زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ صرف کندھے کے پاس خون کا نشان تھا۔

وہ اس کو بیچ سڑک سے اٹھا کر فٹ پاتھ پر لے آیا۔ دور دُور تک کسی آدم زاد کا پتہ نہ تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی اور ہر طرف ویرانی برس رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اُس نے نوشا سے نام و پتہ معلوم کیا۔ اس کے بعد وہ اس کو وہیں چھوڑ کر سڑک کے چوراہے پر پہنچا۔ اتفاق سے ایک خالی تانگہ آتا ہوا نظر آگیا۔ اُس نے فوراً تانگہ لیا اور اس جگہ پہنچ گیا، جہاں نوشا پڑا ہوا آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ سلمان نے تانگہ والے کی مدد سے نوشا کو تانگے میں ڈالا اور خود بھی اس میں سوار ہو گیا۔ تانگہ نوشا کے گھر کی جانب چل دیا۔

سڑک کا راستہ تو تانگے میں اطمینان کے ساتھ گذر گیا لیکن گلی اتنی پتلی تھی کہ تانگہ اندر جا نہیں سکتا تھا۔ سلمان نے تانگہ والے کو کرایہ دیا اور نوشا کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر گلی کے اندر داخل ہو گیا۔ اندھیرے میں دوبارہ وہ ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔

رات کا وقت اور اجنبی جگہ، سلمان کے لئے نوشا کے گھر کا پتہ لگانا بھی ایک مرحلہ بن گیا۔ نہ جانے کتنی دیر اس کو اندھیری گلی میں بھٹکنا پڑتا۔ خوش قسمتی سے محلہ کا ایک آدمی مل گیا، وہ ریلوے میں ملازم تھا اور اس وقت اپنی ڈیوٹی پر جا رہا تھا۔ اُس نے نوشا کا مکان بتا دیا۔ سلمان نے نوشا کو دروازے پر لٹایا اور ذرا دیر تک کھڑا ہانپتا رہا۔ وہ چھریرے جسم کا دُبلا پتلا نوجوان تھا۔ اس قدر مشقت کا عادی نہ تھا۔ اس کا سارا بدن پسینے پسینے ہو گیا تھا۔

سلمان نے دروازے پر دستک دی۔ کئی بار دروازہ کھٹکھٹایا مگر کوئی جواب نہ ملا۔

گھر کے اندر سب لوگ بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ بہت دیر بعد آہٹ سے نوشا کی ماں کی آنکھ کھلی۔ اُس روز اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ اس لئے وہ خود تو دروازے پر نہ جا سکی۔ اُس نے آواز دیکر سلطانہ کو بیدار کیا۔ وہ کچی نیند سے اٹھی تھی، دروازے پر جو کھٹکھٹانے کی آواز سُنی تو ڈر کر ماں سے بولی۔

"اے اماں یہ اتنی رات گئے دروازہ کون پیٹ رہا ہے؟"

ماں غصہ سے بولی "ہو گا کون ا وہی حرام خور ہو گا نوشا ۔ ساری رات واہی تباہی گھومنے کے بعد اب لاٹ صاحب کو گھر کی سوجھی ہے ۔ جا بیٹی دروازہ کھول دے ۔ ورنہ وہ کمبخت سونے بھی نہ دے گا"

سلطانہ نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی ۔ آنگن میں آ کر اُس کو سردی کا احساس ہوا تو جسم کپکپا کے رہ گیا ۔ اوّل شب موسم خوش گوار تھا مگر اب خنکی بڑھ گئی تھی اُس نے دروازہ کھولا اور گردن باہر نکال کر بولی ۔

"نوشا"

سلمان بھونچکا ہو کر اُس کو دیکھنے لگا ۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا ۔ سلطانہ نیند سے اُٹھی تھی، اس کو اندھیرے میں کچھ دکھائی بھی نہ دیا ۔ نوشا کی آواز نہ آئی تو وہ بولی ۔

"ارے کہاں چلا گیا، بولتا کیوں نہیں ؟"

سلمان سے اب خاموش نہ رہا گیا ۔ جلدی سے بولا "اس کا موٹر سے ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے"۔

ایکسیڈنٹ کا نام سنتے ہی سلطانہ بدحواس ہو کر چیخی "ہائے اللہ" اور تیزی سے بھاگتی ہوئی ماں کے پاس پہنچی ۔

ماں نے گھبرا کر پوچھا "ارے کیا ہو گیا ؟"

سلطانہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا "نوشا موٹر سے کچل گیا" اور سسکیاں بھر کر رونے لگی ۔

ماں نے جو یہ بات سنی تو وہ بھی چیخیں مار کر رونے لگی ۔ شور سن کر انو جاگ اٹھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگا ۔ اتنے میں سلمان ، نوشا کو ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے کمرے کے دروازے پر پہنچ چکا تھا ۔ اس کا جسم سلمان کے ہاتھوں پر بارش سے بھیگی ہوئی درخت کی شاخوں کی طرح جھول رہا تھا ۔

سلمان نے نوشا کو دری پر لٹا دیا اور ماں بیٹی کو تسلی دینے لگا "گھبرائیے نہیں، خدانخواستہ زیادہ چوٹ نہیں آئی ہے ۔ بال بال بچ گیا"۔

وہ دونوں بلک بلک کر رو رہی تھیں ماں کو آنسو بہاتے دیکھ کر انو بھی منہ بسور کر رونے لگا ۔ سامنے نوشا آنکھیں بند کئے بے سدھ پڑا تھا ۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ لاش کی طرح خاکستری نظر آ رہا تھا ۔

سلمان نے پھر اُن کو دھارس دی "آپ لوگ اس طرح کیوں رو رہی ہیں۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ کندھے پر ذرا سا زخم آگیا ہے"۔

ماں نوشا کا سر زانو پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ سلطانہ بھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔ دونوں برابر روئے جا رہی تھیں یہ بڑا المناک منظر تھا۔ سلمان سے یہ سب کچھ دیکھا نہ گیا۔ پریشان ہو کر بولا۔

"اچھا تو اب میں چلوں گا"

ماں اُس کو دعائیں دینے لگی۔

سلمان، نوشا کی ماں کی دعاؤں سے لدا پھندا گھر سے باہر آگیا اور سیدھا اپنے مکان کی طرف چل دیا کمرے میں پہنچ کر جب وہ بستر پر لیٹنے لگا تو ایک بارگی اُس کو خیال آگیا کہ نوشا کو گھر لے جانے کے بجائے وہ اس کو اسپتال کیوں نہ لے گیا۔ ممکن ہے چوٹ جسم کے اندرونی حصوں میں آئی ہو۔ یہ بات سوچتے سوچتے وہ کسی قدر پریشان ہو گیا۔ نہ جانے بیچارے نوشا کی اب کیا حالت ہو۔ گھر میں کوئی ایسا مرد بھی اس کو نظر نہیں آیا تھا کہ اگر رات میں طبیعت زیادہ گڑبڑ ہو جائے تو اس کو اسپتال لے جائے۔

یوں تو سلمان بڑا لاابالی نوجوان تھا۔ یہاں اس کا کوئی سرپرست موجود نہ تھا۔ تنہا رہتا تھا اور بڑی بے فکری سے آزادانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ ان طالب علموں میں سے تھا جو زمانۂ طالب علمی میں ہی زندگی کے بہت سے تجربات جان جاتے ہیں فلش کھیلنے پر آتا تو رات رات بھر کھیلتا رہتا اور ایک ایک پیسہ ہار جاتا۔ صحبت مل جاتی تو کبھی کبھار شراب بھی پی لیا کرتا۔ گھر سے جس روز منی آرڈر آتا تھا اُس روز وہ کسی بالاخانے پر جا کر گانا ضرور سنتا تھا۔ مگر ان تمام کمزوریوں کے باوجود وہ دل کا بڑا نرم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رات اُس نے بڑی بے چینی میں گذاری۔

صبح اُٹھتے کے ساتھ ہی وہ نوشا کے گھر پہنچا۔ نوشا کی ماں نے اس کو اندر بلا لیا۔ کمرے میں جا کر اُس نے دیکھا کہ نوشا ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ ماں نے بتایا کہ سویرے بہت تڑکے وہ اٹھا تھا۔ بات چیت بھی کی تھی۔ اب طبیعت ذرا ٹھیک ہے۔

سلمان وہیں دری پر بیٹھ کر نوشا کی ماں سے باتیں کر رہا تھا۔ سلطانہ کمرے کے باہر تھی۔ اُس نے

کئی بار دروازے کی آڑ سے جھانک کر سلمان کو دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور برابر سگرٹ پیے جا رہا تھا۔

سلطانہ نے انو کو اشارہ سے قریب بلایا اور اس سے کہا کہ اوورسیر صاحب کے یہاں سے ایک کرسی مانگ لائے، اس لئے کہ سلمان کا سوٹ پہن کر فرش پر بیٹھنا بڑا بے تکا لگ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد انو کرسی لے کر گھر کے اندر آ گیا۔ کرسی بوسیدہ سی تھی اور اس کا ایک پایہ ٹوٹا ہوا تھا۔ سلطانہ نے کرسی کمرے کے اندر بھجوا دی۔

نوشا کی ماں نے اصرار کر کے سلمان کو کرسی پر بٹھا دیا۔ لمحہ بھر بعد اس نے کرسی پر پہلو بدلا تو کرسی ڈگمگا کر الٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی سلمان دھڑام سے فرش پر آ گیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ کمرے کے باہر سلطانہ کی ہنسی کی آواز ابھر رہی تھی۔ سلمان جھینپ کر مسکرانے لگا۔ ماں بچوں کو خواہ مخواہ کوسنے لگی۔

"خدا سمجھے ان کمبختوں کو، اچھی بھلی کرسی توڑ ڈالی"

پھر اس نے اٹھ کر کرسی کو اٹھایا اور دیوار سے ٹکا کر سلمان کو اس پر زبردستی بٹھا دیا۔ اس وقت وہ اس طرح چوکنا ہو کر کرسی پر بیٹھا تھا جیسے فوٹو کھنچوانے والا ہو۔ اب وہ عین دروازے کے مقابل بیٹھا تھا۔ کئی بار اس نے سلطانہ کو دروازے سے جھانکتے ہوئے دیکھا اور کئی بار اس کی نظریں، سلطانہ کی نظروں سے ٹکرائیں۔

کوئی آدھ گھنٹے تک نوشا کی ماں سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے جب وہ جانے لگا تو نوشا کی ماں نے بڑے اصرار سے کہا کہ وہ آئندہ بھی آتا رہے۔ سلمان اس کو بڑا شریف اور سعادت مند لڑکا معلوم ہوا تھا۔

فصل دُوم

۱

سردیاں جا رہی تھیں اور گرمی کی آمد آمد تھی۔ درختوں میں پت جھڑ لگ چکا تھا۔ دن بھر تیز ہوائیں چلتیں اور راستوں پر خزاں کے مارے ہوئے زرد پتے کھڑکھڑاتے پھرتے۔ دھوپ کی تپش بڑھ جاتی مگر راتیں بڑی سہانی ہوتی تھیں۔ پھاگن کا مہینہ تھا۔ چاند نکلتا تو در و بام آئینہ خانہ بن جاتے۔ شفاف چاندنی سے دل میں کسک اٹھتی اور کتنی ہی موہوم خواہشیں انگڑائیاں لے کر بیدار ہو جاتیں۔

ایک ایسی ہی رات کا ذکر ہے۔ نوشا کی ماں باہر دالان میں سائبان تلے بیٹھی تھی۔ اُس روز اُس نے غسل کیا تھا اور دھلے ہوئے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ سلطانہ کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سوجھی کہ اُس نے ماں کا سفید دوپٹہ اتار کر اپنا بسنتی دوپٹہ اڑھا دیا۔ ماں نے احتجاج کیا

"اری لڑکی کچھ دیوانی ہو گئی ہے۔ لا میرا دوپٹہ دیدے"

وہ ہنس کر بولی "اللہ قسم اماں۔ یہ بسنتی دوپٹہ تو تم پر کھل گیا"

بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اُس کی ڈھلکی ہوئی جوانی بسنتی دوپٹے میں ایک بارگی جاگ اٹھی تھی۔ باہر صحن میں چاندنی بکھری ہوئی تھی اور اُس کے عکس میں نوشا کی ماں کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔ یوں اُس کی عمر ایسی زیادہ نہیں تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں اُس کی شادی ہو گئی۔ سال بھر بعد سلطانہ پیدا ہوئی۔ جو اب ۱۸ سال کے لگ بھگ تھی۔ اس حساب سے اُس کا سن ۳۳ سال کے قریب تھا۔

لیکن شوہر کے انتقال کے بعد کچھ تو دکھوں نے اُس کا حلیہ بگاڑ دیا اور کچھ اس نے اپنی وضع

قطع بھی بڑی بوڑھیوں کی سی بنا رکھی تھی۔ ورنہ ایک زمانہ میں وہ بڑی طرح دار عورت تھی۔ شوہر چاہنے والا ملا تھا۔ وہ تھا تو کچہری میں محرر، مگر اُس نے کبھی بیوی کا دل میلا نہیں کیا۔ اگر آدھی رات کو بھی اُس نے کسی چیز کی فرمائش کی تو وہ اسی وقت لا کر دے کر آتا۔ مگر اب اس کو مرے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے اور ان پانچ سالوں میں اُس کے سارے جتن ہو گئے۔ کون سی مصیبت تھی جو اُس نے نہیں جھیلی، کون سی پریشانی تھی جس سے اُس کا سابقہ نہیں پڑا۔

اوڑھنے کو تو اُس نے بسنتی دوپٹہ اوڑھ لیا۔ مگر ڈر رہی تھی کہ کسی محلے ٹولے والے نے دیکھ لیا تو وہ نکو بن جائے گی۔ سب یہی کہیں گے کہ رنڈاپا چھوڑ چھاڑ اب بننا سنورنا شروع کر دیا ہے۔ مارتے کا ہاتھ سب پکڑ لیتے ہیں، کہتے کی زبان کوئی نہیں پکڑتا۔ وہ بیٹھی یہی سوچ رہی تھی کہ اتنے میں نیاز آ گیا۔

اُس روز وہ بالکل چھیلا بن کر آیا تھا۔ سفید ململ کا کرتا، اُس کے نیچے شربتی بنیائن، کھڑکھڑاتی ہوئی کلفدار لٹھے کی شلوار۔ ٹوپی بھی اُس نے اُتار دی تھی۔ آڑی مانگ نکال کر بڑی محنت سے بالوں کو جمایا تھا، جن پر چپڑا ہوا خوشبودار تیل چمک رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں چنبیلی کے پھولوں کا گجرا پڑا تھا اور کان میں عطر کا پھویا لگا تھا۔

نیاز آکر بیٹھا تو سارا گھر مہکنے لگا۔ اس وقت وہ تھا بھی بڑا خوش۔ نوشا کی ماں کو بسنتی دوپٹہ پہنے دیکھا تو مسکرا کر بولا۔

"ارے آج تو آپ کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔"

سلطانہ جو قریب ہی بیٹھی تھی، کہنے لگی: "دولھا بھائی میں ان سے ابھی یہی کہہ رہی تھی۔ اچھا خاصہ اپنا حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔ جب دیکھو یہ نگوڑا موٹا سفید دوپٹہ سر سے منڈھے بیٹھی ہیں۔"

نیاز نے مڑ کر سلطانہ کو دیکھا، جس کا حسن سفید لباس کی سادگی میں کچھ اور نکھر گیا تھا۔ اُس کے گلابی ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھوں میں تازہ کھلے ہوئے پھولوں کی شگفتگی تھی۔ وہ اُس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔

"ٹھیک تو کہہ رہی ہے سلطانہ" "خدا قسم یہ دوپٹہ آپ پر بڑا اچھا لگ رہا ہے۔"

نوشا کی ماں شرما کر بولی :" کیوں تم دونوں مل کر مجھے بنا رہے ہو؟"

سلطانہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ نیاز کو اس کی یہ ہنسی بڑی اچھی لگی ۔ وہ اُس کو خوش کرنے کے لیے کہنے لگا " سلطانہ تم ان کو روز رنگین دوپٹے پہنایا کرو ۔ ذرا دیکھو تو کیسی سج رہی ہیں ۔ کبھی اسی بات پر سب کا منہ میٹھا ہو جائے " وہ اس وقت بڑے شاہانہ موڈ میں تھا ! ابھی ابھی اُس نے چوری کے موٹر ٹائر فروخت کیے تھے ، جس میں اس کو کئی سو روپے کا منافع ہوا تھا ۔ اُس نے انّو کو بلایا ، اور جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر بولا ۔

" ذرا لپک کر سیر بھر گرم گرم بالوشاہی تو لاؤ "

نوشا کی ماں نے اُس کو بہت منع کیا مگر وہ باز نہ آیا ۔ اُس نے زبردستی کر کے انّو کو مٹھائی لانے کے لیے بھیج دیا ۔

ذرا دیر بعد انّو مٹھائی لے کر آ گیا ۔ نیاز نے اصرار کر کے نوشا کی ماں کو خود اپنے ہاتھ سے ایک بالوشاہی کھلائی ۔ پھر مٹھائی سب کو تقسیم کی گئی ۔ سب خوش تھے ۔ ہنس رہے تھے ، باتیں کر رہے تھے ۔ گھر بھر میں ہنگامہ برپا تھا ۔ نوشا بھی اسی وقت آیا تھا اور سب سے زیادہ شور مچا رہا تھا ۔

رات گئے تک یہ ہنگامہ جاری رہا ۔ آخر نوشا اور انّو اپنے اپنے بستروں میں جا کر دبک گئے تھوڑی دیر بعد سلطانہ بھی جمائیاں لینے لگی ۔ جب وہ بستر پہ جانے کے واسطے اٹھی تو نیاز نے اُس کو اس طرح دیکھا کہ اُس کی نظریں کہہ رہی تھیں " کچھ دیر تو اور بیٹھو " مگر وہ وہاں سے اٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی ۔ نیاز بار بار مڑ کر کمرے کی جانب تکتا رہا کہ شاید سلطانہ واپس آ جائے مگر وہ بے خبر پڑی سو رہی تھی ۔

نیاز ذرا دیر تک بجھا بجھا سا بیٹھا رہا ۔ پھر اُس نے سوچا چلو آج لگے ہاتھوں سلطانہ کے ساتھ رشتے کی بات چھیڑ دی جائے ۔ کچھ یہی سوچ کر وہ اپنی گھریلو تکلیفوں کا رونا رونے لگا ۔ اُس نے ہوٹل کے خراب کھانے سے لے کر گھر کے اکیلے پن تک کی بات کہہ ڈالی ۔ سلطانہ کی ماں چپ چاپ اُس کی ساری باتیں سنتی رہی ۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکا تو اُس نے اظہار ہمدردی کے طور پر کہا ۔

"میرا کہا مانو تو تم اپنا گھر بسا لو۔ اس طرح کب تک تکلیفیں اٹھاؤ گے۔"

نیاز یہی بات اس کی زبان سے سننے کا عرصے سے خواہشمند تھا۔ اس نے فوراً کہا "سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں، مگر میرا یہاں بیٹھا کون ہے جو کہیں سلسلہ چھیڑا جائے۔ لے دیکے ایک آپ کا گھر ہے جہاں چلا آتا ہوں۔"

وہ کہنے لگی۔ "کوئی لڑکی ہے تمہاری نظر میں۔"

نیاز کے ذہن میں ایک بار یہ خیال ابھرا کہ وہ صاف بات کہہ دے، مگر ہچکچاہٹ کے باعث وہ اپنی بات کہہ نہ سکا۔ اس نے صرف اس قدر کہا۔

"یہ تو آپ ہی کو سوچنا پڑے گا۔"

وہ اس کی بات کا مطلب کچھ کچھ بھانپ گئی۔ کہنے لگی۔ "بھئی میں کیا بتاؤں؛ اگر میری سلطانہ کچھ بڑی ہوتی تو میں خدا قسم اس کو تمہارے ساتھ بیاہ دیتی۔"

نیاز کے سینے پر ایک گھونسا سا لگا۔ بوکھلا کر بولا، "آپ میری عمر کتنی سمجھتی ہیں؟"

وہ کہنے لگی۔ "یہ تو میں جانتی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ سلطانہ کی اور تمہاری عمر میں آدھوں آدھ کا فرق ہوگا۔"

نیاز یہ بات کسی طرح ماننے کو تیار نہ تھا۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔

"آپ بھی کمال کر رہی ہیں۔ اتنا فرق کیسے ہو سکتا ہے۔"

نوشا کی ماں بولی "برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔"

"ضرور کہیے" وہ اس وقت سب کچھ سننے کو تیار تھا۔

سلطانہ کی ماں نے دبی زبان سے کہا۔ "سچ پوچھو تو میں تو دو چار سال میں تم سے چھوٹی ہوں گی۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر چیخ پڑا۔ "جی"

وہ بتانے لگی "میری عمر تم کیا سمجھتے ہو، ۳۰، ۳۱ سے زیادہ نہ ہوگی۔" دو چار سال اس نے اپنی طرف سے کم کر دیئے۔

نیاز نے اس دفعہ اُس کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ وہ واقعی ابھی تک خاصی جوان تھی۔ سر کے سارے بال سیاہ تھے اور بڑے سلیقے سے گندھے ہوئے تھے۔ چہرے کے نقوش کا تیکھا پن گو کہ ماند پڑ چکا تھا، پھر بھی ان میں کسی قدر تازگی تھی۔ البتہ جسم ذرا بھدا ہو گیا تھا۔ خاص طور پر کولھے جو بہت پھیل گئے تھے۔ پھر بھی اس میں ایک سج دھج اور کشش نظر آ رہی تھی۔

نیاز نے اب تک اُس کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کو صرف سلطانہ کی ماں کی حیثیت سے دیکھتا رہا تھا اور اس وقت وہ اس کو صرف ایک عورت کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا اور وہ بھی ایک مرد کی نظر سے۔

سلطانہ کی ماں نے جو اس کو اس طرح گہری نظروں سے گھورتے دیکھا تو شرما کر دوپٹہ سر پر سرکا لیا۔ پہلی بار اُس کو احساس ہوا کہ وہ نیاز کے سامنے شرما بھی سکتی ہے۔ اس احساس میں ایک خوف تھا، ایک لذت تھی ایسی لذت جس سے وہ ناآشنا نہیں تھی اور جس کو وہ تھپک کر سلا چکی تھی۔ اُس نے اپنے جسم کے اندر پسینے کی نمی محسوس کی۔ وہ گھبرا رہی تھی اور اس گھبراہٹ پر قابو پانے کے لئے اُس نے جلدی سے پاندان کھول کر پان لگایا اور نیاز کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔

"کس سوچ میں پڑ گئے۔ لو پان کھاؤ"

نیاز نے ہاتھ بڑھا کر پان لیا۔ دونوں کی اُنگلیاں ایک دوسرے سے مَس ہوئیں۔ نوشہ کی ماں کا ہاتھ کپکپایا اور پان نیچے گر پڑا۔ دونوں چونک کر ایک ساتھ بولے۔

"ارے"

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔ اور کئی منٹ تک چُپ بیٹھے رہے۔ چاندنی اور نکھر گئی تھی۔ ہوا سنکی ہوئی تھی اور نیاز کی کلائی میں پڑے ہوئے گجرے کے پھول مہک رہے تھے۔ ایکا ایکی کمرے کے اندر لیمپ زور سے بھڑکا اور بُجھ گیا۔ وہ اُٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی، جہاں گھُپ اندھیرا تھا۔

جتنی دیر وہ کمرے کے اندر رہی، یہ تمام وقت نیاز نے بڑی بے چینی میں گذارا۔ وہ خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، کیا ہونے والا ہے۔ کیا وہ اُٹھ کر یہاں سے چُپ چاپ چلا جائے۔ کئی سوال اُس

کے ذہن میں اُبھر اُبھر کر غوطے لگا رہے تھے۔ اُجلی اُجلی چاندنی باہر صحن میں بکھری ہوئی تھی۔ ہوا سے سکیاں بھرتی ہوئی چل رہی تھی اور چنبیلی کے پھول مہک رہے تھے۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو نیاز نے گردن موڑ کر اُس کی جانب دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔ نیاز کی نظریں برابر اُس کے جسم کے پیچ و خم پر منڈلاتی رہیں۔ مگر جب وہ اُس سے ہٹ کر دور بیٹھنے لگی تو نیاز کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

"یہاں میرے قریب آجایئے"

وہ کھسک کر اُس کے قریب ہوگئی۔ مگر نظر اُٹھا کر نہ دیکھا۔ دونوں چپ بیٹھے رہے۔ اُجلی چاندنی کے جھلکتے ہوئے عکس میں دونوں دالان کی تنہائی میں خاموش بیٹھے تھے۔ نیاز نے پھولوں کا گجرا ہاتھ سے نکال کر سامنے رکھ دیا اور لمحہ بھر تک اُس کے ساتھ انگلیوں سے کھیلتا رہا اور برابر یہ سوچتا رہا کہ وہ کیا بات کرے۔

بہت دیر بعد وہ بولی "بہت رات ہوگئی" اُس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔

نیاز کہنے لگا "گیارہ بجا ہوگا"

دونوں پھر خاموش ہوگئے۔ یہ خاموشی بڑی ہیجان انگیز تھی۔ نیاز نے گہرا کر انگڑائی لی اور اُس کو غور سے دیکھا پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ذرا اور قریب آجاؤ"

اور وہ خود اس کی طرف جھک گیا۔ وہ کسمسا کر اپنی جگہ پر رہ گئی۔

نیاز نے اس کی چوڑی چکلی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا "یوں نہیں یوں" اور اُس کو اپنی جانب گھسیٹ لیا۔

اندر کمرے میں سلطانہ اور اُس کے دونوں بھائی گھُپ اندھیرے میں پڑے سو رہے تھے۔

نیاز بہت تڑکے اُٹھ کر نوشا کے گھر سے چلا گیا۔ رات کے حادثہ کی یادگار گجرے کے مسلے ہوئے پھول رہ گئے تھے، جو دالان میں ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔

اس کے بعد بارہا ایسا ہوا کہ نیاز سرِ شام نوشا کے گھر آجاتا۔ رات گئے تک بیٹھا باتیں کیا کرتا اور علی الصبح اُٹھ کر چپکے سے باہر چلا جاتا لیکن سلطانہ ابھی تک اُس کی نظروں پر چڑھی ہوئی تھی۔ بلکہ ماں اور بیٹی جب کبھی ساتھ بیٹھی ہوتیں تو ماں اُس کو بھدی اور بدوضع معلوم ہوتی۔

موقعہ مل جاتا تو نیاز سلطانہ سے ہنس کر بات بھی کر لیتا۔ مگر ماں اب اُس کی کڑی نگرانی کرنے لگی تھی۔ کسی وقت بھی اُس کو اکیلا چھوڑ کر نہ جاتی۔ ذرا ذرا سی بات پر اُس کو سختی سے ڈانٹ دیتی۔ نیاز کی موجودگی میں سلطانہ کا بیٹھنا دوبھر ہو جاتا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ نیاز سلطانہ کی ماں سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ کسی رشتہ دار کے یہاں کوئی تقریب تھی۔ ماں اور بیٹی ذرا دیر پہلے وہاں سے واپس لوٹی تھیں۔ سلطانہ ابھی تک اپنا ریشمی جوڑا پہنے ہوئے تھی۔ اس لباس میں اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگ رہے تھے۔ چہرے پر معصومیت کے ساتھ وقار جھلک رہا تھا۔ نیاز کے لئے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ بار بار اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ سلطانہ کو بھی اس وقت اپنی دلکشی کا پورا پورا احساس تھا۔ ماں کے بار بار کہنے کے باوجود اُس نے لباس تبدیل نہیں کیا تھا اور وہیں ماں کے کولھے سے لگی بیٹھی تھی۔

نیاز نے جو ایک بار نظر اٹھا کر دیکھا تو سلطانہ کی نگاہیں بھی اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی، وہ بھی مسکرا دیا۔ ماں سر جھکائے پان لگا رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر سلطانہ پر پڑ گئی۔ اس نے سلطانہ کو مسکراتے دیکھ لیا۔ ایک بارگی اس کی تیوری پر بل پڑ گیا۔ اُس نے قہر آلود نظروں سے اس کو گھورا اور ڈانٹ کر بولی

"جا اندر جا کر بیٹھ، جب دیکھو سر پر سوار ہے"

سلطانہ اترانے لگی "ابھی نیند نہیں آ رہی ہے"

ماں نے غصہ سے کہا، "جاتی ہے کہ نہیں" پھر وہ اس کو ڈھکیلتی ہوئی کمرے کے اندر لے گئی۔ وہاں اُس نے سلطانہ کے رخسار میں زور سے چٹکی بھر کر دبی زبان سے کہا۔

"حرامزادی میں تیرے سب کرتوت جانتی ہوں"

سلطانہ منہ بسور کر رہ گئی۔

ماں کے انداز میں جذبۂ رقابت صاف جھلک رہا تھا۔ یہ بات سلطانہ نے تو محسوس نہیں کی البتہ نیاز کو اس کا شدت سے احساس ہوا۔

دوسرے ہی دن سے نیاز یہ بات غور کرنے لگا کہ سلطانہ اب اس کے سامنے آتے ہوئے کتراتی تھی۔

کمرے کے اندر سے کبھی کبھار صرف اُس کے بولنے کی آواز آجاتی۔ اُس نے ایک آدھ بار باتوں باتوں میں ماں سے سلطانہ کا ذکر کیا تو وہ بات کو بڑی ترش روئی کے ساتھ ٹال گئی۔ نیاز کے ذہن میں اچھی خاصی اُلجھن پیدا ہوگئی۔ کئی روز اسی اُلجھن میں گذر گئے۔

ان ہی دنوں ایک روز نیاز خلاف توقع دن کے وقت نوشا کے گھر چلا گیا۔ دس ساڑھے دس بجے کا وقت تھا۔ سلطانہ کی ماں کی طبیعت خراب تھی۔ وہ انو کے ساتھ اسپتال گئی تھی۔ نوشا کارخانے جا چکا تھا۔ گھر میں صرف سلطانہ تھی۔ نیاز نے جو ماں کو غیر حاضر دیکھا تو سیدھا سلطانہ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اُس کو اپنے روبرو دیکھ کر گھبرا گئی۔

نیاز نے سب سے پہلی بات جو اس سے پوچھی وہ یہ تھی "اب تم دکھائی کیوں نہیں دیتیں۔ ہر وقت کمرے کے اندر کیوں بیٹھی رہتی ہو؟"

اُس نے صاف بات بتادی "اماں نے آپ کے سامنے آنے سے منع کر دیا ہے"

نیاز کے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ گھبرا کر بولا "کیوں؟"

اُس نے جواب دیا "اُنھوں نے کہا ہے کہ دولھا بھائی سے پردہ کیا کرو؟"

نیاز نے دل ہی دل میں کہا۔ اچھا تو یہ بات ہے۔ جب ہی سلطانہ نے اس کے سامنے آنا جانا بند کر دیا۔ ایکبارگی اُس نے سلطانہ کی ماں کے خلاف خود میں شدید نفرت کا جذبہ محسوس کیا۔ ذرا دیر تک وہ خاموش کھڑا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ پھر اُس نے محبت بھری نظروں سے سلطانہ کو دیکھا اور بڑے پیار سے بولا۔

"سلطانہ!"

وہ آہستہ سے بولی "جی"

چند ثانیے کے لئے دونوں خاموش کھڑے رہے۔ پھر سلطانہ کی گھبرائی ہوئی آواز اُبھری۔

"آپ جائیے۔ اماں آتی ہوں گی۔ آپ کو یہاں دیکھ لیا تو میرے لئے مصیبت آجائے گی"

نیاز نے سوچا کہ واقعی ان حالات میں اُس کا وہاں ٹھہرنا مناسب نہ تھا۔ لہٰذا وہ فوراً باہر

آگیا۔ اُس کو رہ رہ کر سلطانہ کی ماں پر غصہ آرہا تھا اور اُس کے ساتھ ہی سلطانہ کو حاصل کر لینے کی تمنا شدید ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں دوکان کی جانب جا رہا تھا کہ راستے میں کالے صاحب سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

کالے صاحب نے ملتے ہی کہا "مسٹر نیاز بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو، کیا بات ہے؟"

نیاز نے اُس کو ٹالنا چاہا تو کالے صاحب اُس کے سر ہو گیا۔ "میں کہتا ہوں تم اپنی لائف انشور کرالو، کوئی پریشانی نہیں رہے گی"۔

نیاز اس وقت جھنجھلایا ہوا تھا۔ جل کر بولا "کالے صاحب تم کو ہر وقت بیمہ ہی کرانے کی پڑی رہتی ہے۔ نہ وقت دیکھتے ہو، نہ موقعہ۔ ہر وقت سالا بیمہ تمھارے ساتھ لگا رہتا ہے"۔

کالے صاحب ہنسنے لگا۔ ناراض ہونا تو اُس نے سیکھا ہی نہیں تھا، ورنہ وہ اس قدر کامیاب انشورنس ایجنٹ نہ ہوتا۔ بڑی نرمی سے بولا۔

"ارے تم تو ناراض ہو گئے۔ آؤ میں تم کو چائے پلاؤں"

مگر نیاز اُس کے ہمراہ جانے پر رضامند نہ ہوا۔

کالے صاحب اصرار کرنے لگا "بیمہ نہ کراؤ مگر میری چائے تو پی لو، آؤ میرے ساتھ"

وہ نیاز کو گھیر گھار کر قریب کے ایک چائے خانے میں لے گیا۔ چائے کا آرڈر دیا اور ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں مگر بیمہ کا ذکر کئے بغیر کالے صاحب زیادہ دیر تک نہ رہ سکا۔ گھوم پھر کر اسی موضوع پر آگیا۔ کہنے لگا۔

"زندگی میں گارنٹی بہت بڑی چیز ہے اور وہ صرف انشورنس سے ملتی ہے۔ تم صرف تجربہ کے لئے دو ہزار کی پالیسی لے کر دیکھو، پھر تم خود ہی اُس کے فائدے جان لو گے"

نیاز نے سنجیدگی کے ساتھ بیمہ کرانے کے لئے نہ کبھی سوچا تھا اور نہ اب اُس کا ارادہ تھا۔ اُس نے صرف کالے صاحب کو چھیڑنے کی غرض سے کہا "دیکھو کالے صاحب بیمہ ویمہ تو میں کراؤں گا نہیں، البتہ کوئی ایسی تدبیر تم کو معلوم ہو تو بتاؤ جس سے سال سوا سال میں ۴۰، ۵۰ ہزار روپیہ مل جائے"

کالے صاحب کہاں میدان چھوڑنے والا تھا، بڑی سنجیدگی سے بولا "اس کا بھی ایک ہی طریقہ ہے۔ انشورنس اور صرف انشورنس۔ اپنے کسی بچے یا وائف کا بیمہ کرا دو۔ اگر سال بھر کے اندر وہ نوٹ ہو گیا تو ۵۰ ہزار کیا اگر تم ایک لاکھ کی پالیسی لو گے، تو تم کو کمپنی اتنا ہی روپیہ دے گی۔"

نیاز سوچ میں پڑ گیا۔ کالے صاحب سمجھا کہ وہ اُس کی باتوں پر ناراض ہو گیا، لہٰذا وہ معذرت کرنے کے سے انداز میں بولا "دیکھو بھی اس میں بُرا ماننے کی بات نہیں انشورنس ایجنٹ موت اور زندگی کی بات ہمیشہ ڈاکٹر کی طرح صاف صاف کرتا ہے۔"

وہ کہنے لگا "یہ بات نہیں۔ دراصل میں اس وقت ایک پریشانی میں ہوں، بات یہ ہے۔۔!"

نیاز آگے کچھ اور کہتا مگر کالے صاحب نے اُس کو بات بھی پوری نہ کرنے دی اور لگا اپنی ہانکنے "میں تمھاری پریشانی خوب جانتا ہوں۔"

اس بات پر نیاز نے اس کو گھور کر دیکھا اور چائے کا گھونٹ پی کر سوچنے لگا۔ یہ کالے صاحب عجیب مسخرا ہے، میری پریشانی یہ کیا جانے، مگر کالے صاحب قطعی کاروباری موڈ میں تھا۔ اُس نے دیکھا کہ شکار پھنس رہا ہے۔ اب اس کو نکلنے نہ دو، یہیں گردن دبوچ لو کہ پھڑ پھڑا بھی نہ سکے۔ وہ جوش میں آ کر بولنے لگا۔

"دیکھو مسٹر نیاز آگے کا حال کوئی نہیں جانتا۔ زندگی کیا ہے؟" یہ بات تو خود کالے صاحب کو بھی نہیں معلوم تھی۔ بات کہتے کہتے لمحہ بھر کے لیے وہ الجھا کہ اب کیا کہے۔ پھر اُس نے میز پر رکھی ہوئی چینی کی پلیٹ اٹھا لی اور اُس کو نیاز کے سامنے کر کے کہنے لگا۔

"زندگی کی مثال اس پلیٹ کی طرح ہے۔ اس پلیٹ کو اٹھاتے ہوئے تم ڈرو گے کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ لیکن اگر اس کا بیمہ ہو چکا ہے تو کوئی ڈر کی بات نہیں۔ اس کی قیمت تو تمھاری جیب میں ہے تم اس کو یوں اُٹھا کر پھینک سکتے ہو۔"

اور کالے صاحب نے واقعی پلیٹ اٹھا کر اُچھال دی۔ وہ فرش پہ گر کر چکنا چور ہو گئی۔ پلیٹ کے ٹوٹنے کا چھناکا ہوا تو کالے صاحب بھی چونکا کہ یہ اس نے کیا کر دیا۔ چائے خانے میں ذرا دیر کے

لئے سنسنی پھیل گئی۔ ایک بیرا لپک کر اُس کے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔

"صاحب آپ نے پلیٹ کیوں توڑ ڈالی؟"

کالے صاحب بڑا چکرایا۔ پھر کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا۔ نیاز کو بھی ہنسی آگئی۔ بیرا کہنے لگا۔

"ساب ہنسی کی بات نہیں، دو روپیہ ڈانڈ بھرنا پڑے گا"

ہوا بھی یہی چائے کے بل کے ساتھ کالے صاحب کو پلیٹ کے بھی دو روپے دینا پڑے۔ اس دو روپے کی چپت سے کالے صاحب کی ساری تیزی رفوچکر ہو گئی۔ بھیگی بلی کی طرح مری ہوئی آواز سے کہنے لگا۔

"مسٹر نیاز اب کہاں تم سے ملاقات ہو گی؟"

آج کے دن سے پہلے اگر کالے صاحب یہ بات نیاز سے پوچھتا تو وہ جل کر کہتا "جہنم میں" مگر اب وہ واقعی کالے صاحب سے بیمہ کرانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "پرسوں سہ پہر کو آجاؤ اس وقت کام بھی نہیں ہوتا۔ اطمینان سے بات ہو گی۔"

ملنے کا پروگرام طے کر کے دونوں اپنے اپنے راستے چل دیئے۔

دکان پہنچ کر نیاز کالے صاحب کی باتوں پہ دیر تک غور کرتا رہا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو صرف روپیہ پیدا کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اُسی کے بوجھ سے دبے ہوئے ایک روز چپ چاپ دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔

نیاز نے سوچا کہ اگر بیمے کے ذریعہ سال، دو سال میں ۴۰، ۵۰ ہزار کی رقم ہاتھ لگ جائے تو وارے نیارے ہو جائیں۔ بات کچھ سمجھ میں بھی آتی تھی لیکن اس کے لئے پہلے ایک بیوی کی ضرورت تھی۔ سوچتے سوچتے اُس نے ایک اسکیم تیار کی اور اُس روز معمول سے کچھ پہلے نوشا کے یہاں پہنچ گیا۔

سلطانہ کمرے کے اندر بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی اُس کی آواز ابھرتی تو نیاز کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا اور نوشا کی ماں کی ہر بات اُس کو زہر میں بجھی ہوئی معلوم ہوتی۔ وہ اس وقت نیاز کے سامنے بیٹھی ہنس ہنس کر پڑوس کی ایک عورت کا قصہ سنا رہی تھی، جس کی شلوار میں چوہیا گھس گئی تھی۔

جب پہر رات گذر گئی اور گھر پر گہرا سناٹا چھا گیا تو نیاز نے خلوت میں اُس سے بڑے پیار سے کہا "اس طرح کب تک یہ چوری چھپے کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ میرا تو اب تمھارے بغیر ایک گھڑی جی نہیں لگتا۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "دن میں گھڑی، دو گھڑی کو چلے آیا کرو۔"

وہ کہنے لگا۔ "میں تو کہتا ہوں کہ کیوں نہ ایک روز قاضی کو بُلوا کر دو بول پڑھوا لئے جائیں۔ اللہ رسول بھی خوش اور دنیا کا بھی خوف نہیں۔"

سلطانہ کی ماں کی بھی یہی خواہش تھی مگر اُس کے اپنے پروگرام کے مطابق ابھی اس نیک کام کا وقت نہیں آیا تھا۔ بات یہ تھی کہ اُس کو نیاز کی نیت پر شبہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ پہلے سلطانہ کا کسی کے ساتھ بیاہ کر دے۔ لہٰذا اُس نے نیاز کی بات کو اس وقت بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ٹال دیا۔

●

۲

سہ پہر کا وقت تھا۔ سائے طویل ہو گئے تھے۔ سڑکوں پر چھڑکاؤ شروع ہو گیا تھا۔ سلمان کہیں سے تھکا ہارا آ رہا تھا۔ راستے میں اس کی انو سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ گھر نزدیک تھا۔

وہ اصرار کر کے سلمان کو گھر لے آیا۔ ماں نے اندر بلا لیا۔

سلمان ان دنوں پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ مگر اس دفعہ وہ گھر نہیں گیا تھا۔ اُس کا باپ کسی بات پر اُس سے ناراض ہو گیا تھا۔ ہر ماہ کے اخراجات کے لیے جو رقم آتی تھی وہ بھی بند کر دی تھی۔ وہ پیسے پیسے کو محتاج ہو رہا تھا، اکثر فاقے بھی کرنا پڑتے۔ صحت خراب ہو گئی تھی۔

چہرہ بیماروں کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔

نوشا کی ماں نے جو اُس کی یہ حالت دیکھی تو تعجب سے پوچھا "کیا تم بیمار پڑ گئے تھے؟"

وہ صاف جھوٹ بول گیا "جی ہاں ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔"

وہ بولی "جب ہی تو میں کہوں کہ تم اُس روز کے بعد سے آئے کیوں نہیں"؟

سلمان، کہنے لگا: "کچھ تو امتحان کی مصروفیت رہی، اس کے بعد فرصت ہوئی تو اچانک بیمار پڑ گیا۔"

سلمان کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے جانے لگا تو نوشا کی ماں نے اُس کو روک لیا کہ کھانا کھا کر جانا۔ وہ تھی بھی کچھ باتونی عورت اور اُس روز تو اُس پر باتوں کا دورہ پڑا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں کے

قصے اُس کو سناتی رہی۔ سلمان خاموشی سے بیٹھا اُس کی باتیں سُنتا رہا۔

اس عرصہ میں کئی بار دروازے پر سلطانہ کی جھلک نظر آئی۔ سلمان جو ماں کی بے سر و پا باتوں سے اُکتا گیا تھا، سلطانہ میں دلچسپی لینے لگا۔ اب وہ ماں کی نظروں بچا کر اُس کی جانب بھی دیکھ لیتا۔

سلمان نے سوچا لڑکی خوبصورت ہے، الھڑ ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اُس کی ذات میں دلچسپی لے رہی تھی۔ یہ احساس خود اپنی جگہ کم کشش انگیز نہیں تھا اور ان دنوں تو وہ پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا اُس کو پناہ کی ضرورت تھی۔ ایک ذہنی فرار کی ضرورت تھی۔ کچھ یہی وجہ تھی کہ وہ کمرے کے اندر گرمی کے حبس کے باوجود دیر تک بیٹھا نوشا کی ماں سے باتیں کرتا رہا۔

دن ڈھلنے لگا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ نوشا کی ماں کسی ضرورت سے کمرے کے باہر چلی گئی کمرے میں وہ تنہا رہ گیا تھا اور اس تنہا کمرے میں سلطانہ کے جوان جسم کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اس مہک میں ایک لذت اور وارفتگی تھی، جس کو وہ چُپ چاپ بیٹھا محسوس کرتا رہا۔

شام کا دھندلکا اُفق کی سیڑھیوں سے اُترتا ہوا در و دیوار پہ پھیل گیا۔ گلی کی چہل پہل بڑھ گئی۔ گھروں کے اندر بچوں کا شور اُبھرنے لگا۔ موسم گرما کی یہ ایک ایسی شام تھی۔ جس کی لذت کو وہ صرف آوازوں سے محسوس کر رہا تھا۔ ان آوازوں میں سلطانہ کی بھی آواز تھی۔ وہ خواہ مخواہ اٹھلا اٹھلا کر بول رہی تھی، جیسے اس کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ کوئی اس کی آواز سُن رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا۔ کھانے میں خاصہ تکلف کیا گیا تھا۔ وہ صبح کا بھوکا تھا، کھانا اس کو پسند آیا اور اُس نے تعریف بھی کی۔ نوشا کی ماں اصرار کر کے اس کو ایک ایک چیز کھلاتی رہی۔

اس کی یہ شام بڑی مزے دار گذری۔

ایک روز ناغہ کر کے تیسرے دن وہ پھر وہاں پہنچا۔ نوشا کی ماں اس روز بھی بڑی محبت کے ساتھ پیش آئی۔ باتوں باتوں میں نوشا کے باپ کا ذکر آ گیا وہ ایک لمبی چوڑی داستان سنانے لگی۔ نہ جانے وہ کب تک اس قصے کو جاری رکھتی کہ اسی اثنا میں کسی نے آ کر اطلاع دی کہ ساتھ والی کوٹھی میں جو شیخ جی رہتے تھے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے گھر سے نوشا کی ماں کے دیرینہ مراسم تھے۔ وہ جذباتی ٹائپ کی عورت تھی۔

اس خبر کے سنتے ہی بدحواس ہوگئی۔ اُس نے سلمان سے بات بھی نہیں کی اور فوراً منشی جی مرحوم کے گھر کی طرف چل دی۔

کمرے میں اب سلمان کے پاس صرف نوشا رہ گیا تھا اور کمرے کے باہر سلطانہ تھی جو کھانا پکانے میں مشغول تھی۔ سلمان نوشا سے باتیں کرنے لگا۔ اب زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں تھا لہٰذا اس نے جانے کا ارادہ کیا تو سلطانہ نے خود دروازے پر آکر اُس سے کہا۔

"کھانا کھا کر جایئے گا۔ اماں تھوڑی دیر میں آجائیں گی"

وہ دروازے کی آڑ میں اس طرح کھڑی تھی کہ "صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں" والی بات تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ سلطانہ کی نگاہیں جُھک گئیں اور سلمان نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ نیاز آیا تھا۔ پہلے تو سلطانہ گھبرا گئی کہ کیا کرے۔ پھر اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ اُس کو گھر کے اندر نہ بلائے۔ اُس نے نوشا کو قریب بُلا کر کہا۔

"دولھا بھائی سے کہدو کہ اماں گھر میں نہیں ہیں، آپ رات کو آیئے گا، اس وقت تک وہ واپس آجائیں گی۔"

نیاز نے نوشا کی زبانی جو یہ بات سُنی تو تلملا کر رہ گیا۔ سلطانہ پر تو اس کو ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔ البتہ اس کی ماں پر اس کو سخت غصہ آیا۔ اُس نے سوچا کہ وہ گھر سے جاتے ہوئے سلطانہ کو منع کر گئی ہوگی۔ وہ جھنجھلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

نوشا جو ویسے باہر نکلنے کا بہانہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ اُس نے دیکھا موقعہ غنیمت ہے وہ بھی وہاں سے کھسک گیا۔ کمرے کے اندر سلمان تنہا رہ گیا تھا۔ اس تنہائی نے اس کو شدید بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ اس لئے کہ اب گھر کے اندر وہ دونوں اکیلے رہ گئے تھے۔ ان کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی اور اس دیوار میں ایک دروازہ تھا، جس کا ایک پٹ کھلا تھا۔ شام کی سنکی ہوئی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے کمرے کے اندر آرہے تھے لیمپ کی لَو بار بار بھڑک اُٹھتی۔

ایک بار سلطانہ دروازے کے سامنے سے گذری۔ دوبارہ پھر گذری۔ دونوں میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ کمرے کے اندر بھڑکتی ہوئی لیمپ کی لو جیسے بار بار کہہ رہی تھی۔

"کچھ ہونے والا ہے"

"کچھ ہو کے رہے گا"

اچانک گہری خاموشی میں شیشے کے ٹوٹنے کی آواز ابھری۔ سلمان چونک پڑا۔ کمرے کے باہر شیشے کا کوئی برتن گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ اُس کا چھناکا کچھ اس طرح گونجا کہ سلمان کو گھبرا کر پوچھنا پڑا۔

"کیا ہو گیا؟"

باہر سے سُلطانہ کی آواز اُبھری۔ "کچھ نہیں چوہوں نے طاق پر سے گلاس گرا دیا تھا"

"چوٹ تو نہیں آئی" سلمان نے اظہار ہمدردی کے طور پر کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور ہنسی کی آواز سُن کر سلمان کو اپنے سوال کے بے تُکے پن کا احساس ہوا۔

کچھ اور وقت خاموشی میں گذر گیا۔

سلمان نے اس عجیب سی خاموشی سے اکتا کر اونچی آواز میں کہا "یہ نوشا کہاں چلا گیا؟"

سلطانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ سلمان کو بڑی کوفت ہوئی۔

ذرا دیر بعد باہر قدموں کی آہٹ اُبھری۔ سلطانہ نے دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔ "آپ نے مجھ سے کچھ کہا تھا؟"

وہ بولا "جی ہاں! دیواروں سے تو میں باتیں کرنے سے رہا"

"ارے" وہ بے پرواہی سے ہنسنے لگی

سلمان کہنے لگا "اچھا تو اب میں چلوں گا" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

وہ شوخی سے بولی۔ "اکیلے کمرے میں آپ کو ڈر تو نہیں لگ رہا ہے؟"

کالج کا کھلنڈرا نوجوان شرارت پر اُتر آیا "بات تو کچھ ایسی ہی ہے"

اس دفعہ سلطانہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

سلمان کہنے لگا۔ اچھا تو ایسا کیجیے کہ آپ یہاں کمرے میں آکر بیٹھ جائیے اور میں کھانا تیار کرونگا"

وہ بولی "واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے"

"ایسا فرسٹ کلاس کھانا تیار کروں گا کہ آپ بھی کیا یاد کریں گی"

"کہاں سیکھا آپ نے؟"

وہ بولا۔ باقاعدہ امتحان پاس کیا ہے"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔ اچھا تو کھانا پکانے کا بھی امتحان ہوتا ہے"

سلمان نے کہا "بڑا سخت امتحان ہوتا ہے"

دونوں باتیں کرتے کرتے بالکل آمنے سامنے آگئے تھے۔ اچانک سلطانہ کو جو اس بات کا خیال آیا تو وہ دروازے کی اوٹ میں چھُپنے لگی۔ سلمان نے فوراً کہا۔

"اب کیا کیجیے گا پردہ کر کے"

وہ کہنے لگی "اونہہ ہونہہ" پھر اس نے بڑی معصومیت کے ساتھ کہا "اماں ناراض ہوں گی"

سلمان مسکرانے لگا "اُن کے سامنے پردہ کر لیا کیجیے۔ ٹھیک ہے نا" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل کر اُس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ سلطانہ نے ایکبارگی جو اُس کو اپنے روبرو دیکھا تو گھبرا کر بولی۔

"ہائے اللہ"

اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

سلمان کو اُس کی یہ ادا بھا گئی۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے سلطانہ کے شانے پر اپنا ہاتھ اس طرح رکھ دیا کہ جیسے وہ کوئی دہکتی ہوئی انگیٹھی تھی، جس سے اس کا ہاتھ جھُلس کر رہ جائے گا۔

سلطانہ کا تمام جسم لرز کر رہ گیا۔ سلمان نے جلدی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

ذرا دیر تک دونوں خاموش کھڑے رہے۔ سلمان کسی نامعلوم خوف سے گھبرا گیا۔ کہنے لگا "مجھے اب چلنا چاہیے" اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ اُس نے سلطانہ کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر کے باہر چلا گیا۔ سلطانہ سوچتی ہی رہ گئی کہ کیا کہے۔

سلمان، نوشی کے گھر سے نکلا تو ایک بارگی بھوک نے ستانا شروع کر دیا۔ آج بھی صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ نہ اس کی جیب میں کوئی پیسہ تھا اور نہ کہیں سے کوئی رقم ملنے کی امید تھی لے دیکے اس کے پاس ایک گھڑی تھی، جس کو وہ کئی روز سے فروخت کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

راستے میں نیاز کی دوکان پڑتی تھی۔ جب وہ اس کے سامنے سے گذرا تو جھجکتا ہوا دوکان کے اندر داخل ہو گیا۔

دوکان کے اندر دھندلی سی لالٹین روشن تھی اور اس کی پیلی پیلی روشنی میں نیاز خاموش بیٹھا تھا۔ اس کو دیکھکر بولا۔

"کہیئے"؟

سلمان گھبرایا ہوا تھا، کہنے لگا "میں یہ گھڑی فروخت کرنا چاہتا ہوں" اس نے گھڑی لے کر الٹ پلٹ کر دیکھی۔ کان کے پاس لے جاکر اس بات کا اندازہ لگایا کہ آیا گھڑی چل رہی ہے یا بند ہے۔ جب وہ اس کو اچھی طرح دیکھ بھال چکا تو کہنے لگا۔

"آپ ہی کی ہے؟"

سلمان کو اس بے تکے سوال پر حیرت بھی ہوئی۔ کچھ تاؤ بھی آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس سے کہدے "جی نہیں چوری کی ہے" مگر وہ وہاں جھگڑنے نہیں آیا تھا، گھڑی فروخت کرنے آیا تھا۔ اس نے صرف اس قدر کہا۔

جی ہاں میری ہی ہے"

نیاز طنزیہ طور پر مسکرایا "اگر آپ کی نہیں بھی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں"

سلمان تیزی سے بولا "جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں"

"آپ ناراض نہ ہوں۔ میں نے مان لیا کہ آپ ہی کی ہے"

سلمان نے کہا "تو آپ اُسے خریدنا چاہتے ہیں؟"

نیاز بڑی بے نیازی سے بولا "خرید لوں گا۔ ویسے عام طور پر میں ایسی چیزیں خریدتا نہیں۔ اس لئے

کہ یہ مشنیری کا معاملہ ہے اور اس میں بڑی چار سوبیس ہوتی ہے "

سلمان سوچنے لگا کہ عجیب نامعقول آدمی سے سابقہ پڑا ہے۔ اُلّو کا پٹھا خواہ مخواہ ایک کے بعد دوسرا الزام عائد کرتا جا رہا ہے۔ لیکن کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا اُس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"آپ مجھ پہ اعتبار کر سکتے ہیں" ؛

نیاز نے سلمان کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ پھر کہنے لگا "صورت سے تو آپ بھلے مانس لگتے ہیں"۔ لمحہ بھر تک وہ خاموش رہا۔ اس کی یہ خاموشی سلمان کو بے حد شاق گذری اُس کا جی چاہا کہ وہ گھڑی واپس لے لے اور اُس کو دو تین موٹی موٹی گالیاں دے کر چلا جائے۔ اسی اثنا میں نیاز نے کہا۔

"اچھا اب یہ بتائیے کہ آپ اس کا لیں گے کیا؟"

سلمان نے کہا "یہ امیگا واچ ہے۔ میں نے اس کو ۲۲۵ روپے میں خریدا تھا"

نیاز خالص کاروباری لہجہ میں بولا "۲۲۵ میں تو آپ نے اس کو خریدا تھا اور ۴،۵ سال سے اس کو استعمال بھی کر رہے ہیں۔ اس سے کم تو پرانی نہیں لگتی"؛

"جی ہاں، کوئی چار سال تو اس کو خریدے ہوئے ہو گئے"

وہ ہنس کر بولا "سمجھئے اس کی قیمت تو آپ نے وصول ہی کر لی"

سلمان نے جلدی سے کہا "نہیں صاحب"

نیاز نے بات کو زیادہ طول نہ دیا۔ اُس نے صاف معاملہ کی بات کہدی۔ "بہرحال میں تو اس کے ۵۰ روپے سے زیادہ نہ دوں گا۔ جی چاہے تو گھڑی رکھ جائیے اور روپے لیتے جائیے"

سلمان پچاس روپے پر گھڑی فروخت کرنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔

بڑی مشکل سے نیاز نے ۱۵ روپے اور بڑھائے۔ سلمان کو گھڑی بیچتے ہوئے دُکھ تو بہت ہوا مگر اس کے بغیر چارۂ کار بھی نہ تھا۔ اُس نے نیاز سے ۶۵ روپے لے کر جیب میں ڈالے اور دوکان سے باہر جانے کے لئے مڑا۔

چلتے چلتے نیاز نے ٹوک کر کہا "آئندہ بھی کسی چیز کو فروخت کرنے کا ارادہ ہو تو یہیں آ جایا کیجیے۔ انشاء اللہ دوسری جگہ کے مقابلہ میں آپ یہاں سے خوش جائیں گے۔"

سلمان نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "بہت اچھی بات ہے" اور دوکان سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔

رات سہانی تھی۔ اور سلمان کی جیب میں ۶۵ روپے پڑے تھے۔ عرصے سے دبی ہوئی خواہشیں ایکبارگی جاگ اٹھیں۔ وہ سیدھا ایک بار کے اندر گیا۔ وہاں اس نے بیئر کی دو بوتلیں پیں۔ ہوٹل میں ڈٹ کر کھانا کھایا اور ایک دوست کے گھر چلا گیا۔ حسب معمول وہاں رمی ہو رہی تھی۔ سلمان بھی جا کر شامل ہو گیا۔

سنیچر کی رات تھی۔ دوسرے دن اتوار کی چھٹی تھی۔ اس لیے تمام رات کھیل ہوتا رہا۔ اس روز سلمان کا ستارہ عروج پر تھا۔ جیسے کارڈ اس نے چاہے ویسے ہی لے۔ دو آنے پوائنٹ سے کھیل ہو رہا تھا۔ سلمان نے بیٹھتے کے ساتھ ہی وارے نیارے کر دیئے۔

جب وہ وہاں سے اٹھا تو مسجدوں میں اذانیں ہو رہی تھیں۔ ہر طرف سرمئی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ سلمان کی جیب میں کچھ اوپر تین سو روپے تھے اور آنکھیں شب بیداری کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ تمام دن وہ اپنے اس کمرے میں پڑا بے خبر سوتا رہا جس کی ہر چیز اس کی زندگی کی طرح بے ترتیب تھی۔ دن ڈھلے وہ نوشا کے گھر کی طرف جانے کے ارادہ سے نکلا، راستے میں اکبر مل گیا۔ وہ اس کا بے تکلف دوست تھا۔ دونوں نے بار میں جا کر کئی گلاس بیئر کے پیئے اور وہیں یہ پروگرام بنا کہ کسی اچھی سی طوائف کا گانا سنا جائے۔

دونوں نے کئی بالاخانوں کے چکر کاٹے، آخر ایک گانے والی اُن کو پسند آئی۔ گانا تو وہ کچھ واجبی سا جانتی تھی مگر آواز ایسی پیاری تھی جیسے کوئل کوک رہی ہو۔ سن بھی زیادہ نہیں تھا۔ اداؤں میں الھڑپن تھا۔ ایک ایک بول کے ساتھ یوں بھاؤ بتاتی تھی کہ آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ جاتی۔ سلمان کو وہ سانولی سلونی طوائف کچھ اس قدر بھا گئی کہ وہ کئی گھنٹے تک بیٹھا گانا سنتا رہا۔

شروع میں کچھ دوسرے تماش بین بھی وہاں موجود تھے۔ مگر رفتہ رفتہ سب چلے گئے۔

اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی۔ محفل اپنے شباب پر تھی۔

سلمان کی فرمائش پر طوائف ایک ٹھمری گا رہی تھی۔

"تم بن نا ہیں آوت چین"

اب اُس نے پیروں میں گھونگھرو باندھ لیے تھے اور آہستہ آہستہ ناچتی بھی جا رہی تھی۔ ٹھمری کے بول اونچے اٹھتے گئے۔ ناچ تیز ہوتا گیا۔ سلمان جھوم جھوم کر ٹھیکہ دے رہا تھا اور طوائف کا جسم یوں لچک رہا تھا کہ سلمان کو بار بار پہلو بدلنا پڑتا۔ وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لہراتی ہوئی جب اس کے قریب آتی تو وہ بیتاب ہو کر گہری سانس بھرتا اور جھک کر اکبر کے کان میں کہتا۔

"یار ہم تو قتل ہو گئے"

"سالی بڑی زوردار لونڈیا ہے"

مین اس وقت جب ناچ اور ٹھمری کے پھڑک دار بولوں نے سلمان کو وارفتہ کر دیا تھا اور وہ بے قابو ہو کر چیخ پڑتا۔

"ہائے کیا بات ہے؛ میری جان"

"جیو"

"ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں"

اچانک دروازے پر ایک بھدا سا آدمی نمودار ہوا۔ اس کی گھنی مونچھیں تھیں۔ آنکھیں اُلّو کی طرح گول گول تھیں۔ لباس ڈھیلا ڈھالا تھا۔ وضع قطع سے وہ بھڑوا لگتا تھا۔ اندر آ کر اُس نے دونوں کو دیکھا اور گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ سلمان بھی اُس کو دلال سمجھا۔ کہنے لگا۔

"اماں کچھ شراب وراب کا بھی بندوبست کراؤ گے"

اُس نے سلمان کی جانب تیکھی نظروں سے دیکھا اور طوائف سے ڈانٹ کر کہنے لگا "بند کر جی یہ ناچ واچ۔ بس ہو چکا مجرا"

طوائف نے فوراً ناچ بند کر دیا اور ہاتھ سر پہ ہاتھ دھر کر ایک طرف کھسک کر بیٹھ گئی۔

سازندے بھی خاموش ہو گئے۔ سارنگیا سارنگی پر غلاف چڑھانے لگا اور طبلچی ہتھوڑی لے کر طبلوں کو ٹھونکنے لگا۔ سلمان کو سخت طیش آیا۔ وہ ۵۰۰ روپے سے زائد خرچ کر چکا تھا اور اب جبکہ محفل رنگ پر آئی تھی تو اس نامعقول آدمی نے جو ہر طرف سے بھڑوا لگتا تھا، رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ سلمان اس سے کہنے لگا۔

"آپ یہاں کے چودھری ہیں؟"

اس آدمی نے سگرٹ کا لمبا سا کش لگا کر بڑے نخرے سے کہا "جی نہیں ہزار روپیہ مہینہ دیتا ہوں۔ یہ ملازم ہے میری۔ کیا سمجھے آپ"

سلمان موڈ میں تھا۔ کہنے لگا "بہت سستا سودا کر لیا۔ یہاں تو صرف رات بھر کے ہزار روپے دینے کا ارادہ تھا"

وہ کہنے لگا "آپ لوگوں کا ایندھن کا ٹھیکہ تو نہیں ہے؟"

اس شخص نے تو سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی مگر سلمان سمجھا کہ وہ چوٹ کر رہا ہے۔ فوراً بولا۔

"آپ بتا سکتے ہیں کہ آج کل کوئلہ کا کیا بھاؤ ہے؟"

اس شخص کا رنگ کالا تھا۔ تلملا کر بولا "دیکھئے صاحب میں یہاں اس قسم کی بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتا"۔

سلمان نے کہا "رنڈی کے کمرے پر تمیز تو لکھنؤ کے نوابوں کے صاحبزادے سیکھا کرتے ہیں۔ ہم تو رہے سیلکھنڈی ٹھہرے"

وہ جل کر بولا "آپ روہیلکھنڈی ہوں یا ہمند یلکھنڈی۔ بس اب آپ شرافت کے ساتھ یہاں سے تشریف لے جائیں"۔

اکبر جو اب تک خاموش بیٹھا تھا بیچ میں بول پڑا "ورنہ؟"

اس آدمی نے اس کی بات کا تو کوئی جواب نہ دیا۔ اونچی آواز سے پکارنے لگا۔

"ابے جھلرو، کہاں مر گیا ذرا یہاں تو آ"

ذرا دیر بعد ایک لحیم شحیم آدمی کمرے کے اندر آ گیا۔ اُس نے آتے کے ساتھ ہی پوچھا۔

"کیا حکم ہے سیٹھ جی، ذرا سُلفے پر دم لگا رہا تھا"

وہ شخص جھلرو سے کہنے لگا۔ "کمرہ خالی کرا کے دروازہ بند کر دو۔ یہ دونوں آدمی رنگ بازی کر رہے ہیں"

جھلرو نے ان دونوں کو بغور دیکھا "چلو جی بڑھاؤ ٹٹو۔ اب گانا وانا نہیں ہوگا"۔

سلمان کو اس کی بدتمیزی پر غصہ آ گیا۔ ڈانٹ کر بولا "ٹھیک سے بات کرو"

وہ بولا "سیدھی طرح جاؤ گے یا کچھ لے کر"

یہ کہہ کر اُس نے لپک کر سلمان کا بازو پکڑا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اُس کو کھڑا کر دیا۔ سلمان نے گھبرا کر طوائف کی جانب دیکھا، وہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

سلمان سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ جھلرو نے اپنے مضبوط ہاتھ سے اُس کی گردن کو دبوچ لیا اور دروازے کی جانب لے چلا۔ سلمان نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، مگر اُس کی گرفت سے نہ چھوٹ سکا۔ جھلرو نے دروازے پر لے جا کر اُس کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا سڑک پر آ گیا۔

سلمان ذرا دیر تک سڑک پر دم سادھے پڑا رہا۔ سب کچھ اس قدر اچانک پیش آیا تھا کہ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو گیا۔ فوراً ہی اُس کو اکبر کا خیال آ گیا، اسی وقت اکبر آ کر اُس کے اوپر دھم سے گرا۔ دونوں لڑکھڑا کر ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔

ذرا دیر بعد انھوں نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے۔ خیریت یہ ہوئی کہ ہڈی پسلی نہیں ٹوٹی۔ صرف جسم پر کہیں کہیں خراشیں آ گئی تھیں۔ اکبر کی گھٹنے پر سے پتلون بھی پھٹ گئی تھی۔

سلمان کہنے لگا "سالے کے ہاتھ لوہے کے بنے ہوئے تھے"۔ اکبر کھسیانا ہو کر بولا "یار بڑی بے عزتی ہوئی"

سلمان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ہاتھ کی کہنی کو دیکھنے لگا، جس پر چوٹ لگ گئی تھی۔

کچھ دیر وہاں ٹھہر کر دونوں چپ چاپ آگے بڑھ گئے۔

۳

ہفتہ بھر بعد!

سلمان اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس نے اٹھکر دروازہ کھولا۔ دن ڈھل چکا تھا۔ دھوپ مکانوں کی اونچی منڈیروں کو چوم رہی تھی۔ سائے جھک گئے تھے اور ان جھکے ہوئے سایوں میں، دروازے کے پاس "دلربا ریسٹورنٹ" کا مالک روشن خاں کھڑا تھا۔ سلمان اُس کو دیکھتے ہی گھبرا گیا۔

روشن خاں نے بلا کسی تمہید کے کہا "مسٹر آج ہمارا حساب بے باق ہو جانا چاہیئے"۔

اُس کے تیور دیکھکر سلمان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ یہ طے کر کے آیا ہے کہ روپے لئے بغیر واپس نہیں جائے گا۔ اور اُس کی حالت یہ تھی کہ پاس کھوٹا پیسہ تک نہ تھا۔ رات وہ جوئے میں سب کچھ ہار آیا تھا اور فجر کے وقت سے اب تک پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس بلا کو کس طرح ٹالا جائے۔ اُس نے خوشامد کا پہلو اختیار کیا، بے تکلفی سے بولا۔

"خاں صاحب کیا کسی سے لڑ کر آ رہے ہو؟"

وہ بغیر کسی مسکراہٹ کے بولا "نہیں مسٹر ہم دوکان دار آدمی کس سے جھگڑا کر سکتے ہیں"۔

اس دفعہ سلمان نے اظہار ہمدردی کا سہارا لیا "تو پھر کچھ طبیعت خراب ہو گئی۔ دیکھکر تو یہی پتہ چلتا ہے"۔

"گرمی کے دن ہیں جی۔ آج کل طبیعت کا معاملہ بس گڑبڑ ہی رہتا ہے"

اُس کے تیور مدہم پڑتے جا رہے تھے اور وہ ایک جھنجھلاتے ہوئے قرض خواہ کے بجائے عام آدمی نظر آنے لگا تھا۔ سلمان اُس کو اسی عالم میں دیکھنا چاہتا تھا۔ لاپرواہی سے بولا۔

"خان صاحب گھر سے ابھی میرا خرچہ نہیں آیا۔ کل پرسوں تک منی آرڈر آ جائے گا تو آپ کا بل فوراً ادا کر دوں گا" یہی بات وہ دو ہفتے پہلے بھی کہہ چکا تھا اور پرسوں رات کو چائے پیتے ہوئے بھی یہی بات کہہ کر وہ اس کو صاف چرکا دے گیا تھا۔ اس لئے بات کچھ بنی نہیں۔

روشن خاں ایک بارگی بھڑک اٹھا۔ آنکھیں نکال کر بولا۔

"مسٹر! اس طرح کام نہیں چلے گا۔ حساب آج صاف کرنا ہو گا اور ابھی"

اس دفعہ وہ اس قدر اونچی آواز سے بولا کہ کئی راہگیر راستہ چلتے چلتے ٹھٹک کر رک گئے

سلمان پریشان ہو کر بولا "اماں دروازے پر کھڑے کیوں چیخ رہے ہو اندر آ جاؤ"

وہ کہنے لگا "بس جی میں یہیں ٹھیک ہوں"

سلمان نے پھر مسکہ لگایا "خاں صاحب تم ضرور کسی سے لڑ کر آ رہے ہو" اس نے خواہ مخواہ مسکرانے کی کوشش کی۔ "کچھ ایسی ہی بات معلوم ہوتی ہے۔ بیگم صاحبہ سے لڑ کر آ رہے ہو"

روشن خاں کو جس نے بیراگیری کرتے کرتے خود اپنا چائے خانہ بنا لیا تھا، اپنی بیوی کے لئے بیگم صاحبہ جیسا معزز لفظ کچھ عجیب سا لگا۔ بہرحال اسے خوشی ضرور ہوئی۔ اس دفعہ وہ مسکرا کر بولا۔

"وہ تو میکے گئی ہے۔ لڑوں گا کس سے" یہ بات اُس نے اپنی بیوی کے بارے میں کہی تھی۔

سلمان کو موقعہ مل گیا۔ ہنس کر بولا۔ "یاد ستا رہی ہو گی"

روشن خاں اپنے بدوضع دانت نکال کر ہنس پڑا۔ سلمان کی جان میں جان آئی۔ اُس نے اصرار کر کے روشن خاں کو کمرے کے اندر بلا کر بٹھایا اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔

اس طرح اس کو کچھ روز کی اور مہلت مل گئی۔ مگر آج کی باتوں سے اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر جلد ہی روشن خاں کو کچھ نہ دیا گیا تو وہ کوئی نہ کوئی بدتمیزی کر بیٹھے گا۔ جب روشن خاں کمرے سے باہر

چلا گیا تو اُس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور تھکا ہوا سا کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ خالی معدے کے اندر چوہے فری اسٹائل کشتی کی پریکٹس کر رہے تھے۔ اچانک اُس نے سگرٹ کی طلب محسوس کی۔ سگرٹ کبھی موجود نہیں تھی۔ البتہ کمرے کے ایک کونے میں سگرٹوں کے کئی خالی ڈبے اور مختلف برانڈ کے پیکٹ پڑے تھے۔ فرش پر جگہ جگہ سگرٹوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اُس نے ایک آدھ جلی سگرٹ فرش پر سے اٹھا کر سلگائی کش لگانے ہی کلیجہ سلگنے لگا۔ جھنجھلا کر اُس نے سگرٹ پھینک دی اور غصے سے اس کو مسل ڈالا۔

کچھ دیر تک وہ بت کی مانند ساکت بیٹھا سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ سوچتے سوچتے اُس کی نظر میز پر رکھے ہوئے تھرماس پر پہنچ گئی۔ پچھلے سال وہ اس کو گھر سے لایا تھا۔ ماں نے یہ سوچ کر کہ سفر میں اس کو تکلیف نہ ہو، برف بھروا کر یہ تھرماس ساتھ کر دیا تھا۔ وہ خوابناک نظروں سے اس کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے اٹھ کر کپڑے تبدیل کئے اور تھرماس کو اخبار میں لپیٹ کر باہر آ گیا۔

نیاز کی دوکان اُس کے گھر سے دور تھی۔ تھرماس لے کر اتنی دور پیدل چلنا اُس کو کھل رہا تھا۔ بھوک کی نقاہت اس کو اور بھی نڈھال کئے دے رہی تھی۔ جب وہ نیاز کی دوکان پر پہنچا تو اُس کا گلا خشک پڑ گیا تھا اور سانس بوجھل ہو گئی تھی۔ حیرت ہوئی کہ وہ اس وقت دوکان پر موجود تھا۔

نیاز نے اُس کو دیکھتے ہی کہا "کہیے آج ادھر کیسے بھول پڑے؟"

اس کی یہ بے تکلفی سلمان کو اچھی نہ لگی۔ وہ کوآپریٹو سوسائٹی کے رجسٹرار کا بیٹا تھا کسی کباڑیے کا اس طرح بے تکلفی سے بات کرنا اس کے نزدیک انتہائی معیوب بات تھی اُس نے نیاز کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی کے ساتھ تھرماس پر سے کاغذ علیحدہ کیا اور اُس کے سامنے رکھ دیا۔ تھرماس بالکل نیا تھا۔ نیاز نے حیرت سے کہا۔

"بیچنے لائے ہو"

سلمان نے گردن ہلا دی "جی ہاں!"

نیاز نے تھرماس اُٹھایا۔ گھما پھرا کر اندر باہر سے دیکھا اور سلمان سے کہنے لگا "اپنا ہی ہے نا؟" یہ بات اُس نے ایک آنکھ دبا کر رازدارانہ طور پر کہی۔

سلمان جل کر بولا "دیکھیے آئندہ آپ مجھ سے ایسی بات نہ کہیں"

نیاز بے باکی سے ہنسنے لگا "ارے بھئی آپ تو بُرا مان گئے۔ اچھا یہ بتایئے کہ اس کا کیا دیدوں"؟

سلمان بولا "جو آپ مناسب سمجھیں"

نیاز کہنے لگا "یہ کیا بات ہوئی، میں کہوں کہ آپ مجھے مفت دیدیں تو آپ دیدیں گے؟"

سلمان بھی موڈ میں آگیا "آپ مانگ کر تو دیکھیں، مفت بھی دیدوں گا"

خوبصورت چہرے والے سلمان کی یہ بات نیاز کو بڑی اچھی لگی۔ خوش ہو کر بولا "بھئی بزنس کی بات تو بعد میں ہوگی آپ پہلے چائے پئیں گے" یہ کہہ کر اُس نے گردن بڑھا کر چائے خانے کے بیرے کو آواز دی۔ جب وہ دوکان کے اندر آگیا تو نیاز اس کو چائے اور پیسٹری لانے کا آرڈر دینے لگا۔ سلمان تکلفاً انکار کرنے لگا۔ مگر نیاز نے ایک نہ سنی۔ گردن اکڑا کر بولا۔

"واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے" پھر اُس نے بیرے کو ڈانٹ کر کہا "ابے منہ کیا تک رہا ہے۔ جا جلدی سے ایک سٹ چائے لے کر آ۔ پیسٹری تازہ لانا۔ سویرے کا مال نہ لانا۔ شیخ جی سے بولنا، بیکری سے جو ابھی مال آیا ہے، اس میں سے بھیجیں ورنہ ایک پیسہ نہ دوں گا۔"

بیرا چلا گیا۔

ذرا دیر بعد وہ چائے لے کر آگیا۔ نیاز نے اپنے ہاتھ سے اس کو چائے بنا کر پلائی اور اصرار کر کے تازہ تازہ پیسٹریاں کھلائیں۔ اس خاطر و مدارات میں نیاز کی کوئی غرض وابستہ نہ تھی۔ بات صرف اس قدر تھی کہ چھریرے جسم والا، خوبصورت شکل اور وضع قطع سے تعلیم یافتہ نظر آنے والا، سلمان اس کو بہت اچھا معلوم ہوا تھا۔ چائے پیتے پیتے اچانک اُس نے سلمان سے پوچھا۔

"آپ مجھ کو کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں"

سلمان نے صاف بات کہی "پریشان نہ ہوتا تو پھر یہ تھرماس لے کر یہاں کیوں آتا"؟

نیاز کو ایکبارگی اس پر ترس آگیا۔ بڑی شفقت سے بولا "کتنے روپے کی ضرورت ہے؟"

سلمان اس کے احساسات کا اندازہ نہ لگا سکا، کہنے لگا "اس تھرماس کی آپ جو قیمت لگائیں۔"

نیاز بے تکلفی سے بولا "بھئی حد ہوگئی۔ اماں، تھرماس گیا ایسی کی تیسی میں۔" اس نے جیب سے ۵۰ روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ "لو اس سے کام چل جائے گا۔"

سلمان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ سوچنے لگا آخر ماجرا کیا ہے۔ یہ کباڑیہ ایک بارگی اس پر اس قدر مہربان کیوں ہو گیا ہے۔ اس کو خاموش دیکھ کر نیاز نے فوراً کہا "اماں پہلے ان کو جیب میں تو رکھو۔"

سلمان نے روپے لے لئے۔ نیاز کہنے لگا۔

"یہ تھرماس جی چاہے تو لیتے جاؤ"

سلمان نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟"

نیاز نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہا "یار ہم تو شرافت پر جان دیتے ہیں۔ یہ پیسہ سالا تو ہاتھ کا میل ہے۔ ادھر آیا ادھر گیا۔ سچ پوچھو تو اس روز بھی میں تمھاری گھڑی نہ رکھتا۔ پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ پہلا سابقہ ہے تم نہ جانے کیا سوچو۔ یہ زمانہ سالا بہت خراب ہے" حالانکہ یہ بات اس نے بالکل جھوٹ کہی تھی۔ اس دن اس نے کوئی ایسی بات نہیں سوچی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ گھڑی کے ۱۲ روپے سے زائد نہ دیتا۔ مگر آج اس کا رویہ بالکل مختلف تھا۔

سلمان اس کی باتوں سے بڑا متاثر ہوا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ جس شخص کو وہ بے حد گھٹیا اور کائیاں سمجھ رہا تھا، وہ تو بڑا اچھا آدمی نکلا مگر وہ اب اس سے کہے تو کیا کہے۔ بہرصورت وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔

"تھرماس آپ اپنے پاس رہنے دیں۔ میں آپ کے روپے دے کر اس کو لے جاؤں گا۔"

نیاز خواہ مخواہ کی خفگی کا اظہار کرنے لگا "یار اب تم دل نہ توڑو۔ دوستوں کا حساب دل میں رہتا ہے یہ لینا دینا تو چلتا ہی رہے گا۔" وہ ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہوتا جا رہا تھا اور سلمان کو اس کی یہ بے تکلفی اب ذرا بھی بری نہ لگی۔ وہ دیر تک بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا۔

شام ہو گئی، نیاز نے لالٹین جلائی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ سلمان دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے دوکان سے باہر آ گیا۔ لیکن جس وقت وہ دوکان کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا اسی وقت نوشا بھی وہاں

پہنچ گیا۔ اُس نے سلمان کو دیکھا تو ٹھٹک کے رہ گیا سلمان کی اس پر نظر نہ پڑی۔ نوشا چاہتا بھی یہی تھا۔ جیسے ہی سلمان آگے بڑھا، نوشا جھٹ سے دوکان کے اندر داخل ہو گیا۔

اس روز نوشا خالی ہاتھ آیا تھا اور اس ارادے سے آیا تھا کہ نیاز سے ایک روپیہ اُدھار مل جائے تو اچھا ہے۔ اُس دن اُس نے راجہ اور شامی کے ساتھ سینما دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر جب اُس نے یہ بات نیاز سے کہی تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ بڑے روکھے پن سے بولا۔

"جب کچھ پاس ہوا کرے تب ہی یہاں آیا کرو۔"

نوشا خوشامد کرنے لگا "کل میں ضرور کچھ نہ کچھ لے کر آؤں گا بس آج ایک روپیہ دیدو۔"

وہ بگڑ کر بولا "بس ایک بار کہہ دیا، خواہ مخواہ جان نہ کھا۔"

نوشا ذرا دیر چپ چاپ گردن لٹکائے بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر چل دیا۔ لیکن جب وہ دروازے پر پہنچا تو پیچھے سے نیاز کی آواز آئی "ابے اب چلا ہی جائے گا۔"

نوشا نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔ نیاز بیٹھا بے تکلفی سے مسکرا رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے نوشا کو اپنے قریب بلایا۔ وہ پالتو کتے کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے پاس پہنچ گیا۔ نیاز کہنے لگا۔

"سینما کے لئے روپیہ چاہیئے ہے نا؟"

نوشا نے انکار نہ کیا، گردن ہلا کر بولا "ہاں!"

نیاز نے ایک ہی سانس میں اس کو کئی گالیاں دے ڈالیں۔ پھر جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا "لے، مگر یاد رکھنا سالے یہ سینما کی چاٹ تجھکو تباہ کر دے گی۔"

نوشا نے چپ چاپ روپیہ اٹھا لیا۔ نیاز تیوری پر بل ڈال کر بولا "دیکھ کل کچھ نہ کچھ لے کر ضرور آنا ورنہ سالے خاں ایک پیسہ بھی نہ دوں گا۔"

وہ گردن جھکا کر خوش خوش باہر چلا گیا۔

سڑک عبور کر کے نوشا گلی کی طرف مڑ گیا میونسپلٹی کی لالٹین روشن ہو چکی تھی مگر وہاں راجہ موجود نہیں

تھا قریب ہی ایک مکان کے چبوترے پر شامی اکیلا بیٹھا تھا۔ اُس کی قمیص کا گریبان پھٹ گیا تھا اور نچلے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا، جس کو وہ بار بار آستین سے پونچھ رہا تھا آستین پر جگہ جگہ خون کے لال لال دھبے نظر آ رہے تھے۔

نوشا کو آتے دیکھ کر شامی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اور خاموشی کے ساتھ ہونٹ سے رستا ہوا خون آستین سے پونچھنے لگا۔ نوشا نے قریب جا کر گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"ابے کیا ہو گیا۔ ابا نے مارا ہے؟"

اُس نے گردن ہلا دی "نہیں"

نوشا نے جلدی سے پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

شامی نے منہ سے تو کچھ نہ کہا البتہ اُس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔ وہ سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ نوشا اور گھبرا گیا۔ ڈانٹ کر بولا۔

"ابے کچھ منہ سے تو بول کہ ہوا کیا؟"

شامی بھرائی ہوئی آواز سے بولا "اس سالے ڈاکٹر موٹو کے لڑکے اور نوکر نے مل کر مارا ہے" اتنا کہہ کر وہ اور بھی زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ نوشا نے کہا۔

"اچھا تو وہ سالا لھو ریا تھا۔ وہ تو ایک نمبر کا حرامی ہے، پر تو ان سے کہاں ٹکر گیا،

شامی سسکیاں بھر کر کہنے لگا "اماں بات کچھ بھی نہیں تھی ایسی۔ دوپہر کو میں دوکان سے کھانا کھانے کے لئے گھر آ رہا تھا تو بڑے میدان میں مل گیا۔ کہنے لگا آ و گلی ڈنڈا کھیلیں پہلے تو یہی بدمعاشی کی کہ داؤں اپنا رکھا، پھر دیر تک دھوپ میں پدایا۔ جب میری باری آئی تو کہنے لگا کہ داؤں نہیں دوں گا میں نے کہا میں تو داؤں لئے بغیر جانے نہ دوں گا۔ کیوں ٹھیک بات کہی نا میں نے" اُس نے بیچ میں نوشا سے سوال کر ڈالا۔

نوشا بولا "بالکل ٹھیک بات تھی۔ ہاں پھر کیا ہوا"؟

شامی بتانے لگا "بس سالے نے چھوٹتے ہی ناک پر گھونسا مارا۔ خدا قسم میرے آنسو نکل آئے۔

بس مجھے تاؤ آگیا۔ سائے کو اٹھا کر دھوں سے وہیں دے مارا۔ روتا ہوا چلا گیا۔ اب شامو کو اپنے تو کر کو
ے کر آیا تھا، دونوں کے پاس اسٹکیں تھیں"۔

نوشا نے حیرت سے کہا "اچھا تو سائے اسٹکیں لیکر آئے تھے؟"

"ہاں جی۔ آتے ہی مارنا شروع کر دیا"

نوشا ایکبارگی جوش میں آگیا "ان کی تو ایسی کی تیسی۔ آخر سمجھا کیا ہے۔ تو یہ داد نہ کر سالوں
کو گھر میں گھس کر نہ مارا تو نام نہیں"۔ شامی کا سارا دکھ اڑن چھو ہو گیا۔ جلدی سے بولا۔

"راجہ کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں"

نوشا نے کہا "ہاں اس کو بھی لے لو۔ مگر وہ آیا کیوں نہیں؟"

"پتہ نہیں، کیوں نہیں آیا اب تک"

نوشا نے مشورہ دیا "چلو پہلے اس کو ڈھونڈلیں"

شامی جھٹ سے چبوترے پر سے نیچے اتر آیا۔ دونوں راجہ کی کھولی کی جانب چل دیئے۔ راجہ
خلاف معمول دروازے پر منہ لٹکائے گم سم بیٹھا تھا اس کے قریب ہی لکڑی کی ایک بھدی سی گاڑی پڑی
تھی، جس کے اندر وہ بوڑھے گداگر کو بٹھا کر کچہری پر جایا کرتا تھا۔ کھولی کے اندر گہری تاریکی پھیلی تھی۔
اس پس منظر کے ساتھ دھندلی دھندلی روشنی میں راجہ سائے کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔
دونوں نے اس کو افسردہ دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ نوشا سمجھا کہ راجہ بھی کہیں سے لڑ جھگڑ کر
آیا ہے۔ قریب جا کر بولا "ابے یہ رونی صورت بنائے کیوں بیٹھا ہے"
راجہ نے کوئی جواب نہ دیا اسی طرح منہ لٹکائے بیٹھا رہا۔ نوشا نے جیب سے روپیہ نکال کر ٹن
سے بجایا "بول کیا کھاتا ہے؟"

اس دفعہ وہ بیزاری سے بولا "یار پریشان نہ کر۔ اپنا یوں ہی ڈبا گل ہو رہا ہے"

شامی بیچ میں بول پڑا "استاد سے جھگڑا ہو گیا؟"

"نہیں یار استاد بے چارے کو تو پولیس والے پکڑ کر لے گئے"

راجہ کی زبان سے یہ بات سن کر دونوں چونک پڑے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُس کو انسدادِ گداگری کے قانون کے تحت گرفتار کر کے سرکاری محتاج خانے بھیج دیا گیا ہے۔ راجہ یہ باتیں کہتے کہتے بہت اُداس ہو گیا۔ اس لئے کہ بڈھے گداگر کے گرفتار ہو جانے سے اس کی آمدنی کا ذریعہ اچانک بند ہو گیا تھا۔

وہ دونوں جس ارادے سے وہاں آئے تھے، راجہ کو غمگین دیکھ کر اس کا ذکر بھی نہ کیا۔ سینما جانے کا پروگرام بھی منسوخ ہو گیا۔ تینوں نے مسلم ہوٹل میں جا کر چائے پی اور دیر تک اس بات پر غور کرتے رہے کہ راجہ کو اب کیا کام کرنا چاہیے۔

رات گئے جب اُن کی محفل برخاست ہوئی تو نوشا نے وعدہ کیا کہ وہ اُس کو اپنے کارخانے میں کام دلانے کے لئے حاجی خیر سے بات کرے گا۔ مگر نوشا کی کوئی کوشش کام نہ آئی اور راجہ کئی کئی وقت کے فاقے کرنے لگا۔ اُس نے بھیک مانگنے کی کوشش کی تو ایک روز پولس کے ہتے چڑھ گیا۔ اُنھوں نے دوسرے گداگروں کے ساتھ اُس کو بھی مویشیوں کی طرح ہانک کر پولیس کی لاری میں بند کر دیا۔ یہاں راجہ کا تدبر بڑا کام آگیا۔ ہوا یہ کہ جب سب گداگروں کو تھانے کے احاطے میں لاری سے اُتارا گیا تو راجہ سب کی نظریں بچا کر لاری کے نیچے دبک گیا اور موقعہ لگتے ہی احاطہ کی دیوار پھاند کر ایسا رفو چکر ہوا کہ پولیس کے کانسٹبل دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔

کئی روز تک وہ اپنی کھولی میں پولیس کے ڈر سے چھپا رہا۔ نوشا اور شامی آجاتے تو پیٹ بھرنے کا سہارا ہو جاتا۔ شامی ان دنوں ذرا دیر سے آتا تھا۔ وہ آتے کے ساتھ ہی قمیص کے اندر چھپی ہوئی روٹیاں نکالتا اور راجہ کے سامنے رکھ دیتا۔ یہ روٹیاں وہ گھر سے چرا کر لاتا تھا۔ نوشا کو جس روز نیاز سے کچھ رقم مل جاتی تو وہ ہوٹل سے سالن منگوا دیتا ورنہ راجہ کو روکھی روٹیوں پر ہی گزارہ کرنا پڑتا۔

ان دنوں نوشا قریب قریب ہر روز کارخانے سے کچھ نہ کچھ اڑا لاتا اور سیدھا نیاز کے پاس پہنچتا۔ مگر روز روز کی چوری سے کارخانے میں جلد ہی کھلبلی پڑ گئی۔ عبداللہ مستری چیخ چیخ کر سارے کاریگروں کو گالیاں دیا کرتا۔ پھاٹک پر ہر کاریگر کی سختی کے ساتھ تلاشی ہونے لگی مگر نوشا اپنے کام میں ایسا منجھ گیا تھا کہ وہ چوکیدار کی آنکھوں میں دھول جھونک کر صاف نکل جاتا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ اُس کے ہتھے کوئی پُرزہ یا اوزار نہ چڑھا۔ لہٰذا اُس نے موقعہ ملتے ہی پتیل کا کچھ تار اٹھا کر ایک پُرانی موٹر کی سیٹ کے پیچھے چھپا دیا۔ کار نے میں چھٹی ہونے سے کچھ دیر پہلے اُس نے کاریگروں کی نظریں بچا کر تار کو قمیص کے اندر چھپایا اور جھٹ سے پیشاب خانہ میں گھس گیا۔ دروازہ بند کیا اور پاجامہ اُتار کر تار کو ران سے باندھا اور باہر آ گیا۔ سیر سوا سیر کا وزن تھا۔ چلنے میں قدم ٹھیک سے نہ پڑتے تھے۔ وہ لنگڑاتا ہوا پھاٹک سے گذرا تو پٹھان چوکیدار نے اُس کو مشتبہ نظروں سے دیکھ کر ٹوکا۔

"خو تم کیسا چلتا ہے۔ تمہارا ٹانگ میں کیا ہو گیا؟"

نوشا نے جلدی سے چہرے پر تکلیف کے اثرات پیدا کئے اور بُرا سا منہ بنا کر بولا "لالہ بڑا درد ہو رہا ہے۔ سالا پورا راڈ آ کر ٹانگ پر گر پڑا تھا" یہ کہتا ہوا وہ پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

گھبراہٹ میں اُس نے جلدی چلنے کی کوشش کی تو ایک بار گی لڑکھڑا کر اس طرح پھاٹک کے سامنے گرا کہ پتیل کے تار کا لچھا پاجامے کے اندر سے نکل کر باہر آ گیا۔ چوکیدار اُس کو برابر دیکھ رہا تھا۔ فوراً اُس کی نظر تار پر پڑ گئی۔ وہ لپک کر اُس کے قریب پہنچ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا۔

"چوری کرتا ہے بولتا ہے ٹانگ میں درد ہے"

اُس نے ہاتھ بڑھا کر نوشا کی گردن اپنے چوڑے چکلے ہاتھ میں دبوچ لی اور چیخ کر بولا۔

"خو چھ اب سیٹھ کے پاس چلو"

نوشا گڑگڑانے لگا مگر چھ فٹے پٹھان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اس کو گھسیٹتا ہوا پھاٹک کے اندر لے گیا۔

عبداللہ مستری اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا شراب سے شغل کر رہا تھا۔ اس کے سامنے جیم خانہ وسکی کی بوتل رکھی تھی اور گلاس اُس کے ہاتھ میں تھا۔ چوکیدار نے نوشا کو اُس کے روبرو پیش کیا اور تار کا لچھا میز پر ڈال کر بولا۔

"ساجیب اس نے چوری کیا تھا، ہم نے اس کو پکڑ لیا"

عبداللہ نے گلاس میز پر رکھ دیا اور چوکیدار سے کہنے لگا۔ "خان تم ہمارا بہت اچھا ملازم ہے ہم تم سے بہت خوش ہوا" چوکیدار نے اس کو فوراً سلام کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

عبداللہ نے تار کا گچھا چھو کر دیکھا، پھر نوشا پر نظر ڈالی۔ ایک بارگی اس کی آنکھیں ابل کر سرخ ہو گئیں۔ وہ چیخ کر بولا۔

"کیوں بے حرامی!"

مارے غصہ کے اس نے میز پر رکھا ہوا ایک جمبر نوشا کے منہ پر دے مارا۔ نوشا زور زور سے رونے لگا۔ عبداللہ نے اس پر مطلق توجہ نہ دی۔ اس نے لوہے کی تین کیلیں نکالیں، جن کو وہ کاریگروں کو سزا دینے کی غرض سے ہمیشہ میز کی دراز میں رکھتا تھا۔

عبداللہ نے کھڑے ہو کر ایک کیل دیوار میں ٹھونکی۔ پھر اس کو ہلا کر دیکھا کہ مضبوط لگی ہے کہ نہیں۔

نوشا سہما ہوا سا سب کچھ کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر وہ بلک بلک کر رونے لگا۔

"مستری جی اب کبھی چوری نہیں کروں گا"

"اب کبھی چوری کروں تو جو جی چاہے سزا دینا"

"مستری جی بس اب کی معاف کر دو"

عبداللہ شکار پر جھپٹنے والے پرندے کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس کے منہ پر زور کا ایک تھپڑ مار کر بولا۔ "چپ سالے آواز نکلی تو یہیں دفن کر دوں گا"

نوشا کو سانپ سونگھ گیا۔ اس کے بعد اس نے چوں تک نہ کی۔ عبداللہ نے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس طرح آپس میں پھنسائیں کہ انگلیاں ہتھیلی کے اندر ہی رہیں! اس کے بعد اس نے نوشا کو اٹھا کر کیل پر لٹکا دیا، اور عین اس کے تلووں تلے فرش پر دونوں کیلیں گاڑ دیں، جن کے نکیلے سرے اوپر ابھرے ہوئے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ڈانٹ کر کہا۔

"دیکھ بے ہاتھ چھوٹے تو سمجھ لینا سالے دونوں پوری اندر اتر جائیں گی۔"

نوشا نے جھک کر کملوں کو دیکھا تو سہم کر رہ گیا۔ تکلیف سے اس کی انگلیاں ٹوٹے جا رہی تھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک انگلی کی ہڈی دوسری انگلی کی ہڈی کو توڑ کر اندر پیوست ہو جائے گی۔ وہ درد سے بلبلا کر رونے لگا۔

"مستری جی اللہ کے لیے چھوڑ دو"

"مستری جی، ہائے مستری جی! میں مرا"

"ہائے میری انگلیاں ٹوٹے جا رہی ہیں"

نوشا گڑگڑاتا رہا۔ تکلیف سے بلکتا رہا۔ خدا اور رسول کی دہائی دیتا رہا مگر مستری اطمینان سے بیٹھا چسکی لے لے کر شراب کے گھونٹ حلق کے نیچے اتارتا رہا۔ جب نوشا زیادہ شور مچاتا تو وہ گالیاں دے کر چیختا۔

"چپکا رہے گا یا سالے، دو چار ہاتھ بھی لگاؤں"

"سالے رات بھر لٹکاؤں گا تو نے مجھے سمجھا کیا ہے"؟

تھوڑی دیر کے لیے نوشا چپ ہو جاتا، پھر گڑگڑانے لگتا، عبداللہ وہسکی کا پورا گھونٹ پی کر کہتا

"چوری کرو بیٹا چوری کرو"

دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہر طرف اندھیرے کا جال پھیلتا جا رہا تھا۔ عبداللہ پر جیم خانہ وہسکی کا نشہ چڑھ رہا تھا۔ وہ بے ڈھنگے پن سے اپنی بھونڈی آواز سے جھوم جھوم کر گنگنا رہا تھا

او دور جانے والے وعدہ نہ بھول جانا

او دور جانے والے......

عبداللہ نشہ کی دھن میں کسی دور جانے والے کو یاد کر رہا تھا۔ مگر نوشا جو اس کے قریب دیوار سے لٹکا ہوا تکلیف سے بلبلا رہا تھا اس کو وہ بھول چکا تھا۔ ایکا ایکی نوشا زور سے چیخا۔

"ہائے مستری جی میں مرا"

عبداللہ نشہ کی دھن میں بولا "ابے تو ابھی تک لٹکا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے لٹکے رہو

بیٹا۔ بالکل چنگا دُز لگ رہا ہے اس وقت تو" اپنی بات پر اس کو خود بھی ہنسی آگئی۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

لیکن نوشا کی ٹانگیں لوہے کے اسپرنگ کی طرح زور زور سے کانپ رہی تھیں۔ اور وہ ذبح ہونے والے بکرے کی مانند گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اس دفعہ عبداللہ نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ اوپر سے خون کا ایک قطرہ فرش پر گرا۔ پھر دوسرا، تیسرا۔ ٹپ ٹپ، ٹپ، خون کے قطرے نیچے گر رہے تھے۔ انگلیوں کی کھال پھٹ گئی تھی اور نوشا کے ہاتھ لہولہان ہو گئے تھے۔ وہ کب کا اسے چھوڑ چکا ہوتا مگر عبداللہ نے انگلیاں اس طرح پھنسا کر اس کو لٹکایا تھا کہ انگلیاں کھل نہ سکتی تھیں۔ خون دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے عبداللہ کا چہرہ فکر مند ہو گیا۔ وہ ذرا دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے گلاس میں پڑی ہوئی وہسکی کو ایک ہی سانس میں ختم کر کے نوشا کو ایک گندی سی گالی دی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

قریب جا کر اس نے نوشا کو نیچے اتارا۔ اس کی انگلیاں ابھی تک آپس میں گتھی ہوئی تھیں۔ ان سے جیتا جیتا لہو بہہ رہا تھا۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے پاجامہ میں پیشاب کر دیا۔ عبداللہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کھینچے، نوشا تکلیف سے بلبلا کر زور سے چیخا۔ انگلیاں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئیں۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔

عبداللہ خاموش کھڑا نشے سے جھومتا رہا۔ پھر اس نے ڈانٹ کر کہا۔ جا پہلے ہاتھ دھو کر آ۔

نوشا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر چلا گیا۔ عبداللہ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے گلاس میں تھوڑی سی وہسکی انڈیلی اور ایک ہی سانس میں غٹاغٹ چڑھا گیا۔

تھوڑی دیر بعد نوشا واپس آ گیا۔ عبداللہ نے اس کو گھور کر دیکھا مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا چپ چاپ جیب سے دس روپے کے نوٹ نکالے اور اُن کو نوشا کے سامنے پھینک کر بولا۔

"لو سالے یہ اپنے کفن کے لئے بھی لیتے جاؤ مگر اب کبھی یہاں اپنی شکل نہ دکھانا۔ ابے منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ جا دفان ہو جا"

وہ زور زور سے گالیاں بکنے لگا۔ نوشا نے کانپتے ہاتھوں سے نوٹ اٹھائے اور سسکیاں بھرتا ہوا کارخانے کے پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس کی انگلیاں سوج گئی تھیں۔ ہاتھوں پر ورم آ گیا تھا اور چہرہ گیندے کے پھول کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ ماں نے دیکھا تو بدحواس ہو گئی۔ جلدی سے پوچھا "ارے یہ کیا کر لیا ہاتھوں کا؟"

نوشا نے جیب سے ۱۰ روپے نکال کر ماں کے سامنے ڈال دیئے اور آہستہ سے بولا "مستری جی نے مجھ کو کارخانے سے نکال دیا۔" مگر اس نے صاف بات نہ بتائی۔ بہانہ یہ بنایا کہ ایک قیمتی پرزہ ٹوٹ گیا تھا۔ جس پر ناراض ہو کر عبداللہ مستری نے اس کو مارا بھی اور نوکری سے بھی برطرف کر دیا۔ ماں عبداللہ کو کوسنے دینے لگی۔

نوشا جب کارخانے سے نکلا تھا اسی وقت اس کا جسم بخار سے تپنے لگا تھا۔ اب بخار کی شدت اور بڑھ گئی تھی۔ ماں نے جراح کی دوکان سے مرہم منگوایا اور انگلیوں پر لگا کر اوپر سے پٹی لپیٹ دی۔ اس کے بعد نوشا بستر پہ جا کر لیٹ گیا۔

رات گئے اس نے بخار کے عالم میں سنا، نیاز گھر میں آیا تھا اور ماں سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ وہ اس وقت نوشا ہی کا ذکر کر رہا تھا۔ "میں کہتا ہوں کہ یہ تو آوارہ لڑکوں کی صحبت میں رہ کر پرلے درجے کا حرام خور ہو گیا ہے۔ اس نے ضرور کوئی ایسی حرکت کی ہو گی جس پہ عبداللہ مستری نے اس طرح مارا ورنہ وہ تو بڑا بھلا آدمی ہے۔ کاریگروں کو اپنی اولاد کی طرح رکھتا ہے۔"

نوشا کو اس کی باتیں سن کر سخت غصہ آیا۔ اس نے دل ہی دل میں اس کو کئی گالیاں دیں اور کروٹ بدل کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

۴

نیاز کی دوکان پر کالے صاحب کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ کسی نہ وقت وہاں پہنچ جاتا۔ اور دیر تک بیٹھا انشورنس کی خوبیاں بتاتا رہتا۔ نیاز بھی اُس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتا۔ ۵۰ ہزار کی پالیسی کا معاملہ تھا۔ کمیشن اچھا بنتا تھا۔ اس لئے کالے صاحب چاہتا تھا کہ جلد سے جلد معاہدہ پر دستخط ہو جائیں تو اچھا ہے۔ ایک روز اُس نے آتے کے ساتھ ہی اپنا پورٹ فولیو کھولا، اس میں سے بیمہ کمپنی کے کچھ کاغذات نکالے اور نیاز سے کہنے لگا۔

"مسٹر نیاز! اللہ کا نام لے کر آج تم فارم تو بھر ہی دو"

نیاز نے فوراً کہا "مگر بیمہ تو میں اپنی بیوی کا کراؤں گا"

کالے صاحب نے چونک کر اس کو دیکھا مگر جلد ہی سنبھل گیا "کوئی بات نہیں۔ آپ خود پالیسی لیں۔ یا بیگم صاحبہ کے نام سے لیں، بات ایک ہی ہے" لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد وہ بولا "تو پھر ایسا کیجئے کہ ان کے نام سے فارم بھروا کر دستخط کروا دیجئے۔ اس کے ساتھ پہلی قسط بھی ادا کرنا ہو گی"

نیاز مسکرا کر کہنے لگا "مگر بیوی تو موجود نہیں"

کالے صاحب اُس کی بات کا مفہوم سمجھ نہ سکا۔ پوچھنے لگا "وہ کہیں گئی ہوئی ہیں؟"

نیاز اسی طرح بے تکلفی سے مسکراتا رہا۔ "اُس کو تو مرے ہوئے بھی کئی سال ہو گئے"

کالے صاحب سناٹے میں آ گیا۔ جھنجھلا کر بولا "تو گویا آپ اب تک میرے ساتھ مذاق کر رہے

تھے۔ وہ ابھی غصہ میں نہ جانے اور کیا کیا کہتا۔ مگر نیاز فوراً بیچ میں بول پڑا۔

"بھئی آپ تو خواہ مخواہ بُرا مان گئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں عنقریب دوسری شادی کرنے والا ہوں۔"

اُس کی بات سے کالے صاحب کے چہرے کی کرختگی کم ہو گئی۔ کہنے لگا۔ "تو یوں کہیے نا"

"آپ نے میری بات ہی کب سنی خواہ مخواہ ناراض ہو گئے۔"

"تو پھر کب تک ارادہ ہے۔ ایک عدد دعوت تو ضرور ہو گی"

"دعوت ہو گی اور بہت جلد ہو گی"

اس کے بعد دونوں بے تکلفی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد کالے صاحب نے اپنے کاغذات سمیٹ کر چمڑے کے بیگ کے اندر رکھے اور دوکان سے باہر چلا گیا۔

کالے صاحب کے جانے کے بعد نیاز خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ نکاح پڑھا کر وہ لڑکی کی ماں کو اپنے گھر لے آئے گا۔ ۵۰ ہزار روپے میں اس کا بیمہ بھی کرا دے گا۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ اس کو کس طرح راستے سے ہٹایا جائے تاکہ بیمے کا ۵۰ ہزار روپیہ جلد سے جلد مل جائے اور سلطانہ بھی اُس کے قابو میں آ جائے۔ سوچتے سوچتے ایک تجویز اُس کے ذہن میں آئی۔ اُس نے اُٹھ کر دوکان میں تالا ڈالا اور ڈاکٹر موٹو کے مطب کی جانب چل دیا۔

نیاز نے مطب کے اندر جا کر دیکھا کہ ڈاکٹر ابھی آیا نہیں تھا۔ کمپاؤنڈر نے بتایا کہ وہ ابھی گھر پر ہے۔ تھوڑی دیر بعد مطب میں آئے گا۔ نیاز نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہوا مطب میں وہ مریضوں کی موجودگی کے باعث ٹھیک سے بات نہ کر سکتا، گھر پر اطمینان سے بات ہو سکے گی۔ وہ وہاں سے سیدھا ڈاکٹر کے مکان پر پہنچا۔

ڈاکٹر گھر سے چلنے ہی والا تھا کہ اتنے میں نیاز پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے اُس کو کمرے میں بٹھایا اور مُسکرا کر بولا۔ "کہو میاں نیاز آج اِدھر کیسے آ گئے؟"

نیاز اپنی بات کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ یوں ڈاکٹر موٹو سے اس کے اچھے خاصے مراسم تھے۔ وہ جب کبھی بیمار پڑتا تھا، اسی کے زیرِ علاج رہتا تھا۔ مگر اس وقت جو بات وہ کہنا چاہتا تھا وہ ایسی نہ تھی کہ بے دھڑک کہہ دی جائے۔ حالانکہ اس کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ڈاکٹر موٹو کو رقم کھلا دی جائے تو وہ ہر کام کرنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ڈاکٹر موٹو کا نام تو خیرات محمد تھا۔ مگر اپنے بے ڈول جسم کے باعث عرفِ عام میں وہ ڈاکٹر موٹو کے نام سے مشہور تھا۔ وہ جالندھر کا رہنے والا تھا اور وہاں ایک ڈاکٹر کے یہاں کمپاؤنڈر تھا۔ فسادات کے بعد جب وہ ہجرت کر کے پاکستان آیا تو اس نے اپنی پریکٹس شروع کر دی۔ اب اس نے اپنے نام کے ساتھ ایک بوگس ڈگری لگا لی تھی اور دھڑلے سے ڈاکٹری کرتا تھا۔ اس کو یہاں آئے ہوئے ابھی پورے چار سال بھی نہیں ہوئے تھے مگر اس عرصہ میں وہ کئی سنگین مقدمات میں ماخوذ ہو چکا تھا اور ہر بار جیل جانے سے بال بال بچ گیا تھا۔ مگر اس بدنامی کے باوجود اپنی خطرناک حرکتوں سے باز نہیں آیا تھا۔

ڈاکٹر خیرات محمد عرف موٹو نے نیاز کو خاموش دیکھا تو ہنس کر کہنے لگا "کیا کہیں سے کوئی پوشیدہ بیماری لے آئے ہو جو کہتے ہوئے جھجک رہے ہو۔ میرا کہنا مانو تو اب تم گھر بسا لو، اور یہ بازاری عورتوں کا چکر چھوڑ دو۔" کسی اور وقت ڈاکٹر نے یہ بات کہی ہوتی تو وہ اس کے سر ہو جاتا مگر اس وقت تو وہ غرض مند بن کر آیا تھا، مسکرا کر اس کی بات ٹال گیا۔

"آپ کہہ رہے ہیں تو گھر بھی بسا لوں گا مگر اس وقت میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آیا تھا"

ڈاکٹر کہنے لگا "لوگوں کی خدمت کرنا تو اپنا پیشہ ٹھہرا، کہو کیا کام ہے؟"

نیاز بات کہتے کہتے رک گیا۔

ڈاکٹر بولا "کہو کہو گھبرا کیوں رہے ہو، کوئی خاص بات ہے؟"

"خاص ہی بات ہے"

ڈاکٹر خواہ مخواہ حیرت کا اظہار کرنے لگا "اچھا! تو پھر کہتے کیوں نہیں؟"

نیاز کہنے لگا۔ "بات یہ ہے ڈاکٹر صاحب" وہ پوری بات نہ کہہ سکا اور گھبرا کر ڈاکٹر کا چہرہ تکنے لگا۔ ڈاکٹر نے فوراً کہا۔

"بھئی اب کہہ بھی چکو۔ تم نے تو جی خواہ مخواہ تشویش میں ڈال دیا"

نیاز گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "پھر کسی وقت آکر بات کروں گا"

ڈاکٹر نے فوراً ٹوک دیا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اب تو تم اپنی بات کہہ کر ہی جاؤ گے۔ چلو بیٹھو کہاں چل دیے"؟

نیاز کو مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ پھر اس نے جھجکتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ کوئی چیز سلو پوائزننگ (SLOW POISONING) ہوتی ہے"

ڈاکٹر نے دل ہی دل میں کہا اچھا تو یہ بات ہے، جس کو کہتے ہوئے اس قدر جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اس بات کو جان لینے کے بعد نہ تو وہ خائف ہوا، نہ اس کو کسی قسم کی گھبراہٹ معلوم ہوئی لمحہ بھر تک وہ نیاز کے چہرے کو بغور دیکھتا رہا، اس کے بعد بولا "خیریت تو ہے۔ یہ سلو پوائزننگ کے متعلق معلوم کرنے کی ضرورت تم کو کیوں محسوس ہوئی"؟

نیاز نے جلدی سے کہا "کچھ ایسی ہی بات ہے"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں مجرمانہ چمک ابھر آئی۔ وہ سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولا۔ "میرا کہنا مانو تو سلو پوائزننگ کے چکر میں نہ پڑو۔ یہ طریقہ خطرناک بھی ہے اور اس میں بڑا جھنجھٹ بھی ہے"۔

نیاز کسی قدر ناامید ہو کر بولا "تو پھر کیا کیا جائے"؟

ڈاکٹر نے اس کی حوصلہ افزائی کی "گھبراؤ نہیں، ذرا صبر سے کام لو۔ ایسے کاموں کے لئے اب تو ایک سے ایک نیا طریقہ نکل آیا ہے"

نیاز خاموش بیٹھا اس کی بات سنتا رہا۔

ڈاکٹر کہنے لگا "صرف چند انجکشن دینا ہوں گے، جن سے دل کمزور پڑ جائے گا اور حرکت

قلب بند ہو جانے سے موت واقع ہو جائے گی۔ اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں۔ کام ہمیشہ ہاتھ پاؤں بچا کے کرنا چاہا۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں دھر لیے جاؤ۔ میری رائے پوچھتے ہو تو یہ سب سے اچھا طریقہ ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بھی اب یہی طریقہ چل رہا ہے۔"

نیاز کو ڈاکٹر کا مشورہ پسند آگیا۔ اس نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "جیسی آپ کی مرضی"۔ ڈاکٹر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی کے ساتھ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ واپس آیا۔ پہلے اس نے دروازے کا بولٹ چڑھایا، پھر نیاز کے قریب آ کر اس نے کوٹ کی جیب کے اندر سے ایک ڈبا نکال کر کھولا اور نیاز کے سامنے رکھ کر رازدارانہ انداز میں بولا۔

"دیکھو یہ ہیں وہ انجکشن۔ ایسی چیزیں میں مطب کے بجائے گھر میں رکھتا ہوں۔"

نیاز نے ڈبے کے اندر رکھے ہوئے انجکشنوں کو غور سے دیکھا اور کہنے لگا "یہی ہیں وہ انجکشن؟"

ڈاکٹر بولا "ہاں! مگر اس کام کا میں پانچ ہزار روپیہ لوں گا۔"

نیاز نے پانچ ہزار کا نام سنا تو سناٹے میں آگیا۔ مری ہوئی آواز سے کہنے لگا۔ "ڈاکٹر صاحب یہ تو بہت ہے۔"

"بس اتنا ہی لوں گا۔ اس سے کم نہ ہو گا۔ سوچ سمجھ لو۔ سچ پوچھو تو ایسے خطرناک کاموں کے لیے تو لاکھوں بھی تھوڑے ہیں۔"

نیاز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈاکٹر بھی خاموش بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد نیاز نے کہا۔

"کچھ کم نہیں کیجیے گا۔"

"نہیں۔"

"میری اتنی حیثیت نہیں۔"

"تو پھر یہ خیال ترک کر دو۔" ڈاکٹر بے مروتی سے بولا۔

نیاز لمحہ بھر تک بیٹھا سوچتا رہا، پھر اس نے ڈاکٹر کی بات مان لی۔ "چلیے آپ ہی کی بات سہی"

مگر اس میں کتنا عرصہ لگے گا؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا "چار پانچ مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔"

نیاز نے کہا "آپ چاہیں تو اور بھی زیادہ وقت لے سکتے ہیں مگر سال بھر سے زیادہ نہ لگے۔"

"نہیں بھئی، سال بھر کی مدت تو بہت ہوتی۔"

اس کے بعد دونوں نے کچھ اور ضروری باتیں کیں اور آپس میں یہ طے ہوگیا کہ نیاز ڈاکٹر کو ایک ہزار روپیہ پیشگی دے گا اور جب مریض کی حالت خطرناک صورت اختیار کرنے لگے گی تو مزید دو ہزار روپیہ دیا جائے گا۔ بقیہ رقم موت واقع ہو جانے کے بعد فوراً ادا کر دی جائے گی۔

نیاز نے ڈاکٹر سے یہ تمام باتیں طے تو کرلیں مگر جب وہ دوکان پر واپس آیا تو ایک نامعلوم خوف سے وہ سہما ہوا تھا۔ گو کہ وہ چوری کا مال بیچ بیچ کر خاصا نڈر ہوگیا تھا، مگر اتنا خطرناک جرم اس سے اب تک سرزد نہ ہوا تھا، اس لیے وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

اس الجھن میں اُس روز وہ نوشا کے گھر بھی نہیں گیا۔ ہوٹل میں جا کر کھانا کھایا اور چپ چاپ جا کر سو گیا۔ رات کے کوئی گیارہ کا عمل ہوگا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ اُس نے دروازہ کھول کر دیکھا تو سلمان سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، بال بے ترتیب ہو رہے تھے اور چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔

نیاز اس کو اپنے ہمراہ اندر لے آیا، پھر اُس نے اتنی رات گئے آنے کا سبب پوچھا۔ سلمان نے جھجکتے ہوئے کہا "نیاز بھائی اس وقت تمہارے پاس بڑے ضروری کام سے آیا ہوں۔ اگر تم روپے کا انتظام کر دو تو تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا۔"

لیکن نیاز اس کی باتوں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا، کہنے لگا "مجھے تو آج کل خود روپے کی سخت ضرورت ہے، پھر اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔"

سلمان خوشامد کرنے لگا "نہیں نیاز بھائی اس وقت تو تم کو کہیں نہ کہیں سے بندوبست کرنا ہی پڑے گا، میں بڑی پریشانی میں مبتلا ہوں۔"

حالانکہ نیاز کے پاس اس وقت کئی سو روپے موجود تھے مگر وہ اس کو کچھ دینا نہیں چاہتا تھا۔ سلمان جس روز سے تھرماس دے کر گیا تھا۔ اس کے بعد سے اب پلٹا تھا۔ نیاز نے اس عرصہ میں کئی بار سوچا کہ سلمان مل جائے تو وہ اس سے روپے کا تقاضہ کرے۔ اب وہ آیا بھی تو پیسے مانگتا ہوا۔ وہ بھی دس بیس نہیں، پورے تنسو۔ کچھ ہی سوچ کر اُس نے بڑی بے رُخی سے کہا۔ بھئی معاف کرنا تم نے پہلے ہی جو رقم لی تھی وہ ہی نہیں دی۔ اب اور مانگ رہے ہو۔۔!

سلمان پھر بھی اصرار کرتا رہا۔ بات یہ تھی کہ وہ دوپہر سے بیٹھا فلش کھیل رہا تھا اور اس وقت وہ ایک ایک پیسہ ہار کر نکلا تھا۔ ہارے ہوئے جواری کی جو حالت ہوتی ہے وہی اس وقت اُس کا عالم تھا۔ اس کو روپیہ چاہیئے تھا، چاہے کسی طرح ملے۔

جب نیاز کسی طرح روپیہ دینے پر آمادہ نہ ہوا تو سلمان نے کہا "اگر آپ کو میرا اعتبار نہیں تو رسید لکھا لیجئے"۔

اس بات پر نیاز ایک بارگی بھڑک اٹھا کہنے لگا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ بھئی واہ، اچھا یارا نہ پالا۔ رسید ہی لکھانا ہوتی تو پھر تم ہی رہ گئے تھے"۔

سلمان شرمندہ ہو کر بولا "آپ میری بات کا مطلب غلط سمجھے"۔

نیاز نے کہا "میں تمھاری بات کا مطلب سمجھ گیا۔ سو بات کی ایک بات ہے کہ میرے پاس اس وقت ایک پیسہ نہیں ہے"۔

سلمان ذرا دیر تک خاموش بیٹھا رہا، پھر منہ لٹکائے ہوئے اٹھکر چلا گیا۔

نیند ایسی اچاٹ ہوئی تھی کہ دیر تک نہ آئی۔ نیاز جب کروٹیں بدلتے بدلتے اکتا گیا تو ایک بارگی اُس کو خیال آگیا کہ نوشا کے گھر چلنا چاہیے۔ اُس نے اسی وقت کپڑے تبدیل کئے اور نوشا کے گھر کی طرف چل دیا۔

جس وقت وہ وہاں پہنچا، رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی مگر نوشا کے گھر میں جگار ہو رہی

تھی۔ بات یہ تھی کہ جب سے نوشا کی ملازمت ختم ہوئی تھی، سلطانہ اور اس کی ماں کو زیادہ کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ دونوں اس وقت مٹی کے لیمپ کی دھندلی روشنی میں کارخانے کے لئے بیڑیاں تیار کر رہی تھیں۔

نیاز کے گھر میں داخل ہونے سے قبل سلطانہ دالان سے اُٹھکر کمرے کے اندر چلی گئی لیکن نیاز نے جاتے جاتے بھی اُس کی ایک جھلک دیکھ ہی لی۔ چُست لباس میں وہ اس وقت آم کی قاش کی طرح ترشی ترشائی معلوم ہو رہی تھی۔ نیاز نے بڑے جذباتی انداز میں گہری سانس بھر کر سوچا کہ اُس کو اپنی اسکیم پر جلد ہی کام شروع کر دینا چاہیے۔

فصل سوم

۱

نوشا کے ہاتھوں کے زخم اچھے ہو گئے تھے اور اب وہ لاوارث کتوں کی طرح دن بھر گلیوں میں آوارہ گردی کرتا پھرتا۔ راجہ ابھی تک فاقہ مستی کی زندگی گذار رہا تھا عام طور پر وہ دونوں ساتھ ساتھ نظر آتے تھے۔

کچھ روز سے انھوں نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ دن چڑھے دونوں میں سے کوئی نہ کوئی، راشن کے دفتر کے سامنے جو برگد کا پیڑ تھا اس کے نیچے جا کر بیٹھ جاتا اور دوسرے کا انتظار شروع کر دیتا۔ یہاں سائیکلوں کی مرمت کرنے والی چھوٹی سی ایک دوکان تھی۔ اس کا مالک مجید نامی ایک نوجوان تھا، جس سے دونوں نے یارانہ کر لیا تھا اور دن کا زیادہ تر وقت اُس کے پاس گذارتے تھے۔ وہ اکیلا آدمی تھا، اکثر ایسا ہوتا کہ کئی گاہک ایک ساتھ آجاتے تو وہ پہیوں میں ہوا بھرنے یا ایسے ہی چھوٹے موٹے کاموں کے لئے اُن کو لگا دیا کرتا۔ اس کے صلہ میں وہ ان کو سگرٹ اور کبھی کبھار چائے بھی پلا دیا کرتا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ مجید کے پاس کام بالکل نہ آیا۔ البتہ راشن کے دفتر کے سامنے اسٹینڈ پر بہت سی سائیکلیں ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ راجہ اور نوشا حسب معمول وہاں موجود تھے دوپہر کا وقت تھا، سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجید کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سوجھی کہ اچانک دونوں سے بولا۔

"ابے آج تو تم ہی دونوں کچھ بانکا پن دکھاؤ۔ گاہک سالے نے تو آنے کی قسم کھائی ہے"

اُنھوں نے غور سے اُس کے چہرے کو دیکھا مگر اُس کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ مجید نے خود ہی وضاحت کی، کہنے لگا۔ "یار جا کر دو چار سائیکلوں میں پنکچر ہی کر دو، کچھ تو سالا کام آئے گا۔"

نوشا تو چپکا بیٹھا رہا، لیکن راجہ نے کہا۔ "یار پکڑے گئے تو بڑی مار پڑے گی۔"

مجید نے کہا۔ "ابے تو تو بڑا ڈرپوک نکلا، بس ٹائر میں جا کر ذرا پن ہی تو چبھونا ہے، اور کون سا بڑا تم کو ڈاکہ ڈالنا ہے۔"

راجہ رضا مند ہو گیا، کہنے لگا۔ "یار، تم اکھوں مانتا ہے، آج یہ بھی سہی۔" اس کے بعد وہ اٹھکر دفتر کی عمارت کی طرف چل دیا۔ احتیاطاً اُس نے نوشا کو بھی لے لیا۔ اس وقت آس پاس کوئی آدمی نہ تھا۔ نوشا کو پہرہ پر لگا کر، راجہ نے جھپاک جھپاک کئی سائیکلوں میں پنکچر کر دیئے۔

مجید کا خیال ٹھیک نکلا، کچھ ہی دیر بعد سائیکلوں کے پنکچر جڑوانے والے اُس کی دوکان پر آنا شروع ہو گئے۔ دن ڈھلے جب وہ دوکان بڑھانے لگا تو اُس نے راجہ اور نوشا کو فی پنکچر ایک آنہ کے حساب سے سات آنے دیئے۔

تجربہ کامیاب رہا تھا، لہٰذا دوسرے دن انھوں نے پورے ایک درجن پنکچر کیے اور اُس کے صلہ میں نقد ۱۲ آنے کمائے۔ اب تو اُن کا یہ معمول ہو گیا کہ سائیکلوں کے اسٹینڈ کے گرد منڈلاتے رہتے، انگلیوں میں نکیلی تیز پنیں دبی ہوتیں، جہاں موقعہ ملا، آنکھ بچا کر کام کر جاتے۔

وہ اپنے کام میں اس قدر منجھ گئے تھے کہ اکثر تو بے دھڑک پنکچر کر دیتے۔ اُن کی اس دیدہ دلیری پر مجید نے ایک آدھ بار ڈانٹا بھی، مگر اُن کو تو اب خطرہ مول لینے میں لطف آنے لگا تھا۔ ایک دفعہ تو انھوں نے بدمعاشی کی حد کر دی، ایک سرے سے تمام سائیکلوں کے پنکچر کر ڈالے۔ اس بات پر بڑی کھلبلی مچی۔ کچھ لوگوں نے مشتبہ نظروں سے اُن کو بھی دیکھا مگر وہ ذرا نہ گھبرائے۔ اُس روز انھوں نے کچھ کم تین روپے کمائے تھے۔

چند روز بعد کا ذکر ہے، راجہ نے ایک سائیکل کا پنکچر کیا، اسی وقت دفتر سے وہ آدمی باہر نکلا، جس کی سائیکل تھی، اُس نے راجہ کو ٹائر میں پن چبھوتے دیکھ لیا۔ پہلے بھی دو بار اس کی سائیکل میں اسی اسٹینڈ پر پنکچر ہو چکا تھا، اُس نے جھپٹ کر راجہ کی گردن دبوچ لی۔ شور سن کر وہاں لوگوں کا ہجوم لگ گیا۔

ان میں بیشتر ایسے تھے، جن کی سائیکلوں کا پنکچر ہو چکا تھا۔ پہلے تو راجہ پر گالیاں پڑیں۔ پھر مار پڑنے لگی۔ نوشا بھی ہجوم میں موجود تھا اور گھبرایا ہوا سوچ رہا تھا کہ کس طرح راجہ کو بچایا جائے۔ اُسی وقت کسی نے کہا۔

"اماں اس کے ساتھ ایک لڑکا اور بھی رہا کرتا تھا، اس سالے کی بھی خبر لو"

نوشا نے جو یہ بات سنی تو اُس کے کان کھڑے ہوئے اور ایک بارگی وہ بھیڑ کو چیر کر، لوگوں کو دھکا دیتا ہوا سرپٹ بھاگا۔ لوگوں نے شور مچایا "پکڑنا، پکڑنا۔ جانے نہ پائے" مگر نوشا کہاں ہاتھ آنے والا تھا۔ سڑک چھوڑ کر فوراً ایک گلی میں گھس گیا اور پھر گلیوں، گلیوں ہوتا ہوا گھر پہنچ گیا۔

شام کو راجہ ملا تو نوشا نے دیکھا کہ اُس کی گردن اکڑی ہوئی تھی، ایک آنکھ سوج گئی تھی اور وہ لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ کہنے لگا "یار سالوں نے بہت بُری طرح مارا" نوشا نے پوچھا

"مجید نے نہیں بچایا"

راجہ نے جواب دیا "وہ سالا تو خود ڈرا ہوا تھا۔ دور سے کھڑا تماشہ دیکھتا رہا"

وہ دونوں گلی کے نکڑ پر کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں شامی آگیا۔ وہ بڑا خوش نظر آرہا تھا اس نے آنے کے ساتھ ہی پانچ روپے کا ایک نوٹ دکھایا اور لہک کر بولا "سینما چلتے ہو؟" نوشا اور راجہ سینما دیکھنے کے لئے تیار ہو گئے۔

سینما جانے سے قبل تینوں نے مسلم ہوٹل میں جا کر چائے پی اور وہیں شامی نے بتایا کہ یہ پانچ روپے کا نوٹ اُس نے دوکان سے اڑایا تھا۔ اُس روز اُس کے باپ کو دمہ کا سخت دورہ پڑا تھا، اس لئے وہ دوکان نہیں آسکا تھا۔ اور جس روز باپ دوکان نہیں آتا تھا، شامی کے ٹھاٹھ ہو جاتے تھے۔ وہ خوب گل چھرے اُڑاتا اور پکڑا جاتا تو مرمت بھی خوب ہوتی تھی۔

راجہ اور نوشا نے شامی کے پانچ روپلوں پر سینما بھی دیکھا اور تفریح بھی کی۔ بڑے مزے کی شام گذری دوسرے دن نوشا سویرے ہی سویرے راجہ کے پاس پہنچ گیا۔ مجید کی دوکان پر جانے کی اب کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ کل اُس نے راجہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا "دیکھو جی اب تم یہاں نہ آنا، ورنہ خواہ مخواہ لوگ میرے پیچھے پڑ جائیں گے، ساری دوکان داری چوپٹ پڑ جائے گی" لہٰذا اب مسئلہ یہ پیدا ہوا

کہ وقت کہاں گزارا جائے۔ کچھ دیر تک دونوں کھولی کے اندر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ شامی کی دوکان پر پہنچے، مگر وہ وہاں موجود نہ تھا، البتہ اس کا باپ بیٹھا کھانس رہا تھا۔

دونوں نے بازار کا ایک چکر لگایا اور پھر راجہ کی تجویز پر انھوں نے ندی پر جانے کا پروگرام بنایا۔ پروگرام یہ تھا کہ ندی کے اس پار سے کشتیوں پر سامان لد کر آتا ہے، دونوں مل کر اس کو اُتارنے کا کام کریں گے۔ کچھ نہ کچھ تو قلی گیری میں مل ہی جائے گا۔ مگر ۲ میل کا راستہ پیدل طے کرکے جب وہ وہاں پہنچے، تو ندی پر سناٹا پڑا تھا۔ کشتیاں موجود ضرور تھیں، مگر وہ سب کی سب ریت پر دور تک کچھوؤں کی طرح اُلٹی پڑی تھیں۔ قریب ہی کچھ ملاح بیٹھے اونچی آواز سے باتیں کر رہے تھے۔ راجہ کو اس بات پر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ بالو کے ایک ٹیلے پر کھڑا کشتیوں کو دیکھتا رہا۔

ذرا دیر بعد ایک ملاح قریب سے گزرا۔ اس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میونسپلٹی نے کشتیوں پر ٹیکس بڑھا دیا ہے، اس لئے بطور احتجاج ملاحوں نے ہڑتال کر دی ہے۔ اس اطلاع سے دونوں کو بڑی کوفت ہوئی۔

دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھاٹ پر پہنچے۔ وہاں بھی سناٹا تھا۔

گھاٹ آثار قدیمہ کے کسی کھنڈر کی طرح شکستہ تھا۔ اس کا ایک حصہ دریا کی طغیانیوں سے منہدم ہو چکا تھا۔ صرف ایک بُرج باقی تھا۔ اس میں بھی ایک بڑا سا شگاف تھا۔ دونوں سیڑھیاں طے کرکے بُرج کے اوپر پہنچ گئے۔

اب دوپہر ہو چکی تھی۔ سورج آسمان کے بیچوں بیچ آگیا تھا۔ دھوپ کی حدت بڑھ گئی تھی۔ دونوں تھکے ہارے، تیز دھوپ میں کئی میل چل کر آئے تھے۔ بُرج کے اندر پہنچتے ہی، ہوا کا ایک بھیگا ہوا جھونکا آیا تو مزا آگیا۔ دونوں شکستہ محراب کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ نیچے دریا آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ میلوں تک پانی ہی پانی پھیلا تھا۔

نوشا کو بُرج کے اندر بیٹھ کر دریا کا نظارہ کرنے میں بڑا لطف آرہا تھا۔ مگر راجہ چپ چپ تھا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ نوشا نے اس کو کئی بار بات کرنے کے لئے اُکسایا، مگر وہ بیزاری سے کچھ نہ

کچھ کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ آخر نوشا نے پوچھا۔

"اماں راجہ، بات کیا ہے، جو تم اتنے چُپ چاپ بیٹھے ہو۔"

وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا "یار پریشان نہ کر۔"

نوشا باز نہ آیا "آخر ہوا کیا، یار تو تو خواہ مخواہ روٹھا ہوا سا بیٹھا ہے"

راجہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

نوشا اصرار کر کے بولا "اماں کچھ بتاؤ تو۔"

اس دفعہ بھی وہ خاموش رہا۔ نوشا بھی چپ ہو گیا۔ دونوں بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ سورج کی سنہری کرنیں دریا کی لہروں پر جھلملاتی رہیں۔ پانی کے آہستہ آہستہ بہنے کی گنگناہٹ اُبھرتی رہی۔ بھیگی ہوئی ہوا کے جھونکوں سے اُن کے سر کے بال بار بار بکھر کے چہرہ پر آ جاتے۔ بُرج کے اندر گہرا سکوت تھا اور اس سکوت میں وہ دونوں شکستہ محراب کے نیچے اُلوؤں کی طرح گول گول آنکھیں نکالے خاموش بیٹھے تھے۔ اچانک راجہ کھسک کر آگے آ گیا۔ اُس نے اپنی دونوں ٹانگیں باہر لٹکا دیں۔

نوشا نے راجہ سے تو کوئی بات نہیں کی البتہ جُھک کر نیچے دیکھنے لگا۔ لہریں بار بار آ کر گھاٹ کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ان کے ٹکرانے سے سفید سفید جھاگ اٹھتا، پانی کے چھینٹے دور تک بکھر جاتے اور ہر بار ایک ایسا شور اٹھتا جیسے کوئی کراہ رہا ہو، سسکیاں بھر رہا ہو۔ خوف سے اس کا جسم لرز اٹھا اسی وقت لہروں کے شور میں راجہ کی آواز اُبھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"یار میرا جی چاہتا ہے کہ مر جاؤں۔"

نوشا نے سہمی ہوئی نظروں سے راجہ کو دیکھا جس کی گردن دیوار سے لگی ہوئی تھی، آنکھیں آسمان کی جانب تھیں، اور ٹانگیں دریا کی طرف لٹک رہی تھیں۔ نوشا اس کی بات سے کچھ اس قدر خوف زدہ ہو گیا کہ زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔

راجہ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولا: "سالی اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔"

نوشا نے دیکھا اُس کا چہرہ چھپکلی کے پیٹ کی طرح پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھیں دیکھ کر ایسا محسوس

ہوتا تھا جیسے وہ دیر تک روتا رہا ہے۔ راجہ نے گہری سانس بھری اور گردن جھکا کر نیچے دیکھنے لگا۔ اس کی ٹانگیں کھسک کر آگے بڑھ گئی تھیں۔ آدھا دھڑ باہر لٹک رہا تھا۔

نوشا نے ایک بارگی جھپٹ کر اس کو دبوچ لیا اور گھبرا کر بولا "یار راجہ تجھے کیا ہو گیا ہے"

راجہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور نوشا کے ہاتھوں کی گرفت سے اپنا بازو چھڑانے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گتھ گئے۔ راجہ نے بگڑ کر کہا "نوشا مجھے چھوڑ دے" مگر نوشا باز نہ آیا۔ وہ اس کو اپنی جانب گھسیٹ رہا تھا اور راجہ اپنے جسم کو اس کے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں باہر لٹکی ہوئی زور زور سے ہل رہی تھیں۔ نیچے دریا کی لہریں آ آ کر گھاٹ کی دیوار سے ٹکراتیں، پانی اچھل کر دور تک بکھر جاتا، سطح آب پر سفید سفید جھاگ پھیل جاتا۔ ہر بار شور اٹھتا، جیسے کوئی کراہ کر ہائے کرتا ہے۔

لہریں ٹکراتی رہیں، باہر شور ابھرتا رہا۔

ہائے، ہائے، ہائے.....

"نوشا مجھے چھوڑ دے، نوشا مجھے چھوڑ دے" راجہ بار بار کہہ رہا تھا۔

مگر نوشا نے اس کو نہ چھوڑا۔ اس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ پڑ گئی تھیں۔ چہرے پر پسینے کے قطرے بکھرے ہوئے تھے اور بڑے بڑے بال جھک کر پیشانی پر آ گئے تھے۔ راجہ نے ایک بارگی چیخ کر کہا۔

"چھوڑ دے مجھے ورنہ تو بھی میرے ساتھ جائے گا"

نوشا نے کچھ کہنا چاہا، اسی وقت بلبلا کر راجہ نے اس کی کلائی پر اپنے دانت گڑو دیئے۔ لمحہ بھر کے لئے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ راجہ نے ڈانٹ کر کہا "ابے حرامی چھوڑ مجھکو" نوشا نے جلدی سے اس کے بازو کو پکڑ کر زور سے گھسیٹا تو راجہ کا تمام جسم اوپر آ گیا۔

راجہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ نڈھال سا فرش پر پڑا رہا۔ اس کا چہرہ نیچے جھکا ہوا تھا جس کو اس نے ایک ہاتھ سے چھپا لیا تھا۔ نوشا اس کے قریب ہی بیٹھا ہانپ رہا تھا۔

گھاٹ کے خاموش برج کے اندر آہستہ آہستہ سسکیوں کی آواز اُبھرنے لگی۔ راجہ فرش پر پڑا ہوا رو رہا تھا۔ وہ دیر تک روتا رہا۔

آخر نوشا اُس کے نزدیک گیا اور اُس کا بازو جھنجوڑ کر بولا۔

"ابے اس طرح کب تک عورتوں کی طرح روتا رہے گا۔"

راجہ نے کوئی جواب نہ دیا، چہرہ کو ہاتھ سے چھپاتے ہوئے سسکیاں بھرتا رہا۔

نوشا کہنے لگا "آؤ اب گھر چلیں"

راجہ بیزاری سے بولا "نہیں یار، میں کہیں نہیں جاؤں گا"

نوشا جل کر بولا "ابے کچھ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

راجہ ذرا دیر تک خاموش رہا، پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا "یار تو نے ناحق روک لیا۔ مر جاتا تو اچھا تھا میرے مرنے سے کسی کو دکھ نہ ہوتا کوئی نہ روتا۔ میرا بیٹھا ہی کون ہے، نہ ماں، نہ باپ، نہ بھائی، نہ بہن۔ کوئی بھی تو نہیں ہے۔ کوئی نہیں۔" اُس نے ایک گہری سانس بھری اور بڑے دکھ سے بولا "ہائے میرا کوئی نہیں۔" اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ایکا ایکی دوپہر کے سناٹے میں بندوق چلنے کی آواز اُبھری۔ دونوں خوف زدہ ہو کر برج سے باہر دیکھنے لگے۔ دریا کے اوپر پرندے شور مچاتے ہوئے اُڑ رہے تھے۔

گھاٹ کے مشرقی جانب نشیب میں سرکنڈوں کے جھنڈ تھے، جن کی اوٹ سے شکاریوں کی ابھری ہوئی گردنیں نظر آ رہی تھیں۔ اوپر فضا میں آبی پرندوں کے غول منڈلا رہے تھے۔ دونوں ذرا دیر تک تو اُن کو خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے اور پھر برج سے نیچے اُتر کر اسی طرف چل دیئے۔

شکاری دبے دبے قدموں آگے بڑھتے۔ دھائیں دھائیں کر کے بندوقیں چلتیں۔ کوئی پرندہ زخمی ہو کر چیختا ہوا نیچے گرتا اور وہ دونوں کیچڑ اور پانی میں گھس کر اس کو نکال لاتے۔ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا۔ بہت دیر بعد جب شکاری تھکے ہارے پڑاؤ پر آ کر اکٹھا ہوئے تو انھوں نے دونوں کو بھنا ہوا گوشت اور ڈبل روٹی کے ٹکڑے دیئے۔ سہ پہر کو چائے پلائی۔ دن ڈھلے تک وہ شکاریوں کے ساتھ ہاؤ ہو کرتے

شام ہوگئی ۔ سورج مغرب میں اُتر گیا ۔ درختوں کے سائے طویل ہوگئے ۔ افق پر گہری نارنجی روشنی پھیل گئی ۔ ندی کی لہریں دلہن کے سرخ آنچل کی طرح لہرانے لگیں ۔ شکاریوں کی ٹولی جیپ میں سوار ہوکر جا چکی تھی ۔ ہر طرف خاموشی تھی اور مغرب میں گہرے رنگ ماند پڑتے جارہے تھے ۔ وہ دونوں دن بھر کے تھکے ہوئے شہر کی جانب چل دیئے ۔

نوشا جب گھر میں داخل ہوا تو رات ہوچکی تھی ۔ ماں ان دنوں اُس سے یوں ہی بیزار بیزار رہتی تھی ۔ بات بات پر برس پڑتی ۔ وہ تمام دن غائب رہا تو وہ اور بھی جلی بھنی بیٹھی تھی ۔ نوشا جیسے ہی صحن میں پہنچا ، ماں اُسی وقت باورچی خانے سے نکل کر دالان میں آگئی ۔ نوشا نے چاہا کہ اُس کی نظریں بچا کر کمرے میں گھس جائے مگر اس کی نظر پڑ گئی ۔ چیخ کر بولی ۔

"حرام خور نکھٹو اب کیوں واپس آیا ۔ دن بھر جہاں آوارہ گردی کرتا رہا ، وہیں جا ۔ یہاں کیوں آیا ہے ؟ "

نوشا نے کوئی جواب نہ دیا ۔ ماں دالان میں کھڑی دیر تک اُس کو کوسنے دیتی رہی ۔ وہ چپ چاپ ایک طرف جاکر بیٹھ گیا ۔ تھوڑی دیر بعد سلطانہ کھانا لے کر آگئی ۔ گرم گرم کھانے کی خوشبو نتھنوں میں پہنچی تو وہ مریل کتے کی طرح سہما ہوا اس طرف بڑھا ۔ ماں نے فوراً ڈانٹ کر کہا ۔

"خبردار جو کھانے کو ہاتھ لگایا ۔ میں اپنی ہڈیاں پیل پیل کے اس لئے نہیں محنت کرتی ہوں کہ تو مشٹنڈا حرام کی کھا کھا کر اینڈتا پھرے ۔"

نوشا کے قدم جہاں تھے ، وہیں رُک گئے ۔ سلطانہ نے اُس کی سفارش کی تو ماں نے اُس کو ایسی سختی سے ڈانٹا کہ وہ سہم کر چپ ہوگئی ۔ اسی وقت انو بھی آگیا ۔ ماں نے اُس کو اپنے قریب بلا کر بٹھالیا ۔ تینوں اس کے سامنے بیٹھے کھانا کھاتے رہے ۔ کسی نے اُس کی جانب دیکھا بھی نہیں ۔ وہ چُپ چاپ بیٹھا رُک رُک کر اُن کی جانب نظریں اُٹھا کر دیکھ لیتا ۔ اس کو توقع تھی کہ ماں ضرور اُس کو کھانے پر بُلائے گی ۔ مگر جب سب کھانا کھا چکے اور سلطانہ برتن سمیٹ کر باورچی خانے کی طرف چل دی تو وہ تلملا کر رہ گیا ۔ اس وقت اس کو سخت بھوک لگ رہی تھی ۔ غصے اور دکھ سے اُس کا دل بھر آیا ۔ وہ خاموشی کے ساتھ

وہاں سے اٹھ کر کمرے کے اندر چلا گیا اور اندھیرے میں بیٹھا سسکیاں بھر کر روتا رہا۔

ذرا دیر بعد وہ نہ جانے کیا سوچ کر کمرے سے نکلا اور دالان سے ہوتا ہوا، باہر جانے والے دروازے کی جانب چل دیا۔ ماں نے ٹوک کر کہا۔

"پھر چلا باہر!"

نوشا نے جواب نہیں دیا۔ ماں چیخ کر بولی "ایک باپ کا جنا ہو تو اب واپس نہ آنا"

اُس نے پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "ہاں نہیں آؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ گھر سے باہر نکل گیا۔

گلی میں آکر اُس نے آنسو پونچھے اور سیدھا راجہ کے پاس پہنچا۔ وہ اپنی کھولی کے دروازے پر کبڑوں کی طرح جھکا ہوا بیٹھا تھا۔ اُس کو دیکھتے ہی حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"ابے تو تو بہت جلدی آگیا!"

نوشا نے اُس کی بات کو خاموشی کے ساتھ سُنا اور زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر، چپ چاپ اُس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ راجہ نے اس کے تمتمائے ہوئے چہرے کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور فوراً بھانپ گیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ کہنے لگا۔

"کیا کسی سے جھگڑا ہو گیا؟"

نوشا نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے، پوچھا "راجہ میں اگر تیرے ساتھ یہاں رہوں تو تو مجھے رکھ لے گا۔"

"کیوں؟"

"میں اب گھر نہیں جاؤں گا"

راجہ نے چونک کر کہا "آخر بات کیا ہوئی؟"

نوشا نے آب دیدہ ہو کر بتایا۔ "اماں نے مجھ کو گھر سے نکال دیا ہے" اور یہ کہتے کہتے وہ بے اختیار رو پڑا۔ راجہ نے فوراً اس کو تسلی دی "ابے تو تو رونے لگا۔ گھبراتا کیوں ہے۔ دونوں

مزے سے یہاں رہیں گے۔"

نوشا سسکیاں بھر کر شکوہ کرنے لگا" سب لوگ مجھے ذلیل سمجھتے ہیں، ہر ایک برا کہتا ہے میرا دنیا میں کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں رہا۔"

راجہ نے فوراً کہا" ابے میں تو موجود ہوں۔ تو کسی بات کی پرواہ نہ کر" لمحہ بھر رُک کر وہ بولا۔

" یہ مائیں تو سالیاں، سب ایک نمبر حرام کی جنی ہوتی ہیں۔ اب میری ہی ماں کو دیکھ، سُنا ہے بڑے ٹھاٹھ سے لاہور میں رہتی ہے اور میں یہاں بھیک مانگتا پھرتا ہوں۔" یہ کہتے کہتے دکھ کا ہلکا سا سایہ اُس کے چہرے پر پھیل گیا۔

نوشا کو اُس کی بات پر بڑا تعجب معلوم ہوا احمقوں کی طرح آنکھیں پھاڑ کر بولا" ابے تیری ماں بھی ہے؟"

راجہ ترش روئی سے بولا "کیوں نہیں ہے؟"

"اور باپ؟"

راجہ نے گہری نظروں سے نوشا کو دیکھا اور دُکھ بھرے لہجہ میں کہنے لگا "یار وہ تو بلوے میں مارے گئے۔ دو بڑے بھائی تھے۔ وہ بھی قتل کر دیئے گئے۔ ہم دونوں کو تو دتی سے وہ سالا شبیر لایا تھا۔ ایک نمبر حرامی تھا۔ مجھ کو بہت مارا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے جل کر اُس کو گالی دیدی۔ سالا میرے سینہ پر چڑھ بیٹھا اور جلتی سگرٹ سے میرا منہ چیر کر زبان جلا ڈالی۔ یہ دیکھ" اُس نے منہ کھول کر زبان نکالی، جس کے ایک گوشہ میں بھورا سا دھبہ تھا۔ نوشا نے غور سے اُس کی جلی ہوئی زبان کو دیکھا اور اظہار ہمدردی کے طور پر بولا۔

" سالا بڑا حرامی تھا"

" ایک نمبر حرام کا تخم تھا۔ میری زبان جلانے پہ ماں کو بھی بڑا غصہ آیا تھا۔ اس سالے سے تو کچھ کہا نہیں لیکن دوسرے ہی دن مجھ کو لے جا کر یتیم خانہ میں داخل کرا دیا۔"

نوشا نے ایک بار پھر اس کو احمقوں کی طرح گول گول آنکھیں نکال کر دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر

پوچھنے لگا۔ "ابے تو تو یتیم خانہ میں کبھی رہ چکا ہے؟"

راجہ نے جواب دیا "یہ سالی بھیک مانگنے کی عادت وہیں سے تو پڑی ہے۔ وہاں سالا ایک ملّاں تھا۔ یہ لمبی داڑھی تھی۔ پانچوں وقت نماز پڑھتا تھا۔ پر ایک نمبر حرامی تھا۔ سب اُس سے ڈرتے تھے۔ چھوٹا مہتمم تو ذرا اچھا تھا، مگر وہ بہت پاجی تھا۔ روزانہ شام کو معائنہ کرنے آتا تھا، اُس وقت اُس کے ہاتھ میں ایک بید ہوتا، جو لڑکا پیسے کم لاتا، بس اُس کی شامت آجاتی۔ یار وہ مارتا تھا کہ اب بھی یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" راجہ نے یتیم خانہ کے بڑے مہتمم کو ایک ہی سانس میں بہت سی گالیاں دے کر اپنے دل کا غبار ہلکا کیا۔ "ایک روز مجھے صرف ۱۱ آنے ملے، بس اس بات پر اُس کے آگ لگ گئی۔ سالے نے بہت مارا۔ اُسی رات میں یتیم خانہ سے بھاگ کھڑا ہوا۔"

نوشا نے کہا "وہاں سے تو تم ماں کے پاس گئے ہوگے؟"

"نہیں یار وہ پھر یتیم خانے بھجوا دیتی۔ پھر تو وہ سالا ڈرجیل میری کھال اُدھیڑ ڈالتا۔"

"اس کے بعد سے تم اپنی ماں کے پاس نہیں گئے؟"

راجہ نے جھنجھلا کر کہا "نہیں یار، کیا کرتا اُس کے پاس جا کر"

"یاد تو کرتی ہوگی"

راجہ کہنے لگا "پتہ نہیں۔ پر میں تو اب اُس کی صورت بھی نہیں دیکھوں گا"

نوشا نے سوال کیا "کیوں؟"

راجہ خاموش بیٹھا رہا۔

نوشا اصرار کرنے لگا "یار بتا آخر بات کیا ہے؟"

راجہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ کہنے لگا "اب اُس کے پاس جا کر کیا کروں گا۔ سالی رنڈی پنا کرتی ہے۔ کبھی مل گئی تو خدا قسم قتل کر دوں گا۔" وہ اب بے حد غصہ کے عالم میں تھا۔ نوشا نے مارے ڈر کے کوئی بات نہیں کی۔ پھر راجہ خود ہی بولا۔

"یہ بات میں نے تجھ کو بتا تو دی، لیکن اگر تو نے کسی سے کچھ کہا سُنا تو سمجھ لینا اچھا نہ ہوگا"

نوشا نے جلدی سے قسمیں کھا کر اُس کو یقین دلایا کہ وہ کسی سے ان باتوں کا ذکر نہیں کرے گا۔

اس کے بعد دونوں اچانک خاموش ہوگئے۔ کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ راجہ کے چہرے پر سے غصہ کے نشانات آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے تھے اور دُکھ کا احساس، سائے کی طرح پھیلتا جا رہا تھا۔ کھولی کے پچھواڑے، کھنڈر میں ایک کتا بڑی خوفناک آواز میں رو رہا تھا۔ بہت دیر بعد راجہ کی آواز ابھری۔

"یار میرا تو جی چاہتا ہے کہ اس سالے شہر ہی کو چھوڑ دیں۔ بول کیا کہتا ہے۔"

"مگر جائیں گے کہاں؟"

راجہ کہنے لگا "ابے کراچی چلیں گے۔ بڑا زوروں کا شہر ہے۔ کام تو وہاں کھٹ سانی مل جاتا ہے"

نوشا فوراً رضامند ہوگیا۔ "میں بھی تیرے ساتھ ہی چلوں گا۔ یار واقعی اب یہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔"

راجہ خوشی سے چیخ کر بولا "تو پھر ملا پلاؤ والا ہاتھ"

دونوں نے گرم جوشی کے ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔ اس وقت وہ ایک نامعلوم سی خوشی محسوس کر رہے تھے۔ ان کے لئے اس احساس میں بڑی دل کشی تھی کہ وہ اس شہر کو چھوڑ دیں گے جس میں اُن کے لئے دُکھ ہی دُکھ تھے اور ان دکھوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا اُنھوں نے راستہ دیکھ لیا تھا۔ وہ ابھی اس لذت سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ اسی اثناء میں شامی بھی وہاں آگیا۔ اس کو دیکھتے ہی راجہ نے زور کا نعرہ لگایا۔

"آ یار، بس تیری ہی کمی تھی"۔

لیکن شامی اس پرجوش خیر مقدم سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ وہ کچھ اُداس اُداس نظر آ رہا تھا نوشا نے اس کی یہ حالت دیکھ کر پوچھا "ابے چپ چپ کیوں نظر آ رہا ہے؟"

پہلے تو وہ خاموش رہا مگر جب راجہ نے ڈانٹ کر کہا۔ "منہ سے تو بول، آخر بات کیا ہے؟"

تو اُس نے آہستہ آہستہ بتایا "سالے ڈاکٹر موٹو نے ابا سے میری شکایت کر دی۔ بس اسی بات پر اُنھوں

نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ اب تک کمر میں درد ہو رہا ہے۔"

راجہ نے کہا۔ "تم نے آبا سے کہا نہیں کہ بات کیا ہوئی تھی"

"یار انھوں نے میری بات ہی کب سُنی۔ بس ایک دم سے مارنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر موٹو کے ساتھ سالا اس کا لڑکا بھی تھا۔ خوب خوش ہو رہا تھا۔ یار کتنی ذلت کی بات ہے۔"

نوشا نے اُسی وقت کہا۔ "ہم دونوں تو کراچی جا رہے ہیں۔ یہاں اب رہنا بالکل بیکار ہے۔ جس کو دیکھو گالیاں دے رہا ہے، مار رہا ہے۔"

شامی نے حیرت زدہ نظروں سے پہلے نوشا کو دیکھا اور پھر راجہ سے پوچھنے لگا۔ "کیوں راجہ، یہ نوشا ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

وہ بولا۔ "ہاں جی، اپنا تو بس یہی پروگرام ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ تو بھی ہمارے ساتھ چل۔ تینوں ٹھاٹھ سے وہاں رہیں گے۔ نہ کسی سالے کا ڈر نہ کسی کا خوف۔"

شامی پہلے تو کچھ جھجکا، پھر آمادہ ہو گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ سفر کے لئے رقم کہاں سے مہیا کی جائے۔ یہ مسئلہ شامی نے حل کر دیا۔ اُس کے پاس اخباروں کی بکری کے روپے رکھے ہوئے تھے۔ وہ وہاں سے اٹھ کر گھر گیا اور چپکے سے سارے روپے نکال لایا۔

اس وقت رات کے ۹ بجے کا عمل تھا۔ پونے گیارہ بجے ایک پسنجر ٹرین کراچی جاتی تھی۔ اُنھوں نے سوچا اب کل تک کا انتظار کیوں کیا جائے۔ وہاں سے وہ سیدھے اسٹیشن پہنچے، ٹکٹ خریدے اور ٹرین میں سوار ہو کر کراچی روانہ ہو گئے۔

۳

آدھی رات گذر چکی تھی۔

ریل گاڑی کے ایک تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں وہ تینوں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ راجہ فرش پر ٹانگیں پھیلائے بے خبر سو رہا تھا، اس کے قریب ہی نوشا اور شامی بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ بجلی کی زرد، زرد روشنی میں کمپارٹمنٹ کے اندر مسافر، سامان کے بنڈلوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ سو رہے تھے، کچھ اونگھ رہے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو جاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔

نوشا نے اچانک راجہ کو جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کی مگر وہ بڑی گہری نیند میں تھا۔ کروٹ بدل کر اُس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ نوشا نے جھل کر اس دفعہ زور سے اُس کو جھنجھوڑا۔ راجہ نے ایک آنکھ کھول کر اُس کی جانب دیکھا اور بگڑ کر بولا۔

"یار سونے دے کیوں خواہ مخواہ پریشان کر رہا ہے"

نوشا نے آہستہ سے کہا "ابے اُٹھ تو"

راجہ لمحہ بھر تو آنکھیں بند کئے خاموش لیٹا رہا۔ پھر ایکا ایکی گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور اس سے پوچھنے لگا

"کیا بات ہے؟"

نوشا نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، البتہ آنکھ کے اشارے سے اس کو شامی کی طرف متوجہ کیا، جو دیوار کی طرف منہ کئے آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ راجہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ دہشت زدہ

نظروں سے گھور گھور کر شامی کو دیکھنے لگا۔ ذرا دیر وہ اسی عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر وہ کھسک کر شامی کے قریب گیا اور محبت سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے بولا۔

"ابے رو رہا ہے ؟"

شامی نے کوئی جواب نہیں دیا اور برابر سسکیاں بھر کر روتا رہا۔ راجہ نے اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ "ابے بات کیا ہے ؟"

کئی بار دریافت کرنے پر شامی بھرّائی ہوئی آواز میں بولا "گھر یاد آ رہا ہے"۔

راجہ کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ اُس نے شامی کو ایک گندی سے گالی دی اور ڈانٹ کر کہنے لگا "جب یہی بات تھی تو سالے پھر ہمارے ساتھ آیا ہی کیوں تھا"

نوشا نے بھی اس کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اور بھی زیادہ سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ اب اس کی آواز کمپارٹمنٹ کی خاموشی میں صاف سنائی پڑ رہی تھی۔ جو مسافر جاگ رہے تھے وہ مڑ مڑ کر تینوں کی جانب دیکھنے لگے۔ راجہ پریشان ہو کر نوشا سے کہنے لگا۔

"یار یہ سالا تو سب کو پکڑوائے گا"

نوشا بھی سہما ہوا تھا۔ کہنے لگا "سب لوگ ہماری ہی طرف دیکھ رہے ہیں"

دونوں نے چمکار کر اُس کو خاموش کرانے کی کوشش کی تو وہ اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ راجہ غصہ سے تلملا اٹھا۔ اُس کا جی چاہا کہ شامی کی گردن دبوچ کر اُس کو خوب مارے مگر وہ مسافروں کے ڈر سے کچھ نہ کر سکا۔ آخر دونوں نے طے کیا کہ اگلے اسٹیشن پر شامی کو سمجھا بجھا کر منانے کی کوشش کی جائے۔ اب سفر جاری رکھنا ان کے لئے مصیبت بن گیا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی ٹرین ایک اسٹیشن پر رُکی، دونوں شامی کو اپنے ہمراہ لے کر ریل گاڑی سے باہر آ گئے۔

یہ ایک اجاڑ سا اسٹیشن تھا۔ ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ٹرین ذرا دیر رُک کر، روانہ ہو گئی اسٹیشن کے سناٹے میں چند لمحوں کے لئے ہلچل پیدا ہوئی اور پھر ہر طرف ہُو کا عالم ہو گیا۔ اسٹیشن کی مختصر سی عمارت کے اندر ایک دھندلا سا لیمپ روشن تھا، جو ہر سمت چھائے ہوئے اندھیرے میں

بڑا پُراسرار معلوم ہو رہا تھا۔

وہ تینوں اسٹیشن سے باہر جانے کے بجائے، پلیٹ فارم ہی پر ایک جگہ جا کر ٹھہر گئے۔ شامی ابھی تک سسکیاں بھر رہا تھا۔ راجہ جلا ہوا تو تھا ہی، اُس نے جھنجھلا کر اس کو کئی گالیاں دیں اور مارنے کے لئے بھی جھپٹا مگر نوشا نے اس کو سمجھا بجھا کر روک دیا۔ شامی نے خوف زدہ ہو کر رونا بند کر دیا تھا۔

تینوں نے طے کیا کہ صبح تڑکے جو ٹرین آتی ہے، اُس سے سفر کیا جائے۔ شامی نے گھر واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اب وہ کسی حد تک مطمئن نظر آ رہے تھے اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ تینوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات ڈھلنے لگی تھی۔ ہوا میں خنکی آ گئی تھی۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ نیند کا غلبہ ہوا تو تینوں اونگھنے لگے اور وہیں پتھریلے فرش پہ سو گئے۔

سب سے پہلے راجہ کی آنکھ کھلی۔ اُس نے دیکھا ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ایک خارش زدہ کتا اُس کے برابر بیٹھا ہوا اپنی گردن کو زور زور سے کھجا رہا تھا۔ راجہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ کتا تو دُم دبا کر بھاگ گیا مگر راجہ کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ نوشا تو وہیں پڑا سو رہا تھا مگر شامی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اُس نے جلدی سے نوشا کو جگایا۔ دونوں دیر تک شامی کا انتظار کرتے رہے کہ شاید کہیں اِدھر اُدھر چلا گیا ہو تو آ جائے۔ مگر وہ رات کے پچھلے پہر آنے والی ٹرین سے واپس گھر چلا گیا تھا۔ اُس نے دونوں کو خبر تک نہ ہونے دی، چپکے سے کھسک گیا۔

وہ دونوں اس قدر گہری نیند سوئے تھے کہ کراچی جانے والی گاڑی، جب صبح تڑکے آئی تو اُن کی آنکھ نہ کھلی۔ دوسری گاڑی سہ پہر میں آتی تھی۔ سب سے بڑی پریشانی کی بات یہ تھی کہ ساری رقم شامی ہی کے پاس تھی، جس کو وہ اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ ان دونوں کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔ خیریت یہ ہوئی کہ ریل گاڑی کے ٹکٹ راجہ کے پاس رہ گئے تھے۔

دن بھر وہ پلیٹ فارم کے کنارے لگے ہوئے ایک درخت کے نیچے بیٹھے رہے۔ ۴ بجے کے قریب پسنجر آئی تو وہ اس میں بیٹھ کر کراچی روانہ ہو گئے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو ایک پہر رات گذر چکی

تھی۔

اجنبی شہر نہ کسی سے جان نہ پہچان۔ رات کا وقت۔ دونوں جاتے بھی کہاں سفر کے تھکے ہارے اور دن بھر کی بھوک سے نڈھال، وہ مسافر خانے کے ایک گوشہ میں جا کر پڑ گئے۔ رات آہستہ آہستہ گذرتی گئی۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ مسافر خانے کے اندر جوا کا دُکّا مسافر رہ گئے تھے، وہ ٹانگیں پسار کر سو گئے تھے یا پڑے اونگھ رہے تھے مگر راجہ اور نوشا کو بھوک کے مارے نیند نہیں آ رہی تھی۔

رات گئے مسافر خانے میں ایک شخص داخل ہوا۔ وہ دُبلا پتلا مریل سا آدمی تھا اُس نے چاروں طرف تجسس انگیز نظروں سے دیکھا۔ مسافر خانے کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک چکر لگایا۔ اچانک اس کی نظران دونوں پر پڑی۔ لمحہ بھر کے لئے وہ ٹھٹکا اور دونوں کو گہری نظروں سے دیکھتا ہوا اُن کے قریب چلا گیا۔ ذرا دیر تک وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر بڑے اطمینان سے ان کے پاس بیٹھ گیا اور بیٹھتے کے ساتھ ہی بولا۔

"گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟"

نوشا تو ڈر کر سہم گیا۔ البتہ راجہ نے کسی قدر نڈر ہو کر جواب دیا "نہیں جی ہم تو اپنے ماموں کے پاس آئے ہیں"

اُس شخص نے فوراً پوچھا "کہاں رہتا ہے تمھارا ماموں؟"

اس غیر متوقع استفسار پر راجہ گھبرا گیا اس لئے کہ شہر کے کسی علاقہ کا اس کو نام نہیں معلوم تھا۔ پہلی بار یہاں آیا تھا۔ ہکلا کر بولا "وہ ...... وُہ ...... وہاں رہتے ہیں؟"

وہ شخص ایک آنکھ دبا کر بدمعاشی سے مُسکرایا "جھوٹ بولو گے تو اُستاد سیدھے حوالات میں ہو گے" اس بات پر راجہ کے بھی اوسان خطا ہو گئے۔ سہمی ہوئی نظروں سے چُپ چاپ اس آدمی کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ اُس نے جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالا اور دونوں کی طرف بڑھا کر بولا "لو پہلے تم سگرٹ پیو" نوشا تو خاموش بیٹھا رہا۔ مگر راجہ نے جھجکتے ہوئے ایک سگرٹ نکال ہی لی۔

اس آدمی نے ماچس جلا کر راجہ کی سگرٹ سلگائی اور اُس کے کندھوں کو تھپتھپا کر کہنے لگا "ڈرو مت، مجھ سے تم کو کچھ فائدہ ہی پہنچ جائے گا۔ ویسے یہ کراچی سالا بہت خراب شہر ہے۔ یہاں ایک سے ایک نمبری پڑا ہے۔"

دونوں خاموشی کے ساتھ اُس کی باتیں سنتے رہے۔ لمحہ بھر رُک کر وہ بولا "کسی ایسے ویسے کے چکر میں پڑ گئے تو سمجھ لو بس گئے کام سے۔" انھوں نے خوف زدہ نظروں سے اُس کو دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے اُن کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے جیب سے دوبارہ سگرٹ کا پیکٹ نکالا۔ اس دفعہ اُس نے اپنی سگرٹ سلگائی۔ لمبا سا ایک کش لگایا اور بڑی سنجیدگی سے بولا۔

"نوکری کرو گے؟"

دونوں نے ایک ساتھ چونک کر اس کو دیکھا اور جلدی جلدی گردن ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ وہ ذرا دیر تک خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ پھر بڑے تیکھے لہجہ میں بولا "دھندے سے تو میں تم دونوں کو لگوا دوں گا مگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو اچھا نہ ہوگا۔"

اُن کی سمجھ میں اس شخص کی بات کا مطلب نہ آیا۔ وہ احمقوں کی طرح اُس کو دیکھنے لگے مگر اُس نے ان کی طرف توجہ نہ دی اور ایک بارگی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا تو پھر آؤ میرے ساتھ"

دونوں اس کے ہمراہ ہو گئے اسٹیشن سے نکل کر وہ باہر سڑک پر آئے اور مختلف راستوں کے چکر کاٹتے ہوئے، کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ ایک مکان کے سامنے جا کر ٹھہر گئے۔ یہ علاقہ شہر کی گنجان آبادی سے کسی قدر الگ تھلگ تھا مختصر سی بستی تھی، جس میں زیادہ تر نیچی نیچی چھتوں والے نیم پختہ مکانات تھے۔ مگر وہ مکان پختہ تھا۔ اُس کی دیواریں بلند تھیں اور دُھلے ہوئے کپڑوں کی طرح اُجلی نظر آ رہی تھیں۔

چاروں طرف گہرا سناٹا طاری تھا اور گلی کے اندر اندھیرا تھا۔ وہ دونوں خاموش کھڑے رہے اس آدمی نے آگے بڑھ کر دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دروازہ تو نہیں کھلا البتہ کسی نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر پوچھا۔

"کون۔؟"

وہ شخص آہستہ سے بولا "میں ہوں رحمان"

"اچھا، اچھا"

اندھیرے میں کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ اُس کا چہرہ نظر نہ آسکا۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ رحمن ان دونوں کو اپنے ساتھ لئے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوگیا۔ ایک اندھیرے دالان سے گزر کر وہ ایک کمرے میں پہنچے، جہاں لیمپ کی دُھندلی روشنی میں ایک گٹھے ہوئے جسم کا آدمی آنکھیں بند کئے سر کی مالش کرا رہا تھا۔ وہ گھٹنوں تک اونچی لنگی باندھے ہوئے تھا اور بدن پر صرف بنیائن تھی۔ رحمان نے کھنکھار کر اُس کو اپنی جانب مخاطب کیا اور بے تکلفی سے کہنے لگا۔

"میں نے کہا شاہ جی بڑے زوروں کی چمپی ہو رہی ہے"

شاہ جی نے بغیر آنکھیں کھولے ہوئے کہا "کہاں رہا اتنے دنوں تک؟"

رحمان نے بڑی مسکین سی صورت بنا کر کہا "بیمار پڑ گیا تھا جی ذرا"

وہ بگڑ کر بولا "او تیرا خانہ خراب ہو بے ایمان۔ ہر بار یہی کہتا ہے" اس دفعہ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مگر جیسے ہی راجہ اور نوشا پر اُس کی نظر پڑی تو وہ چونک پڑا اور فوراً ہی پوچھا۔

"یہ دونوں تیرے ساتھ آئے ہیں؟"

رحمان نے آنکھ مار کر جلدی سے کہا "ہاں جی۔ بے چارے گھر سے روٹھ کر چلے آئے مسافر خانے میں پڑے تھے، یہاں ان کا کوئی جان پہچان کا کبھی نہیں۔ میں اپنے ساتھ لے آیا۔ رکھ لو پڑے رہیں گے"

شاہ جی نے اُس کی باتیں سن کر ایک لمبی "ہوں" کی۔ دونوں کو گہری نظروں سے دیکھا "ویسے تو ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں" رحمان نے اُس کی بات کاٹ کر فوراً کہا۔

"مصیبت کے مارے ہوئے آئے ہیں۔ دھندے سے لگ جائیں گے تو تم کو زندگی بھر دعائیں دیں گے"

وہ گردن ہلا کر بولا "اچھا، اچھا" پھر اُن سے پوچھنے لگا "کب آئے جی تم لوگ یہاں؟"

راجہ نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا" آج ہی آئے تھے"

شاہ جی نے گردن گھما کر رحمان کو دیکھا اور اُس سے کہنے لگا۔" تو پہلوان کو رکھ لیا جائے؟"

وہ بولا" ان کو لایا تو اسی لئے ہوں "

شاہ جی بے تکلفی سے مسکرایا" اچھا۔جی تو ہم نے تمہاری بات مان لی۔ ویسے بھی کب تمہارا کہا ٹالا ہے" اس کے بعد وہ ان دونوں سے کہنے لگا" تم نے کچھ کھایا پیا بھی ؟"

دونوں سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔ شاہ جی نے چپی کرنے والے آدمی سے کہا۔ "اوڈوڈے جا ہوٹل سے ان کے لئے کھانا لے کر آ"

ڈوڈے جانے لگا تو اُس نے ٹوک کر کہا" دیکھ وہ کونے والا کمرہ کل خالی کرا دینا۔ یہ دونوں اُس میں رہیں گے۔ آج ان کو کہیں اور سُلا دے" پھر وہ ان دونوں سے بولا" جاؤ جی تم اس کے ساتھ جاؤ۔ ڈٹ کر کھاؤ اور اینڈ کرو۔ اب کل تم سے بات ہوگی"

دونوں خاموشی کے ساتھ ڈوڈے کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد شاہ جی، رحمان سے پوچھنے لگا" ہاں جی اب معاملہ کی بات کرو۔ کیا لوگے؟"

رحمان ہنس کر کہنے لگا" شاہ جی آج تو اپن کو سید کے ہاتھ سے ٹنٹو کے بڑے کرارے دو۔ خدا قسم بڑے کام کے لونڈے ہیں"

شاہ جی نے اس کو ڈانٹ دیا" ٹھیک ٹھیک بات کر۔ ہزار سے ایک پیسہ زیادہ نہ ملے گا"

" ارے شاہ جی کیا ظلم کر رہے ہو۔ اتنے میں سودا نہ ہوگا۔ واپس بلوالو۔ ابھی تو انھوں نے تمہارا نمک بھی نہیں چکھا"

شاہ جی نے اس کو گھور کر دیکھا" دلّالی کرتے کرتے تو نے داداگیری کب سے شروع کر دی۔ بندہ بن بندہ۔ ورنہ مرغے کی بولی بولنا پڑے گی"

رحمان رونی صورت بنا کر بولا" جب ہی تو میں تمہارے پاس مال نہیں لاتا"

" چل چل، ٹسوے مت بہا۔ ٹنٹو اور لے لے"

رحمان نے تھوڑی دیر تک حیل وحجت کرنے کے بعد شاہ جی کو ۱۵۰ روپے پر راضی کرلیا۔
سو روپے اس کو اسی وقت مل گئے، بقیہ ۵۰ کے لئے شاہ جی نے کہا کہ وہ تیسرے دن ادا کردے گا۔
رحمان سو روپے لے کر چلا گیا۔ شاہ جی کمرے کے اندر خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد
دُتّے واپس آگیا۔ شاہ جی نے پوچھا "کھانا کھلادیا؟"

دُتّے بڑی مستعدی سے بولا "ہاں جی"

"اچھا تو ذرا دونوں کو بلا کر لا"

دُتّے فوراً جا کر دونوں کو اپنے ہمراہ لے آیا۔ شاہ جی نے اُن کو دیکھ کر کسی قدر شفقت سے کہا "کھانا پیٹ بھر کر کھایا ہے؟"

اس تمام عرصہ میں نوشا پہلی مرتبہ بولا "خوب پیٹ بھر کر کھایا ہے"

وہ ہنسنے لگا۔ "ارے تو بھی بولنے لگا"

اس بات پر نوشا شرما گیا۔ شاہ جی بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ پوچھنے لگا "چائے پیوگے؟"
دونوں نے آمادگی کا اظہار کیا تو وہ دُتّے سے بولا۔

"او دُتّے، دو سنگل چائے منگوا"

راجہ کو سگرٹ کی طلب ستا رہی تھی۔ دبی زبان سے بولا "شاہ جی! ایک سگرٹ بھی منگوا دو"
وہ بڑے بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا "او تیرا خانہ خراب سگرٹ بھی پیتا ہے" پھر دُتّے سے بولا۔

"ان کے لئے پاسنگ شو کا ایک پاکٹ بھی لادے"

دونوں کے چہروں پر تازگی آگئی۔ شاہ جی اس وقت بادشاہ بنا ہوا تھا۔ کہنے لگا "اور کچھ" راجہ اور نوشا نے انکار میں گردن ہلادی۔ شاہ جی نے دونوں کا جائزہ لیا۔ ان کے لباس بڑے گندے ہو رہے تھے۔ راجہ ننگے پیر تھا۔ نوشا جوتا پہنے ہوئے تھا مگر اُس کی حالت بھی خستہ تھی۔ اگلے حصے سے انگوٹھا جھانک رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"کیوں جی تم دونوں کے پاس کپڑے وپڑے بھی ہیں"

دونوں ایک ساتھ بولے "نہیں"

"اچھا اچھا" شاہ جی ہمدردی سے بولا۔ اُس نے دُتّے کے لئے ایک اور حکم جاری کیا "کل ان کے لئے

دو دو شلواروں اور قمیصوں کا کپڑا بازار سے لے آنا۔ ماسٹر سے کہنا جلدی سی کر دو۔ اس کے علاوہ موچی گلی سے دو لشوری چپلیاں اور جناح کیپ ٹوپیاں بھی۔ ڈُتّے نواب بنا دے اُن کو۔"

وہ اُن کو نواب بنانے کے لئے ابھی اور نہ جانے کیا کچھ کرتا کہ اسی اثنا میں باہر سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر دروازہ بند ہوا۔ شاہ جی نے چوکنا ہو کر آواز کی آہٹ لی۔ باہر دالان میں بھاری بھاری قدموں کی آہٹ اُبھری۔ پھر کئی آدمیوں کی ملی جلی سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ سنائی پڑی۔ شاہ جی لنگی ٹانگ کے اوپر چڑھا کر، ایک ہاتھ سے ران کو زور زور سے کھجانے لگا اور اُن دونوں سے بولا۔

"تم جا کر اب سو جاؤ۔ او ڈُتّے ان کو سونے کی جگہ بتا دے۔"

دونوں ڈُتّے کے ہمراہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔

۳

نوشا کے اچانک غائب ہو جانے سے گھر بھر میں کھلبلی پڑ گئی۔

رات کو جب وہ واپس نہیں لوٹا تو سویرے ہی سویرے ماں نے پوچھا "ارے یہ نوشا اب تک نہیں آیا؟" کوئی اس کی بات کا کیا جواب دیتا۔ وہ جھنجھلا کر نوشا کو کوسنے دینے لگی اور دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ دن چڑھ آیا۔ ہر طرف دھوپ پھیل گئی۔ انو کتابیں سنبھال کر اسکول چلا گیا۔ گلی میں پھیری لگانے والوں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ محلّے کے بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ لیکن نوشا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ماں نے بڑبڑانا بند کر دیا تھا۔ اب اس کو تشویش ہونے لگی۔ بار بار دروازے کی جانب نظر اُٹھ جاتی۔ آج تک نوشا اتنی دیر تک کبھی گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔ اُسے رہ رہ کر رات کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ہر بار وہ سوچتی کہیں وہ سچ مچ ناراض ہو کر کسی طرف چلا تو نہیں گیا۔ اپنے اس خدشہ کا اظہار اُس نے سلطانہ سے بھی نہیں کیا جو دالان میں بیٹھی بیڑی کے پتے تراش رہی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں ساری آئی گئی اُس کے سر نہ جائے۔ جب وہ یہ بات سوچتی تو دل ہی دل میں نوشا کو کوسنے دیتی۔ حرامی نے خواہ مخواہ پریشانی میں ڈال دیا۔ نہ جانے کہاں واہی تباہی گھوم رہا ہوگا۔

اسی اُدھیڑ بن میں دوپہر ہو گئی۔ کسی کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ گلی میں کسی کی آواز اُبھرتی وہ چونک پڑتی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی اور اُس کے کان کھڑے ہوتے۔ سلطانہ بھی اب پریشان ہو گئی تھی۔ دونوں ماں بیٹی بیٹھ کر قیاس آرائیاں کرنے لگیں کہ نوشا کہاں ہو سکتا ہے جس قدر وہ سوچتیں اُسی

قدر دل میں نئے نئے وسوسے پیدا ہوتے۔ بہت دیر بعد اسکول سے انّو واپس آیا تو ماں نے اُس کو فوراً نوشا کی تلاش میں بھیج دیا اور خود بیٹھ کر اُس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

گھنٹہ بھر بعد انّو آیا تو وہ اکیلا تھا۔ اُس کو تنہا دیکھ کر ماں کے دل پر گھونسا سا لگا۔ انّو کا چہرہ دھوپ کی تمازت سے تمتما رہا تھا۔ بالوں پر گرد اور آنکھوں میں تھکن تھی۔ وہ صبح کا بھوکا پیاسا تھا۔ ماں نے اُس کو کھانا نکال کر دیا مگر خود کچھ بھی نہ کھایا۔ نڈھال ہو کر کمرے کے اندر جا کر لیٹ گئی۔

شام ہونے سے کچھ دیر پیشتر سلمان آیا۔ ماں نے نوشا کی گم شدگی کی اس کو بھی اطلاع دی۔ وہ اُسی وقت انّو کو اپنے ہمراہ لے کر نوشا کی تلاش میں نکل گیا۔ جہاں جہاں اُس کے اڈّے تھے، ہر جگہ اُس کو ڈھونڈا۔ محلّے کے ہر لڑکے سے دریافت کیا۔ کسی نے کوئی سراغ نہ دیا۔ شامی سے بھی اُنھوں نے دریافت کیا مگر وہ ڈر کے مارے صاف جھوٹ بول گیا۔ کہنے لگا "میں نے تو اُس کو ہفتہ بھر سے نہیں دیکھا"

بہت دیر تک وہ جگہ جگہ نوشا کو تلاش کرتے رہے۔ شام کا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا۔ روشنیاں جھلملانے لگیں۔ مگر نوشا کی کوئی خبر نہ ملی۔

جب سلمان، انّو کے ساتھ واپس پہنچا تو گھر بھر میں کہرام بپا ہو گیا۔ ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کمرے کے اندر سے سُلطانہ کی سسکیوں کی آواز اُبھر رہی تھی۔ سلمان سر جھکائے دالان میں خاموش بیٹھا تھا۔ لیمپ کی یرقان زدہ زرد روشنی میں سب کے چہرے پر چھائیوں کی طرح دھندلے نظر آ رہے تھے۔

سلمان کچھ دیر ٹھہر کر چلا گیا۔

اُس روز گھر بھر میں کسی نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ انّو تو دیوار کے پاس اونگھتے اونگھتے سو گیا مگر سلطانہ اور اُس کی ماں کو نیند نہ آئی۔ رات کا سنّاٹا بڑھتا جا رہا تھا۔ گلی کی چہل پہل ختم ہوتی جا رہی تھی اور کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں اونچی ہوتی جا رہی تھیں۔ گھر پر موت کی سی ویرانی چھائی تھی۔ پھر اس سکوت میں ماں کی آواز اُبھری۔

"بیٹی اللہ سے دعا کرو"

ماں نے آنسو پونچھے اور اسی وقت جا کر غسل کیا۔ دُھلے ہوئے اُجلے کپڑے پہنے اور مصلا بچھا کر

نماز پڑھنے لگی۔ سلطانہ بھی وضو کر کے اُس کے پاس آ گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر ماں دیر تک سجدے میں پڑی رو رو کر دعائیں مانگتی رہی۔ سلطانہ کلام پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔

جب رات آدھی ہو گئی اور ہر طرف ہو کا عالم طاری ہو گیا تو ماں سلطانہ کے ساتھ باہر صحن میں آ گئی اور آسمان کے نیچے برہنہ سر ہو کر دونوں کلپ کلپ کر دُعائیں مانگنے لگیں۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ کبھی کبھی ماں بے قرار ہو کر اونچی آواز سے کہتی۔ "اللہ میں بہت مصیبت زدہ ہوں۔ میرے بچّے کو مجھ سے ملا دے۔ میں رانڈ بیوہ ہوں۔ میرا کوئی سہارا نہیں، میرا کوئی نہیں۔ ہائے میرا کوئی بھی تو نہیں" وہ بے اختیار رونے لگتی۔ سلطانہ کی آواز بھی بھرّا جاتی۔ اس کی سسکیاں اُبھرنے لگتیں۔

آسمان پر تارے آنسوؤں کے قطروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ رات ڈھلتی گئی۔ ستاروں کی رنگت کافوری پڑ گئی۔ ہوا سرد ہو گئی، اوس سے در و دیوار بھیگ گئے۔ اور وہ دونوں برہنہ سر صحن میں ٹہل ٹہل کر دعائیں مانگتی رہیں، گڑگڑاتی رہیں، اشک بہاتی رہیں۔

ساری رات ان دونوں کی بڑی پریشانی اور دُکھ میں گذری۔ پھر کئی راتیں اسی عالم میں گذریں۔ ماں نے رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا۔ وہ ہر وقت چُپ چاپ بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھی ٹھنڈی سانس بھر کر بے خیالی میں کہتی "یا اللہ میرا بچہ نہ جانے کہاں ہو گا۔ ہائے یہ کیا ہو گیا؟" اکثر ایسا بھی ہوتا کہ وہ بیٹھے بیٹھے خود کو کوسنے لگتی۔ نوشا کے چلے جانے کا اس کو بے حد صدمہ تھا۔ اُس نے نوشا کو بڑے ناز و نعم سے پالا تھا اور ضرورت سے زیادہ اُس کا لاڈ کیا تھا۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ سلطانہ کے بعد اس کے دو لڑکے پیدا ہوئے مگر سال، سال، ڈیڑھ ڈیڑھ سال زندہ رہ کر فوت ہو گئے۔ نوشا بھی بچپن میں دائم المریض تھا اس کا علاج کرانے کے لئے اُس نے نہ جانے کیا کیا جتن کئے تھے۔

ان ہی دنوں ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ بیڑی کے کارخانے میں ہڑتال ہو گئی اور آمدنی کا سلسلہ اچانک منقطع ہو گیا۔ یہ بہت بڑی مار تھی۔ ایسی ٹھوکر لگی کہ وہ اُف بھی نہ کر سکی۔ صرف ایک ہی خیال بار بار ذہن میں شبہ بن کر اُبھرتا تھا "اب کیا ہو گا؟" ہوتا کیا چند ہی روز میں فاقہ کشی کی نوبت آ گئی۔

نیاز ان دنوں اپنے کسی کام سے کوئٹہ گیا ہوا تھا۔ البتہ سلمان اکثر آتا رہتا۔ مگر وہ بھی کچھ پریشان پریشان سا نظر آتا۔ لباس میں بے نیازی، بال اُلجھے ہوئے اور آنکھوں میں کسی دبے ہوئے کرب کے

نشانات صاف نظر آتے۔ عام طور پر وہ خاموش رہتا۔ گھڑی دو گھڑی بات کرتا، وہ بھی انّو کے بارے میں۔ اُس کا ارادہ تھا کہ انّو کو کسی اچھے اسکول میں داخل کرا دیا جائے اور اُس کو اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔ انّو اگر موجود ہوتا تو وہ اس کو بُلا کر پڑھائی کے متعلق پوچھتا۔ کتابیں منگواتا اور دیر تک اس کو بٹھا پڑھایا کرتا۔ اس عرصہ میں کبھی کبھار سلطانہ کی جھلک نظر آجاتی۔ یہ ایک لمحہ اُس کو بڑا حسین معلوم ہوتا جیسے خوشبو سے مہکتا ہوا ہوا کا کوئی جھونکا پاس سے گذر جائے۔

شام کا وقت تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ گھر پر موت کی سی ویرانی چھائی تھی۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں سب لوگ خاموش بیٹھے تھے۔ گھر میں صبح سے کچھ نہیں پکا تھا۔ نقاہت کے باعث سب کی طبیعتیں نڈھال ہو رہی تھیں۔

ماں بُت بنی کھوئی کھوئی نظروں سے آنگن کی دیوار کو تک رہی تھی، جس پر برابر والے مکان میں لگے ہوئے شیشم کے درخت کا مہیب سایہ، ہوا کے جھونکوں کے ساتھ لہرا رہا تھا۔ ابھی ابھی وہ انّو کو مار کر بیٹھی تھی، جو بھوک کے مارے۔ رونے لگا تھا اور اُس کو سمجھانے پر بھی رو رہا تھا۔ اب وہ کمرے کے اندر پڑا ہوا سسکیاں بھر رہا تھا۔ مارنے کو تو وہ اس کو مار بیٹھی مگر اب خود کو ملامت کر رہی تھی۔ اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔ سلمان آیا تھا۔ ماں نے اُس کو اندر بُلا لیا۔ اُس کو دیکھ کر وہ ایک بارگی گھبرا گئی۔ سلمان کی قمیص پر جگہ جگہ خون کے سُرخ سُرخ دھبے تھے۔ ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی اور بال بکھر کر چہرے پر آگئے تھے۔ اُس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ارے یہ کیا ہو گیا؟"

وہ بے نیازی سے بولا "تانگہ سے آرہا تھا، سڑک گیلی تھی، گھوڑے کا پیر پھسل گیا۔ تانگہ اُلٹنے سے چوٹ آگئی"۔ مگر یہ چوٹ تانگہ اُلٹنے کی نہیں لگتی تھی۔ اُس کی لال لال آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ کسی سے لڑ کر آیا ہے۔ لیکن نوشا کی ماں کو اُس کی بات پر یقین آگیا۔

ماں نے جلدی سے سلطانہ کو باورچی خانے میں بھیج کر پانی گرم کروایا اور اُس کے بازو اور کندھے پر جو زخم تھے اُن کو اپنے ہاتھ سے صاف کرنے لگی۔ بارش ایکا ایکی تیز ہو گئی اور پانی کے موٹے موٹے قطرے شور کرتے ہوئے برسنے لگے۔

رات اور گہری ہو گئی۔ موسلا دھار بارش برابر ہوتی رہی۔ ہوا کے جھکڑ سیٹیاں بجاتے ہوئے چل رہے تھے۔ ایسی طوفانی رات میں سلمان کے جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔ وہ گھر جانے کے لئے اصرار کرتا رہا مگر نوشا کی ماں نے اس کی ایک نہ سنی اور دالان میں چارپائی بچھا کر وہاں اس کا بستر لگا دیا۔ کچھ دیر تک وہ بستر پر لیٹا باتیں کرتا رہا مگر زخموں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اس لئے وہ زیادہ دیر تک باتیں نہ کر سکا اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ماں اٹھ کر کمرے کے اندر جا کر لیٹ گئی۔ بارش کے قطرے شیشم کے پتوں پر بجتے رہے۔ اور ہوا کی تیز سرسراہٹیں رک رک کر ابھرتی رہیں۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب بارش کا زور ٹوٹا مینہ برسنا بند ہو گیا تھا۔ لیکن ہوا تیز چلتی رہی اور بادل رہ رہ کر گرجتے۔ ایکا ایکی رات کے سناٹے میں دروازے پر نیاز کی آواز سنائی پڑی۔ نوشا کی ماں تذبذب میں پڑ گئی کہ اس وقت نیاز کو گھر کے اندر بلا یا جائے یا نہ بلایا جائے۔ سلمان کو دیکھ کر وہ نہ جانے کیا سوچے۔ مزاج کا وہ یوں بھی تنکی تھا۔ خدا معلوم کیا ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔ وہ خاموش لیٹی یہی سوچ رہی تھی کہ نیاز اونچی آواز سے اس کو پکارنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کو ناراض بھی کرنا نہ چاہتی تھی۔

بادلِ ناخواستہ نوشا کی ماں نے خود اٹھ کر دروازہ کھولا۔ نیاز گھر کے اندر آگیا۔ سلمان کو دالان میں لیٹا ہوا دیکھ کر بولا "یہ کون لیٹا ہے ؟"

سلمان نے نیاز کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ ایک بارگی گھبرا گیا کہ اگر اس نے یہاں اس کو دیکھ لیا تو بہت برا ہو گا۔ اس لئے کہ اس گھر میں اس کا جو بھرم قائم تھا، وہ فوراً خاک میں مل جائے گا۔ نیاز اس کے سارے حالات نوشا کی ماں سے بتا دے گا۔ اور وہ یہ کسی قیمت پر نہ چاہتا تھا کہ یہ باتیں اس کو معلوم ہوں۔ وہ سہما ہوا دم سادھے چپ چاپ لیٹا رہا اور آنے والے حادثہ کا انتظار کرنے لگا۔

نیاز کے اچانک استفسار پر نوشا کی ماں لمحہ بھر کے لئے گھبرائی لیکن فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور جلدی سے بولی "بھائی اچھن کا منجھلا لڑکا ہے"۔ خیریت یہ ہوئی کہ اس نے سلمان کا نام نہیں بتایا۔ لیکن نیاز کسی بھائی اچھن کو نہیں جانتا تھا لحظہ بھر کے لئے اس نے غور کرنے کی

کوشش کی اور پھر بولا "کون بھائی اچھن ؟"

وہ اس کے سوال کے لئے تیار تھی۔ فوراً بولی "اے وہی خالہ ہمزی کے بڑے بیٹے اور کون"

لمحہ بھر اُس نے توقف کیا۔ "مگر تم نے اُن کو کہاں دیکھا ہوگا"۔

نیاز کہنے لگا "یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں"۔

"وہ جب سے پاکستان آئے ہیں، ملتان ہی میں ہیں۔ کبھی یہاں آتے تو تم سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ یہ لڑکا کل آیا تھا۔ شام تک اچھا بھلا تھا۔ اس وقت بخار میں بھُن رہا ہے"۔

نیاز نے حیرت سے کہا "ارے۔ بارش میں تو نہیں بھیگ گیا؟" یہ کہکر وہ سلمان کی طرف بڑھا۔ اور قریب جاکر اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھکر بخار کا اندازہ لگایا۔ سلمان کی سانس لحظہ بھر کے لئے رک گئی۔

نیاز کہنے لگا "ارے اس کو تو بڑا تیز بخار ہے" یہ کہتے کہتے اُس نے سلمان کو غور سے دیکھا جو دیوار کی طرف منہ موڑے پڑا تھا۔ ایک بارگی نیاز کو کچھ شبہ ہوا مگر سلمان کے چہرے پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس لئے وہ اُس کو پہچان نہ سکا۔

نوشا کی ماں نے جلدی سے بات کا رخ پلٹ دیا اور نوشا کے اچانک گھر سے چلے جانے کی خبر اس کو سُنانے لگی۔ مگر نیاز نے اس بات پر کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ بے نیازی سے بولا۔

"وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ آوارہ ہو گیا ہے۔ اچھا ہے کچھ دن ٹھوکریں کھائے گا تو ساری آوارہ گردی نکل جائے گی"۔

نوشا کی ماں کو نیاز کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ وہ اُس سے ہمدردی کے دو بول سننے کی خواہشمند تھی۔ نیاز۔ نوشا کے ذکر کو نظر انداز کر کے کوئٹہ کی باتیں بتانے لگا۔ وہ چُپ چاپ بیٹھی سب کچھ سنتی رہی

نیاز زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُٹھ کر چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد سلمان نے اطمینان کی سانس لی۔ جتنی دیر تک نیاز بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اتنی دیر تک اُس کی جان سولی پر لٹکی رہی۔ اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آئندہ اس گھر میں آتے وقت اُس کو احتیاط برتنا چاہیے۔ یہ تو ان کی باتوں سے واضح ہو چکا تھا کہ نیاز، نوشا کی ماں کا رشتہ دار

ہے اور وہ بہانے سے اُس کی آمد و رفت چھپانا چاہتی تھی۔ یہی اُس کے حق میں بہتر ہو اور نہ وہ دوبارہ اس گھر میں آنے کے قابل نہ رہتا۔

وہ دیر تک اسی طرح لیٹا ہوا سوچتا رہا۔ رات آہستہ آہستہ گذرتی گئی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ بادل ایک بار زور سے گرجے اور پھر تیز بارش شروع ہو گئی۔ پانی کے قطرے چھت پر شور مچانے لگے۔ سلمان کبھی کبھار درد سے کراہنے لگتا۔ بخار اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ اس کا تمام جسم بھٹی کی طرح تپ رہا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے سُلگ رہے تھے اور سر میں شدید درد تھا۔ اچانک اُس نے اپنے قریب گہری گہری سانسوں کی سرسراہٹ محسوس کی۔ اُس نے کروٹ نہیں بدلی، خاموش لیٹا رہا۔ البتہ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں سامنے دیوار پر ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ کوئی اُس کے سرہانے جھکا ہوا کھڑا تھا۔ پھر اُس کو اپنے رخسار پر ٹھنڈک سی محسوس ہوئی۔ ایک ہاتھ اُس کے چہرہ پر آ کر رک گیا تھا۔ وہ بے قرار ہو کر آہستہ سے بولا۔

"سلطانہ!"

"شی" سلطانہ نے اُس کو خاموش کر دیا۔

سلمان نے اپنا جلتا ہوا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر اُس نے سلطانہ کا نرم نرم ہاتھ ہونٹوں کے پاس لا کر چوم لیا۔ سلطانہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ چُپ چاپ اُس کے پلنگ کے قریب کھڑی رہی۔ باہر تیز بارش ہوتی رہی۔ ہوا شیشم کے پتوں میں سیٹیاں بجاتی ہوئی گذرتی، بادل زور زور سے گرجتے۔

ایکا ایکی کمرے کے اندر ماں کے کروٹ بدلنے کی آواز اُبھری۔ سلطانہ نے سلمان کے چہرے پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا اور وہاں سے الگ ہٹ گئی۔ نہ جانے وہ کب کمرے کے اندر جا کر اپنے بستر پر لیٹی۔ کب اس کو نیند آئی۔ سلمان کو کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ وہ دیر تک خاموش لیٹا سلطانہ کے دوبارہ آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ پھر وہاں نہ آئی۔

صبح ہوئی تو سلمان کا بخار ہلکا پڑ گیا تھا۔ زخموں میں ٹیس بھی کم تھی۔ اب وہاں ٹھہرنا مناسب نہ تھا۔ لہذا وہ سویرے ہی سویرے نوشا کے گھر سے چلا آیا۔

۴

بیڑی کے کارخانے کی ہڑتال طول پکڑتی جا رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی نوشا کی ماں کی پریشانیاں بڑھتی گئیں۔ کئی کئی وقت کے فاقہ پڑ جاتے، گھر میں گرہستی ہی کون سی تھی، تھوڑا بہت جو ساز و سامان تھا وہ بازار میں فروخت ہونے لگا تھا۔ کوئی ایسا کام نہیں مل رہا تھا، جس کے ذریعہ پیٹ پالا جا سکے سلائی کی مشین پاس ہوتی تو پاس پڑوس کے کپڑے سی پرو کر بھی گزارہ کیا جاتا۔ اس کو خریدنے کے لئے نوشا کی ماں نے کئی بار رقم جوڑی مگر کوئی نہ کوئی ایسا خرچ نکل آتا کہ ساری جمع کی ہوئی پونجی صرف ہو جاتی۔

وہ بستر پر لیٹی ہوئی ان ہی باتوں کو سوچ رہی تھی۔ اس کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ سلطانہ اور انو کب کے سو گئے تھے اور وہ خاموش پڑی رات کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ اسی اثنا میں نیاز آ گیا۔ وہ کئی روز بعد آیا تھا۔ اس وقت وہ بڑا خوش خوش تھا۔ بات بات پر ہنس رہا تھا۔ بہت سے سامان سے لدا پھندا آیا تھا، جس میں مٹھائی تھی۔ پھل تھے اور سنگھار کی کچھ اشیا تھیں۔ آتے ہی سارے بنڈل اُس نے نوشا کی ماں کی گود میں ڈال دیئے اور چارپائی پر اطمینان سے بیٹھ کر بولا۔

"آج تو میں بہت تھک گیا ہوں"

وہ بولی "کیوں خیریت تو ہے۔ کہاں سے تھکے ہارے آ رہے ہو؟"

کہنے لگا "بس کچھ پوچھو نا۔ پہلے تم مجھے پانی پلاؤ۔ پیاس کے مارے گلا سوکھ رہا ہے"

وہ فوراً پانی لے کر آئی۔ نیاز واقعی بہت پیاسا تھا۔ پورا گلاس ایک ہی سانس میں غٹاغٹ چڑھا گیا۔ پانی پی کر وہ تھکا ہوا سا بستر پر لیٹ گیا۔ نوشا کی ماں، نیاز کے لائے ہوئے سامان کو کھول کر دیکھنے لگی۔ شام کو گھر میں کچھ پکا نہیں تھا۔ سلطانہ اور انو بھوکے سو رہے تھے۔ اُس نے سوچا کہ دونوں

کو جگا کر کچھ کھلا دے۔ مگر جب اُس نے اپنے اس ارادہ کا نیاز پر اظہار کیا تو اُس نے منع کر دیا۔ کہنے لگا۔

"مجھکو تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ سب اٹھ جائیں گے تو بات کرنے کا موقعہ نہ ملے گا"

وہ چپ ہو گئی۔ اس کے بعد نیاز پلنگ اٹھا کر باہر صحن میں لے گیا اور وہ دونوں وہیں بیٹھکر باتیں کرنے لگے۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ دور تک ستاروں کی افشاں بکھری ہوئی تھی۔ نرم نرم ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ فضا میں خنکی تھی مگر ناگوار نہیں گذر رہی تھی۔ نیاز نے ایک بار گی اُس کا ہاتھ محبت سے تھام لیا اور بڑے اعتماد سے بولا۔

"آج میں یہ طے کر کے آیا ہوں کہ مجھکو ہاں یا نا کا جواب دیدو"

وہ دبی زبان سے کہنے لگی: "کچھ دن اور ٹھہر جاتے تو اچھا تھا"

وہ اور بھی جذباتی ہو گیا "تم ہر بار یہی کہہ دیتی ہو۔ اسی آج و کل میں کئی مہینے ہو گئے":

وہ کسی قدر ناز سے بولی۔ "کئی مہینے؟ اے توبہ کرو"

وہ کہنے لگا "بس اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ پرسوں جمعہ ہے۔ مبارک دن ہے۔ اسی روز نکاح ہو جانا چاہیے":

نوشا کی ماں گھبرا کر بولی۔ "ارے، ارے اتنی جلدی"

نیاز نے بڑے پیار سے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا اور رخساروں کو تھپتھپا کر بولا۔

"مجھ سے تو اب گھڑی بھر کو بھی تم سے الگ نہیں رہا جاتا۔ میری یہ بات تم کو ماننا ہی پڑے گی"

نوشا کی ماں نے کچھ کہنا چاہا تو اُس نے جھٹ سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "تم کو میری جان کی قسم جو انکار کیا۔ بس اب یہ پروگرام طے ہو گیا"

اُس نے چاہا کہ حسب معمول اس وقت بھی نیاز کو ٹال دے مگر وہ اُس کے سر ہو گیا۔ بگڑ کر بولا "اگر اس جمعہ کو نکاح نہیں ہو سکتا تو پھر کبھی نہ ہو گا"

حالات کچھ اس قدر خراب تھے کہ وہ اس کی اس دھمکی کا مقابلہ نہ کر سکی۔ روز روز کی فاقہ کشی اور دوسری گھریلو پریشانیوں نے اس کو بے بس کر دیا تھا۔ اُس سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ چپ چاپ اُس کی

بات مان لی۔

نیاز نے اُسی وقت ضروری اخراجات کے لئے جیب سے نکال کر دو سو روپے دیئے اور پورا پروگرام بتادیا "جمعہ کے دن عصر کے وقت میں قاضی جی کو لے کر آجاؤں گا۔ میرے خیال میں یہ سب سے مناسب وقت رہے گا۔ میرے ساتھ ایک یا دو آدمی اور ہوں گے۔ تم سارا بندوبست کر لینا جی چاہے تو پڑوس سے کسی بڑی بوڑھی کو بھی بلا لینا۔"

وہ گویا ساری اسکیم پہلے ہی سے تیار کر کے آیا تھا۔ ایک ایک بات بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ نوشا کی ماں چپ چاپ بیٹھی اُس کی باتیں سنتی رہی۔

جب ساری باتیں طے ہوگئیں تو وہ خلاف توقع رات ہی کو اٹھ کر چلا گیا۔

نوشا کی ماں نے حامی تو بھر لی مگر بے چینی کے باعث رات بھر جاگتی رہی۔ نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ اُس کو سب سے زیادہ فکر سلطانہ کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سلطانہ میں نیاز کی دلچسپی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ نکاح ہو جانے کے بعد وہ سلطانہ سے اُس کا پردہ بھی نہ کر سکے گی۔ ہر وقت کا ساتھ رہے گا۔ اس میں سلطانہ کی زندگی بھی تباہ ہو جانے کا خوف تھا اور خود اُس کے لئے بھی خطرہ تھا۔

دوسرے دن بھی وہ اسی ادھیڑبن میں رہی۔ کوئی صورت نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بار بار خاموش نظروں سے سلطانہ کو دیکھتی اُس کی بپھری ہوئی جوانی کو اس کے نکھرتے ہوئے حسن کی دلکشی کو، اور ہر بار وہ آنے والے خطرے کے احساس سے کانپ اٹھتی۔ اب صرف ایک دن اور ایک رات باقی رہ گئی تھی۔ پھر یہ بھی مسئلہ سامنے تھا کہ اس بات کو اب سلطانہ سے چھپایا بھی نہیں جا سکتا اور یہ بات وہ اس سے کہتی بھی تو کس طرح۔ زندگی میں پہلی بار وہ خود اپنی بیٹی سے ڈر رہی تھی۔ اس سے بات کرتے ہوئے اُسے خوف معلوم ہو رہا تھا۔ آخر بہت جھجکتے ہوئے اُس نے سلطانہ کو اپنے قریب بلا یا۔ وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ کئی لمحے گذر گئے مگر ماں سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ بہت دیر بعد اُس نے دبی زبان سے کہا۔

"تم سے ایک بات کہنا تھی۔"

ماں کے بدلے ہوئے لہجہ پر سلطانہ کو ذرا سا تعجب ہوا۔ پوچھنے لگی "کیا بات ہے اماں"

وہ بولی "کیا بتاؤں کیا بات ہے!" وہ آگے نہ کہہ سکی۔ سلطانہ نے جلدی سے پوچھا۔

"کیا کوئی خاص بات ہے؟"

ماں کہنے لگی "کل رات نیاز آیا تھا" سلطانہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں ماں نے اس کا رشتہ نیاز سے تو طے نہیں کر دیا۔ اُس نے سہمی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

ماں نے آہستہ سے کہا "وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"اچھا!" سلطانہ کی سانس حلق میں آکر رُک گئی۔ اُس نے لرزتے ہوئے پوچھا "کس سے؟"

ماں نے نظریں نیچی کر کے کہا "میرے ساتھ" اور یہ کہتے کہتے اُس کا چہرہ پسینہ سے شرابور ہو گیا۔

ہائیں! سلطانہ حیرت سے دم بخود رہ گئی۔ اس کا جسم اس طرح جھنجھنایا جیسے کہیں قریب ہی چینی کی پلیٹ گر کر چکنا چور ہو گئی ہے۔ اُس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا' ماں بھی چپ ہو گئی۔ کہنا تو اس کو ابھی بہت کچھ تھا۔ اپنی مجبوریوں کا اظہار کرنا تھا اور بیٹی سے معذرت کرنا تھی' مگر وہ صرف اس قدر کہہ سکی

"جمعہ کو فجر کے وقت نکاح ہے"

یہ بات اُس نے اس طرح کہی' جیسے کنوئیں کے اندر منہ ڈال کر بول رہی ہو۔ اس کے بعد وہ زیادہ دیر تک سلطانہ کے پاس نہ بیٹھ سکی۔ سلطانہ سوچتی ہی رہ گئی کہ وہ کیا کہے کہ اس اثنا میں ماں اُٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی اور ٹرنک کھول کر سامان الٹنے پلٹنے لگی۔

چند منٹ بعد وہ باہر نکلی تو سلطانہ سے نظریں ملائے بغیر بولی "میں ایک کام سے بڑی ممانی کے ہاں جا رہی ہوں" اور یہ کہتی ہوئی گھر سے باہر چلی گئی۔ سلطانہ اُس کو دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی۔ انو اسکول جا چکا تھا۔ سلطانہ گھر میں تنہا رہ گئی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی۔ یا اللہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے والا ہے؟ ایک نامعلوم خوف کے احساس سے وہ بار بار کانپ اٹھتی۔ اسی دوران میں سلمان نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پہلے تو وہ جھجکی' پھر ہمت کر کے اُس کو اندر بلا لیا۔

سلمان حسب معمول کمرے کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد دروازے پر سلطانہ کا چہرہ نظر آیا مگر وہ کمرے کے اندر نہ آئی۔ دہلیز سے لگی کھڑی رہی۔ اس وقت وہ بڑی افسردہ نظر آ رہی تھی۔ کھوئی کھوئی آنکھیں اور رخساروں پر ڈھلتی رات کی سی دُھند۔ اُس نے نظر بھر کر سلمان کو دیکھا اور سوچنے لگی کہ اب آئندہ وہ اُس سے نہ مل سکے گی۔ اس لئے کہ کل نیاز اُس کا سوتیلا باپ بن جائے گا' اور جب وہ اُس کا

سوتیلا باپ بن جائے گا تو یہ گھر اُس کا ہو جائے گا۔ وہ کسی صورت میں سلمان کو اپنے گھر میں آنے نہ دے گا۔

سلمان اٹھ کر اُس کے قریب آ گیا اور محبت سے اُس کے رخسار کو تھپتھپا کر بولا۔ "کیا بات ہے تم بہت اُداس لگ رہی ہو۔ اماں نے کچھ کہا ہے۔"

وہ آہستہ سے بولی "نہیں۔"

"تو پھر بات کیا ہے؟"

مگر وہ کچھ نہ بولی اور ایک بارگی اُس کے سینہ سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ وہ پیار سے اُس کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔ دونوں اسی طرح بہت کھڑے تھے کہ اتنے میں ماں دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ دونوں کو اس کی آہٹ کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ اُس نے جوان کو اس عالم میں دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئی لمحہ بھر تک وہیں دروازے کے قریب ٹھٹکی ہوئی گم صم کھڑی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر باہر چلی گئی۔ دروازہ باہر سے بند کیا اور خواہ مخواہ کواڑ کھٹکھٹانے لگی۔

ذرا دیر بعد خود ہی دروازہ کھول کر بڑبڑاتی ہوئی اندر آئی۔ "اے لو دروازہ تو کھلا ہے میں سمجھی کہ اندر سے بند ہے۔ نہ جانے میری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔"

سلطانہ اب وہاں سے ہٹ آئی تھی اور دالان کے نکڑ پر کھڑی جلدی جلدی آنسو پونچھ رہی تھی۔ سلمان کمرے کے اندر جا چکا تھا۔ ماں سیدھی وہیں پہنچی اور سلمان کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"ارے تم کب آئے؟"

"بس ابھی آیا تھا۔"

وہ کہنے لگی "آج تو بڑا حبس ہو رہا ہے۔ یہاں تو بڑی گرمی ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے دروازے سے منہ نکال کر سلطانہ کو مخاطب کیا اور اُس سے بولی "سلطانہ تم ذرا ہمسائی کے یہاں چلی جاؤ۔"

سلطانہ نے وہیں سے جواب دیا "جی اچھا" اور صحن کو عبور کر کے گھر سے باہر چلی گئی۔

اُس کے جانے کے بعد نوشا کی ماں نے سلمان سے کہا "یہاں دالان میں آ جاؤ۔ اندر تو دم بڑا رہا ہوگا۔"

سلمان خاموشی سے اٹھ کر باہر آگیا۔ نوشا کی ماں پلنگ پر تھکی ہوئی سی بیٹھ گئی۔ ذرا دیر سکوت طاری رہا۔ وہ چُپ چاپ بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔ پھر اچانک بولی "میں تو ایسے چکر میں پھنس گئی ہوں کہ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا کروں" ؟

وہ پوچھنے لگا "خیریت تو ہے ؟"

وہ کہنے لگی "اب تم کو کیا بتاؤں کہ کس پریشانی میں گرفتار ہوں۔"

سلمان اصرار کرنے لگا "کوئی خاص بات ہے" ؟

بولی "ہاں خاص ہی بات ہے۔ اب تم سے کیا پردہ۔ بات یہ ہے کہ سلطانہ کا بیاہ ہو رہا ہے۔"

یہ کہکر اُس نے کنکھیوں سے سلمان کے ردِعمل کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ وہ اس کے لئے قطعی تیار نہ تھا۔ اُس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ گھبرا کر بولا۔

"کب ؟"

"کل" اُس نے جواب میں صرف ایک لفظ کہا۔ وہ برابر سلمان کی ہر حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ اُس نے غور کیا کہ اس دفعہ گھبراہٹ کے بجائے حیرت کا اظہار زیادہ تھا۔ سلمان کہہ رہا تھا۔

"کل یعنی جمعہ کو، آپ نے پہلے نہیں بتایا"

وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگی "میں خود بھی اتنی جلدی نہیں چاہتی تھی مگر خاندان کے بڑے بوڑھوں نے مجبور کر کے دن اور تاریخ مقرر کر دی۔"

سلمان کا چہرہ رفتہ رفتہ اُداس ہوتا گیا۔ وہ تھکے ہوئے لہجہ میں بولا "کہاں رشتہ کیا ہے ؟"

"خاندان ہی کا لڑکا ہے۔ برسرِ روزگار ہے۔ مزاج بھی اچھا ہے۔"

سلمان زیادہ دیر تک اس کی تعریف نہ سُن سکا۔ بات کاٹ کر بولا "خدا مبارک کرے" اس نے بڑا رسمی سا جملہ کہا اور چپ ہو گیا۔ نوشا کی ماں نے بھی کوئی بات نہ کی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ سلمان اب بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اسی عالم میں وہ ایک بارگی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا تو اب میں چلوں گا"

"بیٹھو چلے جانا"

مگر اب وہ وہاں لمحہ بھر ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ نوشا کی ماں چاہتی تھی کہ وہ کچھ دیر اور ٹھیرے۔ کچھ بات چیت ہو اور اُس نے ابھی ابھی جو صاف جھوٹ بولا تھا اس کا کچھ نتیجہ برآمد ہو۔ مگر سلطان نے اس کا موقعہ ہی نہ دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔ اس وقت وہ کچھ عجیب اُول جلول لگ رہا تھا۔

وہاں سے نکل کر راستہ میں، وہ صرف سگرٹ خریدنے کے لیے ٹھہرا اور سیدھا اپنے کمرے میں جا کر یوں گر پڑا جیسے مدت کا بیمار ہو۔ اُس نے نہ جوتا اُتارا، نہ کپڑے تبدیل کیے۔ بس خاموش لیٹا چھت کو تکتا رہا اور لگاتار سگرٹ پیتا رہا۔ یہ عجیب سا غم تھا، عجیب سا احساس تھا، ایسا بوجھ جس سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اپنی بے پرواہ زندگی میں، اس سے قبل اُس نے، سلطانہ کی اس قدر اہمیت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ اس کو صرف ایک عام سی لڑکی سمجھتا تھا، جو جوان تھی، الھڑ تھی، خوبصورت تھی اور آج اچانک وہ معمولی لڑکی، غیر معمولی لڑکی بن گئی تھی۔ سوچتے سوچتے وہ بار بار چونک پڑتا۔ دل سے ہوک اُٹھتی۔ کوئی اُس کے وجود میں بار بار چیختا۔

"یہ کیا ہو گیا؟"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اور اُس کا تمام وجود سوالیہ نشان بن جاتا۔

شام تک وہ اسی کرب، اسی دکھ میں مبتلا رہا۔ بے چینی سے پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ سگرٹیں پھونکتے پھونکتے اس کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ ہونٹ جلنے لگے تھے۔ جب کمرے کے اندر اندھیرا پھیل گیا تو اُس نے اُٹھ کر کئی گلاس پانی کے پیئے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ بازار میں چہل پہل تھی اور انسانی آوازوں کا شور تھا۔ زندگی ہنس رہی تھی، نکھر رہی تھی، گرمیوں کی شام کا حسن اپنے جوبن پر تھا۔

اُس نے بازار کا ایک چکر لگایا۔ کچھ دیر سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ ذرا دیر بعد اُس نے دیکھا کہ وہ

نوشا کے دروازے پر کھڑا تھا۔ نوشا کی ماں نے اُس کو فوراً اندر بلوالیا۔ وہ جیسے اس کا انتظار ہی کررہی تھی۔ اس کا اُترا ہوا چہرہ دیکھکر بولی۔

"کیسی طبیعت ہے؟"

سلمان گھبراسا گیا۔ لمحہ بھر چپ رہا، پھر اُس نے آہستہ سے کہا "ایک بات کہوں، آپ بُرا تو نہیں مانیں گی؟" اُس کی آواز میں ہلکا ہلکا ارتعاش تھا۔

نوشا کی ماں یہی بات اس کی زبان سے سُننا چاہتی تھی مجسم سوال بن کر بولی۔ "ہاں، ہاں، کہو کیا بات ہے؟"

بے ساختہ اُس کی زبان سے نکل گیا "آپ سلطانہ کی شادی نہ کریں" کہنے کو تو اُس نے یہ بات کہہ دی مگر وہ یہ کہکر خود ہی پشیمان بھی ہوگیا۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ سلمان نے فوراً کہا۔

"آپ نے میری بات کا بُرا تو نہیں مانا"

وہ بولی۔ "یہ بات نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو مجھکو خود بھی یہ رشتہ زیادہ پسند نہیں۔ پھر سوچتی ہوں کہ سیانی لڑکی کو کب تک بٹھائے رکھوں گی۔ کوئی اچھا بَر بھی تو نہیں ملتا"

سلمان نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے متعلق اگر کچھ کہوں ——" وہ پوری بات نہ کہہ سکا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ نوشا کی ماں کا جواب سننے کا انتظار کرنے لگا۔

ذرا دیر تک کمرے کے اندر خاموشی چھائی رہی۔ پھر نوشا کی ماں کی آواز اُبھری "یہ بات کاش تم نے چند روز پہلے کہی ہوتی۔" اُس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "مجھے تمھارے ساتھ سلطانہ کا رشتہ کرتے ہوئے بڑی خوشی ہوتی، مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔" بات بھی یہی تھی۔ رات بھر میں وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ کل سے نیاز اس گھر کا مالک بننے والا تھا۔ پتہ نہیں وہ اس رشتے میں کیا کیا رخنے ڈالے اُس نے بڑے دُکھ سے سوچا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہی باتیں اُس نے چند روز قبل سلمان سے کہی ہوتیں۔ مگر چند روز قبل اُس کو ان دو دلوں کی محبت کا علم ہی کب تھا۔

سلمان اُس کو خاموش دیکھکر کہنے لگا۔ "ابھی تو آپ بہت کچھ کرسکتی ہیں۔" پھر وہ بچّوں کی

طرح مچل کر بولا "اللہ کے لیے کچھ کیجئے"

نوشا کی ماں نے نظر بھر کر اس کو دیکھا اور پورے اعتماد کے ساتھ بولی "اب یہی ہو سکتا ہے کہ میں سلطانہ کو تمہارے ساتھ کر دوں۔ دنیا زائد سے زائد یہی تو کہے گی کہ سلطانہ بھاگ گئی۔ میں یہ رسوائی بھی قبول کر لوں گی۔ تم اس کے لئے تیار ہو؟"

سلمان اس کے لیے فوراً آمادہ ہو گیا۔

وہ کہنے لگی "ابھی سرِ شام ہے۔ تم گیارہ بجے تک آجاؤ۔۔ میں سلطانہ کو تیار کئے دیتی ہوں جاؤ اب دیر نہ کرو۔"

سلمان چپ چاپ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد، وہ باورچی خانہ میں سلطانہ کے پاس گئی۔ سلطانہ کھانا پکا چکی تھی اور چولھے کے قریب خاموش بیٹھی تنکے سے گرم گرم راکھ کرید رہی تھی۔ ماں نے وہاں پہنچتے ہی سلطانہ سے کہا۔

"جا بیٹی جلدی سے نہالے"

اس نے اچنبھے سے پوچھا "کیوں اماں؟"

وہ مسکرا کر بولی "بس جو میں کہہ رہی ہوں، وہ کرلے" وہ اس وقت بڑی مسرور نظر آرہی تھی۔ بات بات پر اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ سلطانہ کی سمجھ میں اس کی اس معنی خیز مسکراہٹ کا کوئی سبب نظر نہ آیا۔ وہ چپ چاپ اٹھکر غسل کرنے چلی گئی۔

ماں جلدی سے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے ٹرنک کھول کر سلطانہ کا سب سے قیمتی جوڑا نکالا افشاں کا ملی اور مہندی گھول کر، سلطانہ کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد سلطانہ غسل کر کے نکلی تو ماں قریب بٹھا کر اس کے ہاتھ پیروں میں مہندی لگانے لگی۔ پھر اس نے انو کو بازار بھیج کر عطر، پھولوں کے گجرے اور لباسِ عروسی کی آرائش کا دوسرا سامان منگوایا۔ سلطانہ خاموش بیٹھی سب کچھ دیکھتی رہی مگر جب وہ اس کو سرخ ریشمی جوڑا پہنانے لگی تو اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"اے اماں یہ تم سب کچھ کیا کر رہی ہو؟"

ماں نے اُس کی بات پر زیادہ توجہ نہ دی، مصنوعی غصہ سے ڈانٹ کر بولی "بس تو چپکی بیٹھی رہ۔ ہر معاملہ میں نہیں بولا کرتے"

سلطانہ خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر میں انّو سارا سامان بازار سے لے کر آگیا۔

ماں نے اپنے ہاتھوں سے اُس کے بال گوندھے۔ سُرخ جوڑے پر عطر سہاگ لگایا۔ بالوں میں افشاں چنی، پھولوں کے گجرے پہنائے۔ جب سلطانہ دلہن بن گئی تو ماں نے آہستہ سے کہا۔

"گیارہ بجے سلمان تجھکو لینے آئے گا"۔

سلطانہ حیرت سے دم بخود رہ گئی۔ لمحہ بھر تک وہ سکتے کے سے عالم میں، ماں کے چہرے کو تکتی رہی، پھر اُس نے بیک وقت متضاد کیفیت محسوس کی۔ اس میں خوشی بھی تھی اور بے چارگی بھی۔ ماں نے بڑی شفقت کے ساتھ اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"بٹیا، میری تو خوشی تھی کہ میرے گھر بارات چڑھتی اور میں تجھکو دھوم دھڑکے سے رخصت کرتی، مگر قسمت میں یوں ہی لکھا تھا، میری بچی مجھے معاف کرنا"

سلطانہ نے سر جھکا لیا اور خاموش بیٹھی رہی۔ ماں کی آنکھیں آب دیدہ ہو گئیں۔ وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ سلطانہ کے بھی آنسو نکل آئے۔ ماں نے اس کو روتے دیکھا تو جلدی سے دوپٹے کے آنچل سے اپنے آنسو پونچھے اور زبردستی مسکرا کر سلطانہ سے بولی۔

"اری تو کیوں رو رہی ہے۔ لوکبنی یہ بھی ایک رہی"۔

پھر اُس نے سلطانہ کے خود ہی آنسو پونچھے اور اٹھکر باہر چلی گئی۔ سلطانہ خاموش بیٹھی رہی۔ اُس کا سارا جسم تیز خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ چہرے پر چاندنی راتوں کا عکس تھا۔ آنکھیں ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ دل میں وہ دبا دبا خوف تھا جو ہر دوشیزہ لباسِ عروسی پہننے کے بعد محسوس کرتی ہے۔ ذرا دیر بعد ماں اُس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ ایک طشتری میں اُس کے لئے کچھ پھل اور مٹھائی لائی تھی۔

بھادوں کی مدماتی رات باہر آنگن میں اُتر آئی تھی۔ شیشم کے پتّے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ بادلوں کے ہلکے پھلکے ٹکڑے، عود و لوبان کے مرغولوں کی مانند آسمان پر لہرا رہے تھے۔ رات بھیگتی گئی ——— گیارہ بج گئے۔

ماں کی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔ سلطانہ کا دل بار بار دھڑک رہا تھا۔ اور یہ دھڑکن تیز ہوتی گئی۔ رات کی آنکھوں کا کاجل پھیل گیا۔ تاریکی کا رنگ گہرا ہوتا گیا۔ بہت دیر ہو گئی۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ نہ کسی کے قدموں کی آہٹ اُبھری، نہ دروازے پر دستک ہوئی۔

رات آدھی ہو گئی۔ رات ڈھلنے لگی۔ راستے قبرستان کی طرح سنسان ہو گئے۔ ہر طرف ہو کا عالم ہو گیا۔ وہ دونوں جاگ رہی تھیں۔ ہر آہٹ پر ماں کے کان کھڑے ہو جاتے سلطانہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ پھر مدھم ہوتے ہوتے اس قدر سست پڑ جاتی کہ اُس کو محسوس ہوتا، جیسے اُس کا دل دھڑکنا بند ہو جائے گا۔

رات اور ڈھل گئی۔ ستاروں کی روشنی ماند پڑنے لگی۔ اُفقی سرحدوں پر کافوری شمعیں روشن ہو گئیں۔ اُجالا مشرق کے غاروں سے سر اُبھار رہا تھا۔ ماں کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا گئیں۔ اچانک گلی میں کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آواز اُبھری۔ کہیں دور، قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی آ رہا تھا۔ کھٹ، کھٹ، کھٹ، قدموں کی آہٹ قریب ہوتی گئی۔ قریب اور قریب!

جب قدموں کی آہٹ عین دروازے پر سنائی دی تو سلطانہ کا دل دھڑکتے دھڑکتے ایک بارگی ٹھہر گیا۔ ماں ایک ٹک دروازے کو تکتی رہی، پھر پاگلوں کی طرح اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

دروازے پر کوئی دستک نہ ہوئی، کوئی آواز نہ آئی۔ جانے والا آگے چلا گیا۔ قدموں کی چاپ، دُور ہوتی گئی، اور دور۔ اسی وقت برابر والے گھر میں مرغ نے بانگ دی۔ سحر ہو رہی تھی۔ رات کے ختم ہونے کا اعلان ہو رہا تھا۔

ماں لڑکھڑا کر سلطانہ کے قریب بیٹھ گئی۔ اُس کا چہرہ مردے کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھیں بُجھے ہوئے چراغوں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ ذرا دیر وہ پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت بیٹھی رہی۔ پھر اُس نے

آہستہ سے کہا۔ بٹیا یہ لباس اُتار دو" یہ کہتے کہتے اُس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اُس نے سلطانہ کو اپنے سینہ سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دونوں سسکیاں بھر کر دیر تک روتی رہیں۔

باہر صبح کاذب کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ وقت کم تھا۔ ماں جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سلطانہ سے بولی" میں نہانے جا رہی ہوں۔ تم دالان میں چاندنی بچھا دو۔ وہ لوگ اب آتے ہی ہوں گے۔" یہ کہہ کر وہ غسل کرنے چلی گئی۔

جب ماں غسل کر کے نکلی تو اُس نے دیکھا سلطانہ دالان میں چاندنی بچھا رہی تھی۔ سُرخ لباس اُس نے اُتار دیا تھا۔ افشاں پونچھ ڈالی تھی۔ پھولوں کے گجرے، مٹی کے گھڑوں پر لٹک رہے تھے۔ ماں نے اُس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اُس سے نظریں نہ ملا سکی اور چُپ چاپ کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگی۔

جب مسجدوں میں فجر کی نماز ختم ہو گئی اور گلی میں تھوڑی بہت چہل پہل شروع ہو گئی تو نیاز گھر میں داخل ہوا۔ قاضی کے علاوہ اُس کے ہمراہ دو آدمی اور تھے۔

برسات کی اس دُھندلی صبح کو چُپ چپاتے نکاح کی رسم ادا ہوئی اور تھوڑی دیر بعد حبیب احمد مرحوم کی بیوہ مسماۃ رضیہ بیگم نیاز کی منکوحہ اور سلطانہ سوتیلی بیٹی بن گئی۔ اب وہ اس کنبہ کا سربراہ تھا۔ اس گھر کا مالک تھا۔

●

فصل چهارم

۱

شاہ جی کے سفید دیواروں والے مکان میں رہتے ہوئے نوشا اور راجہ کو ہفتہ بھر سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اس تمام عرصہ میں نہ تو شاہ جی سے دوبارہ اُن کی ملاقات ہوئی نہ اُن کو کوئی کام کرنا پڑا۔ دونوں وقت ہوٹل سے کھانا آجاتا۔ صبح و شام ایک ایک پیالی چائے کی ملتی اور روزانہ ایک پیکٹ بگلا مارکہ سگرٹوں کا مل جاتا کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ چوبیس گھنٹے مکان کی چہار دیواری کے اندر رہنا پڑتا۔ دروازے پر ہر وقت ایک پٹھان اسٹول پر بیٹھا رہتا۔ وہ ہر آنے جانے والے کو ٹوکتا۔ ایک بار دونوں نے باہر جانے کا ارادہ کیا تو وہ آنکھیں نکال کر چیخا۔

"خو تم کیدھر کو جاتا ہے۔ تمھارا باہر جانے کا منادی ہے۔ جاؤ کمرے میں جاؤ۔ ادھر مت آؤ۔"

دونوں اس کے چلّانے سے اس قدر خائف ہوئے کہ دوبارہ اس طرف کا رُخ نہ کیا۔ رہنے کو کمرہ مل گیا تھا، دونوں تمام دن اسی میں پڑے رہتے۔ کمرے میں ایک کھڑکی تھی جو باہر کی جانب کھلتی تھی، دل گھبراتا تو وہ بندروں کی طرح جھک جھک کر باہر جھانکنے لگتے۔ اس طرف گلی تھی، جس کے کنارے اونچے نیچے مکانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ گلی میں دن بھر، ننگ دھڑنگ گندے بچے شور مچایا کرتے اور عورتیں دروازوں کی دہلیز بیٹھکر اونچی آوازوں سے باتیں کیا کرتیں۔

دن رات مکان کے اندر سناٹا چھایا رہتا، کبھی کبھار شاہ جی کی بھاری بھرکم آواز سنائی پڑتی۔ وہ عام طور پر کمرے کے اندر پڑا رہتا تھا۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوتا کہ وہ نکل کر باہر آتا۔ رات کے وقت

البتہ نئی نئی شکلیں نظر آتیں، جو بھی آتا، سیدھا شاہ جی کے کمرے میں چلا جاتا جہاں سے آدھی رات تک باتیں کرنے کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔

ایک بار چھت پر قوالی بھی ہوئی۔ بڑا جشن رہا۔ اُس روز سہ پہر ہی سے چھت پر چھڑکاؤ شروع ہوگیا تھا۔ شام ہوتے ہی دو گیس بتیاں بھی آگئیں۔ چھت پر دری اور چاندنی کا فرش ہوگیا اور قوالوں کی چوکیاں آنا شروع ہوگئیں۔ جب پہر رات گذر گئی تو شاہ جی چھت پر آیا اور مسند سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اُس روز اُس نے لباس میں بڑا اہتمام کیا تھا۔ ململ کا کلف دار کرتا، کھڑکھڑاتی ہوئی لٹھے کی شلوار، ہاتھ میں ریشمی رومال اور بالوں میں پڑا ہوا خوشبودار تیل تیز روشنی میں چمک رہا تھا۔

شاہ جی نے اشارہ کیا اور قوالی شروع ہوگئی۔ نوشا اور راجہ بھی اس محفل میں شریک تھے اور ایک کونے میں دبکے ہوئے بیٹھے تھے۔ شاہ جی قوالی سنتا رہا، جھومتا رہا اور قوالوں کو روپے بانٹتا رہا۔ ایک کے بعد دوسری چوکی آتی رہی۔ اپنے کمالات دکھا کر داد پاتی رہی اور انعام لیتی رہی۔ ساری رات یہ سلسلہ چلتا رہا۔ راجہ اور نوشا قوالی سنتے سنتے وہیں چھت پر سو گئے تھے۔

دن اسی طرح گذرتے رہے، دونوں اس زندگی سے جلد ہی گھبرا گئے۔ ایک روز راجہ نے پریشان ہوکر نوشا سے کہا " یار ہم دونوں کسی چکر میں تو نہیں پھنس گئے۔ نہ کوئی کام ہے، نہ کاج، ہر وقت گھر کے اندر بند۔ کہیں آجا بھی نہیں سکتے۔ مجھے تو کچھ معاملہ گڑبڑ لگتا ہے۔" لیکن نوشا نے اُس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ کہنے لگا۔

"ابے تجھکو ہر جگہ گڑبڑ ہی نظر آتی ہے۔"

راجہ نے کہا " یار نہ جانے کیوں مجھے یہاں ڈر سا لگتا ہے۔"

دونوں دیر تک اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ اتفاق سے اسی روز شاہ جی کے پاس دونوں کی طلبی ہوئی۔ وہ اس وقت ایک چوڑی سی کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اُن کو دیکھتے ہی ہنس کر بولا۔

"ہاں جی، تم دونوں نے خوب آرام کرلیا۔ اب کچھ کام دام بھی ہونا چاہئے۔"

دونوں اُس کے سامنے خاموش کھڑے رہے۔

وہ کہتا رہا "سوچتا ہوں آج تمھاری کچی ڈیوٹی مقرر کر دی جائے۔" اُس نے ایک سگرٹ نکال کر سلگائی اور اُن سے مخاطب ہو کر بولا "لیکن ایک بات کان کھول کر سُن لو۔ میرے ساتھ ٹھیک ٹھیک کام کرنا ہو گا۔ بدمعاشی کرو گے تو ٹھیک نہ ہو گا۔ میں بُرے آدمی کے ساتھ بہت بُرا ہوں۔"

دونوں نے گردنیں ہلا کر اُس کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ وہ بولا "یوں گائے کی طرح گردن ہلانے سے کام نہیں چلے گا۔ میرے سامنے قسم کھاؤ۔"

دونوں نے خدا کی قسمیں کھائیں۔

اُس کے بعد شاہ جی نے لوز خاں کو آواز دی "او لوزے ادھر آ" فوراً ہی ایک لمبا تڑنگا آدمی کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اس شخص کو دونوں اس سے پہلے بھی اس گھر میں دیکھ چکے تھے مگر کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ شاہ جی اس سے کہنے لگا۔

"یہ دونوں آج سے تمھارے چارج میں رہیں گے۔ ویسے ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں۔ اب ان سے کام لینا تم پر ہے۔ تم آج ہی ان کو گشت پر لے جاؤ۔"

لوز خاں نے بڑی مستعدی سے جواب دیا "اچھا جی۔ جیسا آپ حکم کریں۔ اللہ نے چاہا وہی ہو گا۔"

اس کے بعد شاہ جی ان دونوں سے مخاطب ہوا "دیکھو، یہ تم دونوں کو کوٹھیوں پر لے جائے گا صرف تم ہی دونوں اندر جاؤ گے، یہ تمھارے ساتھ نہیں جائے گا۔ وہاں جا کر تم کہنا کہ ہم نوکری کرنا چاہتے ہیں۔ جھوٹ موٹ کے لئے تھوڑی سی اپنی مصیبت بھی کہہ دینا تا کہ آسانی سے ملازمت مل جائے۔ جو تنخواہ دیں اسی پر کام شروع کر دینا۔ جس روز تم کو نوکری مل جائے اُس کے دوسرے دن لوزے تم کو ملنے آئے گا۔ جو کچھ یہ پوچھے ٹھیک ٹھیک بتانا۔ اس کے بعد یہ جیسا کہے، ویسا ہی کرنا۔ سمجھ گئے سب باتیں۔"

دونوں نے فوراً کہا "ہاں جی سب سمجھ گئے۔"

وہ بولا "اچھا تو اب تم دونوں جاؤ" اس کے بعد اُس نے لوزے کو ایک دس روپے کا نوٹ نکال کر دیا "لے یہ چائے پانی کو رکھ لے۔"

نوزخاں عرف نوزے نے اُس کو سلام کیا اور دونوں کو اپنے ہمراہ لے کر کمرے سے باہر آگیا۔ اس کے بعد وہ دونوں کو دوسرے کمرے میں لے گیا اور وہاں دیر تک اُن کو بہت سی باتیں سمجھاتا رہا۔ یہ باتیں تقریباً وہی تھیں جو شاہ جی اُن سے کہہ چکا تھا۔

شام ہونے سے کچھ دیر قبل وہ دونوں کو اپنے ہمراہ جمشید روڈ کی طرف لے کر گیا۔ بس سے اتر کر اُس نے سڑک کے دونوں جانب بنی ہوئی کوٹھیوں کو غور سے دیکھا۔ اُس کی نظروں میں سراغ لگانے والے کھوجی کی سی چمک تھی۔ کچھ دور چل کر وہ عامل کالونی کی جانب مڑ گیا۔ اس سڑک پر تینوں آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ آگے آگے نوزخاں تھا۔ اُس کے پیچھے وہ دونوں تھے۔ آخر ایک موڑ پر نوزخاں ٹھہر گیا اُس کی نظریں ایک دومنزلہ کوٹھی کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں جس کے لان میں کئی بچے کھیل رہے تھے۔ ذرا دیر وہ چُپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اُن دونوں کو مخاطب کر کے بولا۔

"بس یہیں سے بسم اللہ کرو"

ایک بار پھر اُس نے ان کو ہدایتیں دیں اور اس دومنزلہ کوٹھی کی جانب دونوں کو روانہ کر دیا۔ نوزخاں وہیں کھڑا رہا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کوٹھی کے پھاٹک پر پہنچ گئے۔ نوشا اندر جاتے ہوئے ڈر رہا تھا مگر راجہ جھٹ اندر داخل ہوگیا۔ نوشا بھی چلا گیا۔ نوزخاں دونوں کی ہر حرکت کا بغور جائزہ لیتا رہا۔

چند ہی منٹ بعد دونوں واپس آگئے۔ نوزخاں کے دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا کہ فی الحال وہاں کسی ملازم کی ضرورت نہیں۔ نوزخاں نے اُن کو دل شکستہ نہ ہونے دیا۔ کہنے لگا۔

"کوئی بات نہیں۔ دوسری جگہ کوشش کرتے ہیں"

اس کے بعد وہ اُن کو ایک اور کوٹھی پر لے گیا، وہاں بھی کام نہ بنا۔ اسی طرح نوزخاں کی ہدایت ہدایت کے مطابق وہ کئی کوٹھیوں کے اندر گئے۔ مگر کام کہیں نہ ملا۔ آخر رات گئے وہ تینوں اڈے پر واپس آگئے۔

دوسرے دن نوزخاں سویرے ہی سویرے اُن کو لے کر گشت پر نکل گیا۔ آج وہ ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف گئے۔ دن چڑھے تک دونوں نے کئی جگہ کوشش کی۔ ایک کوٹھی میں ملازمت مل رہی تھی مگر

مگر وہاں پٹھان چوکیدار تھا اور اس سے بھی زیادہ خطرناک لمبا سا کتا تھا۔ جس کے بھونکنے کی آواز دور سے سُنائی پڑتی تھی۔ جس وقت نوشا خاں نے دونوں کو وہاں بھیجا تھا، چوکیدار کتے کے ساتھ کہیں گیا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ واپس آگیا تو نوشا خاں نے فوراً پروگرام بدل دیا۔

دوپہر سے کچھ دیر پہلے ان کا کام بن گیا۔ مگر ملازمت صرف راجہ کو ملی۔ نوشا ڈھیلا ڈھالا لگ رہا تھا۔ بولتا بھی شرما شرما کر تھا۔ مگر راجہ خوب چاق چوبند تھا اُس نے بڑی مستعدی سے تڑاق پڑاق باتیں کیں۔ یہ ایک انجینیر کی کوٹھی تھی، وہ خود تو دفتر گیا ہوا تھا۔ گھر پر اُس کی بیوی تھی۔ وہ خود بھی کسی قدر تیز وطرار قسم کی عورت تھی۔ راجہ کی تیزی اُس کو پسند آگئی۔ اُس نے ۲۵ روپے ماہوار کے علاوہ دونوں وقت کے کھانے پر اُس کو ملازم رکھ لیا۔ راجہ تو وہیں رُک گیا۔ نوشا واپس آگیا۔ اُس نے یہ اطلاع آکر نوشا خاں کو دی۔ اُس کے چہرے پر کامیابی کی خوشی لہرا گئی۔ اس کے بعد نوشا خاں اور کہیں نہیں گیا۔ نوشا کو اپنے ہمراہ لے کر واپس آگیا۔

اس رات نوشا کو دیر تک نیند نہ آئی۔ اکیلے کمرے میں اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ پہلے وہ راجہ کو یاد کرتا رہا۔ پھر راجہ کی یاد کے سہارے وہ بہت دور چلا گیا۔ جہاں اُس کا اپنا گھر تھا، ماں تھی، بہن تھی، چھوٹا بھائی تھا۔ اس کو گھر کی ایک ایک بات یاد آنے لگی اور اُن کو یاد کرتے کرتے وہ رو پڑا۔ دیر تک خالی کمرے میں اُس کی سسکیاں آہستہ آہستہ اُبھرتی رہیں۔ وہ اسی طرح روتے روتے سو گیا۔

دوسرے دن بھی اُس کی طبیعت پریشان رہی۔ تنہائی کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ بے چینی کے عالم میں وہ اکیلے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتا۔ تھک جاتا تو لیٹ جاتا۔ گھنٹوں گلی میں کھلنے والی کھڑکی سے لگا ہوا، خوابناک نظروں سے باہر تکتا رہا۔ شام ہوئی تو نوشا خاں اُس کے پاس آیا اور اپنے ہمراہ ہاؤسنگ سوسائٹی لے گیا۔

نوشا خاں خود تو کچھ دور پر ٹھہر گیا اور اُس کو راجہ کے بُلانے لئے کوٹھی کے اندر بھیج دیا۔ نوشا نے وہاں جا کر دیکھا ایک شاندار کمرے کے اندر راجہ بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھا ریڈیو پر گانے سُن رہا

تھا۔ اُس کے برابر دو بھورے بھورے بالوں والے خوبصورت بچے بیٹھے۔ ننھے۔

راجہ نے نوشا کو دیکھا تو اٹھکر اُس کے پاس آگیا۔ نوشا نے کہا "ریڈیو پر گانے سنے جا رہے تھے"

وہ ہنس کر بولا "اپنے تو یہی ٹھاٹھ ہیں پیارے"

"مزے میں ہو!"

راجہ نے جواب دیا "ہاں یار میں تو یہاں بڑا خوش ہوں"

نوشا نے سرگوشی کے لہجہ میں کہا "نورے باہر کھڑا ہے، تم کو بلایا ہے"

نورے کا نام سنتے ہی راجہ کی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا۔ ذرا دیر تک وہ خاموش کھڑا رہا، پھر مری ہوئی آواز میں بولا "اچھا چلو" دونوں کوٹھی سے باہر آگئے۔

نور خاں ایک سنسان سی جگہ پر کھڑا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ راجہ کو دیکھتے ہی اُس نے پوچھا "سب ٹھیک ٹھاک ہے؟"

راجہ نے مختصر سا جواب دیا "ہاں"

"کسی کو تم پر کوئی شبہ وبہ تو نہیں ہوا"

"بالکل نہیں"

"تمھارے علاوہ اور کتنے نوکر ہیں؟"

راجہ لمحہ بھر تک کھڑا سوچتا رہا "ایک، دو، تین۔ ہاں تین ہیں۔"

نور خاں نے پوچھا "سب کوٹھی ہی میں رہتے ہیں؟"

"نہیں آیا اور رحمت تو شام کو گھر چلے جاتے ہیں۔ بوڑھا خانساماں ہے، وہ باہر اپنی کوٹھری میں رہتا ہے۔"

نور خاں نے ایک لمبی 'ہوں' کی اور کچھ سوچنے لگا۔ ذرا دیر بعد اُس نے پھر سوالات شروع کر دیئے۔

"گھر میں مرد کتنے ہیں؟"

وہ جھٹ سے بولا "صرف بڑے صاحب ہیں اور تو سب بالوگ ہیں۔"

"صاحب رات کو باہر جاتے ہیں؟"

"میرے سامنے تو گئے نہیں"

"رحمت کیسا آدمی معلوم ہوتا ہے؟"

راجہ بولا "سالا ہر وقت بیٹھا اونگھا کرتا ہے۔ بی بی جی کہتی ہیں کہ وہ نقد سینما دیکھتا ہے۔ وہ اس کو خوب "ڈانٹتی ہیں۔"

نوشا نے اس کی پیٹھ کو بڑی گرم جوشی سے تھپتھپا کر کہا "تو تو بڑا ہوشیار نکلا۔ جیو میرے شیر۔ بس تھوڑا سا کام تم کو اور کرنا ہے" یہ کہکر اُس نے جیب سے دس کا ایک نوٹ نکالا اور اُس کی جانب بڑھا کر بولا "لو اس کو رکھ لو۔ شاہ جی نے خرچے کے لئے دیا ہے اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔ میں نوشا کے ہاتھ پہنچوا دوں گا"

راجہ نے جھجکتے ہوئے نوٹ لے لیا اور اُس سے کہنے لگا "ابھی تو کسی چیز کی ضرورت نہیں"۔

نوشا نے پیشہ ور مجرموں کی طرح ایک آنکھ دبا کر کہا "اب تم یہ پتہ لگانے کی کوشش کرو کہ بی بی جی زیور اور نقدی کہاں، کہاں رکھتی ہیں۔ جب بھی موقعہ لگے اس کمرے کو اچھی طرح دیکھ لینا۔ جن جن ٹرنکوں میں قیمتی سامان رکھا ہو اُن کو اچھی طرح بھانپ لینا" راجہ یہ سنتے ہی لرز اٹھا۔ نوشا اُس کے خوف سے بے نیاز کہتا رہا "اس کے علاوہ یہ بھی پتہ لگاؤ کہ رات کو صاحب اور بی بی کا کیا پروگرام رہتا ہے۔ کس روز سینما جا رہے ہیں کس روز دعوت میں جا رہے ہیں اور کب تک واپس لوٹیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ـــ" مگر اُس نے مطلب کی بات نہ بتائی۔ صاف گول کر گیا۔ صرف اس قدر کہا۔

"اب میں تم سے آج کے پانچویں دن ملوں گا" ذرا دیر وہ کھڑا کچھ شمار کرتا رہا "آج منگل کا دن ہے۔ گویا اب میں تمہارے پاس سنیچر کو آؤں گا۔ اس وقت تک تم ساری باتیں معلوم کر لینا اور مجھ کو پوری رپورٹ دینا۔ سمجھ گئے نا"

راجہ نے تھکے ہوئے انداز میں گردن ہلا دی۔

"سب کچھ سمجھ گیا"

نور خاں نے اس کے بعد اور کوئی بات نہیں کی۔ سگرٹ کا پیکٹ نکال کر راجہ کو سگرٹ پلائی اور خود اپنے لئے بھی سگرٹ نکال کر سلگائی۔ دونوں لمبے لمبے کش لگا کر دھوئیں کے بھبکے چھوڑنے لگے۔ نوشا خاموش کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ اس کو رہ رہ کر راجہ پر رشک آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد راجہ کوٹھی کی طرف چلا گیا اور نوشا، نور خاں کے ساتھ اڈے پر واپس آ گیا۔

۴

سنیچر کا دن تھا۔ راجہ کو کوٹھی پر کام کرتے ہوئے آج ساتواں روز تھا۔ اس عرصہ میں وہ یہاں کی ہر بات سے مانوس ہو گیا تھا۔ سب بچوں سے اُس کی دوستی ہو گئی تھی۔ بڑے مزے میں دن کٹ رہے تھے۔

روزانہ کا پروگرام یہ تھا کہ سویرے ہی سویرے گرم گرم چائے پینے کو مل جاتی۔ ناشتے کی میز پر سے جو کچھ بچ رہتا اس میں سے ایک آدھ ٹوسٹ، انڈا یا ایسی ہی کوئی چیز کھانے کو مل جاتی بس وقت تک ساڑھے سات کا وقت ہو جاتا تھا۔ آیا ناشتے کے بعد دونوں بچوں کو تیار کر دیتی اور وہ اُن کو اپنے ہمراہ لے کر اسکول چلا جاتا۔ واپسی پر ۹ بج جاتے۔ یہ صاحب کے دفتر جانے کا وقت ہوتا۔ وہ دوڑ دوڑ کر مستعدی سے ان کا ہر کام کرتا۔ اُس کے کان اُن کی آواز پر لگے رہتے۔ ادھر اُنھوں نے کچھ کہا اور وہ لپکا۔ ان کا کام زیادہ نہیں تھا۔ مگر وہ شور بہت مچاتے تھے۔ پہلے روز تو وہ ڈر کر سہم گیا مگر رفتہ رفتہ وہ اس بات کا عادی ہوتا گیا۔ جب وہ دفتر جانے لگتے تو اُن کا ایک ایک سامان اُٹھا کر موٹر کے اندر رکھتا۔ اُس کی مستعدی دیکھ کر وہ ایک روز بیگم سے کہنے لگے۔

"بھئی یہ راجہ تو بڑے کام کا لڑکا ہے"

وہ مسکرا کر بولی۔ "دیکھ لیجیے میں نے غلط تو نہیں کہا تھا۔ میں نے تو پہلے ہی روز تاڑ لیا تھا کہ یہ بڑا ہوشیار لڑکا ہے۔"

وہ کہنے لگے "ارے بھئی تمہارے انتخاب کی کیا بات ہے۔"

دونوں ہنسنے لگے اور اپنی تعریف سن کر جھوم اٹھا۔ اس روز سے وہ کام کرنے میں اور بھی چاق چوبند ہو گیا۔ اس کے سپرد زیادہ کام نہیں تھا۔ بارہ بجے بچوں کو اسکول سے واپس لاتا تو سہ پہر تک اس کے سپرد کوئی کام نہ ہوتا مگر وہ چپکا نہ بیٹھتا۔ کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا۔ کبھی فرنیچر جھاڑ رہا ہے، کبھی بیٹھا جوتوں پر پالش کر رہا ہے، کبھی غسل خانے میں بیٹھا بچوں کے کپڑے دھو رہا ہے۔ یہ کام رحمت اور آیا کے سپرد تھے مگر وہ ان کا بھی کام کر ڈالتا۔ ان دونوں نے اس کے آنے پر بڑی ناک بھوں چڑھائی تھی مگر اب وہ بھی اس سے بہت خوش تھے۔

سہ پہر کو دونوں بڑے لڑکے کالج سے آجاتے تھے۔ ان سے بھی اس نے تھوڑا بہت یارانہ گانٹھ لیا تھا۔ ان کو کرکٹ کھیلنے کا شوق تھا۔ کوٹھی کا لان بہت بڑا تھا۔ پاس پڑوس کی کوٹھیوں سے اور لڑکے بھی آجاتے اور شام تک کرکٹ ہوتی۔ وہ بھی ان کے ساتھ کھیلتا اور اب تو اس کو الٹی سیدھی گیند پھینکنا بھی آگئی تھی اور ایک آدھ رن بھی بنا لیتا تھا۔ صاحب اور بیگم نے اس بات پر کبھی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ایک روز دونوں کھڑے ہو کر دیر تک کھیل کو دیکھتے رہے۔

رات کا کھانا آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ختم ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ بچوں کے ساتھ کمرے میں بیٹھ کر ریڈیو سے بچوں کی کہانی سنتا، گانے سنتا، کبھی کبھار تھوڑی بہت ٹھٹول بازی بھی کر لیتا۔ ان سے اس کی خوب گھٹتی تھی۔ جب وہ سونے کے لیے اپنے اپنے بستروں پر چلے جاتے تو وہ چھوٹی بی بی ناہید کی طرف چلا جاتا۔ اس سے بھی وہ خاصہ بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ کالج جاتی تھی۔ علیحدہ کمرے میں رہتی تھی اور موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتی تھی۔ گھنٹوں بیٹھی ٹیلیفون کرتی یا پھر پیانو پر لہک لہک کر گانا گاتی۔ اس کی آواز سریلی تھی۔ راجہ کو اس کا گانا پسند تھا۔ وہ اس کے پیروں کے پاس بیٹھ کر چپ چاپ آنکھیں بند کیے گانا سنا کرتا۔ وہ گانا ختم کر کے اپنے بڑے بڑے سرخ ناخن اس کی کنپٹی میں چبھو کر کہتی۔

"ہٹ، چلو اٹھو کھیل ختم پیسہ ہضم۔"

وہ مکاری سے رونی شکل بنا کر کہتا۔ "ابھی سے۔"

وہ ہنس کر کہتی۔ "چل بھاگ۔ مجھے ابھی کالج کا بہت سا کام کرنا ہے۔"

راجہ فوراً کہتا۔ "چھوٹی بی بی اولٹین نہیں پیو گی؟"

ناہید رات کو اوولٹین بڑے شوق سے پیتی تھی۔ وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتی۔ "اچھا جا ایک کپ بنا لا۔ مجھے آج دیر تک کام کرنا ہے۔"

وہ فوراً ہیٹر پر جا کر دودھ گرم کرتا اور ٹرے میں اوولٹین کی پیالی سجا کر لے آتا۔

ناہید بڑی نفاست پسند لڑکی تھی۔ اس لئے وہ صفائی کا بہت خیال رکھتا تھا جتنی دیر وہ اولٹین پیا کرتی اس سے کچھ نہ کچھ بات چیت کیا کرتی۔ وہ نظریں چرا چرا کر اس کے دلکش چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھا کرتا۔ یہ ایک عجیب سی لذت کا احساس تھا۔ یوں وہ عمر میں اس سے کئی سال بڑی تھی مگر وہ اپنے ہیٹکل انداز میں کبھی کبھی سوچا کرتا۔ یار بڑی غضب کی لونڈیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بس سالی کو بیٹھے دیکھا کرو۔ یوں دیکھتی ہے کہ تسلی کر کے رکھ دیتی ہے۔ پھر اپنی باتوں پر وہ خود بھی ہنس پڑتا۔

ناہید کے علاوہ محمود اور انور تھے۔ ان سے بھی اس کی پٹنے لگی تھی۔ کرکٹ کے علاوہ رات کو کمرے میں دروازہ بند کر کے ان کے ساتھ چھپکے چھپکے تاش کی بازی لگتی۔ تاش کھیلنے کا وہ ہمیشہ سے رسیا تھا۔ خوب ہاتھ دکھاتا۔ وہ دیکھ کر تا کہ دونوں دنگ رہ جاتے۔

لیکن کوٹھی کے اندر سب سے زیادہ اس پر مہربان بیگم صاحبہ تھیں۔ جن کو سب ملازم بی بی جی کہتے تھے۔ وہ ان کا کام بھی جی لگا کر کرتا تھا۔ ایک روز دوپہر کو وہ ان کے جوتوں پر پالش کر رہا تھا اور ان کو ایسا چمکایا تھا کہ چم چم کرنے لگے تھے۔ بی بی جی بھی کہیں سے ٹہلتی ہوئی ادھر آ گئیں اور اس کے قریب کھڑے ہو کر جوتوں کو دیکھنے لگیں۔ ذرا دیر چپ کھڑے رہنے کے بعد کہنے لگیں۔

"راجہ اگر تو ٹھیک سے آگے بھی کام کرتا رہا تو سچ کہتی ہوں بہت اچھا رہے گا۔ محنت سے عظمت ہے۔ دل لگا کر کام کرے گا تو تیری زندگی بنا دوں گی۔ میرا تو ارادہ ہے کہ تو ذرا بڑا ہو جائے تو صاحب سے کہہ کر تجھ کو ان کا اردلی لگوا دوں۔"

راجہ نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔ "میں اردلی بن جاؤں گا۔ وہ جو سفید کوٹ پر سنہری پیٹی ڈالے

رہتے ہیں۔" اس نے بڑے کھلنڈرے پن سے اپنی گردن ہلائی "پھر تو اپنے ٹھاٹھ ہو جائیں گے۔"
وہ کہنے لگیں "ٹھاٹھ تو ہو ہی جائیں گے۔ ۶۰ روپے تنخواہ ملے گی اور بخشش اوپر سے۔ کام کاج بھی زیادہ نہیں کرنا پڑتا۔"

اس نے فوراً کہا "میں کام کاج سے گھبراتا تھوڑی ہوں۔"

وہ مسکرانے لگیں "بس اب تو تھوڑا سا لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لے۔ اردلی بن جائے گا تو کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کے تیرا بیاہ بھی کرا دوں گی۔ دونوں میاں بیوی یہیں رہنا۔"

اس بات پر راجہ شرما گیا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا تو یار اپنی جورو بھی ہو جائے گی۔ مگر یہ خیال اس کو کچھ عجیب سا لگا۔ دھت تیری کی یہ بھی کیا بات ہوئی۔

لیکن بی بی جی کی باتوں کا یہ اثر ضرور ہوا کہ وہ اور بھی مستعدی سے کام کرنے لگا۔ ادھر کسی نے کچھ کہا اور وہ جھٹ پٹ اس کا کام کر دیتا۔

یہ چھ سات دن اس نے بڑے مزے میں گذارے تھے۔ اب اس کا رنگ بھی ذرا نکھر گیا تھا۔ بی بی جی نے محمود اور انور کی دو پرانی پتلونیں اور کچھ قمیصیں اس کو دے دیں، جن کو پہن کر پہلے روز جب اس نے قد آدم آئینہ کے سامنے اپنا عکس دیکھا تو حیرت سے چونک کر زیر لب بڑبڑایا "استاد بالکل اسٹوڈنٹ لگ رہے ہو" وہ دیر تک آئینہ میں اپنے عکس کو دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔

مگر آج سہ پہر سے وہ پریشان تھا۔ شام کو انور خاں آنے والا تھا جس کی گھنی مونچھوں اور پان سے رچے ہوئے کالے کالے دانتوں سے اس کو گھن معلوم ہو رہی تھی۔ جوں جوں دن ڈھلتا گیا، اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ وہ اس گھر کے لوگوں سے دغا بازی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ وہ اس گھر کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ عمر بھر میں اس کو پہلی بار گھریلو زندگی نصیب ہوئی تھی۔ جہاں خوشی تھی سکون تھا۔ نہ کسی کا ڈر تھا نہ کسی کا خوف۔ بڑے مزے سے ہنستے کھیلتے وقت گذرتا تھا۔ رات کو لمبی تان کر سوتا سویرے اٹھتا تو طبیعت ہشاش بشاش ہوتی۔

شام ہوتے ہوتے وہ بے حد بے چین ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ شاہ جی

بے حد خطرناک آدمی تھا اُس کو ناراض کر کے اپنی جان خطرے میں ڈالنا تھی۔ نہ جانے وہ کیا کرے۔ اس کے تصور ہی سے وہ کانپ اٹھتا۔ دوسری طرف بی بی جی تھیں جو اُس سے بڑی مہربانی سے پیش آتی تھیں۔ نخے لگی اور اکوتے من سے اُس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ ناہید تھی جس کی آنکھیں جادو چلاتی تھیں۔ الاار اور محمود تھے۔ جن کے ساتھ اُس کا یارانہ بڑھتا جا رہا تھا۔ شام کو کرکٹ ہوتی اور رات کو تاش کی بازی لگتی۔ دونوں وقت گرم گرم کھانا ملتا اور بڑا مزے دار ہوتا۔ (سگرٹ اس کو غسل خانے میں چھپ کر پینا پڑتی تھی) سوچتے سوچتے وہ بدحواس سا ہو گیا اور انتہائی بے بسی کے عالم میں باہر درختوں کے نیچے اندھیرے میں چلا گیا اور بے اختیار رو پڑا۔

شام کا دھندلکا جب رات کے اندھیرے میں ڈھلنے لگا تو کوٹھی کے دروازے پر راجہ کو نوشا کا چہرہ نظر آیا۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے اپنے دل میں نوشا کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ محسوس کیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اُس کے منہ پر تھوک دے اور چیخ کر کہے "نکل جا سالے کمینے یہاں سے"۔ لیکن اُس نے کچھ بھی نہ کہا اور خاموش کھڑا رہا۔ نوشا آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے قریب آ گیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"نوشا خاں نے بلایا ہے۔"

راجہ اس طرح خاموش رہا جیسے اُس نے نوشا کی بات ہی نہیں سنی۔

نوشا نے دوبارہ کہا "باہر نوشا کھڑا تم کو بلا رہا ہے۔"

راجہ نے گھور کر اُس کو دیکھا اور تیکھے لہجے میں بولا "کھڑا ہے تو کھڑا رہنے دو۔ میں اس سالے کے پاس نہیں جاؤں گا۔"

نوشا حیرت زدہ ہو کر بولا "کیا کہا، نہیں جاؤ گے؟"

راجہ جھنجھلا کر بولا "ہاں جی نہیں جاؤں گا۔ میں اب ان سالے بدمعاشوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔" لمحہ بھر کے لئے اس کا لہجہ نرم ہوا "میرا کہنا مانو تو تم بھی ان کا ساتھ چھوڑ دو۔ کسی کوٹھی میں تم کو بھی کام دلا دوں گا۔ مارو گولی ان سالے حرامیوں کو۔"

نوشا نے جلدی سے کہا "یار کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں کب ان کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ مگر وہ

تو بڑے خطرناک لوگ ہیں ۔"

راجہ نے کہا۔ "خطرناک ہوں گے تو ہوا کریں۔ صاحب سے کہہ دوں گا تو سب سالوں کو بند کروا دیں گے جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔ مذاق نہیں ہے۔"

نوشا اور خوف زدہ ہو گیا: "نہیں یار ایسی بات نہ کرنا۔ خواہ مخواہ مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ شاہ جی بہت ہی خطرناک آدمی ہے، اس سے بگاڑنا اچھا نہیں۔"

مگر راجہ ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔ فیصلہ کن لہجہ میں بولا۔ "اچھا جی ہم تو کسی سالے کے پاس نہیں جاؤں گا اور دیکھو آئندہ تم یہاں نہ آنا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے برابر والے کمرے میں داخل ہو گیا۔

نوشا اُس کو دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ذرا دیر وہاں گم صم کھڑا رہا۔ اس کے بعد کوٹھی سے نکل کر سیدھا نوشے کے پاس پہنچا۔ نوشا کو اکیلا آتا دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ گھبرا کر پوچھا "راجہ کیوں نہیں آیا؟"

نوشا صاف بات بتانے میں جھجکنے لگا تو اُس نے ڈانٹ کر کہا۔ "صاف صاف بتا بات کیا ہے۔ وہ سالا راجہ کیوں نہیں آیا؟"

نوشا کو مجبوراً کہنا پڑا۔ "وہ کہتا ہے۔ میں نہیں آؤں گا"

نوشاں بڑبڑایا۔ "اچھا تو یہ بات ہے"

نوشا کہنے لگا۔ "اور اُس نے آئندہ مجھ کو آنے سے بھی منع کر دیا۔ بہت غصہ میں تھا"

وہ بولا۔ "سالے کا سب غصہ تیلے کے بل کی طرح نکل جائے گا"

یہ کہہ کر وہ نوشا کو اپنے ہمراہ لے کر اڈے پر پہنچا اور شاہ جی کو ساری بات بتا دی۔ وہ ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔ چیخ کر بولا۔ "تو پھر اُس کا دوسرا بندوبست کرنا پڑے گا۔"

اس کے بعد شاہ جی خاموش ہو گیا۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد اُس کی بھاری بھرکم آواز ابھری "نوشے"؟

نوشاں نے فوراً جواب دیا۔ "ہاں جی"

شاہ جی بولا - اب تو رات زیادہ ہوگئی ہے۔ اس وقت تو تم جاکر آرام کرو۔ کل اپنے ساتھ لوٹن کو لو اور ترکیب نمبر ۲ کا داؤں چلو۔ یوں ہی کام چلے گا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ لونڈا ایک نمبر حرامی لگتا ہے۔ خیر بچ کر کہاں جائے گا۔"

لوز خاں نے فوراً کہا: "تمہارا حکم چاہیے شاہ جی، جائے گا کہاں سالا نکل کے۔"

اس کے بعد زیادہ بات چیت نہ ہوئی۔ لوز خاں کمرے سے باہر آگیا۔ اُس کے ساتھ ہی نوشا بھی نکل آیا۔ مگر وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ اس کو رہ رہ کر راجہ پر ترس آرہا تھا۔ وہ بار بار سوچتا کہ یہ لوگ نہ جانے بیچارے کا کیا حال کریں۔ خوف کے مارے اُس نے لوز خاں کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور چپکے سے اپنے کمرے کے اندر چلا گیا۔

دوسرے دن کوئی ۸ بجے رات کو شاہ جی نے اپنے کمرے سے نوشا کو آواز دی۔ وہ فوراً سہما ہوا سا وہاں پہنچا۔ شاہ جی بستر پر کروٹ کے بل لیٹا تھا، اُس کو دیکھتے ہی بولا۔

"تو بھی کسی کام آئے گا۔ آ ذرا میری پنڈلیوں پر مکیاں لگا۔ وہ سور کا جنا دُمّے نہ جانے کہاں جاکر مرگیا۔"

نوشا خاموشی سے اس کے پائینتی جاکر بیٹھ گیا اور پنڈلیوں پر آہستہ مکیاں لگانے لگا۔ شاہ جی خاموش لیٹا رہا۔ کمرے کے اندر گہرا سکوت چھایا تھا۔ یکایک باہر دروازے پر موٹر کے رُکنے کی آواز اُبھری۔ پھر دھڑ سے موٹر کا دروازہ بند ہوا اور کمرے کے باہر کئی آدمیوں کے ملے جلے قدموں کی آواز اُبھری۔ ذرا ہی دیر بعد لوز خاں اور لوٹن کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ اُن کے نرغہ میں راجہ بھیگے ہوئے چوہے کی طرح سہما ہوا نظر آیا۔ لوٹن نے راجہ کی گردن پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل گر کر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ لوٹن کہنے لگا۔

"لو جی، یہ آگیا حرام کا تخم۔"

شاہ جی اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور سامنے فرش پر اوندھے منہ پڑے ہوئے راجہ کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔ پھر اس کی آواز گرجی: "نخرا کیا دکھا رہا ہے۔ سیدھا کھڑا ہو۔"

راجہ خوف سے کانپتا ہوا اٹھا مگر وہ پورے طور پر کھڑا بھی نہ ہوا تھا کہ شاہ جی نے پلنگ پر سے کود کر اس کے گال پر بھرپور تھپڑ مارا۔ راجہ بلبلا کے زمین پر گر پڑا۔ شاہ جی نے اس کے بدن پر ایک ٹھوکر ماری، پھر دوسری

کئی ٹھوکریں تابڑتوڑ راجہ کے جسم پر لگیں۔ وہ گیند کی طرح فرش پر لڑھکنے لگا اُس کا ہونٹ ایک جگہ سے پھٹ گیا تھا، جس سے لال لال خون بہہ رہا تھا۔

ہر ٹھوکر پر وہ چیختا "ہائے مرگیا" پھر اُس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر شاہ جی کے سامنے جوڑ دیئے۔ اُس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ شاہ جی گردن ہلا کر بولا۔

"بات ابھی ہے" پھر وہ نوشا سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "کچھ مزا نہیں آیا۔ اب ذرا اس کا ٹین پاٹ تو بناؤ تاکہ اس کو یاد ہو جائے کہ قسم کھا کر مکر جانا کیا ہوتا ہے۔"

نوشا فوراً لپک کر راجہ کے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے اپنے چوڑے چوڑے بھدے ہاتھ سے راجہ کی گردن دبوچ کر جھکا دی اور دوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹانگ پکڑ کر گردن کے اوپر چڑھا دی۔ راجہ بلبلا کر چیخا۔

"ارے مرگیا، ارے مرگیا" نوشا نے راجہ کی کنپٹی پر کہنی سے ایک ٹھڈ لگایا۔ فوراً اس کی آواز بند ہو گئی۔ نوشا نے راجہ کی دوسری ٹانگ اٹھا کر گردن پر چڑھا دی۔ راجہ ذرا دیر تک اس حالت میں بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھیں اُبل کر نکل آئی تھیں اور دونوں ٹانگوں کی قینچی میں پھنسی ہوئی اس کی گردن سانپ کا پھن بن گئی۔

راجہ اس عالم میں لمحہ بھر سے زائد نہ بیٹھ سکا۔ اس کا جسم کپکپایا اور وہ فرش پر منہ کے بل آ گیا۔ مگر اس طرح بھی چین نہ آیا تو وہ جاپانی کھلونے کی طرح ادھر اُدھر جھومنے لگا۔ ہر بار وہ پہلو بدل کر شدی دردناک آواز نکالتا۔

"ارے میری گردن ٹوٹی"

"ہائے میری ٹانگیں پھٹے جا رہی ہیں"

"اللہ کے لئے مجھے چھوڑ دو، میں مر جاؤں گا"

"شاہ جی میری توبہ"

"شاہ جی میں تمھارے قدموں پڑتا ہوں"

راجہ کی دل دوز چیخیں کمرے کے اندر گونجتی رہیں۔ نوشا سہما ہوا یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور ٹانگیں برابر کانپ رہی تھیں۔ آخر جب راجہ کی آواز بیٹھنے لگی اور وہ رُک رُک کر تھکے

ہوئے چیتر کی طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر ہانپنے لگا تو شاہ جی نے کہا۔

"لوزے کھول دے ابھی کچا ہے یہ"

لوزخاں نے حکم پاتے ہی راجہ کو ٹانگوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ بے حال سا ہو کر وہیں پڑ گیا اور گہری گہری سانسیں بھر کر ہانپتا رہا۔ شاہ جی نے اُس کو مخاطب کر کے کہا: "یہ پہلا کورس ہے۔ ابھی چھ اور باقی ہیں اور سب سے بڑا یہ ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے تکیہ کے نیچے سے لمبا شکاری چاقو نکالا اور اُس کے سامنے کر کے بولا۔

"ٹکڑے کر کے یہیں دفن کر دیتا ہوں۔ اس گھر کا آنگن اسی لئے کچا رکھا ہے تاکہ زمین کھودنے میں دشواری نہ ہو۔"

راجہ نے آنکھیں پھاڑ کر اُس کو دیکھا اور خوف سے لرز کر گڑگڑانے لگا "نہیں نہیں" اور اُس نے بڑی بے چارگی سے ہاتھ جوڑ دیئے۔ پھر وہ ڈگمگاتا ہوا اٹھا اور جا کر شاہ جی کے پیر پکڑ لئے۔

"اس دفعہ معاف کر دو۔ پھر غلطی کروں تو جان سے مار دینا"

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شاہ نے اس کا بازو پکڑ کر کھڑا کیا اور اس سے کہنے لگا "آئندہ سب کام ٹھیک ہوگا؟"

راجہ قسمیں کھا کر اس کو یقین دلانے لگا۔ شاہ جی ڈانٹ کر بولا "قسمیں تو تو نے پہلے بھی بہت سی کھائی تھیں۔ یہ یاد رکھنا کہ دوبارہ جو تو نے کوئی اُلٹ پھیر کی تو تیری یہاں لاش ہی نظر آئے گی۔ میں خطرے والے آدمی کو زندہ نہیں چھوڑا کرتا۔"

راجہ گردن جھکائے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ ابھی تک اس کی ٹانگیں قابو میں نہیں تھیں۔ لہٰذا شاہ جی نے ہوٹل سے مکھن کی دو ٹکیاں منگوا کر اس کو کھلائیں۔ اُس کے بعد چائے پلائی۔

جب ذرا اُس کے ہوش ٹھکانے ہوئے تو راجہ نے کوٹھی کے اندر کی ایک ایک تفصیل بتائی۔ شاہ جی کرید کرید کر ہر ہر بات پوچھتا رہا۔ پھر اُس کو یہ ہدایت دی گئی کہ آئندہ لوزخاں اُس کے پاس نہیں جائے گا۔ وہ خود آ کر رپورٹ دیا کرے گا۔

دس بجنے سے کچھ دیر پہلے راجہ انور خاں کے ساتھ دروازے پر کھڑی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ کر ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف چلا گیا۔

۴

رات کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی کوٹھی اونگھتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی، نہ آواز۔ سارے دروازے بند تھے اور راجہ کمرے کے اندر تنہا بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ کوٹھی میں انجینئر کی بوڑھی ماں تھی۔ وہ سرِ شام ہی سو جایا کرتی تھی اور اس وقت نکڑ والے کمرے میں پڑی بے خبر سو رہی تھی۔ کوٹھی کے دوسرے لوگ ایک تقریب میں گئے ہوئے تھے اور آدھی رات سے پہلے اُن کے واپس آنے کی توقع نہیں تھی۔ راجہ شام ہی کو اس بات کی رپورٹ شاہ جی کو دے آیا تھا اور اب سہما ہوا بیٹھا تھا۔ اس کی پشت کمرے کے دروازے کی جانب تھی۔ ذرا سی آہٹ ہوتی تو اُس کا دل دھڑکنے لگتا۔

رات اور سنسان ہو گئی۔ کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ عین اُس وقت کوٹھی کے باہر تین بار سیٹی بجانے کی آواز اُبھری۔ یہ اس بات کا سگنل تھا کہ شاہ جی کے آدمی پہنچ گئے ہیں۔ راجہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ کچھ عرصے مکمل خاموشی چھائی رہی۔ پھر کوٹھی کے پچھواڑے جہاں ہر وقت درختوں کے گھنے سائے بکھرے رہتے تھے خشک پتوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی پڑی۔ کوئی رُک رُک کر چل رہا تھا۔

اچانک سکوت چھا گیا۔ پچھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ کھٹ کھٹ کی آہٹ کے ساتھ راجہ کی ٹانگیں کانپ اٹھیں اور سانس رُک رُک کر چلتی۔ دروازے پر کئی بار آہٹ ہوئی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس نے سوچا کہ وہ دروازہ نہ کھولے لیکن وہ اپنے اس ارادے پر قائم نہ رہ سکا۔ وہ آہستہ سے کمرے کے باہر

آیا اور وہاں سے ہوتا ہوا اس دروازے پر پہنچا جس پر آہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے جلدی سے دروازے کا بولٹ کھول دیا۔ کسی نے باہر سے دھکا دے کر دروازہ کھولا۔ دھندلی روشنی میں شاہ جی کا خوفناک چہرہ نظر آیا۔ اس کے پیچھے کئی آدمی اور تھے۔ سب اندر آ گئے۔

شاہ جی نے ایک آدمی کی ڈیوٹی دروازے پر لگائی۔ چار آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے کر راجہ کے ساتھ اس کمرے پر گیا، جس میں قیمتی سامان رکھا تھا۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ شاہ جی نے بالم کو اشارہ کیا اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے تالا کھول دیا۔ سب اندر چلے گئے۔ کمرے کے اندر اندھیرا تھا۔ راجہ نے سوئچ دبا کر روشنی کر دی اور ان ٹرنکوں اور بکسوں کی نشان دہی کرنے لگا، جس میں زیورات اور نقدی تھی۔

آن کی آن میں بالم نے ہر ٹرنک کے تالے توڑ دیئے اور سارے ٹرنکوں کے ڈھکنے کھول دیئے گئے شاہ جی عین دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ وہ اس وقت کسی چٹان کی طرح پرشکوہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غضب کی چمک تھی اور وہ زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر صرف نظروں کے اشاروں سے اپنے آدمیوں کو ہدایتیں دے رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں کمرے کے اندر ہر طرف سامان ہی سامان بکھر گیا اور وہ کسی کباڑیئے کی دکان معلوم ہونے لگا۔

ایکا ایکی باہر سے بوڑھے خانساماں کے کھانسنے کی آواز ابھری۔ سب آدمی ٹھٹک کر جہاں تھے وہیں رک گئے۔ کمرے کے اندر سناٹا چھا گیا۔ خانساماں کی کھانسی رک رک کر ابھر رہی تھی۔ شاہ جی نے خونخوار نظروں سے سب آدمیوں کو گھور کر دیکھا اور ان کے ہاتھ پھر بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ چلنے لگے۔

دس منٹ کے اندر اندر وہ تمام قیمتی اشیاء نکال کر ایک بڑے ٹرنک میں بھر چکے تھے۔ جس کو دو آدمیوں نے سنبھالا اور کمرے سے باہر آ گئے۔ سب سے آخر میں شاہ جی نکلا۔ راجہ بھی اس کے ساتھ ساتھ سہما ہوا چلتا رہا۔ پچھلے دروازے سے جب سب باہر چلے گئے تو وہ ٹھٹکا۔ شاہ جی نے دبی زبان سے کہا۔

"راجہ تو بھی ہمارے ساتھ ہی چلے گا۔"

اس کے بعد کوئی بات نہیں ہوئی۔ سب کوٹھی کے لان سے گزر کر باہر سڑک پر آ گئے۔ پھاٹک کے قریب ہی اندھیرے میں سیاہ رنگ کی ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس میں جلدی سے ٹرنک رکھا گیا اور

سب پھرتی کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور وہ سنسان سڑک پر تیز رفتار سے دوڑنے لگی۔

جب ٹیکسی شاہ جی کے مکان پر جا کر رکی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ٹرنک اتروا کر اندر بھیجا گیا اور شاہ جی سب آدمیوں کو لئے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا لیکن راجہ کو اس نے نوشا کے کمرے میں بھیج دیا۔ وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ راجہ کو دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں کئی لمحے تک ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ پھر نوشا نے سرگوشی کے سے لہجے میں پوچھا۔

"تم آگئے؟"

"ہاں!" راجہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

نوشا نے لمحہ بھر رک کر پوچھا "اب تم کوٹھی پر واپس نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"یہ شاہ جی سے پوچھو۔" راجہ بے حد بیزار نظر آرہا تھا۔ وہ چپ چاپ فرش پر چت لیٹ گیا اور چھت کو تکنے لگا۔ نوشا اس کو دیکھتا رہا پھر کہنے لگا "یار اب کیا ہوگا؟"

راجہ بولا "جو تقدیر میں لکھا ہے"

نوشا نے دیکھا کہ راجہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ ہر بات کا اکھڑا اکھڑا جواب دیتا ہے۔ لہٰذا اس نے پھر کوئی بات نہیں کی اور خاموشی کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا۔ دونوں بہت دیر تک پڑے کروٹیں بدلتے رہے۔ مگر آپس میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔

دوسرے ہی دن سے دونوں کی کڑی نگرانی شروع ہو گئی۔ شاہ جی ان کے کمرے میں دوپہر کو خود آیا اور ان کو ہدایت کی کہ وہ کمرے کے اندر رہا کریں۔ نہ باہر نکلیں اور نہ اڈے کے کسی آدمی سے بات چیت کریں لیکن اس دفعہ خونخوار نظروں سے گھور کر بات چیت کرنے کے بجائے وہ ان سے بڑی نرمی اور شفقت سے گفتگو کر رہا تھا۔

اس کی یہ شفقت دونوں کے ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ اب وہ اکثر ان کے کمرے میں آ جاتا۔ کبھی اُن کے لیے پھل اور مٹھائی لے کر آتا، کبھی سگرٹوں کے نئے نئے قسم کے پیکٹ لاتا۔ اس کے علاوہ اس نے دونوں کے لیے کئی ریشمی قمیصیں اور کرٹ پیس کی پتلونیں بھی بنوا دی تھیں۔ دل بہلانے کے لیے ایک کیرم بورڈ اور تاش کی دو گڈیاں منگوا دی تھیں۔

مگر اس قدر ناز برداری کے باوجود دونوں سہمے سہمے رہتے۔ اُن کے چہرے زرد پڑ گئے تھے اور رخساروں کی ہڈیاں اُبھرنے لگی تھیں۔ شاہ جی بھی کم پریشان نہیں تھا۔ اس لیے کہ انجینئر کا ایک بھائی پولیس کا بڑا افسر تھا۔ لہٰذا اس واردات کی بڑی چھان بین ہو رہی تھی۔ پولیس کو سب سے زیادہ تلاش راجہ کی تھی، جس سے سارا سراغ مل سکتا تھا۔ شاہ جی کو اپنے مخبروں کے ذریعہ پولیس کی کارروائیوں کی برابر اطلاعات مل رہی تھیں۔ ایسی صورت میں راجہ کی موجودگی اڈّے پر بے حد خطرناک تھی۔ روزانہ نئی نئی اطلاع آتی اور ہر اطلاع پر شاہ جی گہری فکر میں ڈوب جاتا۔

ان ہی دنوں اُس کے ہاں ایک بردہ فروش آیا۔ وہ اُس کا پُرانا واقف کار تھا۔ پہلے بھی وہ اس سے کئی بار سودا کر چکا تھا۔ شاہ جی نے اس کو دیکھا تو اُس کا بہت سا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ وہ ٹھگنے قد کا باتونی آدمی تھا۔ پان بے حد کھاتا تھا اور جہاں جی چاہتا وہیں پیک تھوک دیتا۔ ذرا ہی دیر میں اُس نے پان کھا کھا کر کمرے کا سارا فرش گندہ کر دیا۔ یہ اُس کی پُرانی عادت تھی۔ ایک بار شاہ جی نے جل کر اُس کو گالیاں بھی دی تھیں۔ اس لیے کہ گرمیوں میں وہ فرش پر لیٹ کر مالش کرایا کرتا تھا۔ مگر اس وقت وہ کچھ بھی نہ بولا۔

وہ شخص ڈیڑھ سال بعد شاہ جی سے ملا تھا اور اس تمام عرصہ کی اپنی کارگزاری سُنا دینا چاہتا تھا۔ اُس کی باتوں سے شاہ جی کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اب وہ صرف عورتوں کی درآمد برآمد کرتا ہے۔ یہ بات شاہ جی کو بھی کھٹکی تو اُس نے فوراً بات کاٹ کر کہا۔

"چودھری میرے پاس دو لڑکے ہیں بڑے سدھے ہوئے اور کام کرنے والے ہیں۔"

وہ کہنے لگا "میں نے تو جی یہ لین چھوڑ دی ہے۔ ایسے مال کی آج کل کھپت کم ہی ہوتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "خوب یاد آیا۔ سکھر سے ایک اس طرح کا آرڈر آیا تھا۔ کیوں جی یتیم خانے میں چل سکیں گے وہ؟"

شاہ جی فوراً بولا۔ "یہ مت پوچھ چودھری' دونوں بلا ہیں بلا۔ تو یتیم خانے کی بات کرتا ہے۔ وہ تو سکہ سازی اور کرنسی تک میں بڑوں بڑوں کے کان کاٹ لیں گے۔"

وہ احمقوں کی طرح منہ پھاڑ کر بولا۔ "اچھا! کہاں سے ہاتھ لگ گئے"

شاہ جی کہنے لگا۔ "ٹریننگ دی ہے۔ رقم خرچ کی ہے۔ یوں ہی تھوڑی کام چلتا ہے"

وہ پوچھنے لگا۔ "اچھا تو بولو کیا لوگے ان کا؟"

شاہ جی نے جواب دیا۔ "تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ پورے تین ہزار میں خریدا تھا۔ پر اب پانچ ہزار سے کم میں مال نہیں اٹھے گا۔"

"یہ تو زیادہ ہے"

"چل تیرے لئے کچھ کم کر دوں گا۔"

شاہ جی تو خدا سے چاہتا تھا کہ دونوں کسی طرح اس شہر سے نکل جائیں۔ تھوڑی حیل و حجت کے بعد سہ ہزار میں سودا ہو گیا۔ اس نے پانچ سو بیعانہ بھی دے دیا۔ طے یہ ہوا کہ کل رات کو آ کر وہ پوری رقم ادا کر دے گا اور اُن دونوں کو اپنے ہمراہ لے جائے گا۔

اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے تھے جب یہ سودا طے ہوا تھا۔ نوشا اور راجہ ابھی سوئے نہیں تھے۔ دونوں بستر پر پڑے کروٹیں بدل رہے تھے۔ اس اثنا میں راجہ نے کہا۔

"یار بہت برے پھنس گئے"

وہ بولا۔ "ہاں یار سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔ خدا قسم اب تو بہت جی گھبراتا ہے۔"

راجہ نے آہستہ سے کہا۔ "یہاں سے اب نکلنے کی کوئی صورت نکالنا چاہیئے۔"

وہ ڈر کر بولا۔ "ایسی بات مت کر' جان سے مار جائے گا"

"جان سے تو لوں بھی مارے جائیں گے۔"

نوشا خوف سے لرز کر بولا۔ "کیوں؟"

"تجھے کچھ پتہ ہے کہ ہم دونوں پر اتنی پابندی کیوں لگائی گئی ہے!"

"یار مجھے کیا معلوم"؟

وہ جل کر بولا۔ "ابے تو یوں ہی رہا، اس لئے کہ سالے پکڑے نہ جائیں"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ جب ہی تو سالا شاہ جی کمرے سے بھی باہر نکلنے نہیں دیتا"

وہ کہنے لگا: "یار اسی لئے تو ڈر لگتا ہے کہ سالا ہم دونوں کو قتل نہ کر دے تاکہ کسی کو پتہ بھی نہ لگے۔ ان بدمعاشوں کو تو کیا جائے۔ ایک نمبر حرامی ہوتے ہیں"

نوشا بے حد ڈر گیا۔ آہستہ سے بولا "یار تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ شاہ جی بڑا ظالم آدمی ہے"

راجہ بولا "میرا کہنا مان تو جان بچ سکتی ہے"

"یار میں نے تیری اب تک کون سی بات نہیں مانی"

"بس ذرا ہمت کی بات ہے۔ سالوں کو صفا چرکہ دے جاؤں گا"

نوشا بولا "بڑا ڈر لگ رہا ہے"

راجہ نے اُس کو ڈانٹا "دیکھ یار تو زنخا پن مت کر۔ لگ گیا موقعہ تو آج ہی نکل چلیں گے"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا "آج کدھر سے چلو گے؟"

"یہ سب تو مجھ پر چھوڑ دے"

اسی وقت کمرے کے باہر شاہ جی کی آواز سنائی دی۔ دونوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاہ جی اُن کی طرف نہیں آیا۔ کسی سے ذرا دیر تک باتیں کرتا رہا اور پھر اندر چلا گیا۔ دونوں دم سادھے پڑے رہے

رات آہستہ آہستہ گذرتی رہی۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ بہت دیر بعد جب محلے پر قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی تو راجہ اٹھ کر دروازے پر آیا۔ اُس نے جھانک کر باہر دیکھا۔ دالان میں نوز خاں بے خبر سو رہا تھا۔ البتہ باہر والے دروازے پر پٹھان چوکیدار کے کھانسنے کی آواز اُبھر رہی تھی۔ پہلے راجہ کمرے سے باہر نکلا۔ اُس کے پیچھے پیچھے نوشا تھا۔ دونوں نے بے آواز چل کر صحن عبور کیا اور دالان میں آ گئے۔

لوزخاں اُن کے قریب ہی لیٹا تھا۔ وہ اس کے پاس سے آہستہ آہستہ گذر گئے اور چھت پر جانے والے زینہ کے دروازے پر پہنچ گئے۔

دونوں وہاں لمحہ بھر تک کھڑے کانپتے رہے۔ ان کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ پھر راجہ نے پنجوں کے بل اٹھ کر زینے کا بولٹ کھولنے کی کوشش کی۔ بولٹ سخت تھا۔ گھبراہٹ میں ہاتھ بے تکا پڑا۔ گہری خاموشی میں کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ دونوں کا دم نکل کر رہ گیا۔ اسی وقت لوزخاں نے کروٹ بدلی اور اپنی ننگی ران کو کھجانے لگا۔

جب لوزخاں خراٹے بھرنے لگا تو راجہ پنجوں کے بل پھر اٹھا۔ اس دفعہ اس نے بولٹ کھول لیا۔ اُس نے ایک پٹ کھولا، دروازہ چرچرایا۔ راجہ نے دل ہی دل میں دروازے کو ایک گندی سی گالی دی۔ اس کے بعد دونوں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر پہنچ گئے۔

دُور تک سیمنٹ کی چٹیل چھت پھیلی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ پھر راجہ نے نوشا کو اشارہ کیا۔ وہ ایک ایک قدم سنبھال کر رکھتے ہوئے پانی کی ٹنکی کے پاس پہنچ گئے جس میں لگا ہوا پائپ دیوار کے ساتھ ساتھ پچھلی گلی میں چلا گیا تھا۔ راجہ نے پائپ کو ہاتھ سے پکڑ کر ہلایا۔ وہ مضبوطی سے لگا تھا۔

راجہ پائپ پکڑ کر آہستہ آہستہ نیچے گلی میں اُتر گیا۔ نوشا منڈیر پر جھکا ہوا اُس کو دیکھتا رہا۔ جب وہ تاریکی میں غائب ہو گیا تو نوشا نے پائپ کو پکڑا اور نیچے اُترنے کی کوشش کی مگر اُس کے پیر پھسلنے لگے۔ وہ منڈیر سے چمٹ گیا۔ نیچے سے راجہ شی شی کر رہا تھا۔ یہ اس بات کا سگنل تھا کہ وہ جلدی سے اتر آئے۔ مگر نوشا جھجک رہا تھا۔ اتنے میں گلی کے اندر سے راجہ کی آواز آئی۔

"ابے اُتر، نہیں تو میں چلا"

نوشا نے بدحواس ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور پائپ پر پھسل پڑا۔ نیچے راجہ کھڑا تھا، اُس نے فوراً سنبھال لیا۔ ورنہ وہ منہ کے بل زمین پر گرتا۔ راجہ نے اُس کی پیٹھ ٹھونکی اور خوشی سے بولا۔

"شاباش میرے شیر! بس اب بن گیا کام"

دونوں اندھیری گلی میں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ گلی کو عبور کر کے ایک چھوٹا سا میدان پڑتا تھا اور اُس کے دوسری طرف سڑک نظر آ رہی تھی، جس پر ایک کار تیز روشنی بکھیرتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ وہ اسی سمت چل دیئے۔ لیکن جیسے ہی وہ میدان میں آئے۔ ایک بارگی نہ جانے کہاں سے کئی کتے نکل پڑے اور اُن پر بھونکتے ہوئے جھپٹے۔

دونوں نے بدحواس ہو کر بھاگنا شروع کر دیا اور ایک گلی میں گھس گئے۔

۴

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ رات بڑی سنسان تھی۔

راجہ اور نوشا ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں خاموش کھڑے تھے۔ وہ اب شاہ جی کے مکان سے کئی میل دُور آ چکے تھے اور خوف سے سہمے ہوئے کھڑے سوچ رہے تھے کہ رات کہاں گذاری جائے۔ نہ ان کا کوئی وہاں شناسا تھا اور نہ وہ شہر کے راستوں سے واقف تھے۔

شاہ جی کے گھر سے نکل کر جس طرف اُن کا منہ اُٹھ گیا، وہ اسی طرف چل دیئے۔ اگر کتّے ان کو نہ پریشان کرتے تو وہ کسی اور سمت نکل جاتے۔ جس جگہ وہ کھڑے تھے۔ اس پاس کوئی آبادی نہ تھی۔ ان کے سامنے ایک چٹیل ٹیلا تھا، جو اندھیرے میں دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ جس سڑک پر چل کر وہ یہاں تک پہنچے تھے، وہ اسی ٹیلے کے نشیب میں اژدہے کی طرح بل کھاتی چلی گئی تھی۔ آبادی کا آگے کوئی نشان نہیں تھا اور ویرانی بڑھتی جا رہی تھی، اس لیے وہ آگے جاتے ہوئے ڈر رہے تھے۔

دونوں خاموش کھڑے تھے، اسی اثنا میں سامنے سے موٹر کی روشنی ابھری! انھوں نے اس طرف دیکھا۔ ذرا دیر میں موٹر اُن کے قریب پہنچ چکی تھی اور اُس کی تیز روشنی میں وہ دُور سے نظر آ رہے تھے۔ کسی نامعلوم خوف سے انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ موٹر کی رفتار اُن کے قریب پہنچتے پہنچتے سست پڑ گئی۔ بریک لگنے کی آواز اُبھری۔ دونوں کے جسم لرز اٹھے۔ مگر کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ موٹر جس رفتار سے آئی تھی اسی رفتار سے سنسان سڑک پر تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

جب کار دور نکل گئی تو ان کی جان میں جان آئی۔ ورنہ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ کسی مصیبت میں پھنس گئے۔ لیکن اب ان کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ جس جگہ کو انھوں نے محفوظ سمجھا تھا، وہ قطعی غیر محفوظ تھی۔ وہاں کھڑے رہنے سے خواہ مخواہ شبہ پیدا ہوتا تھا۔ آخر نوشا نے کہا۔

"ابے یہ تو بڑی خطرناک جگہ ہے۔ کسی اور طرف چلیں اور راہگیروں سے اسٹیشن کا راستہ معلوم کریں رات وہیں اچھی گذر سکتی ہے اور گھر جانے کے لئے ریل گاڑی بھی مل جائے گی۔"

راجہ نے گھور کر اس کو دیکھا اور ڈانٹ کر بولا۔ "سالے کچھ تیرا دماغ خراب ہوا ہے۔ تو ضرور پکڑا جائے گا اور تیرے سنگ میری گردن بھی پھنسے گی۔"

نوشا نے گھبرا کر پوچھا "کیوں؟"

وہ کہنے لگا "ابے تو شاہ جی کو اُلو کا پٹھا سمجھتا ہے۔ وہ لونڈوں اور لوٹن کو سب سے پہلے اسٹیشن بھیجے گا۔ پھر پولیس الگ تلاش میں ہے۔"

نوشا منہ پھاڑ کر بولا "اچھا تو یہ بات ہے۔"

"تو ابھی لونڈا ہے، ان باتوں کو نہیں سمجھتا۔"

"یار تو تو بہت پہنچا ہوا نکلا۔ لیکن اب یہ تو بتا کہ اس وقت جائیں کہاں"؟

راجہ نے آہستہ سے کہا "ابے یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں"

اس کے بعد دونوں خاموش ہو کر گہری فکر میں ڈوب گئے۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے طے کیا کہ واپس لوٹنا ٹھیک نہیں اور جس جگہ وہ کھڑے تھے، وہ جگہ بھی خطرناک تھی۔ لہٰذا انھوں نے اپنے دلوں کو مضبوط کیا اور آگے چل دیئے۔ اُن کے ایک طرف کئی فرلانگ تک پھیلا ہوا احاطہ تھا، جس کی پتھریلی دیوار کے ساتھ ساتھ وہ چل رہے تھے۔ داہنے ہاتھ پر ٹیلا تھا۔ جس پر دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف موت کی سی ویرانی چھائی تھی۔

انھوں نے کوئی دو ڈھائی فرلانگ کا راستہ طے کیا ہو گا کہ ٹیلے کے نشیب میں ان کو کچھ روشنی نظر آئی۔ یہ کسی آبادی کا نشان تھا۔ انھوں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور اُس طرف چل دیئے۔

قریب جا کر انھوں نے دیکھا کہ یہ ایک خانقاہ تھی، جس کے چاروں طرف گھنے درختوں کی باڑھ تھی۔ خانقاہ کے گنبدوں کے اوپر کئی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اندر روشنی ہو رہی تھی اور لوگوں کی آوازیں آہستہ آہستہ آ رہی تھیں۔ انھوں نے سوچا یہ سب سے محفوظ جگہ ہے اور چپ چاپ درختوں کے نیچے سے گذر کر خانقاہ میں پہنچ گئے۔

اندر جا کر انھوں نے دیکھا کہ خانقاہ خاصی کشادہ تھی۔ بیچ میں بڑا سا صحن تھا جس کے چاروں طرف جھکی ہوئی چھتوں کی صحنچیاں تھیں۔ سامنے گنبد کے نیچے ایک مزار تھا جس پر ہار اور پھول بکھرے ہوئے تھے۔ مزار کے چاروں طرف دیواروں پر طاق تھے، جن میں چراغ جل رہے تھے۔ مزار کے قریب دو آدمی سجدے میں پڑے تھے اور کچھ آدمی آنکھیں بند کئے جھوم رہے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مزار کے قریب پہنچ گئے۔ مزار سے متصل ایک حجرہ تھا جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ فرش پر اُجلی چاندنی کا فرش تھا۔ مسند سے لگا ہوا ایک بزرگ صورت شخص بیٹھا تھا۔ اس کی لمبی سفید ڈاڑھی تھی۔ سر پر عمامہ تھا۔ وہ ہاتھ میں بڑے بڑے دانوں کی تسبیح لئے زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا اس کے آس پاس کچھ لوگ جھکے ہوئے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ وہ دونوں خاموش کھڑے حجرے کی جانب دیکھ رہے تھے، اچانک ایک سمت سے شور بلند ہوا۔

"یا سائیں بابا"

دونوں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا، جدھر سے شور اٹھا تھا۔ ایک صحنچی کے نیچے، دھندلی روشنی میں کچھ لوگ حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ وہ دونوں اسی طرف چل دیئے۔ اس لئے کہ وہاں اندھیرا تھا۔ روشنی سے اُن کو خوف معلوم ہوتا تھا۔ دونوں اس ہجوم کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ کون ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں۔ وہ سب لوگ بوسیدہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ جسموں سے پسینے کی سڑاند اٹھ رہی تھی۔ گندے چیکٹ بال اور سرخ سرخ آنکھیں وہ آپس میں اس طرح چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے کہ کسی کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ایک شخص کے ہاتھ میں لمبی سی چلم تھی۔ اُس نے سانس بھر کر چلم پر دم لگایا اور اس کے اوپر ایک سُرخ سرخ شعلہ لہرا گیا۔ اُس نے چلم برابر بیٹھے ہوئے

آدمی کی جانب بڑھا دی۔

چلم اسی طرح ایک دوسرے سے ہوتی ہوئی راجہ تک پہنچی۔ وہ اُس کو لیتا ہوا جھجکا۔ اس شخص نے جس کے ہاتھ میں چلم تھی۔ اس کو گھور کر خونخوار نظروں سے دیکھا اور نعرہ لگایا "یا سائیں بابا" اس نعرے سے راجہ ایک دم گھبرا گیا۔ اُس نے جلدی سے چلم لے کر ایک لمبا کش لگایا۔ اُس کا کلیجہ تک سُلگ گیا۔ سانس حلق میں گھٹنے لگی۔ اُس نے فوراً چلم قریب بیٹھے ہوئے نوشا کی جانب کر دی۔ نوشا نے بغیر کچھ سوچے سمجھے چلم لے کر دم لگایا اور جلدی سے چلم آگے بڑھا دی۔

چرس پر دم لگانے سے دونوں کے کلیجے جلنے لگے۔ حلق خشک پڑ گیا۔ کچھ ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے اُن کا جسم بہت ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ ہوا کا ایک نرم نرم جھونکا آیا تو دونوں بے اختیار جھوم اُٹھے۔ اُن کی آنکھوں کے گرد پردے لہرانے لگے۔ جسم رفتہ رفتہ بے قابو ہوتے جا رہے تھے۔ ذرا دیر تک دونوں بیٹھے جھومتے رہے۔ پھر اُن کی آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو گئے اور وہ وہیں پڑ کر گہری نیند میں سو گئے۔

دونوں دن چڑھے تک پڑے سوتے رہے۔ باہر صحن میں دھوپ پھیل چکی تھی اور ملی جلی آوازوں کا شور اُبھر رہا تھا۔ ابھی وہ اور نہ جانے کتنی دیر تک پڑے سوتے رہتے کہ اسی اثنا میں کسی نے راجہ کی ٹانگ کھینچ کر اس کو زور سے جھنجھوڑا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اُس نے دیکھا ایک گندا سا آدمی اس پر جُھکا ہوا کھڑا تھا۔ وہ اُس سے ڈانٹ کر بولا۔

"لنگر بٹ جائے گا۔ جاؤ جلدی سے جا کر لے آؤ"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ راجہ اُس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو ملا اور انگڑائی لے کر کسل مندی دور کرنے لگا۔ اُس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ گلا خشک تھا۔ اور ہاتھ پیر ٹوٹ رہے تھے۔ جب وہ اپنے گرد و پیش کی زندگی سے کسی قدر مانوس ہو گیا تو اُس نے پاس پڑے ہوئے نوشا کو جگایا جو اب تک بے خبر سو رہا تھا۔ وہ بھی آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ دونوں کو سخت پیاس لگی تھی۔ وہ سوچ ہی رہے تھے کہ پانی کہاں جا کر پئیں۔ اتنے میں وہ گندا سا آدمی پھر واپس آ گیا۔ جس نے راجہ کو جگایا تھا۔ قریب آ کر بولا۔

"تم ابھی تک اپنا لنگر لینے نہیں گئے"

راجہ نے جلدی سے پوچھا "کہاں ہے؟"

وہ بولا "وہ سامنے لنگر خانہ ہے" اُس نے ایک صحنچی کی طرف اشارہ کیا، جہاں لوگوں کی بھیڑ تھی اور آگے بڑھ گیا۔

وہ دونوں اٹھ کر لنگر خانے کی طرف چل دیئے۔ وہاں پر بہت سے نیم برہنہ اور غلیظ آدمی زور زور سے چیخ رہے تھے۔ اُن کے سامنے دو آدمی ایک چبوترے پر کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں تنوری روٹیاں تھیں اور دوسرے کے ہاتھ میں بڑی سی بالٹی تھی جس میں ڈونگا ڈال کر وہ دال نکال کر سامنے پھیلے ہوئے ٹین کے ڈبوں اور المونیم کے میلے میلے برتنوں میں ڈالتا جا رہا تھا اور اُس کے ساتھ ہی لوگوں کو گالیاں بھی دیتا جا رہا تھا۔

"او خنزیر کے بچے پیچھے ہٹو"

"تو دوبارہ آ گیا ہے او حرام خور، پیچھے ہٹ"

"اتنا شور مت مچا او تیرا بیڑا غرق ہو"

مریل جسموں والے نیم برہنہ انسان گالیاں سُن رہے تھے۔ بندر کی طرح دانت نکال کر ہنس رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ کچھ دیر تک دونوں سہمے ہوئے اُن کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ بھی اس بھیڑ میں گھس گئے۔ انھوں نے دھکے کھائے، گالیاں سُنیں مگر ڈٹے رہے۔ آخر ان کو دو، دو خمیری روٹیاں مل گئیں۔ ان کے پاس چونکہ برتن نہیں تھے اس لئے دال روٹیوں ہی پر ڈال دی گئی۔

لنگر ملنے کے بعد وہ ایک صحنچی میں جا کر بیٹھ گئے اور کھانا شروع کر دیا۔ دونوں کو شدید بھوک لگ رہی تھی۔ روٹیاں ٹھنڈی پڑ گئی تھیں مگر چنے کی دال گرم تھی اور مزے کی تھی۔ البتہ مرچیں بہت تھیں۔ دونوں کے منہ میں آگ سی لگ گئی۔ انھوں نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور کنوئیں کی طرف بھاگے، جس کی جگت کے پاس بڑے بڑے پانی کے مٹکے دھرے تھے۔ دونوں نے المونیم کے گندے گلاسوں میں پانی بھر کر کئی گلاس پانی کے پئے اور بھاری بھاری پیٹوں کے ساتھ صحنچی کے کونے میں

جا کر تھکے ہوئے لیٹ گئے۔ لمبی لمبی جھکی ہوئی چھتوں والی صحنچیوں کے نیچے ان کی طرح اور بھی نہ جانے کتنے لوگ یہاں سے وہاں تک فرش پر پڑے اونگھ رہے تھے۔

دونوں کچھ دیر تک تو خانقاہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پھر آنکھیں بند کر کے سو گئے۔

تمام دوپہر وہ بے خبر پڑے سوتے رہے۔ شام سے کچھ دیر پہلے ان کی آنکھ کھلی تو انھوں نے دیکھا کہ خانقاہ کی چہل پہل بڑھ گئی تھی۔

جب خانقاہ میں چراغوں کی روشنی ہر طرف پھیل گئی تو لوگوں کی آمد و رفت اور بڑھ گئی۔ سفید لمبی ڈاڑھی والے سجادہ نشین مزار کے سرہانے جا کر بیٹھ گئے تھے اور اشاروں سے مجاوروں کو احکامات دے رہے تھے۔ عقیدت مند آتے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے۔ دونوں ہاتھوں پر روپے رکھ کر نذرانہ پیش کرتے اور الٹے قدموں لوٹ کر مزار کے پاس ایک طرف بیٹھ جاتے۔

مزار کے قریب ہی صحنچی میں چرسیوں کی محفل جمنے لگی تھی۔ وہ چلم پر دم لگا رہے اور سائیں بابا کے نام کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ ایکا ایکی خانقاہ کے اندر ایک سب انسپکٹر پولس، چار کانسٹبلوں کے ہمراہ آیا۔ پہلے وہ سجادہ نشین کے پاس پہنچا۔ ان سے اجازت لی اور کانسٹبلوں کے ساتھ صحنچیوں میں گھس کر کسی کو تلاش کرنے لگا۔ پولیس والے جب نوشا اور راجہ کے قریب پہنچے تو اُن کے چہرے خوف سے زرد پڑ گئے۔ انھوں نے ذبح ہونے والے جانوروں کی طرح گردنیں لٹکا لیں اور آنے والی مصیبت کا انتظار کرنے لگے۔ مگر یہ مصیبت اُن کے سر سے صاف ٹل گئی۔ وہ سب ان کے پاس سے گذر گئے۔ ذرا دیر بعد انھوں نے دیکھا کہ چرس پینے والوں کے غول میں سے کانسٹبلوں نے ایک پستہ قد کے کالے سے آدمی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور اُس کو حراست میں لے کر چلے گئے۔

خانقاہ میں سناٹا چھا گیا۔ ذرا دیر یہ خاموشی رہی اس کے بعد چرسیوں نے "سائیں بابا!" کا نعرہ بلند کر کے چلم پر دم لگانا شروع کر دیا۔ خانقاہ کی زندگی میں یہ غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ البتہ راجہ اور نوشا ابھی تک سہمے ہوئے تھے۔ جب پولیس والوں کے قدموں کی آواز دور ہو گئی تو نوشا نے کہا۔

"یار راجہ یہ جگہ تو بہت خطرناک ہے۔ اللہ میاں نے بال بال بچا لیا۔"

"ہاں یار یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں"

نوشا پوچھنے لگا "مگر اب جائیں تو کہاں؟"

راجہ ذرا دیر خاموش رہ کر بولا "یار میری سمجھ میں تو ایک بات آتی ہے مگر تو مانے گا نہیں"

"اماں مانوں گا کیوں نہیں کچھ بتاؤ تو"

راجہ سر کے بال کریدتے ہوئے کہنے لگا "میرا تو جی کہتا ہے کہ بی جی کے پاس جا کر اُن کے پیر پکڑلوں اور اُن سے سب کچھ صاف صاف بتا دوں، میں تو دوپہر سے یہی سوچ رہا ہوں"

"مگر یار شاہ جی سے دشمنی مول لینا پڑے گی۔ وہ ہم دونوں کو قتل کروادے گا۔ وہ بڑا خطرناک آدمی ہے"

راجہ نے کہا "یہی تو مجھکو بھی ڈر ہے۔ مگر جب پولس اُس کو پکڑلے گی تو پھر وہ ہمارا کیا بگاڑ یگا"

نوشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں خاموش بیٹھے سوچتے رہے۔ رات کا اندھیرا بڑھنے لگا تھا اور خانقاہ کی رونق شباب پر آرہی تھی۔ جمعرات کا دن تھا۔ اس لئے عقیدت مندوں کا خوب ہجوم تھا۔ نوشا اور راجہ نے پھر باتیں شروع کردیں۔ اور آخر اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ اُن کو خانقاہ چھوڑ دینا چاہیے اور انجنیر کی کوٹھی پر جا کر بیگم سے سب کچھ بتا دینا چاہیے۔ یہ منصوبہ بنا کر راجہ نے ایک شخص سے ہاؤسنگ سوسائٹی کا راستہ پوچھا اور دونوں رات کے اندھیرے میں خانقاہ سے باہر آگئے۔

جس وقت دونوں کوٹھی پر پہنچے، رات کے ۹ بج چکے تھے۔ اُنھوں نے پیدل کئی میل کا راستہ طے کیا تھا اور تھکن سے نڈھال ہو رہے تھے۔ راجہ وہاں آ تو گیا مگر اندر جاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ آخر وہ ڈرتے ڈرتے پھاٹک کے اندر داخل ہوا۔ نوشا بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ لان کو عبور کرکے جیسے ہی وہ روشنی میں آیا، نہ جانے اس وقت کہاں سے اکو اور ننّی نکل پڑے اور راجہ کو دیکھکر اُنھوں نے چیخنا شروع کردیا۔

"راجہ آگیا، راجہ آگیا"

دونوں بچے اس سے آکر چمٹ گئے۔ شور سُن کر بی جی بھی وہاں آگئیں۔ اُنھوں نے راجہ

اور نوشا کو دیکھا تو حیرت سے اُن کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ لپک کر اُن کے پاس آئیں لیکن فوراً ہی کسی نامعلوم خوف سے ٹھٹک کر جلدی سے پیچھے ہٹ گئیں۔ راجہ اور نوشا دونوں سر جھکائے اُن کے سامنے گنہگاروں کی طرح کھڑے تھے۔

بی بی جی کو دونوں پر ایک بارگی بہت غصہ معلوم ہوا۔ اسی وقت انجنیئر صاحب کی کار آگئی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے اور بیگم سے بولے۔

"ارے تم یہاں کھڑی ہو" اچانک اُن کی نظر راجہ پر پڑی، وہ حیرت زدہ ہوگئے "ارے راجہ" وہ لمحہ بھر تک کچھ سوچتے رہے پھر دونوں کو اپنے ہمراہ کوٹھی کے اندر لے آئے۔ اُن کو ایک کمرے میں بٹھایا۔ بیوی کو نگرانی پر مقرر کیا اور فوراً ٹیلیفون سے تھانہ پر اُن کی آمد کی اطلاع کردی۔

کمرے کے اندر پہنچ کر راجہ بی بی جی کے پیروں پر گر کر بے اختیار رونے لگا "بی بی جی مجھے معاف کردو۔ اللہ قسم میری ذرا بھی غلطی نہیں" اس نے رو رو کر شاہ جی اور اُس کے گروہ کا سارا حال بتایا۔ اپنی مجبوری بیان کی۔ وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہیں۔ ان باتوں سے اُن کو حیرت کا احساس بھی ہوا اور کسی قدر متاثر بھی ہوئیں لیکن ان کو سب سے زیادہ صدمہ اپنے سامان کا تھا۔ دونوں جہنم میں جائیں پہلے ان کا سامان ملنا چاہیے۔

ان کو خاموش دیکھ کر راجہ نے کہا "بی بی جی میرا تو جی چاہتا ہے کہ زندگی بھر یہیں رہوں۔ آپ ہم دونوں کو پولیس سے بچا لیجئے گا۔"

نوشا جلدی سے بولا "اللہ کی قسم ہمارا تو ذرا بھی قصور نہیں تھا"

بی بی جی "اچھا، اچھا" کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ذرا دیر بعد راجہ کو پیشاب لگا۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا تو وہ باہر سے بند تھا۔ فوراً اس کا ماتھا ٹھنکا کہ کوئی خطرناک بات ہونے والی ہے۔

اُس نے فوراً نوشا سے کہا "یار چوٹ ہوگئی"

وہ گھبرا کر بولا "کیا؟"

"کمرہ باہر سے بند ہے"

"کیوں؟"

راجہ اس کے سوال کا جواب دینے بھی نہیں پایا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور پولیس والے اپنے بھاری بھاری جوتے پختہ فرش پر بجاتے ہوئے اندر گھس آئے اور دونوں کے ہاتھوں میں فوراً ہتکڑی ڈال دی۔ اس کے بعد وہ اُن کو پولیس کی گاڑی میں بٹھا کر تھانے لے گئے۔ اُن کا بیان لیا۔ اور اُسی رات کو شاہ جی کے اڈے پر چھاپا مارنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

شاہ جی کو اپنے گرگوں کے ذریعہ راجہ اور نوشا کی گرفتاری کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی — پولیس جب وہاں پہنچی تو گھر میں صرف پٹھان چوکیدار تھا۔ پولس نے اس کو بھی گرفتار کر لیا۔ تھانے پر لا کر اس سے معلوم ہوا کہ شاہ جی اور اُس کے ساتھی کوئی ۱۰ بجے رات کو گھر سے نکل گئے تھے اور یہ کہہ کر گئے تھے کہ صبح واپس لوٹیں گے۔ سب انسپکٹر انچارج نے فوراً اُس کے گھر کی نگرانی شروع کرا دی ہر تھانے اور ریلوے اسٹیشن پر اطلاع دی۔ وائرلیس کے ذریعہ حیدرآباد اور کراچی کے درمیان کے تمام تھانوں کو باخبر کر دیا۔ اس لئے کہ رات بھر میں شاہ جی اس سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔ ریل گاڑی کے جانے کا وقت نہیں تھا۔ سب انسپکٹر کا اندازہ تھا کہ وہ ضرور کار کے ذریعہ فرار ہوا ہے اور کراچی سے جلد سے جلد باہر نکلنے کی کوشش کرے گا۔ وہ خاموش بیٹھ کر کسی امید افزا اطلاع کا انتظار کرنے لگا۔

راجہ اور نوشا کو حوالات کے اندر بند کر دیا گیا۔ وہ سلاخوں کے پیچھے کھڑے ہوئے سوچ رہے تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔ راجہ خاموش تھا اور نوشا بے حد جھنجلایا ہوا تھا۔ وہ گھور گھور کر راجہ کو خونخوار نظروں سے دیکھتا، جس نے اپنے ساتھ اس کو بھی مصیبت میں پھنسوا دیا تھا۔

انچارج کے کمرے سے بار بار کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ ٹیلیفون کے پاس خاموش بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا۔ رات تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ تھانے میں سناٹا پڑ گیا تھا کبھی کبھی فرش پر کانسٹبلوں کے بھاری بھاری قدموں کی آواز اُبھرتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ کوئی دو بجے رات کو

اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے بجی۔ انسپکٹر نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے اطلاع ملی کہ ٹھٹھہ پر شاہ جی کے حلیے کے ایک شخص کو کئی اور آدمیوں کے ساتھ مشتبہ حالت میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ ٹیکسی سے سفر کر رہے تھے۔ انسپکٹر نے جواب میں کہا کہ اُن کو فوراً یہاں بھیج دیا جائے۔

سویرا ہونے سے کچھ دیر پہلے شاہ جی، نوزخان، ولو مٹن، تین اور آدمیوں کے ساتھ پولیس کی حراست میں تھانے کے اندر لائے گئے۔

شاہ جی کو ایک روز حوالات میں رکھ کر جیل بھیج دیا گیا۔ مہینہ بھر تک مقدمہ چلا۔ چوری کا مال برآمد ہو چکا تھا۔ سارے ثبوت موجود تھے۔ شاہ جی اور اُس کے ساتھیوں کو لمبی لمبی سزائیں ہوئیں۔ اُن کے ساتھ ہی راجہ اور نوشا کو بھی سال سال بھر کی سزا دی گئی۔ اُن کو اسی روز ریمانڈ ہوم (بچوں کی جیل) بھیج دیا گیا۔

فصل پنجم

۱

شادی کے چند ہی روز بعد، نیاز کباڑ خانہ کی کوٹھری سے اپنا سامان اٹھوا کر لونشا کے گھر میں آگیا اُس نے مکان کی از سرِ نو مرمت کرائی۔ اپنی رہائش کے لئے ایک علیحدہ کمرہ بنوایا۔ دیواروں پر پلاسٹر کرایا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر روغن پھروایا۔ وہ مکان جو کبھی کھنڈر کی طرح بوسیدہ نظر آتا تھا اب دلہن کی طرح سجا ہوا لگتا تھا۔

سلطانہ کے ساتھ اس کا رویہ بہت سنبھلا ہوا تھا۔ وہ اُس سے بہت کم بات کرتا اور کبھی اس کمرے میں نہیں گیا، جس میں سلطانہ اور انور رہتے تھے۔ یوں کاروبار سے اُس کا جس قدر بھی وقت بچتا تھا، وہ گھر ہی پر گزرتا تھا۔ وہ عام طور سے کمرے کے اندر بیٹھا بیوی سے دنیا جہان کی باتیں کیا کرتا۔ اکثر بیوی کو بازار لے کر جاتا اور سامان سے لدا پھندا لوٹتا۔ دو بار وہ اس کو سینما دکھانے بھی لے گیا۔ رات کو وہ جب بھی دوکان سے واپس آتا تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ خالی ہاتھ آیا ہو، ہمیشہ پھل، مٹھائی یا کچھ اور کھانے پینے کا سامان لے کر گھر میں داخل ہوتا۔ روزانہ شام کو گلفروش دروازے پر آواز دے کر مہکتے ہوئے گجرے اور ہار دے جاتا۔

یہ بڑے ہنسی خوشی کے دن تھے۔ گھر بھر میں ہر وقت گہما گہمی رہتی۔ سب سے زیادہ مسرور سلطانہ کی ماں تھی۔ اُس کے رخسار نکھر کر گلابی پڑتے جا رہے تھے۔ آنکھوں میں نرالی چمک دمک تھی۔ شام کو جب وہ بن ٹھن کے بیٹھتی تو عطر اور پھولوں کے گجروں سے اس کا جسم مہکنے لگتا۔ اس پر ایک نئی پھبن

آجاتی۔ وہ بڑی سدا بہار عورت تھی۔ دیکھنے والوں کو اس پر اور سلطانہ پر چھوٹی بڑی بہنوں کا گمان ہوتا۔

لیکن ماں جس قدر شاداں نظر آتی، سلطانہ اسی قدر بجھی بجھی اور افسردہ نظر آتی۔ اس میں دوشیزگی کا جو الھڑپن تھا، اس پر ایک اکتا دینے والی خاموشی چھاتی جا رہی تھی۔ وہ بہت کم بات چیت کرتی۔ عام طور پر تھکی ہوئی سی کمرے کے اندر پڑی رہتی۔

ستمبر کی ایک شام کا ذکر ہے جب ماں نیاز کے ساتھ سینما دیکھنے گئی تھی۔ انّو بھی ضد کر کے ان کے ساتھ لگ گیا تھا۔ وہ گھر میں تنہا تھی اور نڈھال سی باورچی خانہ میں بیٹھی تھی۔ چولھے کے اندر لکڑیاں جل رہی تھیں۔ آگ کے نارنجی شعلے ابھر رہے تھے۔ باہر رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ شیشم کے درخت سے زرد، زرد پتے ٹوٹ ٹوٹ کر آنگن میں گر رہے تھے۔ ہوا چلتی تو بکھرے ہوئے پتے کھڑکھڑانے لگتے۔ بڑی پراسرار سی آہٹ پیدا ہوتی۔ ان ہی آہٹوں میں ملی جلی ایک آواز دروازے پر ابھری۔

یہ سلمان تھا اور انّو کو آواز دے رہا تھا۔ سلطانہ ایک بارگی چونک پڑی اور خاموش بیٹھی سوچتی رہی کہ اس کو کیا کرنا چاہیے۔ کئی لمحے اسی عالم میں گذر گئے۔ آواز رک رک کر ابھرتی رہی۔ سلطانہ سے اس طرح بیٹھا نہ گیا۔ وہ بے چینی کے عالم میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس دروازے کی جانب دیکھا۔ جس کے پیچھے سلمان کھڑا تھا۔ چھریرے جسم کا وہ نوجوان، جس کی آنکھیں شرمائی رہتی تھیں۔ بالوں میں بے ترتیبی تھی اور چہرے کے تیکھے نقش و نگار میں دل آویزی نظر آتی تھی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ خشک پتے کھڑکھڑائے اور گویا کسی نے سلطانہ کے کان کے پاس سرگوشی میں کہا۔

دیکھ وہ واپس چلا جائے گا،

وہ، جو چل کر تیرے گھر تک آیا ہے،

جس کے انتظار میں تیری آنکھوں کا کاجل پھیکا پڑ گیا،

رخسار گیندے کے پھول بن گئے،

سہانی راتیں اُداس اور کافوری صبحیں ویران ہوگئیں۔

دیکھ وہ واپس جارہا ہے!

— وہ واپس جارہا ہے۔

خزاں رسیدہ پتے آنگن میں کھڑکھڑاتے رہے۔ ہوا سرسراتی رہی اور دبی دبی سرگوشیاں اُبھرتی رہیں۔ سلطانہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باورچی خانے سے باہر نکلی۔ اُس نے آنگن کو عبور کیا اور دروازے کی کنڈی کھول دی۔ وہ اس وقت کسی سحر زدہ ہستی کی طرح مبہوت نظر آرہی تھی۔

سلمان نے دروازہ کھولا اور اندر آگیا۔ دھندلی روشنی میں اُس نے سامنے کھڑی ہوئی سلطانہ کو دیکھا اور ٹھٹک کر رُک گیا۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"سلطانہ!"

"جی"

اس کے بعد دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔ دونوں خاموش کھڑے رہے۔

ذرا دیر بعد سلطانہ کی آواز ابھری: "اب آپ کیوں آئے ہیں؟" اس کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

سلمان نے اس کی تلخی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور سر جھکا کر بولا۔

"تم سے معذرت کرنے آیا تھا"

"کاہے کی معذرت؟"

"بہت ناراض معلوم ہوتی ہو"

سلطانہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش کھڑی رہی۔

سلمان آہستہ آہستہ کہنے لگا "سلطانہ میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا۔ آج میں تم سے سب کچھ صاف صاف بتادینا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے اس رات جب میں تمھارے گھر سے نکل کر گیا، تو میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ اور یہ تو تم جانتی ہو کہ ایسی حالت میں، میں تم کو کیسے اپنے ہمراہ لے جاتا۔ اس رات میں اپنے ہر دوست اور شناسا کے پاس گیا

مگر کوئی بھی میرے اڑے وقت پر کام نہ آیا۔ میرے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی، جس کو بیچ کر کچھ رقم مہیا کر لیتا۔ اُس روز میں ــــ تمام رات پاگلوں کی طرح سڑکوں پر گھومتا رہا۔ تمھیں کس طرح بتاؤں کہ اُس رات مجھ پر کیا بیتی۔"

سلطانہ اس انکشاف پر چونک پڑی۔ اُس نے نگاہیں اٹھا کر سلمان کو دیکھا، جو دروازے کی جانب پیٹھ کئے کھڑا تھا اور بہت مدھم لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کا کرب تھا اور چہرے پر دکھ کا سایہ پھیلا ہوا تھا۔ سلطانہ نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ چپ چاپ اُس کی باتیں سُنتی رہی۔ سلمان کہتا رہا۔

"شاید تمھیں نہیں معلوم کہ میں ایک عرصہ سے پریشانیوں میں گھرا ہوا ہوں۔ ابا جان نے مجھکو خرچہ بھیجنا بند کر دیا ہے۔ میری تعلیم بھی ادھوری رہ گئی۔ ورنہ میں اس سال گریجویٹ ہو جاتا۔ ملازمت تلاش کر رہا ہوں، وہ ابھی تک ملی نہیں۔" وہ اس وقت اپنی زندگی پر سے ہر پردہ اٹھا دینا چاہتا تھا، ہر بات کہدینا چاہتا تھا۔

"....... زندگی میرے لئے عذاب بن گئی ہے، اور اس عذاب میں، میں تم کو شریک کرنا نہ چاہتا تھا۔ حالانکہ یہ میری سب سے بڑی تمنا تھی کہ تم میری بن جاتیں اور ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتیں۔"

سلمان نے گہری سانس بھری اور اس کا چہرہ اور بھی زیادہ اداس ہو گیا۔ سلطانہ کو اس کی باتوں سے صدمہ پہنچا۔ وہ لرز لرز اٹھی۔ اظہار ہمدردی کے طور پر اس نے کہا۔ "تو پھر آپ اپنے گھر کیوں نہیں چلے جاتے۔"

وہ کہنے لگا۔ "نہیں سلطانہ اب میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ زندگی میں بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد، اب میں نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ کسی کی انگلی پکڑ کر چلنے کے بجائے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی کوشش کروں گا۔ یہ عہد میں نے اسی رات کیا تھا۔ وہ رات میری زندگی کی بڑی عجیب رات تھی۔" ایک بار پھر سلمان نے گہری سانس بھری اور آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "بات یہ ہے سلطانہ

میں نے بڑی بے راہ روی کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ مگر اب چاہتا ہوں کہ زندگی میں کچھ باقاعدگی آجائے اور میں ــــ" اپنی بات کہتے کہتے اُس نے اچانک نظریں اٹھا کر سلطانہ کو دیکھا اور بڑی بےچارگی سے بولا "سلطانہ تم مجھ کو اس طرح نہ دیکھو۔ میں اتنا بُرا آدمی نہیں ہوں" وہ ایکبارگی بے حد جذباتی ہوگیا پھر اُس سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ سلطانہ مبہوت کھڑی رہی۔

چند لمحوں کے لئے گہری خاموشی چھاگئی۔ صحن میں خزاں کے مارے ہوئے خشک پتے آہستہ آہستہ کھڑکھڑاتے رہے۔ رات کا اندھیرا اور بڑھ گیا۔ سناٹا آسیب زدہ ہوگیا۔ سلطانہ نے سوچا کہیں سب لوگ واپس نہ آجائیں۔ بڑا غضب ہو جائے گا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے سلمان سے کہا "ایک بات کہوں بُرا تو نہ مانیئے گا" پھر اُس نے جواب کا انتظار کئے بغیر اپنی بات کہدی "آئندہ آپ یہاں نہ آیا کریں"

سلمان کے دل پر گھونسا سا لگا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ سلطانہ نے اُس کو خاموش دیکھکر فوراً کہا "بات یہ ہے کہ اماں نے شادی کرلی ہے" یہ کہتے کہتے وہ گھبرا گئی۔ سلمان حیرت سے چونک پڑا "اماں کی شادی ہوگئی؟" اُس کو سلطانہ کی بات پر یقین نہ آیا۔ وہ آہستہ سے بولی۔

"جی ہاں"

وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا "کس کے ساتھ شادی ہوئی؟"

"آپ انھیں نہیں جانتے۔ ہمارے ایک رشتہ دار ہیں نیاز، انہی کے ساتھ ہوئی ہے"

سلمان نے گھبرا کر پوچھا "وہی تو نہیں، جن کی کباڑ خانے کی دوکان ہے؟" وہ بولی۔

"ہاں وہی۔ آپ اُن کو جانتے ہیں؟"

وہ صاف مکر گیا "ایسے ہی ایک بار ملاقات ہوگئی تھی" سلطانہ کہنے لگی "آپ یہاں آیا جایا کریں گے تو وہ ناراض ہوں گے۔ وہ بڑے شکی آدمی ہیں۔ کسی دن آپ کی بےعزتی کر بیٹھے تو کتنی بُری بات ہوگی۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ آپ آئندہ نہ آئیں۔ مجھے بڑا ڈر معلوم ہوتا ہے" سلمان نے بڑے دُکھ کے ساتھ کہا "اچھا نہیں آؤں گا"

سلطانہ نے بڑی گہری سانس بھری۔ جیسے اس کو شدید صدمہ پہنچا ہو۔ وہ گھبرائی ہوئی

آواز میں بولی "اب آپ جائیں۔ سب لوگ سینما گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔"

"اچھا"

"ہاں مجھے ڈر لگ رہا ہے"

سلمان نے اچانک کچھ سوچ کر پوچھا "سلطانہ تم نے اپنی شادی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا"

وہ حیرت سے بولی "میری شادی؟"

"اُس رات جب میں تم کو لینے کے لئے آنے والا تھا، اُس کی صبح کو تمھارا نکاح ہونے والا تھا۔ تمھاری اماں نے مجھ سے یہی کہا تھا"

"لیکن اُس صبح کو تو اماں کا نکاح ہوا تھا"

سلمان کی سمجھ میں یہ معمہ نہیں آیا۔ وہ خاموش کھڑا سوچتا رہا۔

سلطانہ نے کچھ سوچ کر کہا "وہ پہلے میری شادی کر دینا چاہتی تھیں"

سلمان نے فوراً پوچھا "کیوں؟"

وہ بولی "وہ نیاز کو کچھ اچھا آدمی نہیں سمجھتیں" وہ اپنی بات کو پوری طرح واضح نہ کر سکی۔ مگر سلمان ذہین نوجوان تھا کسی حد تک بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ آن کی آن میں نیاز اُس کے سامنے رقیب روسیاہ کے روپ میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اپنے دل کے چور کو اُس نے بہت چھپانا چاہا مگر پھر بھی وہ پوچھ ہی بیٹھا۔

"اور نیاز کے متعلق تمھاری اپنی رائے کیا ہے؟"

وہ بڑی معصومیت سے بولی "مجھے اُن سے نہ جانے کیوں ڈر لگتا ہے"

اس سادگی پر سلمان کو پیار آگیا، اُس کے رخسار کو تھپتھپا کر بولا "میری بھولی بھالی گڑیا" اور اُس کو بے اختیار اپنے سینے سے لگا لیا۔ لیکن لمحہ بھر ہی بعد وہ سہمی ہوئی آواز سے کہنے لگی۔

"اب جائیے، وہ لوگ آتے ہی ہوں گے"

سلمان بھی گھبرا گیا۔ اُس نے جلدی سے کہا۔ "اچھا اب میں چلوں گا۔ تم جب بھی کسی پریشانی میں ہو۔ انو کے ذریعہ مجھ کو اپنا پیغام بھجوا دینا۔ میرا خیال ہے کہ تم اُس سے یہ کام لے سکتی ہو۔"

وہ بولی۔ "کہیں وہ کسی سے کچھ نہ کہدے۔ اس سے ڈر لگتا ہے۔"

"نہیں تم اُس کو سمجھا دینا۔"

"اچھی بات ہے۔"

سلمان نے دروازے کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ "اچھا خدا حافظ" اور اس کے بعد وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

گلی میں آ کر وہ آگے جاتے جاتے ٹھٹک کر رہ گیا۔ اُس نے سوچا اب معلوم سلطانہ سے کب ملاقات ہو، کچھ دیر اس سے اور باتیں کرے۔ پھر یہ موقعہ بھی میسر نہ آئے گا! ابھی کتنی ایسی باتیں رہ گئی تھیں جو وہ سلطانہ سے دریافت کرنا چاہتا تھا، جن کا جاننا اس کے لئے ضروری تھا، لیکن وہ واپس لوٹ کر نوشا کے دروازے پر نہ گیا۔ آہستہ آہستہ تاریک گلی میں چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جب وہ دوسری گلی کی جانب مڑنے لگا تو اچانک اُس کی نظر نیاز پر پڑی۔ وہ میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے سے گذر رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک برقعہ پوش عورت تھی اور اُس کے ساتھ ساتھ انو بھی چل رہا تھا۔ اُس نے دور ہی سے ان سب کو پہچان لیا۔ اس وقت نیاز کے سامنے جانا مناسب نہ تھا، لہٰذا وہ واپس مڑ کر ایک اور گلی میں گھس گیا۔ اور ایک لمبا چکر کاٹ کر بازار میں آ گیا۔

بازار میں دوکانیں بند ہو چکی تھیں، البتہ پنواڑیوں کی دوکانیں جگمگا رہی تھیں اور چائے خانوں میں خاصی رونق تھی۔ اس کو اب بھوک لگ رہی تھی، جس کا احساس رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی جیب میں بمشکل ۱۲ آنے کی ریزگاری تھی۔ اس لیے کسی اچھے ہوٹل میں جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا بازار کے اس نکڑ پر پہنچ گیا، جہاں سے ایک سڑک نشیب میں جاتی تھی۔ اس سڑک پر چند قدم چل کر بائیں ہاتھ کو ایک بھٹیار خانہ تھا، یوں اُس کے مالک نے اپنے گاہکوں کی تسکین کے لئے دروازے پر "شاہ پسند ہوٹل" کا بورڈ لگا رکھا تھا۔

سلمان جب سڑک پر مڑ کر اس گھٹیا ہوٹل کے سامنے پہنچا تو وہاں خاصی چہل پہل تھی۔ لمبی لمبی غلیظ میزوں کے گرد گاہکوں کی بھیڑ تھی۔ جن میں زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگ تھے۔ وہ اونچی آوازوں سے بول رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے بے تکلفی سے ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔

سلمان ہوٹل کے ایک الگ تھلگ کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہاں روشنی کم تھی اور زیادہ ہنگامہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے صرف ایک آدمی بیٹھا تھا، جو جبڑوں سے آواز پیدا کر کے کتے کی طرح جلدی جلدی کھانا کھا رہا تھا۔ اُس نے نفرت سے ایک بار اُس کو دیکھا اور بیرے کو کھانا لانے کا آرڈر دے دیا۔

ذرا دیر بعد دو گرم تنوری روٹیاں اور سالن کی پلیٹ اُس کے سامنے آگئی۔ کھانا بڑا چیٹ پٹا تھا، اُس کا ذائقہ سلمان کو اچھا لگا۔ جب کبھی اُس کے پاس تھوڑے پیسے ہوتے تھے، وہ اسی بھٹیا خانے میں آکر کھانا کھا جاتا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اُس نے چائے بھی پی، اور اس کا پورا بل کُل ساڑھے سات آنے کا ہوا تھا۔

"شاہ پسند ہوٹل" سے باہر نکلتے ہی اُس کی نظر ایک شخص پر پڑی اور وہ جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ وہ اس کے کالج میں تاریخ کا لکچرار تھا۔ وہ سامنے سے گردن جھکائے کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا آرہا تھا۔ سلمان نے چاہا کہ اُس کی نظر بچا کر گذر جائے مگر وہ چند ہی قدم آگے گیا ہوگا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"مسٹر سلمان!"

اُس نے بادلِ ناخواستہ مڑ کر اس طرف دیکھا۔ پروفیسر علی احمد اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ خشک بال، سوچتی ہوئی آنکھیں اور مرجھایا ہوا زرد چہرہ لیکن اس کی مخصوص مسکراہٹ اس وقت بھی ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ اُس نے نظر بھر کر سلمان کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"بہت دُبلے ہو گئے تم؟"

سلمان صاف جھوٹ بول گیا "بیمار پڑ گیا تھا۔"

وہ پوچھنے لگا۔ کہاں جا رہے ہو؟"

"گھر جانے کا ارادہ تھا"

علی احمد کہنے لگا "اگر کوئی اور پروگرام نہ ہو تو آؤ میرے ساتھ چائے پیو۔ میرا مکان یہاں سے دور نہیں ہے۔ سلمان انکار نہ کر سکا اور خاموشی کے ساتھ اس کے ہمراہ ہو لیا۔

علی احمد کا مکان واقعی زیادہ فاصلہ پر نہیں تھا مشکل سے انھوں نے ایک فرلانگ فاصلہ طے کیا ہوگا کہ علی احمد ایک دو منزلہ بلڈنگ کے سامنے جاکر ٹھہر گیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر زینے کا دروازہ کھولا اور سلمان کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ زینے کے اندر اندھیرا تھا، دونوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ علی احمد نے جیب سے کنجی نکالی اور دروازے پر پڑا ہوا تالا کھولا۔

مکان کے اندر بجلی کا ایک بلب جل رہا تھا، جس کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک کمرے سے گزر کر دوسرے کمرے میں پہنچے۔ یہاں تاریکی تھی۔ علی احمد نے فوراً سوئچ دبایا، اندر روشنی ہوگئی۔ سلمان نے دیکھا کہ یہ خاصہ کشادہ کمرہ تھا۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں ان سے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اندر آرہے تھے۔ کمرے میں معمولی سا فرنیچر تھا۔ بید کا بنا ہوا سستے قسم کا صوفہ، تین چار کرسیاں، ایک آفس ٹیبل اور اس کے برابر کتابوں کی الماری۔ میز پر چند کتابیں اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ مطالعہ کرتے کرتے اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔

علی احمد نے میز پر سے "لائف" کا تازہ نمبر اٹھایا اور سلمان کی طرف بڑھا کر بولا۔

"تم اس کی تصویریں دیکھو، میں اتنی دیر میں چائے تیار کرکے لاتا ہوں"

سلمان بولا "آپ خواہ مخواہ تکلف نہ کریں، میں ـــــ"

وہ بات کاٹ کر فوراً بولا "اس میں تکلف کی کون سی بات۔ میں روزانہ اس وقت چائے کا ایک پیالہ پیتا ہوں اور ہمیشہ خود ہی تیار کرتا ہوں۔ میرا نوکر کھانا کھلانے کے بعد اپنے گھر چلا جاتا ہے"

"میں کچھ آپ کی مدد کروں"

وہ کہنے لگا "شکریہ۔ تم مجھ سے اچھی چائے نہیں بنا سکتے۔ مسٹر یہ سیدھا سادا ٹیسٹ کا

سوال ہے۔"

یہ کہکر وہ کمرے سے باہر چلا گیا اور سلمان خاموشی سے بیٹھا میگزین کے ورق پلٹتا رہا۔ اور تصویریں دیکھتا رہا۔ باورچی خانے سے برتنوں کے ٹکرانے کی آوازیں آرہی تھیں، جہاں علی احمد چائے تیار کر رہا تھا۔

کچھ عرصہ بعد پروفیسر علی احمد کمرے کے اندر تھا اُس کے ہاتھ میں ٹرے دبا ہوا تھا سلمان نے غور کیا کہ علی احمد نے چائے بڑی نفاست سے تیار کی تھی۔ دونوں آہستہ آہستہ بیٹھے چائے پیتے رہے اور سگرٹ کے کش لگاتے رہے۔ کھڑکی سے ہوا کے نرم نرم جھونکے آرہے تھے۔ شہر کے ہنگامے سرد ہوتے جا رہے تھے۔ آوازوں کا شور رفتہ رفتہ مدھم پڑتا جا رہا تھا۔

علی احمد غور سے سلمان کے چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر اُس سے پوچھنے لگا "ہاں بھئی اب یہ بتاؤ کہ تم آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں "سلمان کا مختصر سا جواب تھا۔

"آئندہ کے متعلق تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا"

وہ اصرار کرنے لگا" بہرحال مستقبل کے بارے میں تم نے کچھ نہ کچھ تو سوچا ہی ہوگا۔"

سلمان کچھ اور سنجیدہ ہو گیا: "اس معاشرے نے مستقبل کے لئے کوئی منصوبہ بنانے کا حق ہی کب دیا ہے۔ یہ حق تو زندگی میں صرف چند خوش نصیبوں کو حاصل ہے اور ان خوش نصیبوں کی فہرست میں میرا نام نہیں ہے" اس کے لہجے میں خاصی تلخی آگئی تھی۔

علی احمد مسکرا کر بڑی نرمی سے بولا: "اصطلاحات میں باتیں کرنے کے بجائے کیوں نہ ہم حقیقت پسندی سے کام لیں۔ میرا مطلب ہے کہ تم معاشرے کو کوسنے کے بجائے صرف اپنے متعلق بات کرو"

سلمان اسی تلخی کے ساتھ بولا" دیکھئے بات یہ ہے۔ میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں مگر اس کو جاری نہیں رکھ سکتا۔ ملازمت چاہتا ہوں۔ وہ ملتی نہیں۔ ایک معزز شہری کی حیثیت سے

زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں، اس کے امکانات نہیں پیدا ہوتے۔ سیدھا سادھا اقتصادی مسئلہ ہے۔"
پروفیسر علی احمد ذرا دیر خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا، پھر کہنے لگا " تم بڑے ذہین اسٹوڈنٹ تھے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تم نے اپنی ذہانت سے کوئی کام نہیں لیا"
سلمان نے فوراً کہا "کیا آپ کے خیال میں میں ایک ذہین نوجوان ہوں"
" میرا خیال ہے کہ مجھے اپنی رائے پر فی الحال نظر ثانی کرنے کی ضرورت نہیں"
" تو پھر کسی دن میرے ساتھ کسی انٹرویو بورڈ میں چلئے۔ جہاں سے آج تک مجھے ناکارہ اور گھامڑ ہونے کی سند ملتی رہی ہے۔"
علی احمد آہستہ سے بولا " مجھے تم سے پوری پوری ہمدردی ہے۔"
سلمان جھنجھلا کر بولا "معاف کیجئے گا پروفیسر صاحب، مجھے ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ وہ تو میں کسی بھوکے کو ایک وقت کا کھانا کھلا کر آسانی کے ساتھ خرید سکتا ہوں۔"
وہ گھبرا کر بولا " تم واقعی بیمار ہو۔"
سلمان کہنے لگا " یہ بات بھی نہیں۔ آپ بند کمروں کے اندر بیٹھ کر زندگی کو کتابوں کے اندر تلاش کرتے ہیں اور میں نے زندگی کو شراب خانوں میں، بالا خانوں میں، قمار خانوں میں دیکھا ہے۔ مسلسل فاقے کئے ہیں۔ ذلتیں برداشت کی ہیں۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کے بعد تجربہ حاصل کیا ہے۔ زندگی کو برہنہ آنکھ سے دیکھئے کہ وہ کس قدر مظلوم ہے" وہ بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ اس کے سینے میں مدت سے جو آگ سلگ رہی تھی، وہ اچانک بھڑک اٹھی تھی۔ آج اس کے سارے زخم ہرے ہو گئے تھے اور وہ ان زخموں کو اپنی تمام آلائش کے ساتھ پروفیسر علی احمد کے سامنے برہنہ کر دینا چاہتا تھا۔ اس نے یہ بھی لحاظ نہ رکھا کہ وہ علی احمد کا طالب علم رہ چکا ہے۔
لیکن علی احمد نے اس کی باتوں پر کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ اسی طرح مسکرا کر بولا۔
" مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ حالات نے تمھاری شخصیت کو مسخ کر دیا ہے۔ تم انا کی طرف جا رہے ہو۔ یہ تباہی کا راستہ ہے۔ مجھے خوف ہے کہ تم اپنی ذات سے انتقام لیتے لیتے کہیں سوسائٹی

سے انتقام لینا نہ شروع کردو۔ یہ بڑا خطرناک رجحان ہے۔ تم ذہین نوجوان ہو اور ذہین نوجوان کسی قوم کا بہت بڑا سرمایہ ہوتے ہیں۔"

سلمان جیسے اب تھک گیا تھا۔ وہ اس عرصہ میں دو پیالی چائے بنا کر پی چکا تھا۔ اور مسلسل سگرٹ پیئے جا رہا تھا۔ اُس نے نڈھال ہو کر صوفے کی پشت سے پیٹھ لگا دی اور خاموشی کے ساتھ پروفیسر علی احمد کی باتیں سنتا رہا۔ علی احمد چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولا۔

"تم مجھے اپنا کچھ وقت دے سکتے ہو؟"

سلمان بولا "میرے پاس وقت کا کوئی مصرف نہیں۔ جتنا وقت چاہیں دے سکتا ہوں۔"

"پرسوں شام کو تم میرے پاس آجاؤ۔ میں تم کو ایک جگہ لے چلوں گا۔"

سلمان نے پوچھا "کوئی خاص پروگرام ہے؟"

علی احمد نے جواب دیا "یہ تم کو وہیں پہنچ کر معلوم ہوگا۔"

سلمان نے انکار نہ کیا اور پرسوں شام کو علی احمد کے پاس آنے کا وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد زیادہ بات نہ ہو سکی۔ رات خاصی بھیگ چکی تھی اور سلمان کو ابھی دور جانا تھا۔ لہٰذا وہ پروفیسر علی احمد سے اجازت لے کر اپنے گھر چلا گیا۔

۲

تیسرے دن حسبِ وعدہ سلمان پروفیسر علی احمد کے گھر پہنچا۔ وہ بیٹھا اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ دونوں نے گھر پر زیادہ وقت نہیں گزارا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ زینے کی سیڑھیاں طے کرکے باہر سڑک پر آگئے۔ بڑی خوش گوار شام تھی۔ دونوں کو سڑک پر چہل قدمی کرنے میں لطف آرہا تھا۔

راستہ میں علی احمد نے سلمان سے کوئی گفتگو نہیں کی۔ وہ خاموشی میں ڈوبا ہوا آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور سلمان سوچ رہا تھا کہ علی احمد اس کو نہ معلوم کہاں لے جا رہا ہے۔ نہ اس کو منزلِ مقصود کا پتہ تھا اور نہ یہ خبر تھی کہ وہ کس لئے جا رہا ہے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد پروفیسر علی احمد ایک خوبصورت کوٹھی کے سامنے جاکر ٹھہر گیا۔

اُس نے لمحہ بھر کے لئے کوٹھی کو غور سے دیکھا اور پھاٹک کے اندر داخل ہوگیا۔ سلمان بھی اس کے ساتھ ساتھ اندر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں جاکر دونوں نے دیکھا کہ وہاں کچھ اور بھی لوگ موجود تھے، جو کئی گروہوں میں بیٹھے ہوئے گفتگو کرنے میں مصروف تھے۔ سلمان کو اُن کی بات چیت سے صرف اس قدر اندازہ ہو سکا کہ کوئی کانفرنس ہونے والی ہے۔

ٹھیک آٹھ بجے سب لوگ اٹھ کر اس کمرے میں چلے گئے، جس میں کانفرنس کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ خاصہ کشادہ تھا۔ بیچ میں ایک لمبی میز تھی، جس کے چاروں طرف وارنش سے جھلکتی ہوئی اسپرنگ دار کرسیاں تھیں۔ ہر کرسی کے مقابل، میز پر سفید کاغذ اور پنسلیں قرینے سے

رکھی تھیں ۔کمرے کی فضا کچھ ٹیکنیکلر قسم کی لگ رہی تھی۔ دیوار گیریوں سے گہری نارنجی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں اور اُس تیز روشنی میں دروازوں پر لٹکے ہوئے ریشمی پردے جھلک رہے تھے۔

سلمان بھی سب کے ساتھ ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے نظر بھر کر صفدر بشیر کو دیکھا جو اس کانفرنس کا روحِ رواں تھا! اس کی شخصیت اس وقت سب سے نمایاں نظر آرہی تھی۔ وہ ہونٹوں میں دبے ہوئے پائپ پر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ وہ چھریرے جسم کا طویل قامت نوجوان تھا اور وضع قطع سے اچھا خاصا انٹلکچوئل لگتا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں آٹھ اور نوجوان موجود تھے۔ تین بے روزگار گریجویٹ، سرکاری اسپتال کا ایک معطل ڈاکٹر، گورنمنٹ کالج کا ایک جونیئر لکچرار (علی احمد) ایک کم تنخواہ پانے والا کلرک اور ڈاکٹر ایم۔ اے کے طالب علم بھی ان میں شامل تھے۔ ان کے چہروں پر دھندلی دھندلی لکیروں کا جال بکھرا تھا اور آنکھوں کی گہرائی میں بجھتے ہوئے چراغوں کی سی جھلملاہٹ تھی۔

صفدر بشیر لندن سے پچھلے ماہ واپس آیا تھا۔ وہ کیمبرج میں معاشیات کا طالب علم تھا! اچانک اُس کے گھر سے ایک روز کیبل آیا جس میں اُس کے باپ کے انتقال کی اطلاع تھی۔ اُن کی موت حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث واقع ہوئی تھی۔ سارا پروگرام ادھورا چھوڑ کر اُس کو واپس آنا پڑا۔ باپ نے ترکہ میں کئی لاکھ کی جائیداد چھوڑی تھی، جو اُس کے چار بھائی بہنوں میں تقسیم ہو گئی اور اس طرح ایک کوٹھی کے علاوہ ۸۰ ہزار سے زائد روپیہ اُس کے ہاتھ آ گیا۔

اس ۸۰ ہزار کی رقم کے متعلق صفدر بشیر ایک عرصہ تک غور کرتا رہا۔

پہلے پہل اُس نے سوچا کہ کوئی ایسا کاروبار کیا جائے، جس سے ۸۰ ہزار کے ۸۰ لاکھ ہو جائیں۔

دوسرا خیال اُس کے ذہن میں یہ آیا کہ کیوں نہ بین الاقوامی پاسپورٹ بنوا کر دنیا بھر کی سیاحی کی جائے۔ پھر ایکا ایکی اُس نے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے خیال سے لندن جانے کا پروگرام بنایا۔

لیکن وہ لندن واپس نہ گیا اور خدمتِ خلق کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ یوں وہ سیاسی کارکن بھی رہ چکا تھا اور عقیدے کے اعتبار سے کٹر قسم کا کمیونسٹ تھا۔ زمانہ طالب علمی میں

وہ اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا بڑا سرگرم کارکن تھا اور ۱۹۴۲ء کی تحریک سول نافرمانی میں شریک ہو کر جیل بھی جا چکا تھا لیکن فی الحال اس کا ارادہ کچھ سماجی کام کرنے کا تھا۔ ان عزائم کا تذکرہ اُس نے اپنے چند مخلص دوستوں سے کیا۔ انھوں نے اپنے مخلص دوستوں سے تبادلۂ خیالات کیا اور اس طرح ستمبر کی اس خوش گوار رات کو دس مخلص احباب اس کمرے میں اکٹھا ہو گئے تھے۔

جلسہ کی کارروائی کا آغاز صفدر بشیر کی تقریر سے ہوا اس کا لہجہ بڑا صاف ستھرا تھا اور انداز خطیبانہ تھا۔ اُس نے سب سے پہلے ان مقاصد پر روشنی ڈالی جن کے لئے یہ جلسہ منعقد ہوا تھا۔ پھر اُس نے لندن کے سماجی کارکنوں کی سرگرمیوں کا ذکر کیا کہ کس طرح وہاں کے نوجوان مختلف انجمنیں قائم کرکے ملک و قوم کی خدمت کرتے ہیں۔ اُن کے عزائم اور جد و جہد کا جائزہ لینے کے بعد اُس نے اپنے وطن کے عوام کے رہن سہن پر روشنی ڈالی۔ ان کی پس ماندگی اور زبوں حالی کے بنیادی اسباب بیان کئے آخر میں اُس نے سب سے اپیل کی کہ وہ اُس کے ساتھ مل کر اس نیک کام میں اُس کا ہاتھ بٹائیں۔

صفدر بشیر کی تقریر خاصی موثر تھی۔ حاضرین نے اس کی باتوں کو پوری توجہ سے سُنا اور اُن سے متاثر بھی ہوئے۔ اس کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اظہار خیال کیا لیکن کسی نے اس کی باتوں سے اختلاف نہیں کیا۔ ہر ایک نے اس کو پورے تعاون کا یقین دلایا۔ سب کی خواہش تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور کیا جائے۔

رات کے ایک بجے تک جلسے کی کارروائی جاری رہی۔ سلمان تمام عرصہ خاموش بیٹھا رہا۔ اُس نے کسی بات پر اپنی رائے نہیں دی۔ وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ ہر بات سنتا رہا۔ سامنے میز پر رکھے ہوئے کاغذ پر ضروری پوائنٹس لکھتا رہا اور آہستہ آہستہ سگرٹ پر کش لگاتا رہا۔ اس گلابی دیواروں والے کمرے میں، جہاں گہری نارنجی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ریشمی پردے آہستہ آہستہ سرسرا رہے تھے اُس کو یہ سارا ہنگامہ بڑا رومانٹک لگ رہا تھا۔

جب جلسہ برخاست ہوا تو ایک مختصر سی انجمن وجود میں آچکی تھی۔ انجمن کا نام 'فلک پیما' رکھا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ انجمن کا ہر ممبر اسکائی لارک (SKYLARK) کہلائے گا۔ نام میں یہ تنوع 'صفدر بشیر

کے مغرب زدہ ذہن کی پیداوار تھی) اسکائی لارکوں کا جماعتی نشان "سفید پھول" رکھا گیا۔

انجمن کے ممبروں کی تعداد فی الحال دس مقرر کی گئی یعنی وہ تمام لوگ جنھوں نے اس جلسہ میں شرکت کی تھی۔ جلسہ ختم ہوا تو سب کو شدید بھوک لگ رہی تھی۔ صفدر بشیر نے احتیاطاً کھانے کا بندوبست کرا لیا تھا۔ فوراً ہی سب لوگ وہاں سے اٹھکر ڈائننگ روم میں آئے۔ جہاں میز پر کھانا تیار رکھا تھا۔

کھانا بہت سادہ تھا۔ نہ اس میں کوئی تکلف تھا، نہ کسی اہتمام سے کام لیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سب نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ کھانا کھایا۔ ایک دوسرے کے ساتھ جو اجنبیت تھی وہ کھانے کی میز پر کسی حد تک دور ہو گئی۔ کھانے کے بعد کافی آئی اس موقعہ پر پروفیسر علی احمد کی تجویز پر ہر ممبر نے کھڑے ہو کر خود اپنا تعارف کرایا۔ بڑی پر لطف باتیں سننے میں آئیں، خوب قہقہے لگے۔ اسی نشست میں یہ بھی طے کیا گیا کہ کل نو بجے رات کو انجمن کا دوسرا جلسہ ہو گا جس میں ہر ممبر کو شریک ہونا پڑے گا، اس کے بعد صفدر بشیر کی اسٹیشن ویگن میں بیٹھ کر سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر سلمان دیر تک جاگتا رہا۔ وہ جلسہ سے بہت متاثر ہو کر لوٹا تھا بہت عرصہ بعد وہ زندگی میں ایک خاص سرخوشی محسوس کر رہا تھا۔

دوسرے روز پروگرام کے مطابق، صفدر بشیر کی کوٹھی "فلک پیما" کا دوسرا جلسہ ہوا۔ اس دفعہ لمبی چوڑی تقریریں نہیں ہوئیں۔ سب سے پہلے انجمن کا منشور پڑھ کر سنایا گیا۔ جس کو تھوڑی سی ترمیم کے بعد متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ اس کے بعد صفدر بشیر نے ممبر شپ کے فارم نکالے۔ ہر اسکائی لارک نے فارم کو پُر کر کے اپنے دستخط کئے اور سینہ پر ہاتھ رکھ کر یہ عہد کیا کہ وہ پوری نیک نیتی کے ساتھ ملک اور قوم کی خدمت کرے گا۔ منشور کی ہر شرط کا پورا پورا احترام کرے گا۔ انفرادی خواہشات سے کنارہ کشی کر کے انجمن سے وفاداری کرے گا۔

اس کے بعد عہدے داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ جس میں صفدر بشیر کو صدر، نعیم اللہ کو نائب صدر اور پروفیسر علی احمد کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ اسکائی لارکوں نے تالیاں بجا کر ان کو

مبارک باد دی۔

جلسہ نے اتفاق رائے سے صفدر بشیر کی اس تجویز کو بھی منظور کر لیا کہ جو ارکین بدسر روزگار ہیں وہ فوراً ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لیں۔ گذارہ کے لئے ہر اسکائی لارک کے واسطے ۸۰ روپے ماہانہ الاؤنس مقرر کیا گیا۔ اس مقصد کے واسطے صفدر بشیر نے "فلک پیما" کو ۵ ہزار کا چیک پیش کیا اور یہ وعدہ کیا کہ وہ آئندہ بھی انجمن کے فنڈ کے لئے رقم مہیا کرے گا۔

ابتدائی پروگرام کے مطابق دو، دو ارکین پر مشتمل ۵ گروپ بنائے گئے۔ جن کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ شہر کی مختلف بستیوں میں جا کر، عام لوگوں سے مل جل کر اُن کے مسائل معلوم کریں اور ہفتہ بھر بعد اپنی اپنی رپورٹ پیش کریں۔ جس کی روشنی میں ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت کام کا آغاز کیا جائے۔

دوسرے ہی دن صبح سے اسکائی لارکوں کی ٹولیاں مختلف علاقوں کے دورے پر نکل گئیں ان کی رہائش کا بندوبست صفدر بشیر ہی کی کوٹھی کے ایک حصہ میں کیا گیا، جو انجمن کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ اس کا قدیم نام "رونق منزل" تبدیل کر کے "قطب نما" رکھ دیا گیا۔

"فلک پیما" کا پہلا ہفت روزہ جلسہ حسب معمول رات کے وقت ہوا۔ اس روز ہر گروپ نے اپنی اپنی رپورٹ پیش کی۔ ان رپورٹوں پر رات گئے تک بحث ہوتی رہی۔ آخر میں سب اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ عوام کو سب سے پہلے اُن کے شہری حقوق سے آگاہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے تین بنیادی باتیں طے کی گئیں۔

- تعلیم بالغاں کی تحریک شروع کی جائے۔
- دارالمطالعہ قائم کئے جائیں۔
- ہر بستی میں چوراہوں پر اور گلیوں کے نکڑ پر چھوٹے چھوٹے جلسے کئے جائیں۔

جب یہ پروگرام جلسہ نے منظور کر لیا تو تین تین ارکین پر مشتمل از سر نو گروپ بنائے گئے۔ ڈاکٹر زیدی جو سن و سال کے اعتبار سے تمام اسکائی لارکوں سے سینئر تھے، اُن کو تینوں گروپوں کا نگران مقرر

کیا گیا۔ اُن کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ ہر گروپ کا جائزہ لیں اور اُس کی خامیوں کو دور کریں اور مناسب مشورے دیں۔

کام کی ابتدا جلسوں سے کی گئی۔ اس گروپ کا سربراہ خود صفدر بشیر تھا۔ جو "فلک پیما" کا سب سے اچھا مقرر تھا۔ بات کہنے کا اس کو بخوبی سلیقہ تھا اور اس ڈھنگ سے کہتا تھا کہ لوگ اس کی باتیں دلچسپی اور توجہ کے ساتھ سنتے تھے۔ اُس نے اپنی سیدھی۔ سادھی اور دلنشین تقریروں سے جلد ہی کام کرنے کی فضا پیدا کرلی۔

دوسرے گروپ کا انچارج علی احمد تھا۔ جو کالج کی ملازمت سے علیحدگی اختیار کر چکا تھا اور پوری سرگرمی کے ساتھ "فلک پیما" کا کام کرنے کے لئے کمربستہ ہوچکا تھا۔ اس کے گروپ میں سلمان کے علاوہ دوسرا اسکائی لارک بھی ایک پریشان حال قسم کا طالب علم تھا۔ علی احمد نے ان دونوں کو اس لئے منتخب کیا تھا کہ وہ طالب علموں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھا اور اس گُر کو بھی جانتا تھا کہ ان سے کس طرح کام لیا جائے

ایک روز شام کے وقت جب وہ ایک بڑا سا بورڈ اور پیٹرومیکس لئے سلمان اور اپنے گروپ کے دوسرے اسکائی لارک کے ہمراہ ایک بستی میں پہنچا تو لوگوں نے اُن کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ انھوں نے خاموشی کے ساتھ ایک نیم پختہ مکان کی دیوار کے ساتھ بورڈ کو ٹکا یا۔ پیٹرومیکس روشن کیا اور چپ چاپ کھڑے ہوکر لوگوں کے اکٹھا ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے چاروں طرف خاصہ ہجوم ہوگیا۔
علی احمد نے تعلیم کی اہمیت پر ایک مختصر سی تقریر کی اور وہاں آنے کا مقصد بیان کیا۔ کتنے ہی آدمی اسی وقت تعلیم حاصل کرنے کے لئے آمادہ ہوگئے۔ علی احمد نے اُسی روز سے پہلا سبق شروع کر دیا۔

وہ ایک مشفق استاد کی طرح آہستہ آہستہ بول رہا تھا "دیکھئے صاحب میرے ہاتھ میں یہ ایک چھڑی ہے"
اُس نے ہاتھ میں دبی ہوئی چھڑی اٹھا کر لوگوں کو دکھائی اور کہنے لگا۔

"اب میں تختہ سیاہ پر اس چھڑی کی الٹی شکل بناتا ہوں"

اُس نے بورڈ پر کھریا سے انگریزی کے حروف "L" کی شکل بنادی اور اس کے بعد ہجوم کو مخاطب کرکے کہا "اس الٹی چھڑی پر میں نے یہ ایک ڈنڈا لگا دیا۔ دیکھ رہے ہیں نا آپ لوگ۔ اس کو کہتے ہیں لاَ

یہی کھانا لا، پانی لا و الا لا۔ تو صاحب یہ ہو گیا لا"

ہجوم میں کھڑے ہوئے لوگ تختہ سیاہ پر کھریا سے بنی ہوئی لا کی شکل کو دیکھنے لگے جو گیس بتی کی روشنی میں جھلک رہی تھی۔ علی احمد خاموش کھڑا ان کے ردعمل کا مطالعہ کرتا رہا۔ سلمان اور دوسرا اسکائی لارک اس کے برابر بُت بنے کھڑے تھے۔ منٹ بھر بعد اس نے تختہ سیاہ پر لا کے برابر کھریا سے ایک اور لا بنایا اور مسکرا کر بولا۔

"دیکھئے یہ ہو گیا لالا"

اس دفعہ لوگوں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بورڈ کو دیکھا۔ علی احمد بڑی بے تکلفی سے بولا "لالا سے اور کچھ مطلب نہیں سمجھئے گا۔ لالا، یہی جو اپنے پٹھان بھائی ہوتے ہیں جو رات کے وقت دوکانوں کی چوکیداری کرتے ہیں۔ ہاں تو لالا اب آپ کی سمجھ میں آگیا"

بہت سی ملی جلی آوازیں ابھریں "بالکل سمجھ میں آگیا"

علی احمد بولا "ذرا اس کو تین بار پڑھ تو ڈالیے"

لوگوں نے اس زور کے ساتھ تین بار لالا کا ورد کیا کہ ساری بستی گونج اٹھی۔ علی احمد نے اندازہ لگایا کہ لوگ دلچسپی لے رہے ہیں، لہٰذا اس نے ان سے کہا "کل سے ہم چٹائی بھی بچھائیں گے۔ اس وقت اگر آپ لوگ زمین پر بیٹھ جائیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

کئی آوازیں آئیں "اس میں مہربانی کی کونسی بات ہے۔ یہ لیجئے" اور یکے بعد دیگرے سب زمین پر بیٹھ گئے۔ علی احمد نے تختہ سیاہ پر ایک اور لا لکھا اور حاضرین کو مخاطب کر کے بولا "یہ ہو گیا لالالا۔ یہ ہم اس وقت کہیں گے جب لالا سے کچھ مانگنا ہو۔ لالالا" کئی بار اس جملے کو دہرایا۔ پھر اس نے بورڈ پر لالا سے پہلے ایک لا اور لکھا اور ہنس کر بولا۔

"اس دفعہ میں نہیں پڑھوں گا۔ آپ ہی میں سے کوئی صاحب پڑھنے کی کوشش کریں"

لمحہ بھر تک گہری خاموشی چھائی رہی۔ پیٹرومیکس کی تیز روشنی میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے گھور گھور کر تختہ سیاہ کو دیکھا اور ایک بار کسی نے جھجکتے ہوئے دبی زبان سے کہا "لالالالا کیوں ماسٹر صاحب یہی ہوا نا" علی احمد

اس ادھیڑ عمر آدمی کے ماسٹر صاحب کہنے پر آہستہ سے مسکرایا اور پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔

"بالکل ٹھیک پڑھا آپ نے۔"

اسی وقت دو تین آوازیں آئیں۔ "پڑھ تو ہم نے بھی لیا تھا۔ پر کہتے ہوئے ڈر لگا"

علی احمد نے اُن کی حوصلہ افزائی کی غرض سے کہا "یہ تو آپ نے بُرا کیا۔ جو سمجھ میں آئے فوراً کہنے دیجئے۔ ڈرنے سے تو کام نہیں چلے گا" اس کے بعد اس نے سب سے "لا لا لا لا" کا جملہ پانچ مرتبہ بلند آواز سے پڑھوایا۔

اس دوز کے لئے صرف اتنا ہی سبق تھا۔ جب وہ پڑھائی ختم کر چکا تو سب نے چاروں طرف سے اس کو گھیر لیا اور طرح طرح کے سوالات پوچھنے لگے۔ وہ ایک ایک بات کا تسلی بخش جواب دیتا گیا۔ سلمان ان سب کو اچنبھے سے دیکھتا رہا اور اس وقت اس کو اور بھی تعجب ہوا جب انھوں نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا کہ پڑھائی کے لئے وہ نہ صرف جگہ کا بندوبست کریں گے بلکہ چندہ کر کے گیس بتی اور چپائیوں کا انتظام بھی وہی کریں گے۔ دراصل سلمان کا خیال یہ تھا کہ بجائے دلچسپی لینے کے لوگ ان کا مذاق اڑائیں گے اور اس کے تصور ہی سے وہ بستی میں داخل ہوتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان لوگوں کو اوّل تو اپنی جہالت کا احساس ہی نہیں ہے اور اگر تھوڑا بہت احساس ہے تو وہ اس گمراہی سے نکلنا نہیں چاہتے۔ وہ ان کیڑوں کی طرح ہیں۔ جو گندگی ہی میں زندہ رہتے ہیں۔ اُسی میں جنم لیتے ہیں اور اسی میں مر کھپ جاتے ہیں۔

دوسرے روز جب وہ علی احمد کے ساتھ شام کے وقت وہاں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ بستی کے نکڑ پر کئی آدمی کھڑے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ان تینوں کو دیکھ کر خوشی سے مسکرائے۔ ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر اس کی بغل میں دبا ہوا بورڈ اپنے ہاتھ میں سنبھال لیا۔ دوسرے نے پیٹرومیکس لے لیا اور شکایت کرنے کے سے انداز میں بولا۔

"ماسٹر جی آپ لوگ یہ بورڈ اور بتی اب نہ لایا کریں۔ ہم نے سب بندوبست کر لیا ہے۔"

اُس نے بستی کے اندر جا کر دیکھا، واقعی انھوں نے ہر چیز کا انتظام کر لیا تھا۔ پڑھائی کے واسطے انھوں نے جو جگہ نکالی تھی، وہ ایک مکان سے ملحق دالان تھا جس پر ٹین کا سائبان پڑا تھا۔ یہاں کل تک ممدو تانگے والے کا گھوڑا بندھتا تھا۔ اب اس کے گھوڑے کا تھان کہیں اور بنا دیا گیا تھا۔ اس اصطبل کو سب نے

مل کر دن بھر میں اس طرح صاف کیا تھا کہ کہیں سے کبھی یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ جگہ کبھی گھوڑے کی لید اور پیشاب کا کوڑا گھر تھی۔ دیواروں پر چونے کی سفیدی تھی، جس پر ایک تختۂ سیاہ لٹک رہا تھا۔ اُس کے برابر ہی ایک معمولی قسم کی میز اور تین کرسیاں رکھی تھیں۔ میز کے ایک طرف پیٹرومیکس رکھا تھا جس کی تیز روشنی میں سفید دیواریں جھلک رہی تھیں۔ پڑھنے والوں کے لئے فرش پر کھجور کی چٹائیاں بچھی تھیں۔ سلمان نے یہ سب اہتمام دیکھا تو بڑا متاثر ہوا۔

اُس روز علی احمد نے دوسرا سبق پڑھایا۔ اس میں صرف نقطوں کے استعمال سے پہلے سبق کو آگے پڑھایا گیا تھا۔ اُس نے اُنگلیوں میں چاک کو دبایا اور تختۂ سیاہ پر شکلیں بنانے لگا۔

تالا، بالا، پالا

لالا تالا لا

لا لالا بالا لا

پالا سے فی الحال کوئی جملہ نہیں بنتا تھا، لہٰذا علی احمد نے صرف اس کا مفہوم سمجھا دیا۔

کل جو لوگ پڑھنے آتے تھے، اُن کی حیثیت تماشائی سے زیادہ نہ تھی۔ مگر آج ایک مختصر سے اسکول کی بنیاد پڑ چکی تھی، جس کے طلبا کی تعداد ۲۲ تک پہنچ چکی تھی۔ ان میں نوجوان بھی تھے۔ ادھیڑ عمر بھی تھے۔ اور ایسے بوڑھے بھی تھے جن کی لمبی لمبی سفید داڑھیاں تھیں۔ وہ سب نچلے طبقے کے لوگ تھے فیکٹریوں میں کام کرنے والے قلی، دست کار، کاریگر اور ریڑھی پر سامان رکھکر فروخت کرنے والے چھوٹے موٹے دکان دار۔

تین ہی چار دن میں طلباء کی تعداد بڑھ کر ۳۰ تک پہنچ گئی۔ ابھی یہ تعداد اور بڑھتی۔ مگر علی احمد نے مزید طلباء کو شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ مشکل یہ تھی کہ نئے آنے والوں کے لحاظ سے اس کو سابقہ سبق بار بار دُہرانا پڑ رہے تھے۔

طلباء کے ساتھ ساتھ علی احمد سلمان اور دوسرے اسکائی لارک کو بھی ٹریننگ دے رہا تھا۔ وہ ان کو دن کے وقت ہیڈ کوارٹر میں طریقۂ تعلیم پر لیکچر دیتا اور شام کو عملی تربیت کے لئے بستی کے اسکول میں لے جاتا اور باری باری اُن کو سبق پڑھانے کا موقعہ بھی دیتا۔ ہفتہ بھر بعد وہ اس قابل ہو گئے کہ علی احمد

نے قریب کی بستیوں میں ان دونوں کو بھی پڑھائی پر لگا دیا۔ یہ دونوں اسکول ان بستیوں کے لوگوں نے موجودہ اسکول سے متاثر ہوکر کھولے تھے اور علی احمد کے پاس وفد کی صورت میں آکر درخواست کی تھی کہ وہاں بھی تعلیم بالغان کا سلسلہ شروع کردیا جائے۔

سلمان بڑی تن دہی کے ساتھ "فلک پیما" کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہا تھا۔ وہ روزانہ شام کو مقررہ وقت پر پڑھانے کے لئے جاتا اور پوری توجہ کے ساتھ اسکول کے طلباء کو روزانہ سبق دیتا۔ اس کام میں اب اُس کو ایک خاص لطف ملتا تھا۔ یہ وہی احساس تھا جو انسان میں ایثار کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔

۳

جس روز عدالت سے نوشا کی سزا کا حکم سُنایا گیا تھا۔ اُسی روز انشورنس کمپنی کے اگریمنٹ فارم پر اُس کی ماں کے دستخط ہوئے۔ نیاز نے پالیسی کی پہلی قسط ادا کی اور اُس کی اہلیہ (نوشا کی ماں)، کی زندگی کا ۵۰ ہزار کا بیمہ ہو گیا۔

کمپنی کے دفتر سے لوٹتے وقت دونوں بہت مسرور نظر آرہے تھے۔

نوشا کی ماں سوچ رہی تھی کہ عقدِ ثانی کر کے اُس نے غلطی نہیں کی۔ اس دفعہ بھی اُس کو چاہنے والا شوہر ملا تھا، جو ہر طرح اس کی بہتری کا خواہاں تھا۔ ہر طرح کی ناز برداری کرتا تھا۔ اُس کی دونوں اولادیں اطمینان سے زندگی بسر کر رہی تھیں۔ الو دودھ پی پی کر خوب موٹا ہو گیا تھا۔ اُس کے گال سُرخ پڑ گئے تھے۔

البتہ وہ سلطانہ کی طرف سے کچھ پریشان رہتی تھی اس لئے کہ وہ چُپ چُپ رہتی تھی اُس کا چہرہ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ ماں اُس کے دُکھ کو جانتی تھی لیکن اُس نے کبھی اُس کے زخموں کو کُریدنے کی کوشش نہیں کی، اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح اُس کے ہاتھ پیلے کر دے اور وہ اپنے گھر بار کی ہو جائے مگر اس بات کو نیاز سے کہتے ہوئے وہ جھجکتی تھی۔ حالانکہ اس کاروبار سلطانہ کے ساتھ کسی طرح بھی قابلِ اعتراض نہیں تھا۔

گھر میں بہرحال سکون اور اطمینان تھا اور اُس کے لئے نوشا کی ماں نیاز کی ممنون تھی۔ وہ اب اس کا

بے حد خیال رکھتی۔ سویرے ہی سویرے اُٹھکر اُس کے لیے غسل خانے میں نہانے کا انتظام کرتی۔ اجلا تولیا منجن اور صابن سنبھال کر رکھتی۔ جوتوں پر پالش کرتی۔ ٹرنک سے پہننے کے کپڑے نکالتی۔ ٹوٹے ہوئے بٹن ٹانکتی۔ کسی کپڑے میں مرمت کی ضرورت ہوتی تو اُس کو ٹھیک کر دیتی۔

جتنی دیر میں نیاز غسل خانے سے نہا کر نکلتا وہ ناشتہ تیار کر دیتی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نیاز کے دوکان جانے سے قبل ناشتہ نہ تیار ہو گیا ہو۔ وہ گھر سے نواب بن کر نکلتا تھا۔ اُس کے دوست احباب مذاق میں اُس کو چھیڑتے

"ابے نیاز تو تو چھیلا بن گیا ہے"

"سالے پر جوانی چڑھ رہی ہے"

اور یہ واقعہ ہے کہ اب اس کا رنگ بھی نکھر گیا تھا اور چال ڈھال میں نرالی سج دھج پیدا ہو گئی تھی۔ اور یہ سب کچھ بیوی کی بدولت تھا۔ جس سے اُسے انسیت تھی اور نفرت بھی اور یہ دونوں جذبے بیک وقت کام کر رہے تھے۔ کبھی وہ اس کی تن دہی اور دیکھ بھال سے اس قدر متاثر ہو جاتا کہ اُس کا جی چاہتا کہ ساری زندگی اُسی کے ساتھ گذار دے۔ اس کو اس عورت کی ضرورت تھی جس نے اُس کی زندگی کو بہت حد تک سنوار دیا تھا۔ لیکن اس میں پچاس ہزار روپے کا نقصان تھا۔ اور اتنی بڑی رقم وہ کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس پچاس ہزار کے لئے اُس نے یہ سب کچھ کیا تھا اور اس کے بل بوتے پر آئندہ کے لئے بڑے بڑے منصوبے تیار کئے تھے۔ اس کے علاوہ سلطانہ تھی۔ وہ جب بھی اس کی بھرپور جوانی اور دلکش چہرے کو دیکھتا تو اس کے سینے میں الاؤ دہکنے لگتا۔

نیاز کا وقت اسی کشمکش میں گذر رہا تھا۔ شادی کرنے سے پہلے اُس نے جو پروگرام بنایا تھا۔ اس کے متعلق اب وہ تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ اُسے خود علم نہیں تھا کہ آئندہ وہ کیا کرے گا۔ وہ روزانہ دوکان پر تنہائی میں اپنے منصوبے کو مکمل کرنے کا ارادہ کرتا مگر جب گھر آتا تو سارے ارادے مکڑی کے جال کی طرح تار تار ہو جاتے۔

عام طور پر وہ رات کے ۹ بجے تک گھر پہنچ جاتا تھا۔ جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر اندر آتا بیوی

اٹھکر دروازے پر آجاتی اور مسکرا کر کہتی۔

"کبھی آپ بڑی دیر لگا دیتے ہیں۔ سارا کھانا ٹھنڈا مٹی ہو گیا۔"

وہ نیاز کے ہاتھوں میں دبا ہوا سامان لیتی (وہ کبھی خالی ہاتھ گھر میں نہیں آتا تھا۔ یہ اُس کا روزانہ کا معمول تھا) اُس کو کرسی پر بٹھا کر تولیے سے پیشانی اور گردن کا پسینہ پونچھتی۔ خود اپنے ہاتھ سے اُس کا جوتا اُتارتی اور پیروں کے نیچے چپل لا کر ڈال دیتی۔ اس کے بعد وہ اٹھکر منہ ہاتھ دھونے کے لئے باہر بنے ہوئے چبوترے پر جاتا۔ وہاں لوٹے میں پانی اور صابن دانی موجود ہوتی۔

بیوی باورچی خانے میں جا کر کھانا گرم کرتی۔ نیاز کو میٹھی چیزوں سے رغبت تھی۔ اس لئے وہ بلاناغہ کوئی نہ کوئی ایسی چیز ضرور تیار کرتی۔ دونوں ایک ساتھ بیٹھکر کھانا کھاتے۔ سلطانہ اور راجو عام طور پر سرِشام ہی کھانا کھا کر اپنے اپنے بستروں پر سونے چلے جاتے تھے۔

نیاز مزے لے کر کھانا کھاتا اور سوچتا جاتا "ابے نیاز کیا ٹھیئے اس عورت نے تو تیرے چار چاند لگا دیئے۔ بیٹا ایسے عیش تو تم نے باپ کے زمانہ میں بھی نہیں کئے ہوں گے۔"

ان ہی دنوں ایک حادثہ پیش آگیا۔ ایک روز کوئی گیارہ بجے دن میں نیاز کسی ضرورت سے دکان سے اٹھ کر گھر آیا۔ اس وقت سلطانہ گھر میں اکیلی تھی۔ اس کی ماں کسی رشتے دار کے گھر گئی ہوئی تھی۔ عام طور پر اب وہ کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ اُس دن محض اتفاق تھا کہ وہ گھر پر سلطانہ کو تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔

نیاز نے پہلے تو بیوی کو تلاش کیا جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو وہ سلطانہ کے پاس آیا وہ پلنگ پر گُم صُم بیٹھی تھی۔ نیاز اُس کی پشت پر جا کر کھڑا ہو گیا اور اس سے پوچھنے لگا۔

"سلطانہ تمھاری اماں کہاں ہیں؟"

وہ آہستہ سے بولی "خالہ دلبری کے یہاں گئی ہیں۔ آتی ہی ہوں گی"

نیاز کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر سلطانہ کی پیٹھ پر پڑ گئی۔ اس کا کُرتا مسک گیا تھا اور اندر سے اس کی گوری گوری جلد جھلک رہی تھی۔ نیاز ایک بارگی بے قابو ہو گیا۔ ذرا دیر تک

سانس روکے اس کی نرم نرم جلد کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس سے بولا۔

"تم چپ چپ کیوں بیٹھی ہو"؟

وہ بولی "سر میں درد ہو رہا ہے" یہ بات اُس نے محض ٹالنے کے لیے کہی تھی۔

نیاز مسکرا کر بولا "لاؤ تمہارا سر دبا دوں" یہ کہہ کر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیے۔ سلطانہ سر سے پیر تک کانپ اٹھی۔ اُس نے اپنے بدن کو سمیٹا اور ایک طرف کھسک کر بولی۔

"آپ تکلیف نہ کریں۔ ٹھیک ہو جائے گا"

وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا "تم مجھ سے اس قدر کترانے کیوں لگی ہو؟"

وہ اس کی اس بات کا کیا جواب دیتی۔ خاموش بیٹھی رہی۔

نیاز نے اصرار کیا "بولو، کیا بات ہے"

"کاہے کے تئے"

"یہی کہ تم مجھ سے دور دور رہتی ہو"

سلطانہ کو غصہ تو بہت آیا۔ لیکن وہ صرف اس قدر کہہ سکی۔ "کیا مطلب؟"

"یہی کہ تم مجھ سے کچھ ناراض ہو"

"نہیں تو! آپ کو وہم ہو گیا ہے"

نیاز نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک بارگی وہ بے حد جذباتی ہو گیا۔ اُس نے جھک کر بے اختیار سلطانہ کے رخسار کو چوم لیا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ پلنگ سے نیچے اُتر آئی۔ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے اُس کو گھور کر دیکھا۔ نیاز نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اُس نے نیاز کے منہ پر ایک زنّاٹے کا تھپڑ رسید کیا اور چیخ کر بولی۔

"آپ کو شرم نہیں آتی۔ آئندہ ایسی حرکت کی تو اچھا نہ ہوگا"

وہ غصے سے بڑبڑاتی ہوئی کمرے کے اندر چلی گئی۔

لیکن نیاز نے معاملہ کو برعکس سمجھنے کی کوشش کی۔ اُس نے سوچا، سلطانہ اس لئے ناراض ہے

کہ اُس کے بجائے اُس کی ماں سے اُس نے شادی کیوں کی۔ وہ ذرا دیر تک چپ چاپ دالان کے اندر کھڑا رہا۔ پھر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔

دوکان پر جا کر اُس نے طے کیا کہ اگر اُس نے جلد ہی کچھ نہ کیا تو سلطانہ اُس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ رات کو جب وہ گھر واپس آیا تو دوپہر کے واقعے سے کسی قدر سہما ہوا تھا۔ مگر جب اُس نے بیوی کے رویہ میں ذرا بھی فرق نہ دیکھا تو اُس نے سوچا کہ سلطانہ نے ماں سے اس کی اِس حرکت کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے۔ اس بات سے اُس کے اس شک کو اور بھی تقویت پہنچی کہ سلطانہ کے دل میں ابھی تک اُس کے لئے گنجائش ہے۔ اسی رات اُس نے طے کیا کہ وہ کل ہی صبح "ڈاکٹر موٹو سے ملے گا۔

لیکن وہ دوسرے دن ڈاکٹر موٹو سے نہ مل سکا۔ گھر سے نکلتے ہی سردار سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ سانولے رنگ کا بڑا تیز طرار قسم کا آدمی تھا۔ لینچی کے راستے سامان اسمگل کر کے لاتا تھا۔ سردار ملتے ہی بولا۔

"کچھ سودا دو دا کرتے ہو؟"

نیاز کا ایک بار پہلے بھی اس سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ مگر وہ سودا ایک دلاّل کی معرفت ہوا تھا۔ اس لئے وہ ذرا سا ہچکچایا۔ سردار نے فوراً کہا

"ے لو نہیں تو بعد میں پچھتاؤ گے۔ اچھی رقم بن جائے گی"

نیاز نے دریافت کیا۔ "مال کس قسم کا ہے؟"

"سگرٹ ہیں"

سگرٹ کا سودا اُس نے اس سے پہلے کبھی کیا نہیں تھا۔ لہٰذا وہ بولا۔ "بھئی سگرٹ کا کام تو میں کرتا نہیں"

سردار ہنس کر کہنے لگا۔ "تم کاروبار میں ابھی کچھ دن مجھ سے ٹریننگ لو۔ تم کو بازار کا پتہ بھی ہے آج کل شہر میں سگرٹ بلیک کہاں رہا ہے؟"

نیاز نے سوچا کہ اگر سگرٹ کی تھوڑی قلت ہے تب تو اچھی رقم نکل آسکتی ہے۔ کہنے لگا۔ "اچھا

چلو مال دکھاؤ۔"

سردار نے وہیں سے تانگہ کیا اور اُس میں سوار ہو کر دونوں ایک ہوٹل میں پہنچے۔ سردار وہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ اُس نے کمرے میں لے جا کر مال دکھایا۔ سگرٹ کے تین پانچ ٹرنکوں میں بھرے ہوئے تھے۔

دو ہزار میں سودا طے ہو گیا۔ نیاز اُس کو گھر لے کر آیا۔ بیوی سے رقم لی اور سردار کو دو سو روپے بیعانہ دے دیا۔ طے یہ ہوا کہ وہ مال رات کو لے کر خود اُس کی دوکان پر آئے گا اور بقیہ رقم لے جائیگا۔

اس کے جانے کے بعد نیاز کے لئے اب دو ضروری کام رہ گئے تھے۔ سب سے پہلے وہ علاقے کے تھانے پر پہنچا۔ ہیڈ کانسٹبل محمد خاں کو تلاش کیا۔ وہ اس کا پُرانا واقف کار تھا۔ وہ انچارج تھانے سے کبھی نہیں ملا۔ ہمیشہ محمد خاں کے توسط سے بات کرتا تھا۔ انچارج کوئی ہو۔ اس کا کام خوش اسلوبی کے ساتھ چل رہا تھا۔

محمد خاں کو اُس نے دو سو روپے نکال کر دیئے اور مطمئن ہو کر تھانے سے باہر آ گیا۔ بازار میں جا کر اُس نے سگرٹ فروشوں سے معاملہ کیا۔ واقعی سگرٹ کی بڑی سخت قلّت تھی۔ مال کے اچھے دام لگے۔ کچھ دوکان دار اس قدر ضرورت مند تھے کہ اُنھوں نے بیعانہ تک دے دیا۔

دس بجے کے قریب سردار ایک تانگہ میں سگرٹوں سے بھرے ہوا ٹرنک لے کر آ گیا۔ نیاز نے مال سنبھالا۔ پوری رقم ادا کی اور سردار کو ایک چائے پلا کر رخصت کر دیا۔

دوسرے روز دوپہر سے پہلے پہلے ٹرنک خالی ہو گئے۔ سگرٹ کے ٹن دوکانوں پر پہنچ گئے اس سودے میں اُس کو ہزار روپے سے زیادہ مل گئے۔ نیاز بہت خوش تھا کہ بیٹھے بٹھلائے اتنا اچھا سودا مل گیا۔ زیادہ بھاگ دوڑ بھی کرنا نہیں پڑی۔ مال دوکان پر رکھ کر خطرہ بھی مول لینا نہیں پڑا۔ اس خوشی میں اُس نے ڈاکٹر موٹو کے پاس جانے کا پروگرام بھی ملتوی کر دیا۔

اُس روز وہ سرِ شام ہی دوکان بند کر کے گھر پہنچ گیا۔ بیوی اور راجو کو ساتھ لے کر سینما دیکھنے چلا گیا۔ سلطانہ گھر پر تنہا رہ گئی۔ اُس نے کئی بار اس بات کی تمنا کی کہ اس وقت سلمان آ جائے تو

کتنا اچھا ہو۔

بڑی سُہانی رات تھی۔ آسمان پر ستارے بکھرے ہوتے تھے۔ شیشم کے پتے آہستہ آہستہ تالیاں بجا رہے تھے۔ ہوا نرم اور سبک چل رہی تھی۔ وہ کئی بار دالان سے نکل کر صحن میں آئی۔ کُھلے آسمان کے نیچے اُس نے گہری گہری سانسیں لیں۔ ہوا میں رچی ہوئی مہک کو محسوس کیا اور گلی میں اُبھرنے والی راہگیروں کے قدموں کی چاپ پر کان لگا دیئے۔ کہ شاید ان میں سلمان بھی شامل ہو۔

●

۴

سلمان نے جھاڑن سے تختہ سیاہ کو صاف کیا اور کلاس کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے سامنے کھجور کی چٹائیوں پر ۲۶ آدمی بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے تیز دھوپ سے سنولائے ہوئے تھے۔ جسم پر بوسیدہ لباس تھے، جن سے پسینہ کی بُو اٹھ رہی تھی۔ یہ اُس کے شاگرد تھے۔ سلمان نے سب پر ایک نظر ڈالی اور اونچی آواز سے بولا۔

"آج آپ لوگوں کا امتحان ہوگا"

کسی نے دبی زبان سے کہا "امتحان ؟"

سلمان کہنے لگا۔ "جی ہاں! میں بورڈ پر جملے لکھوں گا اور آپ میں سے ہر ایک سے باری باری اُس کو پڑھواؤں گا۔ جس سے میں کہوں گا۔ وہی اس کو پڑھے گا۔ کوئی اور بیچ میں نہیں بولے گا"

اس کے بعد سلمان تختہ سیاہ پر لکھتا چلا گیا اور باری باری سب سے پڑھواتا گیا۔ بعض نے ہر جملہ کو فر فر پڑھ دیا۔ بعض کو کسی قدر دقت پیش آئی۔ مگر ہر شخص نے جملوں کو پڑھ ڈالا۔ اُس کو بے حد خوشی ہوئی۔ ابھی پورا کورس ختم ہونے میں ۱۳ سبق باقی تھے مگر اس عرصہ میں وہ اچھا خاصا پڑھ لینے کے قابل ہو گئے تھے۔ پھر ان میں ذوق و شوق بھی بہت تھا۔ اس امتحان میں بھی ہر ایک بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ اسی دلچسپی کو دیکھ کر اُس نے بلیک بورڈ پر زیادہ مشکل جملے لکھے۔ کچھ نے روانی کے ساتھ ان کو پڑھ ڈالا۔ کچھ اٹک کر رہ گئے۔ یہ سلسلہ کبھی کچھ دیر چلتا رہا۔ آخر وہ نثر ختم کر کے

نظم پر آ گیا۔

عین اُس وقت علی احمد وہاں پہنچ گیا۔ وہ اکثر اپنے گروپ کے اسکائی لارکوں کی سرگرمیوں کا معائنہ کرنے آتا تھا۔ ان میں جو خامی دیکھتا، اس پر ان کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرتا اور اس کو دور کرانے کی کوشش کرتا۔ اس وقت سلمان بورڈ کی طرف منہ کئے لکھنے میں مصروف تھا۔ علی احمد خاموشی کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ وہ ہمیشہ اسی طرح چپ چاپ وہاں آیا کرتا تھا۔ سلمان جب تختۂ سیاہ کے سامنے سے ہٹا تو سب نے دیکھا اُس پر یہ شعر درج تھا۔

چمکنے سے بجلی کے تھا وہ سماں
ہوا میں اُڑیں جیسے چنگاریاں

اُس نے جس شاگرد کی جانب اشارہ کیا، اُس نے اٹھکر فوراً اس شعر کو پڑھ دیا۔ اس کے بعد اُس نے ایسے ہی کئی اور سادہ سے عام فہم اشعار بورڈ پر لکھکر اُن سے پڑھوائے۔ پھر اُس نے مشکل اشعار لکھے۔ اس میں لوگ اٹکنے لگے اور ایک بار تو خاصی گڑبڑ ہو گئی۔ اُس نے بلیک بورڈ پر لکھا۔

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رُخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

سلمان نے جس شاگرد سے پڑھنے کے لئے کہا تھا۔ اُس نے تین مصرعے تو روانی سے پڑھ دیئے دوسرے مصرعہ نے اُس کو خاصا پریشان کیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ چہرے پر کھچڑی ڈاڑھی تھی۔ اور دیکھنے میں مریل نظر آتا تھا۔ چند لمحہ اُس نے سوچنے کے بعد سلمان سے پوچھا۔

"ماسٹر جی لالہ تو سمجھ میں آ گیا وہی جو آپ نے پہلے دن پڑھایا تھا، پر یہ شہناز کون ہے؟"

پیچھے سے کسی من چلے نے کہا "ابے وہی بوٹا کی بہن شہناز اور کون"

فوراً ہی ایک اور آواز آئی "یہ سالا جھوٹ بولتا ہے۔ ابے یہ تو صاف صاف کلکتہ والی شہناز ہے"

کسی بوڑھے نے جل کر اس کو ڈانٹا " کیا بات کر رہا ہے۔ کلکتہ والی تو گوہر جان تھی۔ یہ کوئی اور ہوگی۔"

یہ ریمارک سن کر سلمان پریشان ہو گیا۔ علی احمد نے بھی بے چینی سے پہلو بدلا۔ سلمان نے نظم کے اس بند کو فوراً تختۂ سیاہ پر سے مٹا دیا اور نسبتاً آسان شعر لکھا۔

بیت گئی، جو دل پہ نہ پوچھ
ہجر کی شب اور آخرِ شب

ابھی اس نے کسی کی طرف پڑھنے کا اشارہ بھی نہ کیا تھا کہ ایک نوجوان نے بڑی سادگی سے اٹھ کر اس سے کہا۔ "ماسٹر جی آخری شب، کی 'ی' چھوٹ گئی ہے" یہ کہہ کر اس نے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس طرح گردن اونچی کر کے دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو۔ اب ہم تو ماسٹر جی کی بھی غلطیاں پکڑ لیتے ہیں۔ سلمان ابھی وار سے نہیں سنبھلا تھا کہ ایک بوڑھے نے اٹھ کر پوچھا۔

"ماسٹر جی یہ ہجر کی شب کیا ہوتی ہے"

ابھی وقت کسی تیز قسم کے نوجوان نے اس کو پیچھے سے ڈانٹا "او بابا بیٹھ جا۔ یہ باتیں تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

دوسرا اس سے بھی دو قدم آگے نکلا۔ چیخ کر بولا "اجی یہ عاشقی معشوقی کی باتیں ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے زوردار نعرہ لگایا۔

ہائے مدھو بالا، پلا دے شربتِ وصل کا پیالا

اس بات پر خاصہ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے احتجاج کیا کہ جس آدمی نے مدھو بالا والی بات کلاس میں کہی ہے، اس کو فوراً نکال دیا جائے۔ وہ باہر نکلنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ "میں نے تو صرف شعر پڑھا تھا، گالی نہیں بکی ہے۔" کچھ اس کے حمایتی بھی پیدا ہو گئے اور اس طرح دو ٹولیاں بن گئیں، جو ایک دوسرے کے خلاف شور مچانے لگیں۔ سلمان گھبرا سا گیا۔ فوراً ہی علی احمد بڑھ کر سامنے آ گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے سب کو سمجھا بجھا کر، کلاس کو قابو میں کیا اور بہت دیر تک بلیک بورڈ پر دلچسپ جملے لکھ لکھ کر پوچھتا رہا۔

اس روز وہ دونوں دیر سے لوٹے۔ راستہ میں علی احمد نے سلمان کو سمجھایا کہ جن لوگوں کو وہ پڑھاتا ہے، ذہنی حیثیت سے وہ بہت پچھڑے ہوئے لوگ ہیں انجمن کا کام فی الحال یہ ہے کہ اُن کو پڑھنے لکھنے کے قابل بنا دیا جائے۔ اُن کی ذہنی نشوونما تو مطالعہ سے ہوگی۔ پھر اُس نے ہنس کر کہا۔

"تمہارے رومینٹک موڈ نے کلاس بھر کو رومینٹک بنا دیا"

سلمان یوں ہی شرمندہ ہو رہا تھا، اس جملہ پر اور بھی شرمندہ ہو گیا۔ مدافعت میں اُس سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ خاموشی کے ساتھ علی احمد کی بات سن لی۔

چند روز بعد "فلک پیما" کی ماہانہ میٹنگ ہوئی۔ ڈاکٹر زیدی نے ہر گروپ کی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ سے یہ اندازہ ہوا کہ علی احمد کا گروپ سب سے زیادہ کامیاب جا رہا تھا۔ دارالمطالعہ قائم کرنے والے گروپ کا کام بہت سست تھا۔ فی الحال ایک دارالمطالعہ قائم کیا گیا تھا وہ بھی ایسی بستی میں تھا، جہاں کی زیادہ تر آبادی بالکل ان پڑھ تھی۔ دارالمطالعہ ہر وقت خالی پڑا رہتا کبھی کبھار کوئی آتا بھی تو رسالوں اور اخباروں کی تصویریں دیکھ کر چلا جاتا۔ لہٰذا اسی میٹنگ میں یہ طے کیا گیا کہ دارالمطالعہ والا گروپ توڑ دیا جائے اور اس کو تحریک تعلیم بالغان کے گروپ کے ساتھ ملا دیا جائے۔

تحریک تعلیم بالغان کے ساتھ ساتھ تقریروں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ صفدر بشیر روزانہ اپنے گروپ کے دو اسکاؤٹ لڑکوں کے ہمراہ کسی نہ کسی بستی میں جاتا اور لوگوں کو اچھے شہری بننے کی ہدایت دیتا، اُن کے مسائل پر بحث کرتا، قدامت پسند رسم و رواج کے خلاف جدوجہد کرنے کی تلقین کرتا۔ ہر شام اُس کی تقریر سننے کے لئے لوگ اکٹھا ہوتے۔ اُس کی باتیں دلچسپی کے ساتھ سنتے اور خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد اس کو اس حقیقت کا اندازہ ہو گیا کہ ان جلسوں کا کوئی عملی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔ اس کی حیثیت اس مجمع گیر دوا فروش کی سی ہو گئی تھی جو اپنی مچھے دار باتوں سے لوگوں کو اکٹھا کر کے اُن کی جیبوں سے کچھ نہ کچھ رقم نکلوا لینے کا گُر جانتا ہے۔

وہ اپنے گروپ کو توڑنے کا پروگرام بنا ہی رہا تھا، اسی اثناء میں شہر کے نشیبی علاقوں میں ملیریا

کی وبا پھیل گئی۔ تعلیم بالغاں کے نائٹ اسکولوں میں آنے والے طلبا کی تعداد گھٹنے لگی۔ ہر طرف بیماری کا زور تھا۔ اُس نے فوراً "فلک پیما" کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور اُس میں یہ تجویز پیش کی کہ اُس کے گروپ کو توڑ دیا جائے اور ڈاکٹر زیدی کی رہنمائی میں ایک دوسرا گروپ بنایا جائے جو ملیریا کے مریضوں کو طبی امداد پہنچائے۔

اس کی اس تجویز کو جلسہ نے منظور کر لیا۔ انجمن کے فنڈ میں سے ۵ ہزار روپیہ ابتدائی اخراجات کے لئے منظور کیا گیا۔ کام کے لئے ڈاکٹر زیدی کو ۲۰ اسکاؤٹ لڑکے دیئے گئے۔ اس سلسلہ میں سلمان نے بھی ایک تجویز پیش کی۔ اُس نے کہا کہ تعلیم بالغاں کا کام صرف رات کو ہوتا ہے۔ جو اسکاؤٹ لڑکے اس گروپ میں کام کرتے ہیں۔ وہ دن میں اپنے وقت کا کچھ حصہ طبی امداد کے لئے دیں۔ تجویز معقول تھی۔ اس لئے اس کو بھی منظور کر لیا گیا بلکہ صفدر بشیر نے اس کے اس جذبہ کی جی کھول کر داد دی۔

اسی روز "فلک پیما" کی جانب سے ایک بستی میں ریلیف کیمپ کھول دیا گیا۔ بڑے زور و شور سے کام شروع ہوا۔ اسکاؤٹ لڑکے سویرے ہی سویرے بیڈ کوارٹر سے نکل جاتے اور رات گئے واپس لوٹتے۔ وہ مریضوں کو دوائیاں دیتے، اُن کی دیکھ بھال کرتے اور دن میں کئی بار ان کی حالت کی رپورٹ ڈاکٹر زیدی کو دیتے۔

ڈاکٹر زیدی ان دنوں اس قدر مصروف رہتا کہ اس کو سر اُٹھانے کی مہلت نہ ملتی۔ اُس کی داڑھی بڑھ گئی تھی اور لباس گندہ ہو گیا تھا۔ اکثر رات کو اُسے سونے کی بھی مہلت نہ ملتی۔ وہ کیمپ میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتا۔ ذرا آنکھ لگتی کہ کوئی نہ کوئی پریشانی کے عالم میں آ کر اطلاع دیتا کہ فلاں مریض کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ اسی وقت اٹھ کر وہاں جاتا۔

جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا ایک ڈاکٹر سے کام نہیں چلے گا۔ لہٰذا دو اور ڈاکٹروں کی رضاکارانہ خدمات حاصل کی گئیں۔ اب "فلک پیما" نے دو ریلیف کیمپ اور کھول دیئے۔ ہر کیمپ کا انچارج ایک ایک ڈاکٹر تھا۔ انجمن نے اس مقصد کے لئے مزید ۵ ہزار کی رقم منظور کر دی۔ شہر کے سرکاری اور خیراتی اسپتالوں کا انتظام انتہائی ناقص تھا۔ اور اُن سے بھی زیادہ خراب رویہ پرائیویٹ ڈاکٹروں کا تھا۔ اس لئے لوگ

انجمن کے ریلیف کیمپوں میں علاج کرانے کو ترجیح دیتے تھے۔ ہر وقت وہاں مریضوں کا ہجوم رہتا۔

ملیریا کی وبا رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ مگر اس سلسلہ میں "فلک پیما" نے جو کام کیا تھا، اُس نے اسکائی لارکوں کو بستیوں کے اندر بے حد مقبول بنا دیا۔

انجمن کی آئندہ میٹنگ میں جب ہر گروپ کے کام کا جائزہ لیا گیا تو یہ تجویز سامنے آئی کہ اب چونکہ ملیریا کی وبا ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا طبی امداد کا گروپ توڑ دیا جائے لیکن کچھ اسکائی لارکوں نے اس کی مخالفت کی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس گروپ کو قائم رکھا جائے اور کسی بستی میں جگہ حاصل کر کے ایک چھوٹا سا اسپتال قائم کیا جائے۔ لیکن اس منصوبہ میں اخراجات زیادہ تھے، لہٰذا متفقہ طور پر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا کئی گھنٹے تک بحث جاری رہی۔ آخر رائے شماری ہوئی اور اکثریت کی رائے اس بات کے حق میں نکلی کہ اسپتال ضرور قائم کیا جائے۔

اسپتال کے لیے سب سے پہلے ایک قطعہ اراضی حاصل کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ایک انتظامی کمیٹی منتخب کی گئی، جس نے کئی بستیوں میں گھوم پھر کر ایک جگہ منتخب کی، جو سڑک کے کنارے تھی۔ دوسرے ہی دن "فلک پیما" کا ایک وفد محکمۂ آبادکاری کے افسران سے ملا۔ کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر کئی ہفتوں کی دوڑ دھوپ کے بعد الاٹمنٹ ملا۔ مگر اس پلاٹ کے ساتھ مشکل یہ درپیش تھی کہ اس پر چند خاندان ناجائز قبضہ کیے ہوئے تھے اور ایک مدت سے وہاں آباد تھے۔ ان سے کہا گیا تو وہ جگہ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ فساد کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ بڑی نازک صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ فوراً "فلک پیما" کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا، جس میں یہ طے کیا گیا کہ سلمان اپنے رسوخ کو کام میں لائے۔ اس لیے کہ اس علاقہ میں انجمن کا جو اسکول تھا، اس کا انچارج سلمان ہی تھا۔

دوسرے ہی دن، سلمان نے اپنے شاگردوں سے اس بات کا ذکر کیا۔ ماسٹر صاحب کی بات کیسے خالی جا سکتی تھی۔ دوبارہ اس مسئلہ پر زور دینے کی نوبت ہی نہ آئی۔ پوری بستی ان لوگوں کے سر ہو گئی کہ پلاٹ خالی کرو۔ منت سماجت بھی کی اور یہ دھمکی بھی کہ پلاٹ خالی نہ ہوا تو ان کا سوشل بائیکاٹ شروع کر دیا جائے گا۔ وہ لوگ تعداد میں تھوڑے تھے۔ بستی کے ہزاروں آدمیوں سے دشمنی مول نہیں لے سکتے

تھے۔ لہٰذا انھوں نے جگہ خالی کردی۔ بستی والوں نے اس کے صلے میں، ان کو مکان بنانے کے لئے زمین دی، چندہ جمع کیا اور سب نے خود مل کر اپنے ہی طرح کے اُن کے نیم پختہ مکانات تیار کر دیئے۔ یہ سارا کام آناً فاناً ہوا۔ بستی میں نہ کوئی ہنگامہ ہوا، نہ کھلبلی پڑی۔ سب کچھ خاموشی کے ساتھ ہو گیا۔ اسکاؤٹ لڑکوں نے ایک روز آ کے دیکھا تو پلاٹ خالی پڑا تھا۔ لوگوں نے شکستہ مکانوں کا ملبہ تک صاف کر دیا تھا۔ چٹیل زمین سرما کی ہلکی سنہری دھوپ میں اجلی اُجلی نظر آرہی تھی۔

جگہ کا مسئلہ حل ہو گیا تو اسپتال کی تعمیر کا کام زیرِ غور آیا۔ انجمن کے فنڈ میں صرف ۶ ہزار روپیہ باقی رہ گیا تھا۔ صفدر بشیر نے مزید ۱۰ ہزار روپیہ دیا۔ لیکن یہ مجموعی رقم بھی اسپتال کے لئے کم تھی۔ اسکاؤٹ لڑکوں نے ایک میٹنگ میں طے کیا کہ وہ تعمیر کا کام خود کریں گے۔ اسی میٹنگ میں یہ تجویز بھی پیش ہوئی کہ لوگوں سے اس کام کے لئے چندہ جمع کیا جائے۔ لیکن اختلافِ رائے کے باعث اس تجویز پر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور آئندہ جلسہ تک اس کو ملتوی کر دیا گیا۔ البتہ اسکاؤٹ لڑکوں کو اس بات کی اجازت دیدی گئی کہ وہ اپنے ملنے جلنے والوں سے مل کر اس امر کا اندازہ لگائیں کہ اگر چندے کی مہم شروع کی جائے تو اس کی کامیابی کے کس قدر امکانات ہو سکتے ہیں۔

اسپتال کی تعمیر کا منصوبہ ابھی "فلک پیما" کے زیرِ غور ہی تھا کہ ایک روز صفدر بشیر کی کوٹھی پر ایک جھلملاتی ہوئی کیڈلک آکر رکی۔ اس میں سے ایک دوہرے جسم کا آدمی باہر نکلا۔ اس کے سر کے بال اُڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر سرخی تھی۔ اور آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ لگا تھا۔ اپنی آن بان کے اعتبار سے وہ خاصہ معزز شخص معلوم ہوتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چھڑی کے سہارے چلتا ہوا کوٹھی کے اندر داخل ہوا اور صفدر بشیر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ صفدر بشیر اس وقت کوٹھی پر موجود تھا۔ ڈرائنگ روم میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اجنبی نے صفدر بشیر سے اپنا تعارف کرایا۔ اس کا نام خان بہادر فرزند علی تھا۔ کسی زمانہ میں وہ گزیٹیڈ آفیسر رہ چکا تھا۔ اور اب شہر میں اس کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ اس ملاقات کا مقصد اُس نے یہ بتایا کہ وہ "فلک پیما" کی کچھ امداد کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے ساتھ ہی اُس نے کچھ تجاویز پیش کیں۔

مسئلہ چونکہ اہم تھا لہٰذا اسفیر اسکائی لارکوں سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔ صفدر بشیر نے علی احمد، ڈاکٹر زیدی اور فہیم اللہ کو وہیں بلوا لیا اور اُن کے سامنے خان بہادر فرزند علی کی امدادی پیش کش اور تجاویز کو پیش کیا۔ طے یہ ہوا کہ ساری باتوں کو انجمن کے تمام ممبروں کے سامنے لایا جائے اور متفقہ طور پر جو فیصلہ ہو، اُس پر عمل کیا جائے اس وقت سب اسکائی لارک ہیڈ کوارٹر پر موجود تھے۔ لہٰذا اسی وقت "فلک پیما" کا ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا۔ خان بہادر کی خواہش تھی کہ اس کو اس بات کی اجازت دی جائے کہ وہ اجلاس کے روبرو خود اپنی تجاویز پیش کرے۔ یہ بات "فلک پیما" کی روایات کے خلاف تھی۔ مگر صفدر بشیر کی سفارش پر اس درخواست کو منظور کر لیا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد، تمام اسکائی لارک، کانفرنس روم میں اکٹھا ہونے لگے۔ خان بہادر بھی، صفدر بشیر کے ہمراہ کمرے کے اندر آ گیا۔ اجلاس کی صدارت کے لئے علی احمد کا نام تجویز کیا گیا۔ جسے دُو اسکائی لارکوں کی تائید پر منظور کر لیا گیا۔ علی احمد صدر کی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ جلسہ کی کارروائی کا آغاز ہوا تو صفدر بشیر نے کھڑے ہو کر خان بہادر فرزند علی کا تمام اسکائی لارکوں سے تعارف کرایا اور اس کی مالی پیش کش کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ خان بہادر اس سلسلہ میں اجلاس کے سامنے کچھ تجاویز پیش کرنا چاہتے ہیں۔

جب صفدر بشیر اپنی بات کہہ کر بیٹھ گیا۔ تو خان بہادر نے کھڑے ہو کر صدر سے اجازت لی کھنکار کر گلا صاف کیا۔ رومال سے چہرے کا پسینہ خشک کیا۔ چشمہ کو آنکھوں پر درست کر کے لگایا! اس تیاری پر اُس نے تقریباً ایک منٹ صرف کیا۔ اُس کے انداز میں عام مقرر سے زیادہ اسٹیج کے اداکار والی بات تھی۔ اس کی آواز بھاری تھی اور لہجہ میں نرمی تھی۔ بات کرتے وقت وہ بار بار اپنی گردن کو ایک خاص زاویہ پر خم دیتا تھا۔

اُس نے سب سے پہلے "فلک پیما" کے کاموں کی تعریف کی اور اسکائی لارکوں کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ اس وقت بڑے سرپرستانہ انداز سے بات کر رہا تھا۔ وہ بار بار مسکراتا، سگار پر ہلکے ہلکے کش لگاتا اور سامنے بیٹھے ہوئے اسکائی لارکوں کو ایسی نظروں سے دیکھتا جیسے وہ کسی کالج کے طالب علم

ہیں، جن کا تجربہ محدود اور مشاہدہ ابتدائی منازل میں ہوتا ہے۔ اسکائی لارکوں نے اس کی باتوں پر کسی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ نہ صرف سن و سال میں ان سے بڑا تھا، بلکہ وضع قطع سے خاصا باوقار نظر آرہا تھا۔

خان بہادر اپنی بات کہتے کہتے، لمحہ بھر کے لئے رکا۔ اُس نے اپنا چمڑے کا پورٹ فولیو کھولا۔ اس میں سے چیک نکالا اور اُس کو اسکائی لارکوں کے روبرو پیش کرتے ہوئے بولا "میں نے سُنا ہے کہ آپ کی جماعت ایک اسپتال تعمیر کررہی ہے۔ میری جانب سے اس کے لئے یہ ایک حقیر پیشکش ہے۔ یہ ۲۵ ہزار کا چیک ہے" خان بہادر نے ۲۵ ہزار پر خاص طور پر زور دیا اور اسکائی لارکوں کو اس طرح گردن اونچی کرکے دیکھا کہ وہ چٹان کی طرح پُرشکوہ نظر آنے لگا۔

اُس نے ۲۵ ہزار کا چیک صدر کو پیش کیا اور لمحہ بھر تک خاموش کھڑا رہا۔ اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی تھی۔ اُس نے سگار پر ایک لمبا کش لگایا اور اسکائی لارکوں سے خطاب کرتے ہوئے بولا "مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ اسپتال تعمیر کرلیں گے۔ آپ میں وہ جذبہ عمل پایا جاتا ہے۔ جس سے زندگی میں بڑے بڑے کام انجام دیئے جا سکتے ہیں" اچانک اُس نے اپنا لہجہ بدل دیا اور گردن کو اپنے خاص انداز میں خم دے کر کہنے لگا "مگر آپ اسپتال کو چلائیں گے کس طرح۔ میرا مطلب اُس کے اخراجات سے ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ حکومت کی امداد یا ذاتی فنڈ۔ اور یہ دونوں ہی باتیں فی الحال ممکن نہیں۔ ایسی صورت میں اس مسئلہ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے" خان بہادر فرزند علی نے چند لمحے توقف کیا۔ سگار کے دو چار کش لگائے۔ سامنے بیٹھے ہوئے اسکائی لارکوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ آپ کی جماعت نے اس مسئلہ پر کیا سوچا ہے البتہ اس سلسلہ میں میری ایک تجویز ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ اسے پسند کریں گے۔ بات بنیادی طور پر یہ ہے کہ اسپتال کے اخراجات کے لئے ایک مستقل آمدنی کا وسیلہ ہونا ضروری ہے۔ کیوں نہ آپ ایسا کریں کہ اسپتال کے نام پر دوائیں امپورٹ کرنے کا لائسنس حاصل کرلیں۔ اور یہ لائسنس تو بہرحال آپ کو حاصل کرنا

ہی پڑے گا۔ مگر اس میں اتنا اور کرنا پڑے گا کہ لائسنس اسپتال کی ضرورت سے زیادہ ہو۔ کم از کم دوگنا ہونا چاہیے۔ دواؤں کا جو فاضل کوٹا بچے، اس کو بازار میں بہت اچھی قیمت پر فروخت کیا جا سکتا ہے۔ میرا مطلب آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے" اس نے چور بازار میں دوائیں فروخت کرنے کی بات کو کہنے سے حتی الوسع احتراز کیا۔ صرف مسکرا کر اسکائی لارکوں کو دیکھا "امپورٹ لائسنس اور دواؤں کے لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کا بندوبست میں کرلوں گا۔ البتہ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ دواؤں کی فروخت سے جو منافع ہوگا۔ اس میں ۵۰ فی صدی اس پارٹی کو دینا پڑے گا، جو آپ کے لیے امپورٹ لائسنس مہیا کرے گی اور دواؤں کے سیل کی بھی ذمہ دار ہوگی۔ اس لیے کہ یہ کام آپ لوگوں کے بس کا نہیں۔"

اس کی یہ بات سن کر اسکائی لارکوں نے بے چینی سے پہلو بدلے۔ کمرے کی فضا میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ مگر کسی اسکائی لارک نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔

خان بہادر نے اس بدلی ہوئی فضا کو محسوس کیا اور بڑے مشفقانہ انداز سے کہنے لگا۔

"ممکن ہے کہ آپ لوگ میری اس تجویز پر چونکیں کہ یہ شخص کیا ایک رہا ہے ہمیں بلیک مارکیٹنگ کی ترغیب دے رہا ہے" اس دفعہ وہ کھل کر ہنسا "ہے تو بھئی یہ بلیک مارکیٹنگ۔ مگر صاحب کبھی کبھی یہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ سرسید مرحوم کو سب سے زیادہ چندہ طوائفوں سے ملا تھا۔ مولویوں نے بڑا شور مچایا کہ یہ حرام کی کمائی ہے۔ اس کا استعمال قطعی غیر شرعی ہے۔ سرسید اگر ان کی باتوں سے مرعوب ہو جاتے تو جناب آج یہ مسلم علی گڑھ یونیورسٹی نظر نہ آتی۔ جس نے سچ پوچھیے تو مسلمانوں میں سیاسی بصیرت اور بیداری کا جذبہ پیدا کیا۔" اس نے اسکائی لارکوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی "تو میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نیک کام کے لیے کبھی کبھی برائی کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔"

خان بہادر نے ذرا دیر کے لیے خاموشی اختیار کی۔ سگار سے تھوڑا سا شغل کیا اور فاتحانہ انداز سے سر اونچا کر کے تمام اسکائی لارکوں کے رد عمل کا اندازہ لگایا۔ اسکائی لارکوں میں کشیدگی کا احساس زائل ہو رہا تھا۔ ان کے چہرے سوچتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ کمرے کے اندر بڑی پراسراری

سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خان بہادر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور لہجہ میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔

" میرا جی چاہتا ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ کچھ کام کروں۔ دوڑ دھوپ کا کام اب میرے بس کی بات نہیں۔ ۵۵ سے اوپر عمر ہو چکی ہے۔ مگر کام کرنے کا حوصلہ ضرور ہے۔ آپ لوگ تو مجھے اپنا مشیر بنالیں، پھر دیکھئے میں کیسا اس جماعت کو چلاتا ہوں۔ میرا ایک مشورہ یاد رکھئے۔ ہر کام کے لئے روپیہ بہت بڑی قوت ہے۔ جماعت بنا لینا آسان ہے مگر اس کا چلانا بہت مشکل ہے۔ بغیر فنڈ کے کوئی جماعت نہیں چلتی۔ بہرحال میں نے آپ کے سامنے یہ ایک مخلصانہ تجویز پیش کی ہے۔ اب جو جی چاہے آپ لوگ فیصلہ کریں۔ آپ کو اختیار ہے۔ وہ کیا کہا ہے کسی شاعر نے

مانو نہ مانو جانِ جہاں ہم تمھیں سمجھائے جاتے ہیں

بس مجھے یہی کہنا تھا۔ آگے آپ لوگوں کی مرضی "

یہ کہکر وہ خاموشی کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ سگار پر کش لگاتا رہا۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی چھائی رہی۔ اس کے بعد کئی اسکائی لارکوں نے صدر سے کچھ کہنے کی اجازت چاہی مگر اس نے کسی کو کچھ کہنے کا موقعہ نہیں دیا۔ اُس نے خان بہادر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

" ہم آپ کے قیمتی مشوروں کے لئے بے حد ممنون ہیں۔ اب ہمیں اس بات کا موقعہ دیجئے کہ ہم اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے کسی نتیجے پر پہنچ سکیں "

خان بہادر نے کہا۔ آپ اپنے فیصلے سے مجھے کب تک مطلع کرسکیں گے؟ "

علی احمد (صدر) نے کہا " مجھے یقین ہے کہ اسی میٹنگ میں کچھ نہ کچھ ضرور طے ہو جائے گا "

وہ بولا " اگر آپ مجھے بھی بحث میں شرکت کرنے کا موقعہ دے سکیں تو مجھے اپنا نقطۂ نظر سمجھانے میں سہولت ہوگی "

علی احمد نے کہا " مجھے افسوس ہے کہ میں اس بات کی اجازت نہ دے سکوں گا۔ اس لئے کہ یہ بے ضابطہ بات ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اپنی بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کردیا ہے۔ اب اس سے زیادہ وضاحت کی اور کیا ضرورت ہوگی "

خان بہادر فرزند علی نے مزید اصرار نہ کیا اور شب کو ۹ بجے آنے کا وعدہ کرکے کانفرنس رُوم سے باہر چلا گیا۔ صفدر بشیر نے تمام اسکائی لارکوں کی جانب سے اُس کا شکریہ ادا کیا اور کوٹھی کے گیٹ تک اُس کو رخصت کرنے گیا۔

اس کے جانے کے بعد جلسہ کی کارروائی از سرِ نو شروع کی گئی۔ صدر نے خان بہادر کی تجاویز پر اسکائی لارکوں کو اظہارِ رائے کی دعوت دی۔ وہ بہت دیر سے اس پر بولنے کے لیے بے چین تھے۔ ایک بار ہی کئی اسکائی لارکوں نے بولنا شروع کردیا اور اس طرح جلسہ میں گڑبڑ پیدا ہوگئی۔ وہ چیخ چیخ کر بول رہے تھے۔ اُن میں ایسے بھی تھے جو خان بہادر کے ہم خیال تھے اور وہ لوگ بھی جو اُس کی شدید مخالفت کررہے تھے۔ جلسہ کا رنگ بگڑتا جارہا تھا۔ علی احمد نے بڑی مشکل سے اس کو قابو میں کیا اور بحث کے لئے اُس نے یہ طریقہ رکھا کہ ایک اسکائی لارک اگر تجویز کی حمایت میں بولتا، تو دوسرے کو مخالفت میں بولنے کا موقعہ دیا جاتا۔ پھر بھی بار بار پوائنٹ آف آرڈر اٹھا کر بیچ بیچ میں مداخلت کا سلسلہ چلتا رہا۔

ان تقریروں سے جلد ہی یہ اندازہ ہوگیا کہ اسکائی لارکوں کی اکثریت خان بہادر کی ہم خیال تھی۔ ان میں سلمان پیش پیش تھا۔ وہ اس وقت بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ اس کے لہجہ میں کھردرا پن تھا اور وہ معمول سے زیادہ اونچی آواز سے بول رہا تھا۔ اُس نے اپنی دھواں دھار تقریر میں نہ صرف اس بات پر زور دیا کہ خان بہادر کی تجویز کو مان لیا جائے بلکہ جذبات کی رَو میں اور بھی بہت کچھ کہہ گیا۔

تقریر کرتے کرتے ایک بار اُس نے اپنی آواز اونچی کرکے کہا "آپ کو دواؤں کی بلیک مارکٹ پر اعتراض ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر ہم کو بنکوں کو لوٹنا پڑے، بڑے بڑے سرمایہ داروں کی تجوریاں توڑنا پڑیں، محلوں میں رہنے والے جاگیرداروں کے گھروں پر ڈاکہ ڈالنا پڑے تو ہم کو اس سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ ہم کو روپیہ چاہیئے ہے، عوام کی بہبودی کے لئے، اُن کی بھلائی کے لئے۔ ہم اس کے لئے سب کچھ کرسکتے ہیں۔ ہمارا نصب العین بلند اور ہمارا مقصد انسانوں کی فلاح و بہبود

ہے۔ ہمیں جھوٹی اخلاقی روایات کو نظرانداز کر کے یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہم کس طرح جلد سے جلد اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہناتیں۔ ہمیں وقت کی اہمیت کو کسی حال میں بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ دیر تک اسی انداز میں بولتا رہا۔ جب اُس نے تقریر ختم کی تو اس کے ہم خیال اسکاتی لارکوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔

"فلک پیما" کا یہ جلسہ سہ پہر کو شروع ہوا تھا اور شام تک جاری رہا۔ اسکاتی لارکوں نے اس روز سہ پہر کی چائے بھی کانفرنس روم ہی میں پی اور جلسہ کی کارروائی کو جاری رکھا۔ بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ جب شام کا دھندلکا کوٹھی کے در و دیوار پر پھیل گیا اور کانفرنس روم کی دیوارگیریوں سے نارنجی روشنی پھوٹنے لگی تو علی احمد بولنے کے لئے کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ نظر آرہا تھا اور آنکھوں میں سکون تھا۔ اُس نے جذبات سے عاری، نرم لہجے میں اپنی تقریر شروع کی۔

"اسکاتی لارک ساتھیو! میں جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہوں، وہ اس جلسہ کے صدر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اسکاتی لارک کی حیثیت سے یہ میری انفرادی رائے ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسکاتی لارکوں نے خان بہادر فرزند علی کی تجویز کے بنیادی مقصد کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ خان بہادر کاروباری قسم کے آدمی ہیں۔ روپے سے روپیہ پیدا کرنا ان کا مقصد حیات ہے۔"

سلمان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: "ہم کو بھی خان بہادر کے متعلق کسی قسم کی خوش فہمی نہیں ہے۔ ہم اُن کو فرشتہ نہیں سمجھتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے ....."

علی احمد نے سلمان کو آگے بولنے کا موقعہ نہیں دیا: "میں اسکاتی لارک سلمان احمد سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے اپنی بات کہنے کا موقعہ دیں۔" سلمان نے اس کو مشتعل کرنے کی کوشش نہیں کی اور خاموشی کے ساتھ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ علی احمد نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ خان بہادر کا مقصد حیات زیادہ سے زیادہ روپیہ پیدا کرنا ہے۔ یعنی اپنی ضروریات سے بہت زیادہ دولت حاصل کرنے کی خواہش۔ یہ خواہش ایک مجرمانہ فعل ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ دوسرے کے گھروں سے روشنی چھین کر اپنے محلوں میں چراغاں کرنا۔ غریبوں کے پسینے

سے جھلکتی ہوئی کاروں کے لیے پٹرول مہیا کرنا، لاکھوں انسانوں کے لئے برہنگی اور اپنے لئے اطلس و کمخواب" علی احمد کا لہجہ بتدریج تیکھا ہوتا گیا۔ اس کی آواز میں گھن گرج پیدا ہوتی گئی "یہ محنت کا استحصال ہے۔ ڈاکہ زنی ہے۔"

اسکائی لارکوں میں سنسنی سی پھیل گئی۔ وہ سحرزدہ انسانوں کی طرح خاموش بیٹھے ہوئے علی احمد کو دیکھتے رہے جواب اونچی آواز سے بول رہا تھا "خان بہادر سے ہمارا کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا ہماری راہیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ "فلک پیما" کو اپنے مقاصد کا آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔ پہلے دواؤں کی بلیک مارکٹ ہو گی اور خان بہادر کے مشوروں پر یوں ہی عمل ہوتا رہا تو پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ اسپتال میں دواؤں کے بجائے، رنگین پانی کی بوتلیں نظر آیا کریں گی دوائیں چور بازار پہنچ جایا کریں گی اور بیماریوں کا شکار، بے سہارا اور محتاج انسان سسک سسک کر دم توڑتے رہیں گے۔" علی احمد نے ہاتھ اٹھا کر انگشت شہادت سے بلندی کی طرف اشارہ کر کے کہا "میں اس تجویز کے پس پردہ "فلک پیما" کی تباہی دیکھ رہا ہوں۔ اسکائی لارکوں کا عبرت ناک انجام"

جلسہ پر سناٹا چھا گیا۔ ہر اسکائی لارک دم بخود بیٹھا تھا۔ علی احمد نے چند لمحے توقف کیا اور اپنے لہجہ کو دھیما کر کے کہنے لگا "کیا ضروری ہے کہ "فلک پیما" ایک بہت شاندار اسپتال تعمیر کرے، جس کے کثیر اخراجات کے لیے نہ صرف بلیک مارکٹنگ بلکہ بعض اسکائی لارکوں کی رائے کے مطابق ڈاکہ زنی اور لوٹ مار تک کی جائے۔" اس کا اشارہ براہ راست سلمان کی جانب تھا۔

علی احمد نے بڑی تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "جناب من، یہ رابن ہڈ کے شاہ رچرڈ کا عہد نہیں ہے۔ جب چند امیروں کو لوٹ کر چند غریبوں کی مدد کی جاتی تھی۔ یہ علم و آگہی کا دور ہے، سائنس اور جمہوریت کا دور ہے۔ آج انسان کو اپنے مسائل کا شعور ہے۔ اور اس کے لئے وہ جد و جہد کر رہا ہے۔ جو لوگ ان مسائل کا حل نہیں جانتے، وہ انار کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کے بہت سے نوجوان جذباتی ہو کر اسی انداز سے سوچنے لگے ہیں۔ یہ ایک تباہ کن رجحان ہے، جس کی اسکائی لارکوں کو مذمت کرنا چاہیے۔"

علی احمد نے تمام اسکائی لارکوں کے چہروں کا جائزہ لیا اور اپنے لہجہ میں نرمی پیدا کرتے ہوئے

بولا" جہاں تک خان بہادر کا تعلق ہے۔ میں ان کے ساتھ اس حد تک تعاون کرنے کا مشورہ دوں گا کہ وہ اسپتال کی تعمیر کے لئے جو چندہ دے رہے ہیں، اس کو قبول کر لیا جائے اور اُن کی تجویز کو مسترد کر دیا جائے۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی تجویز منظور نہ کی گئی تو وہ "فلک پیما" کو چندہ دینے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ یہی ان کے خلوص اور ہمدردی کی آزمائش ہوگی۔ مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں نے اپنی رائے کا پوری دیانت داری سے اظہار کر دیا۔ فیصلہ آپ سب مل کر کریں گے۔"

یہ کہہ کر وہ بیٹھ گیا۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی چھا گئی۔ علی احمد کی تقریر نے جلسہ کی فضا بدل دی۔ چنانچہ رائے شماری کی بھی ضرورت درکار نہ ہوئی۔ تمام اسکائی لارکوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ جب جلسہ ختم ہوا تو اسکائی لارکوں کے چہروں پر اطمینان اور سکون جھلک رہا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

رات کے نو بجے خان بہادر کی کار "فلک پیما" کے ہیڈ کوارٹر پر ایک بار پھر نظر آئی۔ وہ مسکراتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ صفدر، بشیر، علی احمد اور نعیم اللہ اس کا پہلے ہی سے انتظار کر رہے تھے۔ خان بہادر نے کچھ دیر تک تو موسم کی خرابی کے متعلق گفتگو کی، پھر حرف مطلب پر آتے ہوئے بولا۔

"کہیے کیا فیصلہ ہوا آپ کے جلسہ میں؟"

صفدر، بشیر نے جواب دیا "خان بہادر صاحب، ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی تجویز پر عمل نہیں کر سکیں گے۔ البتہ اگر آپ اسپتال کی تعمیر کے لئے ہماری مالی امداد کرنا چاہیں تو ہم آپ کے بے حد ممنون ہوں گے۔"

خان بہادر کا چہرہ فق ہو گیا۔ گھبرا کر بولا "ایسی صورت میں مجھے غور کرنا پڑیگا کہ میں کیا کروں"

علی احمد نے خاموشی کے ساتھ ۲ ہزار کا چیک نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا اور اس سے کہنے لگا "یہ چیک حاضر ہے، اب آپ جیسا مناسب سمجھیں، وہ فیصلہ کریں۔"

خان بہادر جلدی سے بولا "دیکھئے برا ماننے کی بات نہیں۔ روپیہ بڑی محنت سے حاصل ہوتا ہے لہٰذا آپ مجھ کو یہ تو حق دیں گے کہ اگر میں کسی مقصد کے لئے چندہ دوں تو یہ بھی دیکھوں کہ میری رقم

صحیح کام پر صرف ہو رہی ہے یا نہیں۔ پھر آپ یہ بھی غور کریں کہ ۵ ہزار روپیہ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔"

علی احمد نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا "یہ حق آپ سے کون چھین سکتا ہے۔ اگر آپ فلاح بہبود کے پروگرام سے متفق نہیں ہیں تو پھر کسی تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ ہنس کر بولا "اوہو ہو، آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔ آپ کے پروگرام سے تو مجھکو سو فی صدی اتفاق ہے۔ لیکن جس طرح آپ اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں، اس سے مجھے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ بھئی آپ لوگوں نے میری تجویز پر معلوم ہوتا ہے۔ جذباتی انداز سے غور کیا ہے۔ ورنہ اس کو منظور نہ کرنا بڑی عجیب سی بات نکلتی ہے۔"

صفدر بشیر نے کچھ کہنا چاہا مگر اس سے قبل فہیم اللہ بول پڑا "خان بہادر صاحب آپ کی تجویز کے ہر پہلو پر جلسہ میں غور کیا گیا تھا اور جو فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔"

خان بہادر کہنے لگا "صاحب بات کچھ سمجھ میں آئی نہیں"

فہیم اللہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے خان بہادر کو گھور کر دیکھا اور کسی قدر روکھے پن سے بولا "معاف کیجئے گا، آپ کی سمجھ میں یہ بات آ بھی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ ہمارے آپ کے سوچنے کے طریقہ میں بنیادی فرق ہے۔"

خان بہادر کی پیشانی پر بل آ گیا۔ اُس نے فہیم اللہ کی بات کو پسند نہیں کیا۔ ذرا دیر تک خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اُس نے چیک اٹھا کر پورٹ فولیو میں رکھا اور شگفتہ مزاجی کے اظہار کے طور پر زبردستی مسکرا کر کہنے لگا۔ "بھئی آپ لوگ ماشاء اللہ ابھی نوجوان ہیں، تازہ خون ہے، اب یہ آپ کی مرضی میری بات مانیں یا نہ مانیں۔"

اس کے بعد وہ وہاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہرا۔ چند ہی منٹ بعد اُٹھ کر چلا گیا۔

۵

نیاز ان دنوں بڑی پریشانی میں مبتلا تھا۔ ہوا یہ کہ ملٹری ڈپو سے ڈسپوزل کا کچھ سامان نکلا، جس کے نیلام میں وہ بھی گیا۔ اس میں اونی کمبلوں کی ایک بہت بڑی لاٹ تھی جس کی بولی خلاف توقع اونچی گئی۔ نیاز گھر سے یہ سوچ کر آیا تھا کہ اس کو یہ لاٹ خریدنا ہے۔۔ وہ بولی بڑھاتا چلا گیا۔ ۱۸ ہزار میں پوری لاٹ اُس کے نام چھوٹ گئی۔ وہ خوشی خوشی سارا مال ٹرکوں پہ لدوا کر دکان پر لایا۔ خیال تھا کہ سردی کا موسم آرہا ہے، کمبلوں کے اچھے دام مل جائیں گے۔

لیکن جب اُس نے نیلام کے بنڈلوں کو کھلوایا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سارے کمبل بوسیدہ اور گلے ہوئے تھے۔ ذرا سا دباؤ پڑتا تو کاغذ کی طرح مسک جاتے۔ ڈپو کے جس شیڈ کے اندر وہ رکھے تھے، وہاں ڈھلوان تھا۔ برسات کا سارا پانی شیڈ کے اندر گھس گیا تھا۔

کمبل عرصہ تک اس میں پڑے پڑے گل گئے تھے۔ منافع تو ایک طرف رہا، رقم نکلنے کے لالے پڑ گئے۔ دو ایک دلالوں کو اُس نے مال دکھایا، وہ بازار میں نمونہ لے کر گئے اور چپ چاپ اُن کو دکان پر لاکر ڈال گئے۔ کوئی کوڑیوں کے مول بھی کمبلوں کو لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ نیاز کی راتوں کی نیند اُڑ گئی۔

وہ ہر وقت گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ چند ہی روز میں اس کا چہرہ مرجھا گیا اور پیشانی پر سیاہ لکیریں اُبھر آئیں۔ اسی پریشانی کے عالم میں ایک روز رات گئے وہ گھر پہنچا تو خلاف معمول بیوی کو دالان میں نہ پاکر اس کو تعجب ہوا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سہ پہر سے اس کی طبیعت گڑبڑ ہے۔ وہ اس وقت کمرے کے اندر لیٹی تھی۔ نیاز نے وہاں جاکر دیکھا، اس کو اچھا خاصا تیز بخار تھا، حرارت

چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

وہیں بیوی کے سرہانے کھڑے ہو کر نیاز نے سوچا کہ اب اُس کی اسکیم کے پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے، جس کے لئے وہ عرصہ دراز سے غور کر رہا تھا۔

بظاہر اُس نے بیوی سے بڑی محبت کی باتیں کیں اور اُس کو تسلّی دے کر ڈاکٹر موٹو کی طرف چلا گیا۔ وہ اپنا مطب بند کر کے جانے ہی والا تھا۔ اس وقت کوئی مریض موجود نہ تھا۔ دونوں نے تنہائی میں بیٹھکر اطمینان سے باتیں کیں۔

معاملہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ اب نیاز کو معاہدہ کے مطابق ایک ہزار روپیہ پیشگی ادا کرنا تھا، جس کا مہیا کرنا فی المحال نیاز کے لئے مشکل تھا۔ ان دنوں اُس کا سارا سرمایہ کمبلوں کے علاوہ، دو ایک اور سودوں میں بھی پھنسا ہوا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر سے اس کے لئے کچھ مہلت مانگنا چاہی تو اُس نے بڑے روکھے پن سے کہا۔

"نہیں بھئی پیشگی رقم پہلے ملنا چاہیئے۔ اس کے بعد ہی کچھ ہوگا۔"

اس انکار پر نیاز سٹ پٹا کر رہ گیا۔ اُس نے ڈاکٹر کو اپنی مالی پریشانیاں بتائیں، منت سماجت کی تو وہ ذرا نرم پڑا اور بڑی مشکل سے مہینہ بھر کی مہلت دی۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر پیشگی رقم وقت پر نہ ملی تو وہ انجکشن لگانا بند کر دے گا۔

نیاز اسی وقت ڈاکٹر موٹو کو لے کر گھر آیا۔ اُس نے مریضہ کی نبض دیکھی، ٹمپریچر لیا۔ تشویش کی قطعی کوئی بات نہ تھی۔ موسمی بخار تھا۔ دو ایک روز میں وہ بلا علاج کے بھی اچھی ہو جاتی مگر ڈاکٹر نے خواہ مخواہ کی باتیں کر کے اس کو پریشان کر دیا۔ اُس نے ایک عجیب و غریب بیماری کا نام لے کر مرض کو بے حد خطرناک بتایا۔ اس کی تشخیص کے مطابق مریضہ کا جگر بالکل خراب ہو چکا تھا اور آنتوں میں زخم پڑ گئے تھے۔ اُس نے مریضہ کے سامنے ہی نیاز کو مشورہ دیا کہ علاج باقاعدگی کے ساتھ ہونا چاہیئے ورنہ جان کا خطرہ ہے۔ علاج کے لئے اُس نے انجکشنوں کا کورس تجویز کیا۔ پہلا انجکشن اُس نے اُسی وقت لگایا اور مریضہ کو ہدایت کی کہ وہ پانی کم پیا کرے۔ غذا میں نمک کا استعمال زیادہ کرے اور جسمانی

مشقت سے پرہیز کرے۔

دو تین روز میں سلطانہ کی ماں کا بخار اُتر گیا اور طبیعت سنبھلنے لگی۔ ڈاکٹر مونو ہر چوتھے روز آکر خود اپنے ہاتھ سے انجکشن لگاتا۔ یہ سلسلہ برابر چلتا رہا۔ مریضہ کی طبیعت کچھ عرصہ تک تو ٹھیک رہی۔ لیکن ایکا ایکی اُس کی حالت بگڑنے لگی۔ ڈاکٹر نے فوراً کچھ پیٹنٹ دوائیاں تجویز کیں، جن سے اُس کی طبیعت میں کسی قدر افاقہ ہوگیا۔ مگر وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے سخت مشقت کرنے کی عادی تھی۔ ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود گھر کے کاموں میں دلچسپی لیتی لیکن ذرا سا جسمانی کام کرنے کے بعد اس کی سانس پھول جاتی اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا۔ وہ نڈھال ہوکر بستر پر گر پڑتی۔ دیر تک طبیعت قابو میں نہ آتی۔ ایک روز اُس نے دبی زبان سے اپنی حالت کا نیاز سے تذکرہ کیا تو وہ بگڑ کر بولا۔

"تم کو تو وہم ہوگیا ہے"

وہ کہنے لگی "آپ کو کیا پتہ کہ میری کیا حالت ہو رہی ہے۔ نہ جانے یہ ڈاکٹر کیسا علاج کر رہا ہے طبیعت سنبھلنے کے بجائے دن بدن گرتی ہی جا رہی ہے۔"

نیاز نے فوراً کہا "تم ہمیشہ کی شکی ہو، ہر وقت اُلٹی سیدھی باتیں سوچا کرتی ہو۔ مجھے تو کہیں سے تمہاری حالت بگڑتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ پہلے سے اب صحت اچھی ہوگئی ہے۔ یوں وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔"

وہ زچ ہوکر بولی "میں کیسے بتاؤں آپ کو کہ میری کیا حالت ہے۔"

نیاز غصہ سے آنکھیں نکال کر چیخا "تو پھر خیراتی اسپتال چلی جاؤ۔ تم کو تو وہیں سے آرام ملے گا۔" لمحہ بھر کے لئے اُس نے توقف کیا، پھر بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا۔ "دیکھو آج کل میں یوں ہی چکر میں پھنسا ہوا ہوں، تم خواہ مخواہ مجھ کو پریشان مت کیا کرو ورنہ میں کہیں اپنا منہ کالا کر کے چلا جاؤں گا۔ پھر بیٹھی جس سے چاہے علاج کراتی رہنا۔"

اس دھمکی کو سُن کر وہ ایک دم سناٹے میں آگئی۔ اس کے بعد اُس نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموش

بیٹھی رہی۔

نیاز تھوڑی دیر بیٹھا غصہ سے بڑبڑاتا رہا اور پھر اٹھکر گھر سے باہر جانے لگا۔ اس وقت اُس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی اور وہ بار بار انگلیوں کو آپس میں رگڑ رہا تھا۔ اُس کو جاتے دیکھکر بیوی نے کہا۔ "اب اتنی رات گئے کہاں جانے کا ارادہ ہے" وہ جھلا کر بولا۔

"جہنم میں"

وہ اٹھکر اس کی جانب بڑھی۔ "آپ کو میری قسم جو گھر سے باہر گئے"

نیاز کے قدم دروازے تک پہنچتے پہنچتے سست پڑ گئے۔ وہ اُس کے قریب پہنچی اور اُس کا بازو پکڑ کر دالان میں لے آئی۔ نیاز روٹھے ہوئے بچّے کی طرح منہ پُھلا کر بستر پر لیٹ گیا اور بیوی سرہانے بیٹھی دیر تک اس کا سر دباتی رہی۔

اُس دن کے بعد اُس نے پھر نیاز سے اپنی گرتی ہوئی صحت کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا۔ علاج کا سلسلہ جاری رہا۔ انجکشن لگتے رہے اور اُس کا جسم چھپکلی کی طرح پیلا پڑتا گیا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوتا جیسے دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا ہے۔ اُس کا دم بار بار ڈوبا جاتا اور اختلاجی کیفیت طاری ہو جاتی۔

علاج کرتے ہوئے چوتھا ہفتہ شروع ہو گیا۔ نیاز کو ڈاکٹر کی رقم کی فکر تھی۔ وہ ایک ہزار روپیہ دے تو سکتا تھا مگر اتنی رقم کا اُس کے پاس سے نکل جانے کا یہ مطلب ہوتا کہ اُس کی دوکان بیٹھ جاتی۔ ان دنوں وہ دو ڈھائی ہزار روپے کے لوٹ پھیر سے اپنا کاروبار چلا رہا تھا۔ نیاز کی پریشانی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ رہ رہ کر سوچتا کہ ڈاکٹر نے اگر انجکشن لگانا بند کر دیئے تو یہ بہت بُرا ہو گا۔ انشورنس کی پہلی ششماہی قسط جو اُس نے کئی ہزار روپے کی صورت میں ادا کی تھی ڈوب جائے گی۔ اس لئے کہ بغیر انجکشنوں کے بیمہ کی پالیسی کو جاری رکھنا فضول تھا۔

وہ اسی ذہنی اُلجھن میں مبتلا تھا کہ ایک روز شام کے وقت خان بہادر فرزند علی کا ایک کارندہ نیاز کے پاس آیا۔ اُس کی باتوں سے پتہ چلا کہ خان بہادر کو کسی دلال کے ذریعہ یہ معلوم ہوا تھا کہ نیاز کے پاس خاصی بڑی تعداد میں کمبل موجود ہیں اور جن کو نکالنے کے لئے وہ بہت کوشاں ہے۔

خان بہادر کے آدمی سے بات چیت کچھ ڈھنگ سے نہ ہو سکی، لہٰذا اسی رات وہ خان بہادر فرزند علی سے خود ملا۔ وہ بڑے تپاک سے پیش آیا۔ اپنے خوبصورت ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس نے نیاز کو گرم گرم چائے پلائی۔ پھر اس نے پاس رکھی ہوئی فائل کھول کر ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ نکالا اور نیاز کو وہ کاغذ دکھا کر بولا۔

"میرے پاس ۵ ہزار کمبلوں کی سپلائی کا یہ سرکاری آرڈر ہے۔ اگر آپ سے معاملہ پٹ جائے تو آپ کا سارا اسٹاک نکلوا دوں گا۔"

نیاز نے فوراً کہا۔ "تو پھر اس میں سوچنا کیا ہے۔ کچھ ایسا بھاؤ لگا دیجئے کہ مجھ کو بھی کچھ بچ جائے۔ میں سارا مال دینے کو تیار ہوں۔"

خان بہادر بولا۔ "دیکھئے میں کمبل خود نہیں خریدوں گا۔ آپ کا مال میرے توسط سے جائے گا۔ ریٹ طے کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنے ٹینڈر میں ۱۰ روپے فی کمبل کا ریٹ دیا تھا۔ گورنمنٹ نے وہ ریٹ منظور کر کے سپلائی کا آرڈر دے دیا ہے۔"

نیاز کی سمجھ میں خان بہادر کی پوری بات نہ آئی۔ کہنے لگا "حکومت تو آپ کو ۱۰ روپے فی کمبل کے حساب سے پےمنٹ کرے گی مگر آپ مجھ کو کیا دیں گے؟"

خان بہادر کو اپنی بات کی مزید وضاحت کرنا پڑی۔ "دیکھئے اس کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ میں آپ سے کمیشن لوں۔ مگر میں کمیشن پر سودا کرنا نہیں چاہتا۔ میری شرائط یہ ہوں گی کہ اس سپلائی سے جو منافع ہو گا اس کے تین حصہ دار ہوں گے۔ میرا اور آپ کا ۴۰، ۴۰ فی صدی کا برابر کا حصہ ہو گا۔ ۲۰ فی صدی کا حصہ دار ایک سرکاری افسر ہو گا۔ جس کے ذریعہ یہ ٹینڈر منظور ہوا ہے اور جس سے آئندہ سپلائی میں بھی مدد ملے گی۔ اب جیسا آپ مناسب سمجھیں وہ طے کر لیں۔"

نیاز نے سوچا سودا تو بہت اچھا ہے۔ ۲۰ ہزار روپے سیدھے سیدھے بچتے تھے۔ اس کے لئے تو کمبلوں کا نکلنا ہی ایک مصیبت تھی۔ کہاں اتنا بڑا منافع۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی خوشی کو قابو میں کیا اور اس سے کہنے لگا "مجھے آپ کی یہ شرط تو منظور ہے اور جو کوئی شرط ہو وہ بھی بتا دیجئے۔"

خان بہادر ہنس کر بولا "یہی بنیادی شرط ہے اور جو کچھ چھوٹی موٹی قانونی شرائط ہوں گی وہ ہم معاہدہ کرتے وقت طے کرلیں گے۔"

نیاز کو بڑی مسرت تھی کہ اتنا اچھا سودا اس قدر آسانی سے طے ہوگیا۔ دونوں نے سپلائی کے متعلق کچھ کاروباری سی باتیں کیں اور یہ طے کیا کہ وکیل کی معرفت جلد ہی آپس میں معاہدہ ہو جائے۔ اس کے بعد نیاز گھر واپس آگیا۔ اُس روز وہ خاصا مطمئن نظر آرہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ہر وقت جو دھندلا سایہ چھایا رہتا تھا، وہ دور ہوگیا تھا۔

تیسرے روز معاہدے پر دستخط ہوگئے۔ سرکاری افسر کے حصے کا اس میں تذکرہ نہ آیا۔ اس کو اخراجات کی ایک فاضل مد میں ڈال دیا گیا۔ نیاز نے معاہدے کی نقل لے کر جیب میں رکھی تو اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی جیبیں نوٹوں کی گڈیوں سے بھر گئی ہیں! اس وقت خان بہادر اُس کو بڑا سیدھا اور نیک آدمی معلوم ہوا۔ بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ خان بہادر چاہتا تو اس سے بہت سستے داموں میں کمبل خرید کر اچھی رقم پیدا کر سکتا تھا۔

اس سپلائی کی نوعیت یہ تھی کہ شدید بارشوں کے باعث ملک کے شمالی علاقوں میں زبردست طغیانی آگئی تھی۔ سیکڑوں بستیاں اُجڑ گئیں۔ ہزاروں انسان بے گھر ہوگئے۔ طرح طرح کے وبائی امراض پھیل گئے۔ لوگ دھڑا دھڑ بیمار پڑ رہے تھے۔ حکومت نے اُن کی امداد کے لئے جگہ جگہ ریلیف کیمپ کھول دیئے تھے۔ سیلاب زدگان کے لئے جن اشیا کے فراہم کرنے کی ضرورت تھی، ان میں کمبل بھی شامل تھے۔ اس کی سپلائی کے لئے ٹینڈر جاری کئے گئے۔ ریلیف کمیٹی کا جو افسر ٹینڈر منظور کر رہا تھا۔ اس سے خان بہادر کے کچھ مراسم نکل آئے۔ پہلی ہی ملاقات میں بات کچھ اس ڈھب سے ہوئی کہ اُسی وقت معاملہ پٹ گیا۔

خان بہادر اور نیاز، دونوں معاہدہ ہو جانے کے بعد اپنی اپنی جگہ بہت مطمئن تھے۔ لیکن جب منظوری کے نمونہ کا کمبل بھیجا گیا تو کچھ عرصہ کے لئے وہ پریشانی میں ضرور پڑ گئے۔ اس لئے کہ اگر نمونہ مسترد ہو جاتا تو ان کا سارا پروگرام ریت کے محل کی طرح بیٹھ جاتا۔ لیکن نمونہ کی نامنظوری کا سوال ہی پیدا

دہ ہوتا تھا، جو افسر اس کو پاس کرر ہا تھا اُس کا سپلائی میں ۱۰ فی صدی کا منافع تھا۔ چنانچہ فوراً ہی نمونہ کی منظوری آ گئی اور مال سپلائی ہونا شروع ہو گیا۔

گلے ہوئے بوسیدہ کمبل نیاز کی دکان سے نکل نکل کر ریلیف کیمپوں میں پہنچ گئے اور وہاں سے سیلاب کے ستائے ہوئے پریشاں حال لوگوں میں تقسیم کر دیئے جاتے۔ ہفتہ بھر کے اندر اندر سپلائی کا کام ختم ہو گیا۔ ۱۵ روز بعد خان بہادر نے اپنے رسوخ سے بل منظور کرا لیا اور کمبلوں کا سارا حساب وصول ہو گیا۔ اصل رقم اور خرچ نکال کر ۲۵ ہزار کا منافع ہوا۔ دس، دس ہزار روپے خان بہادر اور نیاز نے لے لیے اور ۵ ہزار روپے معاہدے کی رو سے ریلیف کمیٹی کے متعلقہ افسر کو پہنچا دیئے گئے، جس نے ٹینڈر منظور کرایا تھا اور نمونہ بھی پاس کیا تھا۔

جس روز نیاز کو یہ ساری رقم ملی اُس دن وہ بے حد خوش تھا۔ اُس نے بازار سے مٹھائی اور پھولوں کے گجروں کے علاوہ، بیوی کے لئے کئی سو کا سامان خریدا اور مسرت سے جھومتا ہوا گھر کی جانب چل دیا۔ جب وہ گھر کے اندر داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی۔ ذرا دیر پہلے سلطانہ کی ماں کی طبیعت بیٹھے بیٹھے اچانک خراب ہو گئی تھی۔ وہ بستر پر آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ قریب ہی سلطانہ پریشان سی بیٹھی تھی۔

نیاز نے نزدیک جا کر دیکھا، بیوی دونوں ہاتھوں سے سینے کو دبوچے ہوئے بے سدھ پڑی تھی۔ اُس کا رنگ لیمپ کی روشنی میں گہرا زرد نظر آ رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کے ہلکے ہلکے قطرے چمک رہے تھے۔ آنکھوں کے نیچے حلقوں کے نشانات تھے۔ چہرے کی کھال کا تناؤ کم پڑ گیا تھا۔ اس وقت وہ خاصی سن رسیدہ نظر آ رہی تھی۔ نیاز نے اپنی مالی پریشانیوں کے باعث اب تک اُس کی حالت پر زیادہ توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اُس نے اب جو اس کو غور سے دیکھا تو اُس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ اس کو گھناؤنی اور بدصورت معلوم ہوئی اُس نے بڑی نفرت کے ساتھ سوچا۔ اب تو اس عورت کو مر ہی جانا چاہیے۔ یہ مرجھایا ہوا مریل جسم اُس کے لیے بالکل بیکار تھا۔

اُس نے قریب بیٹھی ہوئی سلطانہ کو دیکھا اُس کے گداز جسم کا ایک ایک خم پھڑک رہا تھا۔ دھندلی روشنی میں اُس کے چہرے پر ایک خاص دل کشی نظر آ رہی تھی۔ بے خیالی کے عالم میں ایک بار سلطانہ نے

نظریں اٹھا کر نیاز کی جانب دیکھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کنول کے پھول کی طرح کھل گئیں ۔ وہ اس سے نظر بھی نہ ملا سکا۔

اُس نے گھبرا کر نگاہیں نیچی کرلیں اور اُس سے پوچھنے لگا۔

"کیسی طبیعت ہے ؟"

وہ بولی "اچھی خاصی بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، اچانک طبیعت خراب ہو گئی"

نیاز کہنے لگا: "شام کو نہائی ہوں گی"

سلطانہ نے فوراً اس کی بات کی تردید کی "نہیں تو۔ اکثر اُن کو ایسا ہی دورہ پڑا کرتا ہے کہتی ہیں سینے میں تکلیف ہوتی ہے"

اس کے بعد نیاز نے مزید گفتگو نہیں کی اور گھر سے نکل کر سیدھا ڈاکٹر موٹو کے پاس پہنچا۔ اُس وقت اس کی آنکھوں میں مجرمانہ چمک تھی۔ اُس نے ڈاکٹر کو ایک ہزار روپیہ دیا۔ تاخیر کے لئے معذرت کی اور اس کے بعد اُس سے بولا۔

"ڈاکٹر صاحب سال بھر کے بجائے پہلے ہی معاملہ صاف ہو جائے تو اچھا ہے"

وہ کہنے لگا: "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا، مگر تم راضی نہ ہوئے۔ یوں بھی دیر کرنے میں خطرہ ہے"

نیاز اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا "اچھا ڈاکٹر صاحب جیسی آپ کی مرضی۔ میں اب اس معاملہ میں کچھ نہیں کہوں گا"

اس روز ڈاکٹر نے مریضہ کی حالت کے بارے میں اس کو بہت سی باتیں بتائیں اور کچھ ضروری ہدایتیں بھی دیں، جن پر عمل کرنے کے لئے وہ بار بار تاکید کرتا رہا۔

فصلِ ششم

۱

آغاز سرما کی ایک کہر آلود رات تھی۔ دس بج چکے تھے۔ کانفرنس روم میں تمام اسکاؤٹ لارک موجود تھے۔ "نولک پیما" کا ماہانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر زیدی نے انجمن کی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد اسپتال کی تعمیر کے منصوبے پر بحث شروع ہوئی، جس کو بعض ترمیمات کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔

اسپتال کی تعمیر کے لیے جو گروپ بنایا گیا، اس میں سب ہی اسکاؤٹ لارک شریک تھے اس گروپ کا سربراہ محمد علیم تھا، وہ ایک کنسٹرکشن کمپنی میں کچھ عرصہ کام کر چکا تھا۔ تعمیر کے کاموں کا اس کو عملی تجربہ تھا۔

پروگرام یہ طے ہوا کہ سب سے پہلے محمد علیم جا کر پلاٹ کا سروے کرے گا اور جب یہ کام ختم ہو جائے تو کسی کنسٹرکشن کمپنی سے تعمیری ضروریات کا سامان کرایہ پر لے لیا جائے اور اسکاؤٹ لارک اسپتال کی فاؤنڈیشن کھودنا شروع کر دیں۔

دوسرے دن محمد علیم دو اسکاؤٹ لارکوں کے ساتھ سویرے ہی سویرے پلاٹ کا سروے کرنے کے لیے نکل پڑا مگر جب وہ وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ پلاٹ پر قدِ آدم چہار دیواری کھنچی ہوئی تھی۔ کچھ حصے پر ٹین کا سائبان پڑا تھا۔ مشرقی دیوار میں ایک دروازہ بنا تھا جس پر ایک بورڈ لگا تھا۔ بورڈ پر بڑے بڑے حروف میں "نورانی مسجد" لکھا تھا۔

محمد علیم نے سوچا کہ شاید وہ کسی دوسری جگہ آ گیا ہے۔ مگر جب اُس نے دونوں اسکاؤٹ لارکوں کے

ہمراہ گھوم پھر کر چاروں طرف سے مسجد کو دیکھا تو اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ کسی نے اسپتال کی زمین پر راتوں رات مسجد کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ وہ دم بخود رہ گیا۔ دونوں اسکا ئی لارک بھی چکر میں پڑ گئے۔ کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ مسجد کس نے بنوائی۔ کیوں بنوائی۔؟

اب افقی سرحدوں پر سنہری روشنی پھیلنے لگی تھی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ دن کی آمد آمد تھی۔ بسنتی دھوپ آہستہ آہستہ بلندیوں پر سے نیچے اتر رہی تھی۔ بستی میں ملی جلی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے کام پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان تینوں کو چہار دیواری کے قریب حیرت کے عالم میں کھڑا دیکھ کر کچھ آدمی ادھر بھی آ گئے۔ مسجد کو دیکھ کر وہ بھی اچنبھے میں پڑ گئے۔ ایک بوڑھا سا آدمی کہنے لگا۔

"دس بجے جب میں دوکان سے لوٹا ہوں تو میدان صاف پڑا تھا۔ رات بھر میں نہ جانے کس نے مسجد کھڑی کر دی۔ اللہ میاں نے فرشتے بھیجے ہوں گے۔ اور تو کچھ اپنے پلے نہیں پڑتا کہ یہ ہوا کیا۔"

ذرا ہی اس کے برابر کھڑا ہوا دوسرا شخص بولا "یار نبی جان تو بھی کمال کرتا ہے۔ تو بھی آج تک تو ہم نے سُنا نہیں کہ فرشتے آ کر مسجد بنوا گئے۔ یہ تو کچھ اور ہی بات جان پڑتی ہے"۔

اس کے بعد وہ سب مل کر طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اسی اثنا میں بلاک والی گلی سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تہبند درست کرتا ہوا نکلا اور ان لوگوں سے کہنے لگا "اب کیا دیکھ رہے ہو۔ رات کو دیکھتے کہ یہاں کیا ہو رہا تھا"۔ اس نے سڑک کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "وہاں تین چار ٹرک کھڑے تھے اور ان میں سے سامان نکال نکال کر دنا دن دیواریں اٹھ رہی تھیں"۔

"یہ کے بجے رات کی بات ہے جی؟"

"میں کارخانے سے واپس آ رہا تھا۔ تین بج رہا ہو گا۔ اماں خدا جھوٹ نہ بلوائے کیا سیوں آدمی جٹا ہوا تھا"۔

"تو یار تو نے دوسرے لوگوں سے پوچھا تو ہوتا"۔

"میں تھکا ہارا آ رہا تھا۔ میں نے کہا نہ جانے بھئی یہاں کیا ہو رہا ہے"۔

"اذان تو فجر کی میں نے بھی سنی تھی اور اماں میں نے تو نمازیوں کو بھی مسجد سے نکلتے دیکھا تھا۔ مگر وہ

کہتا تھا کہ اپنے محلہ کا تو اس میں کوئی نہیں تھا۔ نہ جانے کون لوگ تھے"۔

"یار و اللہ کے بھید اللہ ہی جانتا ہے"

"ہاں جی یہ سب اُس کی قدرت کے کرشمے ہیں"

وہ سب مل کر اسی طرح باتیں کرتے رہے، علیم نے سوچا اب وہاں زیادہ ٹھہرنا فضول تھا۔ لہٰذا وہ دونوں اسکائی لارکوں کے ساتھ ہیڈ کوارٹر واپس آیا اور صفدر بشیر کو فوراً اس واقعہ کی رپورٹ دی۔ اسکائی لارکوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ کسی کو بھی محمد علیم کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ صفدر بشیر نے گیراج سے اسٹیشن ویگن نکالی اور علی احمد کو اپنے ہمراہ لے کر معائنے کے لئے چل دیا۔

واپس آ کر اُس نے "فلک پیما" کا ہنگامی جلسہ طلب کیا۔ اور اسکائی لارکوں کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ علیم احمد کی اطلاع کی اُس نے تصدیق کی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس سلسلہ میں کیا کارروائی کی جائے نوجوان اسکائی لارکوں میں بڑا جوش پایا جاتا تھا۔ اُن کے چہرے سرخ ہو رہے تھے اور وہ چیخ چیخ کر بول رہے تھے۔ صفدر بشیر اور علی احمد پر ہر طرف سے سوالات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے اپنے معائنے میں جو کچھ دیکھا تھا، اس کی وہ ایک ایک تفصیل بتا چکے تھے۔ مگر ان باتوں سے اسکائی لارکوں کی تشفی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھے کہ یہ مسجد بنی کیسے اور کس نے بنوائی ہے جلسہ میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اسی دوران میں کوٹھی کے ایک ملازم نے کمرے کے اندر آ کر صفدر بشیر کو اطلاع دی کہ اُس کا ٹیلیفون آیا ہے۔

صفدر بشیر نے دوسرے کمرے میں جا کر ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف سے خان بہادر کی آواز ابھری "میں خان بہادر فرزند علی بول رہا ہوں" صفدر بشیر نے پوچھا۔

"مزاج تو اچھا ہے۔ کہیے اس وقت ٹیلیفون کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی"

وہ کہنے لگا "بھئی ایک بہت بڑا مسئلہ سامنے آ گیا ہے"۔

صفدر بشیر نے دریافت کیا "کیا مسئلہ آ گیا؟"

خان بہادر کی آواز آئی "میں نے سُنا ہے کہ جس زمین پر آپ اسپتال بنانا چاہتے تھے۔ اُس پر محلّہ

کے لوگوں نے مسجد تعمیر کرلی ہے۔"

"محلے کے لوگ تو قطعی لاعلمی ظاہر کررہے ہیں۔ میں خود وہاں گیا تھا۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی۔"

خان بہادر کے ہنسنے کی آواز ریسیور میں سنائی دی۔"بھئی غلط اطلاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کا ایک وفد صبح تڑکے سے میرے پاس بیٹھا ہے۔"

صفدر بشیر گھبرا کر بولا۔"آپ کے پاس وفد آیا ہے؟"

"جی ہاں! میں نے عرض کیا نا کہ وہ تو صبح سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر ایسا کیجئے کہ آپ ان لوگوں کو میرے پاس بھیج دیں۔ اس وقت "فلک پیما" کا جلسہ ہورہا ہے۔ ہم اسی مسئلہ پر غور کررہے ہیں۔ ان لوگوں کی موجودگی میں اس مسئلے کو سلجھانے میں آسانی ہوجائے گی۔"

"میرا کہا مانئے تو اب اس خیال کو ترک ہی کردیجئے۔ اس لئے کہ بات بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ شہر کے تین عالموں سے مسجد کی تعمیر کے شرعی ہونے کا فتویٰ لیا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ میں ابھی وفد کے ہمراہ کلکٹر سے مل کر آرہا ہوں تاکہ کوئی گڑبڑ پیدا نہ ہوجائے۔ میں نے کلکٹر کو مشورہ دیا تھا کہ نقصِ امن کا خطرہ ہے۔ لہٰذا انھوں نے پولیس کا پہرہ لگانے کا بھی وعدہ کرلیا ہے۔"

اس دھمکی پر صفدر بشیر کو سخت غصہ معلوم ہوا۔ مگر اس نے ضبط سے کام لیا اور شکایت کرنے کے سے انداز میں کہنے لگا۔"مگر یہ ساری کارروائی کرنے سے پہلے آپ نے مجھ سے تو مشورہ کرلیا ہوتا۔"

وہ بڑے اطمینان سے بولا۔"بھئی وہ ہوا یہ کہ انھوں نے مجھکو غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔"

"بہرحال اس وقت تک جو کچھ ہوچکا ہے، وہ ہوگیا۔ میں درخواست کروں گا کہ آئندہ اس مسئلہ میں آپ دلچسپی نہ لیں تو مناسب ہوگا۔"

خان بہادر بگڑ کر کہنے لگا۔"کیا کہا آپ نے۔ یعنی میں اس مسئلے میں دلچسپی نہ لوں۔ بات ذرا سوچ کر کہا کیجئے۔ واہ صاحب واہ، آپ نے تو کمال ہی کردیا۔ یہ بھی خوب کہی۔ اجی آپ نے تو صرف صاحب سلامت ہی ہے۔ اگر میرا حقیقی بھائی بھی مجھ سے یہ بات کہتا تو خدا میں اس کا منہ نوچ لیتا۔ جناب یہ دینی معاملہ ہے۔ میں تو اس کے لئے اپنی جان و مال قربان کرسکتا ہوں۔"

ابھی وہ اپنے جذبۂ ایمانی کے اظہار میں نہ جانے اور کیا کیا لن ترانی کرتا لیکن صفدر بشیر نے اُس کی بات کاٹ کر فوراً کہا: "معاف کیجیے گا آپ میری بات کا مطلب قطعی غلط سمجھے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا جو آپ نے سمجھا۔"

"بہر حال آپ کا کچھ بھی مطلب ہو۔ ایک بات ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ مسئلہ بہت خطرناک ہے آپ لوگ تو اب اس پر سوچنا ہی چھوڑ دیں" خان بہادر نے اپنا لہجہ کچھ نرم کر لیا۔ "یہ میرا برادرانہ مشورہ ہے۔ پھر آپ لوگ بھی تو مسلمان ہیں۔ کچھ اپنے ایمان ہی کا پاس کیجیے۔ اسپتال تو حکومت بھی بنوا دیتی ہے۔ مسجدیں تو وہی بنواتے ہیں جن کے دلوں میں خوفِ خدا ہوتا ہے اور اسلام کا سچا جذبہ ہوتا ہے۔"

صفدر بشیر نے کسی جھنجھلاہٹ اور ناراضگی کا اظہار کیے بغیر جواب دیا۔ "ہم کوشش کریں گے کہ آپ کی رائے پر عمل کریں۔ آپ کے ان بیش بہا مشوروں کا بہت بہت شکریہ۔ اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر اُس نے ریسیور رکھ دیا۔

کانفرنس روم میں واپس پہنچ کر اُس نے صدر سے اجازت لی اور اسکائی لارکوں کو بتایا کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں خان بہادر کی سازش ہے۔ ابھی ٹیلیفون پر جو اُس نے گفتگو کی تھی، اُس سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ پھر اُس نے خان بہادر کی دھمکی سے بھی سب کو آگاہ کیا۔ اس کی ذاتی رائے اس سلسلے میں یہ تھی کہ "فلک پیما" کو خان بہادر کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اُس کی بدمعاشی کا منہ توڑ جواب دیا جائے۔ وہ اس وقت بڑے غصّے کے عالم میں بول رہا تھا۔

کئی جوشیلے اسکائی لارکوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ ان میں سلمان بھی تھا۔ اُس نے ہاتھ بلند کر کے کہا: "اگر رات بھر میں چار دیواری کھڑی کی جا سکتی ہے تو ایک ہی رات میں اس کو مسمار کر کے برابر بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔"

نعیم اللہ جو اسکائی لارکوں میں بڑا معاملہ فہم سمجھا جاتا تھا اور مزاج کے اعتبار سے بھی بڑا غیر جذباتی قسم کا نوجوان تھا، اُس نے فوراً اُٹھ کھڑے ہو کر سلمان سے کہا: "استغفر اللہ۔ آپ مسجد شہید کریں گے؟"

نعیم اللہ کی اس بات پر سلمان کے آگ ہی تو لگ گئی۔ جھلا کر بولا: "آپ اس گھروندے کو مسجد

کہہ رہے ہیں۔ کل چند شرپسند لوگ "فلک پیا" کے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہو کر نماز پڑھنا شروع کر دیں اور دروازے پر مسجد کے نام کا کتبہ لگوا دیں، تو کیا آپ اُن کے دعوے کو تسلیم کر کے اس کوٹھی سے دست بردار ہو جائیں گے۔ اسکائی لارک نعیم اللہ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ قانون بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور اس کی خلاف ورزی جرم ہے۔ مذہب کی آڑ لے کر کسی کی ملکیت پر اس طرح قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔"

نعیم اللہ نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا۔ "لیکن اس طرح لوگوں کے مذہبی جذبات مشتعل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔"

اسی وقت ایک اور اسکائی لارک نے کہا "اس کے علاوہ نقص امن کے پیشِ نظر پولیس کا پہرہ بھی شاید لگ گیا ہے۔"

سلمان اسی طرح تیکھے لہجے میں بولا "اگر یہ تجویز پسند نہیں تو ہم اس چہار دیواری کے دروازے کے سامنے بھوک ہڑتال کریں گے۔" اس کی تائید میں کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

"یہ بالکل ٹھیک تجویز ہے۔"

"بھوک ہڑتال بڑا کارآمد حربہ ہوگا۔"

نعیم اللہ ان کے جوش و خروش کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ لیکن اُس کی حمایت میں علی احمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سلمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "دیکھئے یہ بہت نازک مسئلہ ہے۔ اس میں جذباتی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ اگر ہم نے بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم اٹھایا تو اُس کے نتائج بے حد خطرناک بھی نکل سکتے ہیں۔ مجھے آپ کے جذبات کا پورا پورا احساس ہے اور میں اس کی قدر بھی کرتا ہوں۔ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا ہے۔ یہ ہماری خودداری کو چیلنج ہے" یہ لمحہ بھر رک کر وہ بولا "اس سلسلہ میں میری تجویز یہ ہے کہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے حکومت کا تعاون حاصل کریں۔ ہمارا ایک وفد جا کر شہر کے اعلیٰ حکام سے ملے اور ان کو صورتِ حال سے آگاہ کر کے مناسب کارروائی کا مطالبہ کرے۔ اس کے علاوہ ہمیں اس بات کا بھی اندازہ لگانا چاہیئے کہ بستی کے لوگوں کا اس سلسلہ میں کیا ردِ عمل ہے۔ اُن کی ہمدردی حاصل کئے بغیر جاری

راہ میں ہزاروں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

علی احمد کا سلجھا ہوا اندازِ بیان، اُس کی شخصیت کا وقار اور صورتِ حال کا تجزیہ، ان سب باتوں نے مل کر اسکاؤٹ لارکوں کو خاصا متاثر کیا۔ ان کے چہروں پر مشتعل جذبات کے بجائے سنجیدگی چھانے لگی۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی چھا گئی۔ ہر اسکاؤٹ لارک علی احمد کی تجاویز پر غور کر رہا تھا۔ آخر جب انھوں نے اس پر اپنی رائے کا اظہار کیا تو سب اسکاؤٹ لارک علی احمد سے متفق تھے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ سلمان کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ اس قضیہ کے متعلق بستی کے لوگوں پر کیا ردِ عمل ہوا ہے۔ وہ اس مسئلہ کو کس انداز سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ذمہ داری سلمان کے سپرد اس لئے کی گئی تھی کہ اس حلقے میں "فلک پیما" کا جو اسکول تھا، وہ اُس کی نگرانی میں کام کر رہا تھا۔ دوسرے اسکاؤٹ لارکوں کی بہ نسبت بستی کے رہنے والوں سے اُس کی زیادہ شناسائی تھی۔

حسبِ معمول وہ رات کے آٹھ بجے بستی میں گیا۔ اسکول میں جا کر اُس نے کلاس کو سبق پڑھایا اور جب پڑھائی سے فراغت ہو گئی تو اُس نے سب کو روک کر کہا "مجھے آپ لوگوں سے آج کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہماری پارٹی آپ کے محلّہ میں ایک اسپتال تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لئے ہم نے زمین بھی حاصل کر لی تھی۔ آپ سب نے مل کر اُس کو حاصل کرنے میں ہماری مدد کی تھی۔ مگر اس پر کچھ لوگوں نے راتوں رات ایک گھروندا بنا کر مسجد کا نام دے دیا اور یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ اسپتال نہ بنے۔ ورنہ مسجد ہی بنانا تھی تو وہ کسی اور جگہ بھی بنائی جا سکتی تھی۔ اسپتال کی زمین پر اس طرح ناجائز قبضہ کرنے کا مقصد آپ ہی بتائیے اور کیا ہو سکتا ہے؟" اُس نے لمحہ بھر کے لئے خاموشی اختیار کر کے سب پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی اور ان سے سوال کیا "اب میں آپ لوگوں سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں آپ سب کی کیا رائے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق آپ سب سے ہے۔ اس لئے کہ یہ اسپتال آپ ہی لوگوں کے لئے تعمیر کیا جا رہا ہے۔"

فوراً ہی سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کئی آوازیں اُبھریں۔

"یہ ضرور کسی نے بدمعاشی کی ہے۔"

"یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اس میں بستی کے لوگوں کا کوئی ہاتھ نہیں۔ یہ تو باہر کے لوگوں کا کیا کرایا ہے۔"

"یہ چودھویں صدی ہے۔ ہمارے حضور نے کہا تھا کہ چودھویں صدی میں جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے۔ اب تو اللہ کے نام پر لوٹ مار ہونے لگی ہے۔ یہ لوٹ مار نہیں تو کیا ہے۔ بغیر پوچھے گچھے چوروں کی طرح مسجد بنا ڈالی۔ سالوں نے خدا کے گھر کو بھی مذاق بنا ڈالا۔"

"نہیں جی اس کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔"

"ہاں جی یہ تو بہت خراب حرکت ہے۔"

سلمان کی ان باتوں سے بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ کچھ دیر تک ان سے اسی موضوع پر گفتگو کرتا رہا۔

اسکول سے باہر آکر اس نے دیکھا کہ بستی کے چوراہے پر کئی گیس تبیاں جل رہی تھیں۔ اور اس کی تیز روشنی میں بہت سے لوگ فرش پر بچھی ہوئی دریوں پر بیٹھے تھے جلسہ غالباً ذرا ہی دیر قبل شروع ہوا تھا۔ وہ اسی طرف چل دیا۔ قریب جا کر اس نے دیکھا کہ ایک لمبی ڈاڑھی والا مولوی تقریر کر رہا تھا اس کے قریب ہی کرسی پر خان بہادر شیروانی پہنے، جناح کیپ لگائے، بڑی شان کے ساتھ اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ وہ جلسہ کی صدارت کر رہا تھا۔ سلمان کے ساتھ اس کے شاگرد بھی وہاں آگئے تھے۔ وہ سب کے ساتھ مل جل کر جلسہ میں بیٹھ گیا۔ پانچ، چھ سو آدمیوں کا اجتماع تھا۔ مولوی ان سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تو صاحب میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ بہت بڑی بات ہے۔ جی ہاں بہت بڑی بات ہے۔ ایک زندگی کیا اگر ہزار زندگیاں بھی نصیب ہوں تو خانۂ خدا کی حفاظت کے لئے قربان۔ وہ کانپور والی مسجد کا واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ کانپور کے غیور مسلمان سر سے کفن باندھ کر نکل آئے اور جام شہادت نوش کرنے والوں کا یہ عالم تھا کہ ایک گرتا تھا، دس بڑھتے تھے۔ اللہ

اللہ کیا مسلمان تھے۔ اور یہ مسجد شہید گنج کا واقعہ تو کل کی بات ہے۔ جن کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن تھی، وہ یوں سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے تھے کہ گولی چلانے والوں کے ہاتھوں میں بھی رعشہ آ جاتا تھا۔ کیا شان تھی ان مومنوں کی۔ دستِ قاتل بھی ہیبت سے لرزتا تھا۔ آج بھی کچھ لوگ آپ کے ایمان کو جھنجھوڑنا چاہتے ہیں۔ آپ کے جذبۂ ایمانی کی آزمائش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس مسجد کو شہید کرنے کے منصوبے باندھ رہے ہیں۔ اس خانۂ خدا کو نعوذ باللہ ڈھانا چاہتے ہیں، کیا آپ اس مسجد کو شہید ہو جانے دیں گے۔ کیا آپ کا ایمان اس کو گوارا کرے گا؟"

یہ کہہ کر وہ رُک گیا اور حاضرین جلسہ کی جانب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ ایک ملی رگی بہت سی ملی جُلی آوازوں کا شور اُبھرا۔

"نہیں، ہرگز نہیں"

"ہرگز نہیں، ہرگز نہیں"

سلمان نے گھبرا کر دیکھا، ان شور مچانے والوں میں اُس کے شاگرد بھی تھے، جو اُس کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ اُن کے چہرے غضبناک ہو رہے تھے اور گردن کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ مولوی پھر تقریر کرنے لگا "برادرانِ اسلام آپ کو خان بہادر فرزند علی صاحب کا ممنون ہونا چاہیے جن کی کوششوں سے یہ مسجد تعمیر ہوئی" اُس نے برابر بیٹھے ہوئے خان بہادر کی طرف اشارہ کیا۔ خان بہادر نے انکساری کا مظاہرہ کرنے کی غرض سے سر کو ذرا سا جھکا لیا۔ "باری تعالیٰ نے ان کو دولت اور عزت کے ساتھ ساتھ ایک ایمان بھرا دل بھی دیا ہے۔ اب ان ملعونوں کو دیکھیے جو ان پر طرح طرح کے الزام لگا کر بدنام کر رہے ہیں۔ اس مسجد کے شہید کرنے کے درپے ہیں۔ آپ ان کو بتا دیں کہ ہمارے دلوں میں ایمان کی حرارت ابھی باقی ہے۔ جان و مال کیا، ہم راہِ خدا میں سر بھی کٹا سکتے ہیں۔ سینوں کو گولیوں سے چھلنی کرا سکتے ہیں" حاضرین نے جوش میں آ کر نعرۂ تکبیر لگایا۔

"اللہ اکبر"

"اللہ اکبر"

ساری بستی نعروں کے شور سے گونج اٹھی۔ سلمان نے غور کیا کہ اُس کے برابر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے دہکنے لگے تھے۔ آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں اور جذبات سے اُن کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اُس نے بدحواس ہو کر سوچا کہیں جوش کے عالم میں اُس کے شاگرد ہی اُس کی مرمت نہ شروع کر دیں اُس نے خیریت اسی میں سمجھی کہ چپ چاپ جلسہ سے اٹھکر باہر آ گیا۔

جب وہ ہیڈ کوارٹر پہنچا تو بہت اُداس ہو رہا تھا۔ اُس نے صفدر بشیر کو تمام باتوں کی رپورٹ دی اور تھکا ہوا سا بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ یہ رات اُس نے بڑی بے چینی اور دُکھ میں بسر کی۔ رہ رہ کر اُس کو خیال آتا کہ جن لوگوں کی بہبود کے لئے اسکاؤٹ لارک اپنی ہر مسرت کو تج کر جفاکشی کی زندگی بسر کر رہے تھے، وہ ایک کرایہ کے مولوی کی باتوں میں آ کر کس طرح اسکاؤٹ لارکوں کے خلاف اپنی نفرت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ عجیب ستم ظریفی تھی، ناانصافی اسکاؤٹ لارکوں سے ساتھ ہوئی تھی اور وہی ملعون ٹھہرائے جا رہے تھے اور خان بہادر جس کی سازش سے یہ سب کچھ ہوا تھا اس کو خراج عقیدت پیش کیا جا رہا تھا۔ یہ سوچ کر اُس کو بستی کے لوگوں پر سخت غصہ آیا۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا: "سالے گندگی کے کیڑے ہیں، گندگی ہی میں خوش رہتے ہیں۔ اُن کی بھلائی کے لئے کچھ کرنا، خواہ مخواہ کی دردسری ہے۔" جب وہ سوچتے سوچتے اس انتہا تک پہنچ گیا تو اُس کو "فلک پیما" سراسر مسخرا پن اور اسکاؤٹ لارک احمق معلوم ہونے لگے۔

نیند آنکھوں سے اُڑ چکی تھی۔ وہ بے چینی کے عالم میں اٹھکر کمرے کے اندر ٹہلنے لگا۔ اس وقت وہ کمرے میں تنہا تھا، اُس کے ساتھ جو دوسرا اسکاؤٹ لارک رہتا تھا، وہ اپنے کسی بیمار رشتہ دار کی عیادت کے لئے گیا تھا اور اب تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ کمرے کے اندر اندھیرا تھا اور باہر گلابی جاڑوں کی شفاف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دریچے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہوا نرم اور پُرسکون تھی۔ اس میں آغاز بہار کے پھولوں کی ہلکی ہلکی مہک تھی۔ چاند ایک سہ منزلہ عمارت کی منڈیر کے پیچھے سے اُبھر رہا تھا۔ شبنم سے بھیگے ہوئے درختوں پر اُس کی گہری زرد شعاعیں جھلملا رہی تھیں۔ رات مُسکرا رہی تھی اور سلمان کا دل افسردہ تھا۔

وہ ٹکٹکی باندھے خوابناک نظروں سے جاگتی ہوئی رات کے حُسن کو دیکھتا رہا! اسی عالم میں ایکبارگی اس کو سلطانہ یاد آ گئی۔ وہ سیاہ آنکھوں والی دوشیزہ، جو اُس کے کندھے پر اپنا سر ٹکا کر رو پڑی تھی اور جس کو وہ "فلک پیما" کی طوفانی سرگرمیوں میں فراموش کر چکا تھا۔ اُس نے سوچا نہ جانے وہ اس کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی، کیا کہتی ہوگی۔ معلوم نہیں وہ کس حال میں ہے، کیسی ہے۔ پھر وہ دیر تک سلطانہ کے متعلق سوچتا رہا۔

دوسرے دن وہ دوپہر سے کچھ پہلے، نیاز کی دوکان کی جانب گیا۔ دوکان پر قفل لگا تھا۔ اُس نے قریب کے ایک چائے خانہ میں ایک پیالی گرم چائے کی پی اور ریستوراں سے نکل کر اس گلی میں داخل ہو گیا، جو نوشا کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ اُس روز وہ گلی اُس کو کچھ اجنبی سی معلوم ہوئی اور اس میں سے گذرتے ہوئے ایک نامعلوم سا خوف معلوم ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا نوشا کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ وہی نیچی نیچی صحن کی دیواریں، کھپریل کی چھت، اور کبڑے دو ن کی طرح جھکا ہوا شیشم کا پیڑ۔ ہر چیز اپنی جگہ ویسی ہی تھی۔

نوشا کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ اُس کے سامنے سے گذرتے ہوئے لمحہ بھر کو وہ ٹھٹکا مگر فوراً ہی اُس کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی اور وہ آگے چلا گیا۔ گلی میں بہت دُور تک جانے کے بعد وہ کچھ سوچ کر واپس لوٹ پڑا۔ ایک بار پھر وہ نوشا کے دروازے پر تھا اور اس بار بھی وہ خاموشی کے ساتھ وہاں سے گذر گیا۔ یہ عجیب سا خوف تھا، عجیب سی بے چینی تھی۔ اس کا دل ہر بار زور زور سے دھڑکتا اور طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگتے۔

جب وہ تھکا ہوا سا گلی سے نکل کر سڑک کی جانب مڑ رہا تھا تو اچانک نیاز سے اُس کا آمنا سامنا ہو گیا۔ سلمان نے چاہا کہ اُس کی نظر بچا کر چپکے سے گذر جائے مگر نیاز نے اُس کو دیکھ لیا۔ بڑی بے تکلفی سے مسکرا کر بولا۔

"او ہو، سلمان صاحب ہیں۔ بھئی آپ تو عید کا چاند ہو گئے، کہاں رہے اتنے دنوں؟"

سلمان سوکھا سا منہ بنا کر بولا "کچھ دنوں کے لئے گھر چلا گیا تھا۔"

"جبھی میں نے کہا کہ آپ ایکا ایکی کہاں غائب ہو گئے۔ سب خیریت تو ہے کہیں کام کاج بھی لگا؟"

"فی الحال تو تعلیم شروع کرنے کا ارادہ ہے"

وہ بڑے سرپرستانہ انداز سے کہنے لگا "چلو یہ بھی اچھا ہے۔ میں بھی ادھر بہت سے چکروں میں گھر رہا۔ کچھ تو کاروبار کا بکھیڑا تھا۔ پھر بیوی کی روز روز کی بیماری نے الگ جان عذاب میں کر دی ہے۔ اور ہاں یہ تو میں نے بتایا ہی نہیں کہ میں نے شادی کر لی ہے"

سلمان نے مسکرا کر کہا "مبارک ہو"

وہ بیزاری سے بولا "ارے بھئی کہاں کی مبارک بادی۔ کبھی فرصت سے ملاقات ہوگی تو بتاؤں گا کہ کن چکروں میں پڑا ہوں۔ آج تو میں ۴ بجے دن کی گاڑی سے کوئٹہ جا رہا ہوں"

سلمان نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ اس نے فوراً پوچھا "کب تک واپسی کا ارادہ ہے"۔

وہ بولا "جلد ہی آجاؤں گا، زیادہ سے زیادہ ہفتہ بھر رکوں گا"

سلمان نے کہا "تو پھر میں واپسی پر آپ سے ملوں گا"

وہ کہنے لگا "ضرور ملئے گا آپ سے تو ملنے کو بہت دل چاہتا ہے"

اس کے بعد نیاز گلی میں مڑ گیا اور سلمان سڑک پر چلتے ہوئے سوچنے لگا کہ نیاز اس سے ملنے کے لئے اتنا اشتیاق کیوں ظاہر کر رہا تھا۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کو سلطانہ کی ماں کی بیماری کی خبر سن کر تشویش پیدا ہو گئی۔ اس نے اسی وقت طے کیا کہ اس کو نوشا کے گھر ضرور جانا چاہیئے۔

وہ ہیڈ کوارٹر واپس پہنچ کر سلطانہ سے ملنے کا پروگرام بناتا رہا۔ رات کو وہ بستی کے اسکول گیا مگر اس روز اس نے سبق نہیں پڑھایا۔ اپنے شاگردوں کو سامنے دیکھ کر اس نے سوچا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو کل رات جلسہ میں گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگا رہے تھے۔ اور اسکائی لارکوں کو گالیاں دینے والے اس حرام خور مولوی کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ یہ سب کمینے اور ذلیل ہیں۔ ... میں ان کے لئے کیوں اپنا سر کھپاؤں۔

اس نے سردرد کا بہانہ کیا اور ذرا ہی دیر بعد اسکول سے باہر چلا گیا۔ مگر ہیڈ کوارٹر جانے کے بجائے

وہ سیدھا نوشا کے گھر کی جانب چل دیا۔ اس وقت رات کے نو بجے کا عمل تھا۔ گلی کی چہل پہل اُجڑنے لگی تھی۔ جانے کو تو وہ نوشا کے گھر پر پہنچ گیا مگر نیاز کے خوف سے دروازے پر دستک دینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ تذبذب کے عالم میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسی اثنا میں سامنے سے ایک راہگیر آتا ہوا نظر آیا۔ اُس نے سلمان کو اندھیرے میں اس طرح کھڑا دیکھ کر مشتبہ نظروں سے گھور کر دیکھا۔ آگے جا کر بھی اس نے مڑ مڑ کر دیکھا تو سلمان گھبرا گیا۔ اس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر دروازے کو کھٹکھٹایا۔

اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔

اُس نے دوبارہ دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد سلطانہ کی آواز آئی "کون ہے" وہ کہیں دور سے بول رہی تھی۔ سلمان شش و پنج میں پڑ گیا کہ کیا جواب دے۔ اُس نے ایک بار پھر دروازے کو کھٹکھٹایا۔ اس دفعہ وہ بیزاری سے بولی:

"ارے بھئی کون ہے۔ بولتے کیوں نہیں؟"

اس کے ساتھ ہی صحن میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔ قدموں کی چاپ نزدیک آتی گئی۔ سلمان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر دروازے کے بالکل قریب سے سلطانہ کی آواز آئی۔

"کون ہے؟"

اب خاموش رہنا ناممکن تھا۔ سلمان نے آہستہ سے کہا "میں ہوں سلمان"

سلطانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ گہری خاموشی چھا گئی۔ دروازے کے اس پار چوڑیوں کے کھنکنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ، دو منٹ، ۳ منٹ، خاصی دیر ہو گئی۔ نہ کوئی آواز اُبھری، نہ دروازہ کھلا۔ سلمان کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ آیا وہ ایک دفعہ پھر دروازہ کھٹکھٹائے، خاموش کھڑا انتظار کرتا رہے یا واپس چلا جائے۔ عین اس وقت جب وہ نااُمید ہو چکا تھا۔ آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھلنے کی آہٹ ہوئی اور دروازے کا ایک پٹ چرچراتا ہوا تھوڑا سا کھل گیا۔

سلمان نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کو اور کھول دیا۔ دہلیز پر ایک قدم رکھکر وہ اندر داخل ہو گیا دروازے سے لگی ہوئی سلطانہ سہمی ہوئی سی کھڑی تھی۔ سلمان نے محبت سی اس کی ٹھوڑی کو چھولیا۔ وہ پیچھے ہٹ کر سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولی۔

"اماں جاگ رہی ہیں، میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آپ آئے ہیں"

سلمان نے جلدی سے صحن کی جانب دیکھا۔ اُسے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ باورچی خانے کی دیوار سے ملحق ایک اور کمرہ بن گیا تھا اور اس وقت اس میں روشنی ہو رہی تھی۔ سلطانہ نے اسی کمرے کی طرف اشارہ کرکے دبی زبان سے کہا۔

"اماں اس کمرے میں ہیں۔ وہیں چلے جایئے"

سلمان نے پوچھا "نیاز کورٹ چلا گیا؟"

"ہاں! مگر آپ کو کس نے بتایا؟"

"وہ مجھکو آج دوپہر کے وقت ملا تھا"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی "اچھا!"

زیادہ بات چیت کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ سلمان فوراً نئے کمرے کی جانب چلا گیا۔

کمرے کے اندر جا کر اُس نے دیکھا۔ سامنے پلنگ پر سلطانہ کی ماں لیٹی تھی۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ نیالا نظر آ رہا تھا۔ اُس کا جسم بہت لاغر ہو گیا تھا۔ اس کو دیکھکر وہ خفیف آواز سے بولی۔

"بہت دن بعد آئے ہو۔ کیسے رہے؟"

وہ کمرے میں رکھی ہوئی کرسی کھسکا کر اُس پر بیٹھ گیا اور آہستہ سے جواب دیا "میں تو اچھا رہا۔ مگر آپ نے اپنی یہ کیا حالت بنالی ہے"

وہ بولی "پتہ نہیں کیا بیماری ہے۔ بس بیٹھے بٹھائے ایک بارگی دورہ پڑتا ہے"

سلمان نے پوچھا "علاج کس ڈاکٹر کا ہو رہا ہے"

وہ بولی "ڈاکٹر تو سنا ہے کہ وہ بہت اچھا ہے، مگر میری حالت روز بروز گرتی جا رہی ہے خدا معلوم اب تک کتنے انجکشن لگ چکے ہیں۔ آئے دن اور نہ معلوم کون کون سی دوائیاں آتی ہیں۔ مگر میرا حال جو کچھ ہو رہا ہے، وہ تم دیکھ ہی رہے ہو۔"

سلمان نے ایک بار غور سے اس کو دیکھا، واقعی اس کی صحت بہت گر چکی تھی۔ بات کرتے کرتے وہ بار بار ہانپنے لگتی۔ آنکھوں کے گرد گہرے حلقے پڑ گئے تھے اور اُس کو دیکھ کر یہ صاف معلوم ہوتا کہ وہ کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہے۔ سلمان نے سوچا کہ وہ "ڈاکٹر زیدی کو اپنے ہمراہ لے کر آئے گا اور اُس سے معلوم کرے گا کہ آخر یہ بیماری کیا ہے۔ اُس کی یہ حالت کیوں ہوتی جا رہی ہے۔ یہی سوچ کر اُس نے کہا "میرے ایک دوست ہیں، وہ بڑے ہوشیار ڈاکٹر ہیں۔ میں کسی دن اُن کو لے کر آؤں گا"

وہ بولی۔ ہاں کوئی یہ تو بتا دے کہ آخر یہ مرض کون سا ہے۔ یہاں تو اب تک یہی پتہ نہیں۔ ان سے کہتی ہوں کہ کسی اور ڈاکٹر کو دکھاؤ تو وہ ناراض ہوتے ہیں۔ وہ اس ڈاکٹر کو نہ جانے کیا سمجھتے ہیں۔ سچ پوچھو تو میرا تو اس پر یقین ہی نہیں رہا۔ جب اعتقاد نہ ہو تو علاج کیا فائدہ کرے گا۔" اس کے بعد وہ ایسی باتیں کرنے لگی جس سے بڑی نا امیدی ظاہر ہوتی تھی۔ سلمان نے اُس کو ڈھارس دلائی کہ وہ پریشان نہ ہو۔

یا تو سلطانہ نے اُس سے ساری باتیں بتا دی تھیں یا پھر اُس نے جان بوجھ کر اُس رات کے متعلق تذکرہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جب وہ اس سے وعدہ کر کے واپس نہیں لوٹا تھا۔ وہ اس وقت صرف اپنی بیماری کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اُس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے بہت مایوس ہوتی جا رہی ہے۔

سلمان نے حتی الوسع اُس کو تسلی دینے کی کوشش کی اور چلتے وقت اس سے وعدہ کیا کہ وہ ڈاکٹر زیدی کو لے کر بہت جلد آئے گا۔

کمرے سے نکل کر جب وہ صحن میں آیا تو اُس نے دیکھا کہ دالان کے کھمبے سے لگا ہوا کوئی اندھیرے میں کھڑا تھا۔ یہ سلطانہ تھی۔ وہ اس کو دیکھ کر بھی اپنی جگہ پر خاموش کھڑی رہی۔ سلمان کو اُس کی جانب جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ صحن میں سے گزرتا ہوا دروازے پر پہنچ گیا اور وہاں رک کر سلطانہ کا

انتظار کرنے لگا۔

سلطانہ دالان سے باہر نکلی۔ اُس نے آنگن کو عبور کیا اور سلمان کے قریب پہنچ گئی۔ لمحہ بھر کے لئے دونوں خاموش کھڑے رہے۔ پھر سلمان نے سلطانہ کے نرم نرم ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے جذباتی انداز میں بھینچ لیا۔ اور آہستہ سے بولا۔

"میں پھر آؤں گا"

اُس نے دبی زبان سے کہا "دیکھئے آیئے گا ضرور"

سلمان نے جواب دینے کے بجائے اقرار میں گردن ہلادی اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

۲

"فلک پیما" کا ایک وفد، علی احمد کی سرکردگی میں کلکٹر سے ملا۔ کلکٹر حال ہی میں تبدیل ہو کر اس شہر میں آیا تھا۔ وہ لمبے قد کا نوجوان آفیسر تھا۔ اس وقت وہ سرمئی رنگ کا سوٹ پہنے، ہونٹوں میں پائپ دبائے، بڑے وقار کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وفد کے ساتھ وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ بات چیت شروع ہوئی تو علی احمد نے 'مسجد' کا قضیہ اس کے سامنے پیش کیا۔

کلکٹر نے اس کی باتوں کو پوری توجہ کے ساتھ سنا۔ پھر اس نے پائپ پر کش لگایا اور ذرا دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ وفد کو مخاطب کر کے کہنے لگا: "اچھا ہوا کہ آپ لوگ بھی آ گئے۔ کل خان بہادر فرزند علی بھی ایک وفد کے ساتھ میرے پاس آئے تھے۔ دونوں فریقین کے بیانات میں نے سن لیے ہیں۔ میں عنقریب اس کی تحقیقات شروع کرنے والا ہوں۔"

علی احمد نے اس سے دریافت کیا۔ "کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ مسجد کے نام پر یہ تعمیر خان بہادر صاحب کے ایما پر ہوئی ہے؟"

اس نے جواب دیا: "ان کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد بستی ہی کے لوگوں نے بنائی ہے اور وہ صرف اپنے مذہبی فریضے کے تحت اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔"

علی احمد نے فوراً کہا: "میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس تعمیر سے بستی کے لوگوں کا کوئی تعلق نہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ کی اطلاع مکمل نہیں ہے۔ بستی ہی کے لوگوں کا وفد میرے پاس آیا تھا۔ ان کے اس علاقہ میں مکانات ہیں اور وہ ایک مدت سے وہاں رہائش اختیار کئے ہوئے ہیں۔"

کلکٹر آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ سلمان نے جو اسکائی لارکوں کے وفد میں شریک تھا۔ کلکٹر کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ "خان بہادر نے سراسر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ بستی کے لوگوں کو تو اس بات کا علم بھی نہیں تھا۔ یہ صرف خان بہادر کی سازش ہے۔ وہ اس طرح اسپتال کی زمین پر ناجائز قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو ان کے خلاف فوری کارروائی کرنا چاہیے۔ ورنہ مجبوراً ہم کو جوابی اقدام کرنا پڑے گا یہ تو سراسر دھاندلی ہے۔ مذہب کے نام پر ڈاکہ زنی ہے۔"

سلمان بالکل اس انداز سے بول رہا تھا، گویا وہ اسکائی لارکوں کے جلسہ میں تقریر کر رہا ہے وہ یہ بالکل بھول گیا کہ وہ شہر کے اعلیٰ حاکم کے روبرو بات کر رہا ہے۔ جو ایک سی۔ ایس۔ پی آفیسر تھا اور اپنے ان پیش رو۔ آئی سی۔ ایس افسروں کی روایات کو برقرار رکھنا چاہتا تھا، جو غیر منقسم ہندوستان میں نہتے مظاہرین پر گولیاں چلا کر اپنے انگریز آقاؤں کی خوشنودی حاصل کیا کرتے تھے ان کی حکومت کے ہاتھ مضبوط کرتے تھے۔ اور کلب میں وہسکی کا ایک جام چڑھا کر بڑے فخریہ لہجے میں کہتے تھے "آج پانچ کتے مارے گئے۔" سلمان کے لہجے کی تلخی کو علی احمد نے بھی محسوس کیا۔

کلکٹر اکبارگی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی گردن کو خم دیا اور پائپ پر کئی لمبے لمبے کش لگا کر بہت سا دھواں منہ سے اگل دیا۔ اس نے وفد کے اراکین کو تیز نظروں سے دیکھا۔ "دیکھیے آپ لوگوں نے کوئی گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی تو میں سب کو اٹھا کر بند کر دوں گا۔ اس قسم کی دھمکیاں آپ لوگ وزیروں کو دیا کریں۔ اس لئے کہ ان کو آپ لوگوں کے ووٹوں کی ضرورت پڑتی ہے۔"

سلمان کلکٹر کی باتوں پر بہت جھنجلایا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا مگر علی احمد نے اس کو بولنے کا موقعہ نہ دیا۔ اس نے فوراً کلکٹر سے کہا۔ "ہماری جانب سے دھمکی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم تو آپ کے پاس اپنی فریاد لے کر آئے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں اس قسم کی مجرمانہ حرکتوں کی سرکوبی کی جائے۔ ورنہ اسی سے نہ صرف عوام میں اسلام کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوگا، بلکہ مفسدوں کی حوصلہ افزائی ہوگی

وہ بولا ۔ "آپ مسئلہ کو جس قدر معمولی سمجھ رہے ہیں ۔ ایسا ہے نہیں ۔ یہ مسئلہ بے حد نازک ہے ۔ آپ کو علم نہیں کہ لوگوں کے مذہبی جذبات کس قدر جلد مشتعل ہو جاتے ہیں ۔ اگر ایسی کوئی خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی تو آپ لوگ بھی اُلٹا حکام ہی کو بُرا بھلا کہیں گے ۔" کلکٹر اب اونچی آواز سے بول رہا تھا ۔ اُس کے چہرے پر خشونت آ گئی تھی ۔ اُس کے بات کرنے کے انداز سے یہ حقیقت صاف جھلکتی تھی کہ اُس کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ محض اُلو کے پٹھے ہیں ۔ نہ اُن کو اپنی ذمہ داری کا کوئی احساس ہے اور نہ قانون کا کوئی احترام ہے ۔

کلکٹر نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ۔ "بہر حال میں آج ہی اس معاملہ کی تحقیقات کے لیے حکم جاری کر دوں گا ۔ یوں میں نے احتیاطاً مسجد کے دروازے پر پولیس کا پہرہ لگوا دیا ہے ۔ ضرورت پڑی تو پولیس فورس میں اور اضافہ کر دیا جائے گا ۔" یہ سیدھے سادے الفاظ میں اراکینِ وفد کو دھمکی دی گئی تھی ۔ مگر انھوں نے اس کے خلاف کوئی احتجاج نہ کیا ۔

اس کے بعد کلکٹر نے سلسلۂ گفتگو منقطع کر دیا اور ٹیلیفون کا ریسور اٹھا کر کسی سے بات کرنے کی غرض سے ڈائیل گھمانا شروع کر دیا ۔

وفد کے اراکین جب کلکٹر کے بنگلے سے باہر نکلے تو وہ دل برداشتہ سے تھے ۔ اُن کے چہرے اُترے ہوئے تھے اور قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے ۔ وہ کلکٹر کے پاس بہت سی توقعات لے کر آئے تھے اور اب ان توقعات کے جنازے کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ، ہیڈ کوارٹر کی جانب جا رہے تھے ۔

وفد کے اراکین میں ، جو اسکائی لارک ، سب سے زیادہ مضمحل معلوم ہو رہا تھا ، وہ سلمان تھا ۔ وہ اس طرح تھکا ماندا چل رہا تھا ، جیسے اس کی پشت پر منوں بوجھ لدا ہے ۔ ہیڈ کوارٹر پہنچنے کے بعد بھی اس کا یہی موڈ رہا ۔ علی احمد تو اپنی رپورٹ لکھنے چلا گیا اور سلمان اپنے کمرے کے اندر جا کر بے سُدھ سا بستر پر دراز ہو گیا ۔ اس کو کلکٹر سے زیادہ علی احمد پر تاؤ آ رہا تھا ، جس نے بڑے دعوے کے ساتھ یہ یقین دلایا تھا کہ حکومت اس معاملہ میں ضرور کچھ نہ کچھ کرے گی ۔

سلمان سہ پہر تک کمرے کے اندر لیٹا ہوا ، بڑی اوٹ پٹانگ سی باتیں سوچتا رہا ۔ اس وقت وہ

بڑا چڑچڑا اور جذباتی ہو رہا تھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ کوٹھی کے باہر اسکول سے لوٹنے والے بچوں کا ملا جلا شور ابھر رہا تھا۔ اس کو یہ شور و غل بہت برا معلوم ہوا۔ اس نے کھڑکی کے قریب جا کر سڑک پر گذرنے والے بچوں کو گھور کر دیکھا اور غصہ سے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیئے۔

شام ہونے سے کچھ دیر پہلے سلمان نے ڈاکٹر زیدی کو اپنے ہمراہ لیا اور نوشا کے گھر پہنچا۔ ابھی تک سلطانہ کی ماں کی طبیعت سنبھلی نہیں تھی۔ دو روز قبل اس کو جو دورہ پڑا تھا اس سے نقاہت بہت ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ نڈھال سی پڑی تھی۔ اور رک رک کر گہری سانس بھر رہی تھی۔ ڈاکٹر زیدی نے بڑی توجہ کے ساتھ اس کا معائنہ کیا۔ بیماری کے متعلق بہت سے سوالات پوچھے اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

نوشا کی ماں پوچھنے لگی "ڈاکٹر صاحب کوئی گھبرانے کی تو بات نہیں"

ڈاکٹر زیدی نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا "جی نہیں، آپ انشاء اللہ جلد اچھی ہو جائیں گی"

وہ بولی "مگر میری حالت تو دن بدن گرتی جا رہی ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اب بچوں گی نہیں" یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

ڈاکٹر زیدی نے اس کو تشفی دی۔ اور دیر تک ایسی باتیں کرتا رہا۔ جس سے مریضہ کو خاصی ڈھارس بندھی۔ اس نے ایک کاغذ پر چند دوائیاں لکھ دیں۔ ان کے استعمال کے متعلق ضروری ہدایات دیں اور اس کو تاکید کرتے ہوئے بولا "جس قدر جلد ہو سکے یہ دوائیاں استعمال کرنا شروع کر دیجیے"

وہ دبی زبان سے بولی "مگر اس کے لئے اپنے ڈاکٹر صاحب سے بھی تو پوچھنا پڑے گا"

ڈاکٹر زیدی اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ پڑ گیا۔ وہ جواب دینے کے بجائے کچھ سوچنے لگا۔ نوشا کی ماں نے اس کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا"

ڈاکٹر زیدی ذرا دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا "میرا خیال ہے کہ آپ ڈاکٹر خیرات محمد کا علاج

فوراً بند کر دیں۔ ورنہ آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

نوشا کی ماں اور سلمان دونوں حیرت زدہ ہو کر ڈاکٹر زیدی کو دیکھنے لگے۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی چھا گئی۔ لیمپ کی لو ہوا کے ایک تیز جھونکے سے زور سے بھڑکی، دیواروں پر پھیلی ہوئی پرچھائیاں جھومنے لگیں۔ کمرے کی فضا ایک بارگی بڑی آسیب زدہ نظر آنے لگی۔ مریضہ کا چہرہ گہرا اندو پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں کے اندر بے حس پڑی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور وہ کسی لاش کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔

آخر اس ہیبت ناک سناٹے میں ڈاکٹر زیدی کی آواز ابھری "مسٹر سلمان اب مجھے چلنا چاہیئے۔"

اس کی بات سنتے ہی سلمان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نوشا کی ماں نے سلمان سے کہا "تم ابھی لوٹ کر واپس آؤ گے؟"

سلمان کے پاس اب وقت بہت کم تھا۔ اس کو بستی کے اسکول میں پڑھانے کے لئے جانا تھا، لہٰذا اس نے جواب دیا۔ "نہیں، اس وقت تو میں واپس نہیں آؤں گا۔ مجھکو ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

وہ کہنے لگی۔ "کل تو آؤ گے؟"

سلمان نے فوراً کہا۔ "جی ہاں، کل دوپہر کو آؤں گا۔"

سلطانہ کی ماں اصرار کرنے لگی۔ "دیکھو آنا ضرور"

"نہیں، نہیں، میں ضرور آؤں گا"

اس کے بعد دونوں کمرے سے نکل کر باہر صحن میں آ گئے۔ آگے آگے ڈاکٹر زیدی تھا۔ سلمان اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ کمرے سے نکلتے ہی اس نے چاروں طرف تجسس انگیز نظروں سے دیکھا۔ سلطانہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ سلطانہ نے بڑی معصومیت کے ساتھ اپنا داہنا ہاتھ اٹھا کر ماتھے پر رکھ لیا۔ سلمان مسکرا دیا۔

دونوں گھر سے نکل کر باہر گلی میں آ گئے۔ ڈاکٹر زیدی کچھ دور تک اندھیری گلی کے اندر خاموش

چلتا رہا۔ اچانک اس کی بھاری آواز اُبھری۔ وہ سلمان سے کہہ رہا تھا۔

"مجھکو تعجب ہے کہ مریضہ اب تک زندہ کیوں ہے اس کو تو بہت پہلے ہی مرجانا چاہیئے تھا۔"

سلمان نے پوچھا "مگر یہ بیماری کیا ہے؟"

ڈاکٹر نے اُس کی بات کا تو کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس سے ایک بڑا بے تکا سا سوال کیا "تم یہ بتا سکتے ہو کہ شوہر کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ دونوں کے تعلقات خوش گوار ہیں۔ ابھی چند ہی ماہ ہوئے تو ان کی شادی ہوئی ہے"

ڈاکٹر زیدی نے پلٹ کر اس کو تیکھی نظروں سے دیکھا "تو یہ ان کی دوسری شادی ہے۔ ان کے شوہر کی عمر کیا ہوگی؟" سلمان نے ذرا سا توقف کیا اور پھر بتانے لگا "دیکھنے میں تو وہ خاصا جوان معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُس کی عمر بھی کم ہی ہوگی"

"مریضہ کی کچھ جائداد بھی ہے؟"

"نہیں"

ڈاکٹر ذرا دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا "تب تو مجھے اپنی رائے بدلنا پڑیگی" لمحہ بھر رُک کر وہ بولا "یہ ڈاکٹر خیرات محمد اس قدر بدنام ہوگیا ہے کہ اس کا نام سنتے ہی خواہ مخواہ شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ دراصل وہ مریضہ کی بیماری کی تشخیص نہیں کر سکا اور الٹے سیدھے انجکشن دینا شروع کر دیئے۔ ان عطائی ڈاکٹروں کے علاج میں ہمیشہ جان کا خطرہ رہتا ہے۔"

سلمان اُس کی بات سُن کر بولا "معلوم ہوتا ہے۔ پہلے آپ کوئی خطرناک بات سوچ رہے تھے"

ڈاکٹر زیدی مسکرانے لگا "تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ میں نے کچھ ایسی ہی بات سوچی تھی۔ بات یہ ہے کہ میں آٹھ سال تک پولیس اسپتال میں سرجن رہا ہوں۔ اس لئے کرمنالوجی (علم جرائم) سے میرا بہت عرصہ تک تعلق رہا ہے"

سلمان نے اصرار کر کے پوچھا "مگر یہ تو بتایئے آخر یہ مرض ہے کیا؟"

ڈاکٹر کہنے لگا "مریضہ کے دل کی حرکت ہر ۱۳ دھڑکنوں کے دوران ایک بار رک جاتی ہے"
سلمان خوف زدہ ہو کر سوچنے لگا کہ یہ تو بہت خطرناک بیماری ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر زیدی پولیس اسپتال کے تجربات بتانے لگا۔ اُس نے سلمان کو ایک بوڑھے کرنل کا کیس سنایا۔ جس کے جسم میں انجکشن کے ذریعہ ایک پاگل کتے کا خون داخل کیا گیا تھا۔ جس سے وہ دیوانہ ہو گیا اور ایک روز دیوانگی کے عالم میں اُس نے ریوالور سے خود کو ہلاک کر کے خودکشی کر لی تھی۔ اس واقعہ کی تفصیلات بڑی ہیبت ناک تھیں۔ سلمان بار بار حیرت زدہ نظروں سے ڈاکٹر زیدی کو دیکھتا، جس کا سر گنجا تھا اور آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

دونوں اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ہیڈ کوارٹر پر زیادہ دیر ٹھہرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ فوراً بستی کے اسکول کی جانب چل دیا۔

اُس روز بھی وہ جلد ہی پڑھا کر ہیڈ کوارٹر پر واپس آ گیا۔ ان دنوں وہ اپنے کام میں بہت کم دلچسپی لے رہا تھا۔ "فلک پیما" کی سرگرمیوں کی جانب سے اُس نے بے نیازی برتنا شروع کر دی تھی۔ اب وہ سلطانہ اور اُس کے گھر کے متعلق زیادہ سوچا کرتا۔

کئی روز بعد وہ نوشا کے گھر کی طرف گیا۔ سڑک طے کر کے جیسے ہی وہ اس گلی میں داخل ہوا، جو نوشا کے گھر کی جانب جاتی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ نیاز سامنے سے آ رہا تھا۔ وہ فوراً واپس لوٹ پڑا۔ اب نوشا کے گھر جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اُس کو معلوم ہوا کہ اسکاؤٹ لڑکوں کا ایک وفد کلکٹر سے ملنے گیا ہے۔ اس کے بعد وہ اکثر ایسی اطلاعات سنتا رہا۔ وفد کی حکام سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ پولیس تحقیقات کرتی رہی۔ اس عرصہ میں خان بہادر نے مسجد کی تعمیر کا کام باقاعدگی کے ساتھ شروع کر دیا۔ پُرانی چہار دیواری گرا کر نئی دیواریں تعمیر کی گئیں۔ بڑے بڑے ستون کھڑے کیے گئے۔ اُن پر اونچی اونچی محرابیں بنائی گئیں۔ کام اس قدر تیزی سے شروع ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک شاندار عمارت اُبھر کر سامنے آنے لگی اور حکام

یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کیا کارروائی کی جائے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا کہ مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ اُس کے فلک بوس مینار تھے جس پر چڑھ کر صبح صادق کے دھندلکے میں، جب خوش الحان موذن فجر کی اذان دیتا تو سننے والوں پر وجد طاری ہو جاتا۔ مسجد کی تعمیر کچھ اس طرح کی گئی تھی کہ سڑک کی جانب اُس کا جو حصہ تھا اُس میں ۲۰ دوکانیں نکالی گئیں۔ چونکہ مسجد کی تعمیر میں چندہ کی رقم کے علاوہ بھی اخراجات کی ضرورت تھی، اس لئے خان بہادر نے ہر دوکان کا دس دس ہزار روپیہ نذرانہ وصول کیا۔ مسجد کے انتظامات کے لئے خان بہادر نے ایک ٹرسٹ بھی قائم کر دیا تھا، جس کا وہ خود چیئرمین تھا اور پانچ ٹرسٹیوں میں اُس کے تین بھتیجوں اور ایک داماد کے علاوہ، گھر کا ایک پُرانا خانساماں بھی شامل تھا۔ اس لئے کہ اُس سے زیادہ اور کوئی معتبر آدمی اُس کی نظر میں اس وقت نہیں تھا۔

دوکانیں سڑک کے رخ پر تھیں اور بڑے موقعہ سے تھیں، لہٰذا مسجد کی تعمیر سے پہلے ہی ضرورت مندوں نے پیشگی رقم دے کر اُن کو حاصل کر لیا تھا۔ خان بہادر ہر شام کو اپنی گہری سبز رنگ کی جھلکتی ہوئی کار میں بیٹھ کر تعمیر کا کام دیکھنے آتا۔ ٹھیکیدار سے گفتگو کرتا، معماروں کو ضروری ہدایتیں دیتا اور خراماں خراماں کار تک واپس جاتا، ٹھیکیدار دوڑ کر کار کا دروازہ کھولتا، خان بہادر اندر بیٹھ کر سر کے خفیف سے اشارے سے معماروں اور ٹھیکیدار کے سلاموں کا جواب دیتا اور کار روانہ ہو جاتی۔

اسکاؤٹ لڑکوں میں پہلے پہل تو بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ مگر جوں جوں مسجد کی تعمیر مکمل ہوتی گئی ان کے حوصلے پست ہوتے گئے۔ اُن میں جھنجھلاہٹ اور شکست خوردگی کا احساس پیدا ہونے لگا۔ وہ اکثر اپنے محاذ سے غائب رہنے اور چائے خانوں میں بیٹھے گھنٹوں فضول باتیں کیا کرتے۔ اس زمانے میں "فلک پیما" کے تین جلسے ایسے ہوئے جس میں کورم پورا نہ ہو سکا۔ صدر کو بغیر کسی کارروائی کے مجبوراً جلسہ ختم کرنا پڑا۔ انجمن کے لئے یہ بڑا نازک دور تھا۔ کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اب "فلک پیما" کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

اس موقعہ پر علی احمد نے بڑی جرأت اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ اُس نے فوراً اسٹیڈی سرکل قائم کیا۔ جس میں وہ زندگی کے بنیادی مسائل پر بحث کرتا، اُن کا حل بتاتا، اسکائی لارکوں کے کام کی اہمیت اور اُن کے نصب العین کی عظمت پر روشنی ڈالتا۔ ہر رات ۱۰ بجے، جب تمام اسکائی لارک اپنے اپنے محاذ سے واپس لوٹ آتے، تو کانفرنس روم میں، اسٹیڈی سرکل کا کلاس شروع ہوتا۔ ان میں زیادہ تر علی احمد لکچر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ صفدر، بشیر اور نعیم اللہ بھی مختلف موضوعات پر بولتے۔ پھر ان پر مباحثہ شروع ہوتا۔ ہر اسکائی لارک اپنی بساط کے مطابق اظہارِ خیال کرتا۔ اپنی ذہنی کج روی کی اصلاح کرتا اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتا۔

ابتدا میں تو اسکائی لارک اسٹیڈی سرکل میں بے دلی کے ساتھ شریک ہوتے، مباحثہ میں حصہ لینے سے کتراتے اور خاموش بیٹھے سگرٹ کے کش لگایا کرتے۔ مگر یہ بے تعلقی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی۔ ان میں مطالعہ کا ذوق پیدا ہونے لگا۔ اب وہ چائے خانوں میں اپنا وقت برباد کرنے کے بجائے لائبریری میں نظر آتے۔ علی احمد جن کتابوں کو تجویز کرتا، ان کو پوری توجہ کے ساتھ پڑھتے۔ ان سے نوٹ لیتے اور رات کو اسٹیڈی سرکل میں شریک ہوتے تو بڑھ چڑھ کر بولتے۔

سلمان، جس کا لہجہ "فلک پیما" کے جلسوں میں ہمیشہ جارحانہ ہوتا تھا، اب اس کے انداز میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر بات کرتا اور اپنی بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتا۔ وہ اکثر رات گئے تک جاگتا نظر آتا۔ اُس کی گردن میز پر جھکی ہوتی۔ سامنے کوئی کتاب ہوتی اور ٹیبل لیمپ کے شیڈ سے پھوٹتی ہوئی ہلکی ہلکی دودھیا روشنی میں، اُس کے چہرے کے نقوش بڑے ٹھوس نظر آتے۔

اسٹیڈی سرکل قائم ہونے کے چند ہی ہفتوں بعد فضا بدلنے لگی۔ اسکائی لارکوں میں شکست خوردگی اور بے حسی زائل ہونے لگی، علی احمد کے لکچروں نے ان میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اب پھر وہ "فلک پیما" کی سرگرمیوں میں دلچسپی کا اظہار کرنے لگے تھے۔ مگر علی احمد ہنوز مطمئن نہیں تھا۔ اُس نے اسکائی لارکوں کی بنیادی کمزوری کا سراغ نکال لیا تھا۔ چنانچہ جب "فلک پیما"

کا ماہانہ اجلاس ہوا تو علی احمد نے یہ تجویز پیش کی کہ اسکائی لارکوں کا ہیڈ کوارٹر صفدر بشیر کی کوٹھی سے منتقل کر کے کسی بستی میں بنایا جائے۔

علی احمد نے جس وقت یہ تجویز پیش کی تو اجلاس میں ایک بارگی سناٹا چھا گیا۔ ہر اسکائی لارک دم بخود رہ گیا۔ یہ جاڑوں کی رات تھی۔ باہر تیز برفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اسکائی لارک گرم کمرے کے اندر بیٹھے تھے۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ دیوارگیریوں سے گہری نارنجی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہیٹر پر سماوار رکھا تھا، جس سے قہوے کی ہلکی ہلکی مہکتی ہوئی بھاپ نکل رہی تھی۔ کمرے کے اس رومانٹک ماحول میں اسکائی لارک گرم لباسوں میں ملبوس، سگرٹوں کے کش لگا رہے تھے۔ ان کو علی احمد کی تجویز بڑی عجیب سی معلوم ہوئی۔ کئی اسکائی لارکوں نے اس تجویز کی شدت کے ساتھ مخالفت کی۔

علی احمد نے ان کے اعتراضات کو خاموشی کے ساتھ سنا۔ جب تجویز کی مخالفت میں بولنے والا ہر اسکائی لارک اپنی بات کہہ چکا، تو اس نے کھڑے ہو کر بڑے نرم اور سنجیدہ لہجے میں اپنی تجویز کی وضاحت کی اور ان کے اعتراضات کا جواب دیا۔ اس نے اسکائی لارکوں کو سمجھایا کہ انجمن کی جانب سے اراکین میں جو بے نیازی پیدا ہو رہی ہے اور ان میں شکست خوردگی کا جو احساس پایا جاتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ نہیں ہے کہ اسکائی لارکوں کو اسپتال کی زمین کے سلسلہ میں ناکامی ہوئی۔ ایسی ناکامیوں سے تو ان کا آئندہ سابقہ پڑتا رہے گا اور وہ ہر بار نئے عزائم کے ساتھ ان کے لئے جدوجہد کریں گے۔ اس شکست خوردگی کے احساس کی اصل وجہ کوٹھی کا رہن سہن ہے۔ جب تک اسکائی لارک عام لوگوں کے ساتھ مل جل کر نہیں رہیں گے، نہ وہ ان کے مسائل کو سمجھ سکیں گے، نہ ان کی نفسیات کو اور نہ اپنے کام کی اہمیت کو۔

علی احمد آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ اس نے اپنے لہجہ پر زور دیتے ہوئے کہا، "انجنیر بننے کے لئے مشین کے کل پرزوں سے اور ڈاکٹر بننے کے لئے انسانی جسم کی ساخت اور ہر عضو کی بناوٹ سے پوری طرح آگاہ ہونا ضروری ہے۔ جب ایک انجنیر بگڑی ہوئی مشین کو درست کرتا ہے۔ جب ایک ڈاکٹر

مریض کو موت کے منہ سے بچاتا ہے، تو اس کی خوشی میں ایک مقدس جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اسکائی لارکوں کا کام اور بھی زیادہ اہم ہے۔ وہ انسانوں سے گمراہی اور پریشاں حالی دُور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کو بہتر انسان بنانے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کی کامیابی ایک عظیم جذبہ ہے، اُن کی مسرت فرشتوں سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ آپ ان پیشہ ور سیاست دانوں کی مثال اپنے سامنے نہ رکھیے جو زندگی کو دُوربین سے دیکھتے ہیں۔ عام لوگوں کے مسائل کا اندازہ، اخبارات کی من گھڑت خبروں سے کرتے ہیں۔ ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر سیاست پر بات چیت کرتے ہیں۔ جلسوں میں جا کر زندہ باد کے نعرے لگواتے ہیں۔ جو لیڈر بننا چاہتے ہیں، شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اقتدار اور دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اسکائی لارکوں کی راہ ان سے مختلف ہے۔ یہ انسانی ترقی اور ارتقا کا راستہ ہے۔ جس نے وحشی انسان کو غاروں سے نکال کر ایٹمی عہد میں لا کر کھڑا کر دیا۔ کل تک وہ عناصر قدرت کے سامنے ایک حقیر کیڑا تھا۔ آج وہ عناصر قدرت کو تسخیر کرتا جا رہا ہے۔"

علی احمد لمحہ بھر کے لئے رُکا۔ پھر اُس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیڈری تو دولت سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور دولت کمانے کے نسخے تلاش کرنے کے لئے بازار سے 'دولت کماؤ اور لکھ پتی بن جاؤ' کتاب خریدنے کی بھی ضرورت نہیں، خان بہادر فرزند علی سے رجوع کیجئے۔ وہ اچھا خاصا دولت پیدا کرنے کا چلتا پھرتا نسخہ ہیں۔" اس بات پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور کانفرنس روم دیر تک اس سے گونجتا رہا۔

سلمان نے بلند آواز سے کہا "وہ تو کفن کھسوٹ ہے"

علی احمد نے کہا "شائی لارک بھی بُرا خطاب نہیں ہے"

صفدر بشیر مسکرا کر بولا "کیا آپ خان بہادری کو چھوٹا خطاب سمجھتے ہیں"

ایک بار پھر قہقہہ پڑا۔

علی احمد خاموش کھڑا زیر لب مسکراتا رہا۔ جب جلسے میں خاموشی ہو گئی تو اُس نے پھر اپنی تقریر شروع کی "میرا اس بات سے یہ مطلب تھا کہ اسکائی لارک پیشہ ور لیڈر بننے کے بجائے اس دہقان

کی زندگی کو اپنائیں، جو مٹی سونگھ کر یہ بتا سکتا ہے کہ زمین کیسی ہے۔ جو بنجر زمین کو زرخیز اور چٹیل میدانوں کو لہلہاتی ہوئی کھیتوں میں بدل دیتا ہے۔ جو زمین کا سینہ چیر کر خوشۂ گندم پیدا کرتا ہے۔

علی احمد دیر تک تقریر کرتا رہا۔ اپنی تجویز کی حمایت میں اُس نے بڑی ٹھوس دلیلیں پیش کیں۔ آخر اس کی تجویز کو منظور کر لیا گیا اور اسی وقت اس کو عملی جامہ پہنانے کے واسطے ایک منصوبہ تیار کیا گیا۔

صفدر بشیر نے دوڑ دھوپ کر کے ہفتہ بھر کے اندر اندر گمٹی میں تھوڑی سی زمین الاٹ کرائی۔ یہ بہت بڑی بستی تھی اور ایک بنجر پہاڑی کے دامن میں آباد تھی۔ یہاں زیادہ تر فیکٹریوں میں کام کرنے والے قلیوں کی آبادی تھی۔ ان کے علاوہ گوالوں کے کچھ خاندان بھی آباد تھے۔ گمٹی میں "فلک پیما" کا اسکول قائم تھا اور بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا جب شہر میں ملیریا کی وبا پھیلی تھی تو اسکاؤٹ لارکوں نے اپنا پہلا کیمپ بھی یہیں لگایا تھا۔

نیا ہیڈ کوارٹر قائم کرنے کے منصوبے پر برابر کام ہوتا رہا۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب تمام اسکاؤٹ لارک سویرے ہی سویرے اپنے پلاٹ پر پہنچ گئے۔ وہ خاکی نیکریں اور خاکی قمیصیں پہنے ہوئے تھے۔ انھوں نے کھریا مٹی سے عمارت کی بنیاد کے نشان زمین پر ڈالے۔ کدالیں اٹھائیں اور بنیاد کھودنا شروع کر دی۔

بستی کے لوگوں کے لئے جلد ہی وہ تماشہ بن گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے چاروں طرف ہجوم لگ گیا۔ اس ہجوم میں بچے بھی تھے، جوان بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ عورتیں دروازوں سے جھانک جھانک کر ان کو حیرت سے دیکھتیں۔

چند ہی روز میں انھوں نے عمارت کی بنیاد کھود ڈالی اور دیواریں کھڑی کرنا شروع کر دیں، وہ بڑی تن دہی کے ساتھ، اِدھر اُدھر بھاگتے پھرتے، کوئی اینٹیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لا رہا ہے۔ کوئی گارا بنا رہا ہے۔ کوئی پاڑھ پر چڑھا ہوا زور زور سے آوازیں دے رہا ہے کوئی دیوار چن رہا ہے اس عالم میں واقعی وہ عجیب سے لگتے۔ ان کے بال بکھرے ہوتے، چہروں پر خاک جمی ہوتی اور آواز میں بے ترتیبی

ہوتی خاص طور پر دوپہر کے وقت جب وہ سب کے سب پسینے میں ڈوبے ہوئے زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے پھر ماس سے پانی نکال کر پیتے اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سگریٹیں سلگا کر لمبے لمبے کش لگاتے۔ اس وقت وہ بڑی بے تکلفی سے موڈ میں ہوتے تھے۔ بات بات پر قہقہے لگاتے ایک دوسرے کے کام پر تبصرہ کرتے اور جب زیادہ تھک جاتے تو کسی دیوار کے سائے میں لیٹ کر آنکھیں بند کئے خاموش پڑے رہتے۔

جب انھوں نے عمارت تعمیر کرنے کا کام شروع کیا تھا اس وقت اُن کو کام کرنا بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ وہ کمر دہری کرکے جھکا کر چلتے اور شرمائے شرمائے سے رہتے مگر اب وہ جھجک جاتی رہی تھی۔ وہ سینہ تان کر مشقت کرتے اور لاابالی پن سے ایک دوسرے کو چھیڑتے۔ ان کو کام میں اب ایک خاص مسرت محسوس ہوتی، ایسی مسرت جس کی لذت سے وہ ابتک ناآشنا تھے۔

اسکاؤٹ لڑکوں نے اس قدر تن دہی اور جاں فشانی سے عمارت تعمیر کرنے کا کام شروع کیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک عمارت زمین کے سینے سے گردن ابھار کر سامنے آ گئی۔ اس میں آٹھ کمرے تھے۔ ایک میں "فلک پیما" کا دفتر قائم کیا گیا۔ ایک کمرے کو جو سب سے زیادہ کشادہ تھا لائبریری اور جلسوں کے لئے وقف کر دیا گیا۔ پانچ کمرے اسکاؤٹ لڑکوں کی رہائش کے لئے تھے اور دو کمروں میں ڈاکٹر زیدی نے ایک معمولی سی ڈسپنسری کھول دی۔

ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے مکمل ہوتے ہی، تمام اسکاؤٹ لڑکے اس میں منتقل ہو گئے۔ یہ زندگی بڑی سادہ اور سیدھی سادھی تھی۔ وہ سویرے اٹھ کر بستر درست کرتے، کمرے صاف کرتے، چائے بناتے، کپڑے دھوتے۔ غرضکہ اپنا ہر کام وہ خود ہی کرتے تھے۔ "فلک پیما" کے کام کے علاوہ ان کا بیشتر وقت لائبریری میں گذرتا۔ علی احمد اور صفدر بشیر روزانہ اسٹڈی سرکل میں ان کے کلاس لیتے۔ مہینہ میں ایک دن انھوں نے چھٹی کا رکھا تھا۔ اس روز وہ شہر سے کہیں دُور نکل جاتے اور کسی پُرفضا مقام پر پکنک مناتے۔

بستی کے اندر رہائش اختیار کرنے سے اسکاؤٹ لڑکوں کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔

ان کو اس علاقے میں آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ اسکائی لارک اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگا کہ ان کے چاروں طرف غلاظت ہی غلاظت ہے۔ گندہ پانی کی نکاسی کے لئے گلی میں نالیوں کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں تھا۔ گھروں کے پاس گڑھے کھدے ہوئے تھے جن میں بھرا ہوا گندہ پانی سڑا کرتا۔ گلی کوچوں میں ہر طرف کوڑا کرکٹ بکھرا رہتا۔ رات ہوتی تو بستی پر گہرا اندھیرا چھا جاتا۔ روشنی کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ راہگیر رات کے وقت راستوں پر ٹھوکریں کھاتے، کیچڑ پر پھسل کر گر پڑتے۔ قدم قدم پر گندے پانی کے گڑھے میں گرنے کا خطرہ رہتا تھا۔

گو کہ یہ علاقہ میونسپلٹی کی حدود میں تھا مگر اس نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ "فلک پیما" کے ایک اجلاس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور یہ طے کیا گیا کہ اسکائی لارکوں کا ایک وفد ڈاکٹر زیدی کی رہنمائی میں میونسپلٹی کے متعلقہ افسروں سے ملے اور ان کو صورت حال سے آگاہ کرے۔

چند روز بعد "فلک پیما" کا وفد میونسپلٹی کے چیئرمین سے ملا۔ اس نے ان کے مطالبات سن کر کہا کہ شہر کی نواحی بستیوں کے لئے میونسپلٹی نے ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔ بورڈ کے آئندہ اجلاس میں وہ اس منصوبے کو منظور کرانے کی کوشش کرے گا۔ اس نے وفد کو یقین دلایا کہ منصوبے کی منظوری ملتے ہی نواحی بستیوں میں تعمیرات کا کام تیزی سے شروع کر دیا جائے گا۔

ڈاکٹر زیدی نے واپس آکر مجلس عاملہ کو اپنی رپورٹ دے دی۔

ہفتہ بھر بعد میونسپل بورڈ کا اجلاس ہوا مگر نواحی بستیوں کے ترقیاتی منصوبے کو پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آسکی۔ اجلاس میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور صورت حال اس قدر نازک ہو گئی کہ سکریٹری کو ٹیلیفون کرکے پولیس کی امداد حاصل کرنا پڑی اور چیئرمین کو اجلاس برخاست کرکے میز کے نیچے روپوش ہونا پڑا۔

اس ہنگامہ کی ابتدا اختلافات سے شروع ہوئی۔ پھر گالم گلوچ ہونے لگی۔ ممبروں نے ایک دوسرے کی ماں اور بہنوں کے پراسرار معاملوں کی تعریف میں زور بیان صرف کرنا شروع کر دیا۔ جس نے آگے چل کر ہاتھا پائی کی صورت اختیار کر لی۔ جوتے چلے، ارکان درندوں کی طرح

اڑنے لگے۔ گریبان چاک ہوگئے۔ بال پریشان ہوگئے اور ہر ممبر قیس عامری کے میک اپ میں اسٹیج کا ایکٹر نظر آنے لگا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ چند دوکانوں کے الاٹمنٹ کا قضیہ تھا، جو ڈپٹی چیئرمین نے اپنے بھائی کے نام الاٹ کرادی تھیں۔ اس بات پر ایک دوسرے کی عقدہ کشائیاں ہونے لگیں۔ کسی ممبر پر ٹھیکیداروں سے رشوت لینے کا الزام تھا۔ کسی نے گرلس اسکول کی استانیوں کی عصمتیں آندھی کے آموں کی طرح لوٹی تھیں۔ کسی نے بعض محکموں میں اپنے تمام سسرالی عزیزوں کو ملازمتیں دلوا کر ان محکموں کو اپنی سسرال بنا دیا تھا۔ غرضکہ اس حمام میں سب ننگے تھے۔

"فلک پیما" نے کچھ عرصہ تو چیئرمین کے وعدوں پر اعتماد کرکے انتظار کیا مگر جب اسکائی لڑکوں کو یہ معلوم ہوا کہ نواحی بستیوں کے ترقیاتی منصوبے کو تیار ہوئے تین سال سے زائد ہو چکے ہیں اور آج تک بورڈ کے کسی اجلاس میں اس کو پیش کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تو اس سلسلہ میں "فلک پیما" کا ایک خاص جلسہ بلایا گیا اور اس میں متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ اس کام کو اسکائی لڑکے خود ہی انجام دیں گے۔ اس مقصد کے لئے "ہفتہ صفائی" منانے کا پروگرام مرتب کیا گیا۔

صفائی کا ہفتہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا! اسکائی لڑکوں نے بستی کے کئی درجن نوجوانوں کو رضاکار کی حیثیت سے اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ مختلف اسکائی لڑکوں کی سرکردگی میں کئی گروپ بنا کر کام شروع کیا گیا۔

ہفتہ بھر کے اندر اندر بستی کا حلیہ تبدیل ہوگیا۔ بستی بھر میں نالیاں کھود کر ان کو بڑے نالے سے ملایا گیا۔ گڑھے پاٹ دیئے گئے۔ گلیاں صاف کرکے جگہ جگہ کوڑا رکھنے کے لئے بڑے بڑے ٹین کے ڈرم رکھ دیئے گئے۔ چار لالٹینیں خرید کر بستی کے مختلف نکڑوں پر لگا دی گئیں۔ جن کو روزانہ روشن کرنے اور کیروسین آئل سپلائی کرنے کا بندوبست ایک اسکائی لڑکے کے سپرد کیا گیا۔ (یہ ڈیوٹی ہر مہینے کے بعد بدلتی رہی)۔ بستی کے قریب جو خالی میدان پڑا تھا، اس کو صاف کرکے بچوں کے کھیل کود کے لئے ایک معمولی سے پارک کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ جن مکانوں

کی دیواریں اور چھتیں شکستہ ہو گئی تھیں، اُن کی سب نے مل کر مرمت کی۔ روزانہ رات کو ہفتہ بھر تک حفظانِ صحت کے موضوع پر تقریریں کی گئیں۔

ہفتہ صفائی توقعات سے زیادہ کامیاب رہا۔ بستی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے الف لیلائی داستانوں کے کسی جن نے راتوں رات پُرانی بستی کی غلاظت کھرچ کر ایک نئی بستی بنا دی تھی۔ اب گلیاں صاف ستھری نظر آتیں اور رات کے وقت لالٹینوں کی روشنی در و دیوار پر جھلکتی۔ اسکاؤٹ لڑکے اپنی اس کامیابی پر بے حد مسرور تھے۔ ان میں کام کرنے کا جذبہ اور تیز ہو گیا تھا۔

۳

نیاز، جس کام سے کوئٹہ گیا تھا، وہ کام بنا نہیں۔ لہذا اس کو جلد ہی واپس لوٹنا پڑا۔ ان دنوں اُس کا مزاج کچھ چڑچڑا ہو رہا تھا۔ بات بات پر گالیاں بکنے لگتا۔ کوئی بات اُس کی مرضی کے خلاف ہوتی تو باؤلے کتے کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ گھر میں رہتا تو بستر پر گھنٹوں خاموش پڑا رہتا یا پھر دالان میں ٹہلتا رہتا۔ اس وقت وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آتا۔ گردن جھکی ہوتی اور دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوتے۔

کوئٹہ سے واپس آنے کے بعد سے اس میں یہ تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ حالانکہ جب وہ کوئٹہ گیا تھا تو بڑا ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ واپس آیا تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ خلافِ معمول وہ اس دفعہ خالی ہاتھ گھر آیا تھا۔ ورنہ وہ ہمیشہ سوغاتوں سے لدا پھندا گھر کے اندر داخل ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئٹہ میں اس کے ساتھ کوئی سنگین واقعہ پیش آیا تھا۔ ایک آدھ بار بیوی نے اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی تو اُس نے بڑے روکھے پن سے جواب دیا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے۔ رات کا وقت تھا اور نیاز کچھ ہی دیر قبل دوکان سے گھر واپس آیا تھا۔ وہ بستر پر چپ چاپ لیٹا ہوا چھت کو تک رہا تھا۔ پاس ہی تخت پر بیوی بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی تھی۔ اس روز اُس کی طبیعت ذرا سنبھلی ہوئی تھی۔ دوپہر کو اُس نے غسل بھی کیا تھا اور اس وقت خوب بنی ٹھنی بیٹھی تھی۔ اُس کے جسم سے عطر کی تیز خوشبو نکل رہی تھی۔ جب کبھی وہ پہلو

بدلتی تو ریشمی لباس کی سرسراہٹیں ابھرتیں۔ لیمپ کچھ اس رُخ سے رکھا تھا کہ پوری روشنی اُس کے چہرے پر نہیں پڑ رہی تھی۔ روشنی اور سایوں کے اس امتزاج میں اُس کے رخساروں کی زردی دھندلی پڑ گئی تھی اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں کے نشانات مٹ گئے تھے۔

کمرے کے اندر انگیٹھی سُلگ رہی تھی۔ دہکتے ہوئے انگاروں کی سُرخ روشنی دیواروں پر پھیلی ہوئی تھی۔ کمرہ خوب گرم ہو رہا تھا۔ باہر دسمبر کی سرد ٹھٹھری ہوئی راتوں کا مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شیشم کے پتے ہوا سے رُک رُک کر کھڑکھڑاتے۔ پُراسرار آہٹیں ابھرتیں اور پھر گہری خاموشی چھا جاتی۔ بیوی نے اونی شال کو سینے کے نیچے ڈھلکا کر اپنا ہاتھ باہر نکالا اور نیاز کا بازو جھنجھوڑ کر بولی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

نیاز نے مڑ کر اُس کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ بیوی ایک خاص ادا کے ساتھ مسکرائی مگر نیاز اُس کی جانب توجہ دیئے بغیر بیزاری سے بولا "کبھی اس وقت مجھے پریشان نہ کرو۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

بیوی کے دل پر گہرا چرکا لگا مگر وہ اس کو جھیل گئی۔ اس دفعہ اُس نے اپنا نصف جسم اُس کے سینے پر جھکا دیا اور بڑے پیار سے بولی۔ "ناراض ہو مجھ سے؟"

وہ کسی قدر جھنجھلا کر کہنے لگا "اُف بھئی حد ہو گئی خدا کے لیے تم مجھ کو اسی طرح پڑا رہنے دو۔"

یہ دوسرا چرکا تھا۔ وہ بلبلا کر رہ گئی۔ ذرا دیر خاموش رہی اور شکوہ کرنے کے سے انداز میں بولی۔ "آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ لاؤ میں تمھارا سر دبا دوں" اُس کے لہجے میں خوشامد جھلک رہی تھی۔

نیاز ذرا بھی نہ پسیجا۔ اُس کی جانب دیکھے بغیر کہنے لگا "جاؤ تم اپنے بستر پر لیٹو۔ مجھ کو نیند آ رہی ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

وہ جل بھن کر رہ گئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ کمرے کا درجہ حرارت بڑھ گیا ہے۔ اور حبس

سے اُس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔ اُس نے ایک گہری سانس بھری اور بڑے دُکھ کے ساتھ سوچنے لگی۔ کیا واقعی اب اس میں کوئی دلکشی نہیں رہی۔ بیماری نے اس کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیا ہے اور اس کھوکھلے جسم سے نیاز کو ذرا بھی دلچسپی نہیں رہی یا پھر وہ واقعی پریشان ہے وہ بڑی معاملہ فہم عورت تھی۔ ایک شوہر کے ساتھ زندگی کے ۱۲ سال گذار کر وہ خاصی تجربہ کار ہو گئی تھی۔ اس کا پہلا شوہر زندگی بھر اس کا مرید رہا اور وہ اس کو نت نئے حربوں سے اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر کرتی رہی تھی۔ ایکا ایکی اُس کا جی چاہا کہ وہ نیاز کو آزما کر دیکھے۔ یہ بڑا خطرناک اقدام تھا۔ لیکن اس وقت وہ ہر خطرے کو مول لینے کے لئے آمادہ تھی۔ اُس نے سلطانہ کو آواز دی۔

"سلطانہ۔ اے سلطانہ"

سلطانہ اپنے کمرے سے بولی "جی اماں" وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔

ماں نے کہا "ذرا یہاں آؤ"

ذرا دیر بعد دروازہ کھولنے کی آواز اُبھری اور دالان میں قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ سلطانہ آ رہی تھی۔ پھر کمرے کے باہر سے اُس کی آواز آئی "اماں"

ماں کہنے لگی "دروازہ کھلا ہے۔ چلی آؤ"

سلطانہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ وہ اس وقت سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ ماں نے اُس کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا اور اُس سے پوچھنے لگی "کیا اتو سو گیا؟"

"وہ تو سرِ شام ہی سو گیا تھا"

ماں بولی: "میرا دل گھبرا رہا تھا۔ سوچا۔ لاؤ تم سے کچھ باتیں کروں۔ شاید دل بہل جائے"

سلطانہ نے گردن گھما کر نیاز کی جانب دیکھا جو خاموش پڑا تھا۔ ماں اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ چند ہی لمحوں بعد نیاز کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ ایک ہاتھ اٹھا کر اپنی کمر کھجانے لگا۔

وہ دونوں بیٹھی آہستہ آہستہ باتیں کرتی رہیں۔ انگیٹھی میں ابھی تک انگارے دہک رہے تھے۔ گہری سُرخ روشنی میں سلطانہ کے چہرے کی دل کشی نکھر گئی تھی۔ سیاہ آنکھوں میں شبنم کے قطرے جھلک رہے تھے۔ تروتازہ رخساروں پر برسات کی سہانی شاموں کی شفق پھیل گئی تھی۔

ذرا دیر بعد نیاز نے کروٹ بدلی اور آنکھیں ملتے ہوئے بیوی سے بولا "ارے یہ سلطانہ کب آئی" وہ صاف جھوٹ بول رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

بیوی نے جواب دیا "ابھی ذرا دیر پہلے آئی تھی"

"اس سردی میں اس کو باہر نکلنے کی کیا سوجھی"؟

سلطانہ سر جھکا کر یاں لگانے لگی۔ وہ اس سے نظریں ملاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ اُس نے جب بھی نیاز کی جانب دیکھا اُس کو نیاز کی آنکھوں میں شکار پر جھپٹنے والے تیندوے کی سی تیز چمک نظر آئی۔ وہ ایک نامعلوم خوف سے تھرّا کر رہ جاتی۔

بیوی نے نیاز سے پوچھا "اب طبیعت کیسی ہے؟"

وہ کہنے لگا "کل ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ آج کل طبیعت کچھ گڑبڑ ہی رہتی ہے"

"میں تم سے خود ہی کہنے والی تھی۔ کل یاد کر کے ڈاکٹر کے پاس چلے جانا"

"دیکھو فرصت مل گئی تو ضرور جاؤں گا"

وہ پیار سے ڈانٹ کر بولی "فرصت تو تم کو کبھی نہیں ملے گی۔ تم نے اپنی جان کے ساتھ بکھیڑے ہی اتنے لگا رکھے ہیں۔ مگر کچھ اپنا بھی تو خیال کیا کرو۔ واہ بھئی اچھی مصروفیت ہے کہ ڈاکٹر کے پاس جانے تک کا وقت نہیں نکل سکتا"

نیاز اُس کی باتوں پر بے پرواہی سے ہنسنے لگا۔

دونوں کو باتوں میں مصروف دیکھ کر سلطانہ اٹھ کر جانے لگی تو ماں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ کہنے لگی "ابھی کون سی زیادہ رات ہوئی ہے"

سلطانہ بولی "نیند آرہی ہے"

ماں نے کہا۔ "تیری آنکھوں میں تو چراغ جلتے ہی نیند آجاتی ہے۔ اٹھ چلی جا نا" دراصل وہ چاہتی تھی کہ سلطانہ ابھی نہ جائے۔ وہ جانتی تھی کہ سلطانہ کے جاتے ہی نیاز کروٹ بدل کر اُس کی جانب سے منہ پھیرے گا۔ نیاز کی یہ بیزاری اُس کے لئے بڑی اذیت ناک تھی اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اُس کی ذات میں نیاز کی دلچسپی ختم ہو چکی ہے۔ وہ اپنی دل کشی اور کچی کچی جوانی تک کھو چکی ہے۔ وہ بوڑھی اور بدصورت ہو گئی ہے۔ یہ احساس اُس کے سینے میں نشتر چبھوئے رکھتا۔ یہ ایسا دُکھ تھا جس کو برداشت کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

سلطانہ کو ماں کے مجبور کرنے پر بیٹھنا ہی پڑا۔ وہ دونوں پھر باتیں کرنے لگے۔ انگیٹھی کے اندر انگارے دہکتے رہے۔ سلطانہ کے چہرے پر شفق پھوٹتی رہی۔ اُس کے حُسن کا جادو جاگتا رہا۔ باہر ہوا سردی سے بلبلاتی رہی۔ کُہر آلود رات چپ چاپ کھڑی تھی۔

اچانک کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ "ڈاکٹر موٹو آیا تھا۔ سلطانہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی ماں نے شال کو اچھی طرح اپنے جسم کے چاروں طرف لپیٹا اور دیوار کی جانب منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ نیاز جا کر ڈاکٹر کو اپنے ہمراہ لے آیا۔ وہ اس وقت سیاہ اور کوٹ پہنے ہوئے تھا اور بڑا لحیم شحیم نظر آ رہا تھا۔

کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی ڈاکٹر نے کہا "مسٹر نیاز معاف کرنا، میں ایک کیس دیکھنے چلا گیا تھا۔ بس سیدھا ادھر ہی سے آ رہا ہوں۔"

نیاز کہنے لگا "انجکشن کل بھی لگ سکتا تھا۔ آپ نے اس جاڑے پالے میں خواہ مخواہ تکلیف اٹھائی۔"

ڈاکٹر مسکرا کر بولا "ارے بھئی ہمیں کہاں آرام نصیب۔ اپنا کام ہی ایسا ٹھہرا۔" یہ کہکر وہ دیوار کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور نیاز سے کہنے لگا "کمرہ تو خوب گرم ہے" اس وقت وہ بڑا بشاش نظر آ رہا تھا۔ بات یہ تھی کہ سہ پہر ہی کو نیاز نے اُسے ایک ہزار روپے کی دوسری قسط دی تھی۔

سلطانہ کی ماں خاموش بیٹھی ہوئی ڈاکٹر کی باتیں سنتی رہی۔

ڈاکٹر نے ذرا ہی دیر بعد اپنے چرمی بیگ کے اندر سے سرنج نکالی اور انجکشن لگانے کے واسطے اس کے اندر دوا بھرنے لگا۔ نیاز خاموش کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر کی پشت اس کی جانب تھی اور سامنے دیوار پر ڈاکٹر کا سایہ بڑا ہیبت ناک معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دوا سے بھری ہوئی سرنج لے کر مریضہ کے پاس گیا اور مسکرا کر اس سے پوچھنے لگا۔

"کہئے طبیعت اب کیسی ہے؟"

وہ بولی "آج تو ذرا بہتر ہے"

ڈاکٹر اس کو تسلی دینے کے سے انداز میں بولا "بس اب آپ کی طبیعت انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی"۔

یہ کہہ کر اس نے سرنج والا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس سے کہنے لگا "ذرا ہاتھ ادھر کیجیے۔ میں انجکشن لگا دوں"۔

وہ دبی زبان سے کہنے لگی "ڈاکٹر صاحب میں انجکشن نہیں لگواؤں گی"۔

پہلی بار اس نے انجکشن لگوانے سے انکار کیا تھا۔ ڈاکٹر اور نیاز دونوں چونک پڑے۔

ڈاکٹر بے نیازی سے ہنس کر بولا "کیوں، خیریت تو ہے۔ یہ آج آپ کو کیا سوجھی؟"

"نہ جانے کیوں انجکشن لگوانے سے میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے"۔

ڈاکٹر نے مشتبہ نظروں سے مریضہ کو دیکھا، جو دیوار کی جانب منہ موڑے بیٹھی تھی، پھر اس سے کہنے لگا "آپ کو خواہ مخواہ کا وہم ہو گیا ہے۔ کہیں انجکشن سے طبیعت خراب ہوتی ہے" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "لائیے ہاتھ ادھر کیجیے۔ گھبرائیے نہیں۔ اب زیادہ انجکشن نہیں لگاؤں گا"

مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا "نہیں ڈاکٹر صاحب اب تو میں انجکشن نہیں لگواؤں گی"۔

نیاز کو اس کی باتوں پر سخت غصہ آیا۔ کہنے لگا "خواہ مخواہ کی باتیں مت کرو۔ چلو

انجکشن لگواؤ۔"

"میں نے کہہ دیا کہ اب میں کوئی علاج نہیں کرواؤں گی"

نیاز نے غصہ سے آنکھیں نکالیں مگر ڈاکٹر نے اُس کو اشارہ سے منع کر دیا اور خود بڑی نرمی سے بولا۔ "دیکھیے انجکشن ناغہ ہو گیا تو یہ آپ کے مرض کے واسطے بہت بُرا ہو گا۔ میں تو اتنی رات گئے جاڑے پالے میں آپ کی خاطر یہاں آیا اور آپ ہیں کہ انجکشن لینے سے انکار کر رہی ہیں۔ یہ تو ٹھیک بات نہیں" وہ ابھی تک غیر سنجیدگی کا اظہار کر رہا تھا یعنی مسکرا مسکرا کر بات کر رہا تھا۔

مگر جب وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئی تو ڈاکٹر کے چہرے پر پریشانی کا ہلکا سا سایہ پھیل گیا اس میں دبے دبے خوف کا بھی احساس ملا ہوا تھا۔ اب اصرار کرنا فضول تھا اُس نے سرنج کو خالی کر کے چرمی بیگ کے اندر رکھا اور نیاز سے کہنے لگا۔ "معلوم ہوتا ہے یہ بہت گھبرا گئی ہیں۔ ابھی ان کو کچھ روز کی چھٹی ملنا چاہیے" اس کے بعد اُس نے مریضہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"لیجیے اب تو آپ خوش ہو جائیے"

وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

ڈاکٹر زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہرا اور کمرے کے باہر چلا گیا۔ نیاز بھی اُس کے ہمراہ چلا گیا۔

دونوں خاموشی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ گلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ گلی میں چلنے لگے۔ ان کے قدموں کی آہٹ سنسان رات میں پُراسرار معلوم ہو رہی تھی۔

گھر سے کچھ دور آگے بڑھ کر ڈاکٹر نے نیاز سے پوچھا "دیکھو پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ایک خاص اسٹیج پر پہنچنے کے بعد مریض کا مزاج ایسا ہی ضدی اور چڑچڑا ہو جاتا ہے"

نیاز کہنے لگا۔ "مگر ڈاکٹر صاحب یہ تو اُس نے بڑی خراب حرکت کی ہے"

ڈاکٹر بولا "تم اس بات کا کچھ خیال نہ کرو۔ مریضہ کو کچھ وہم ہو گیا ہے۔ یہ عورتیں تو شکی مزاج ہوتی ہیں۔ اور اس شک کو تم ہی دور کر سکتے ہو۔ دیکھو زبردستی مت کرنا ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔"

"کہیں اس کو کچھ شبہ تو نہیں ہو گیا؟"

ڈاکٹر کے دل میں بھی یہی چور تھا مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نیاز کی بات سن کر اُس کے بدن میں خفیف سی لرزش ہوئی۔ آہستہ سے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے" اُس کی آواز میں دبی دبی کپکپاہٹ تھی۔

نیاز کہنے لگا۔ "پچھلے دنوں میں کوئٹہ گیا ہوا تھا۔ کہیں میری غیر موجودگی میں وہ کسی ڈاکٹر کے پاس نہ چلی گئی ہو۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟"

"یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ انجکشن لگوانے سے اس کئی مہینے کے عرصہ میں اُس نے پہلی بار انکار کیا ہے۔ مجھے تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی کے ساتھ کچھ سوچتا رہا۔ دونوں آہستہ آہستہ گلی کے اندر چلتے رہے۔ کہر کے دھندلکے میں لپٹے ہوئے وہ سنسان رات میں بھوتوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ ایکا ایکی سناٹے میں ڈاکٹر کی آواز ابھری۔ "میرا خیال ہے کہ تم کو ایسی باتیں نہیں سوچنا چاہئیں جب تک کوئی بہت ہی ہوشیار ڈاکٹر نہ ہو اُسے شبہ تک نہیں ہو سکتا۔ بہرحال تم اس بات کی نگہداشت رکھو کہ وہ اسپتال نہ جانے پائے اور نہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرے۔ احتیاط کرنا ہر حال میں ضروری ہے"

اس کے علاوہ اُس نے نیاز کو کچھ اور ضروری ہدایات دیں اور آپس میں یہ طے ہوا کہ جب مریضہ انجکشن لگوانے کے لئے آمادگی کا اظہار کرے تو نیاز ڈاکٹر کو بلوالے۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے گلی کے نکڑ پر آگئے۔ سامنے سڑک پر ڈاکٹر کی کار کھڑی تھی۔ دونوں اُس کے قریب پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے نیاز سے مصافحہ کیا اور کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ نیاز گلی کے اندر چلا گیا۔ وہ تھکے ہوئے قدموں سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ بیوی کی اس حرکت نے اُس کو بہت پریشان کر دیا تھا۔ اس پریشانی میں خوف اور غصہ کا امتزاج تھا۔

وہ جھنجھلایا ہوا سا گھر کے اندر داخل ہوا۔ بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ دونوں نے ایک

دوسرے کو دیکھا مگر کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ نیاز تھکا ہوا سا جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ ذرا دیر تک وہ خاموش پڑا رہا۔ مگر اس کو چین نہ آیا۔ اٹھکر بیٹھ گیا اور بیوی سے کہنے لگا۔

"آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

وہ آہستہ سے بولی۔"کیا؟" اُس نے جان بوجھ کر تغافل برتا۔

اس بے نیازی پر نیاز کو اور تاؤ آیا۔ بگڑ کر بولا "تمھارا سر"

وہ نرم لہجے میں کہنے لگی "تمھارا تو لڑنے کو دل چاہ رہا ہے۔ کئی روز سے تم پر اس کا بھوت سوار ہے" یہ کہہ کر اُس نے شال سنبھالی اور تخت سے نیچے اُترتے ہوئے بولی "مجھے تو نیند آرہی ہے" اُس نے زبردستی جماہی لینے کی کوشش کی اور تخت سے اُتر کر کھڑی ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ نیاز اس وقت غصہ میں بھرا بیٹھا ہے۔ لہذا وہ اس سے اُلجھنا نہ چاہتی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اب اسی میں خیریت ہے کہ وہ بستر پر جا کر لیٹ جائے۔

نیاز لمحہ بھر تو اس کو گھورتا رہا، پھر بگڑ کر کہنے لگا۔"میں کہتا ہوں تم نے آج انجکشن کیوں نہیں لگوایا۔؟"

وہ بولی۔" مجھے انجکشن لگوانے سے ہول ہوتا ہے"

"اور میں جو اتنا پیسہ علاج پر برباد کر چکا ہوں"

"تو اب مت برباد کرو"

نیاز زچ ہو کر بولا "انجکشنوں کا پورا کورس تو تم کو لینا ہی پڑیگا۔ میں اُس کی پیشگی رقم دے چکا ہوں"

وہ تنک کر کہنے لگی" واہ یہ بھی اچھی رہی۔ چاہے میں ان کو لگوا کر مر ہی کیوں نہ جاؤں۔ مگر تمھاری رقم وصول ہو جائے"

"میں کہتا ہوں کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑی ہو" اس دفعہ نیاز کا لہجہ کسی قدر مدھم تھا۔

وہ بھرائی ہوئی آواز سے بولی" خدا کے لئے تم مجھکو میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں کوئی علاج ولاج نہیں

کروں گی۔ خدا کی ذات میں بڑی قوت ہے۔ زندگی ہے تو یوں ہی اچھے ہو جاؤ گی" یہ کہتے کہتے اُس کی آواز گلوگیر ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

نیاز کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گذری۔ جل کر بولا "عجیب اُلّو کی پٹھی عورت سے سابقہ پڑا ہے"

نیاز نے پہلی بار اس کو گالی دی تھی۔ اُس کے آگ ہی تو لگ گئی۔ چیخ کر بولی۔ "دیکھو زبان سنبھال کر بات کرو۔ مرنے والا مر گیا۔ وہ اپنی جگہ۔ میں اپنی جگہ کبھی گالی دینا تو درکنار مجھ سے تو کڑکے بھی بات نہیں کی" یہ سلطانہ کے باپ کا ذکر تھا اور اس کے ذکر سے نیاز ہمیشہ جھنجھلاتا تھا۔ اس وقت تو وہ یوں بھی جلا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"اسی سالے بھڑوے نے تمھارا مزاج خراب کیا ہے"

"مرے ہوئے کو گالی دیتے تم کو شرم نہیں آتی"

نیاز زور سے چیخا "اب زبان بند کر۔ جتنا منع کرو اسی قدر حرامزادی سر پہ چڑھتی چلی جا رہی ہے۔ تیری تو۔۔" اس نے ایک گندی سی گالی دی اور لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"اچھا نواب تم مجھ پر ہاتھ بھی اٹھاؤ گے"

نیاز نے ایک بار گی کئی گالیاں دے ڈالیں اور اس کے منہ پر زناٹے کا ایک تھپڑ رسید کیا۔ پھر دوسرا، تیسرا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے چلتا رہا۔ وہ خاموش کھڑی مار کھاتی رہی۔ نیاز نے اس کی کمر پر کئی لاتیں ماریں۔

شور سن کر سلطانہ ننگے پیر بھاگتی ہوئی کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ اس نے دیکھا۔ ماں زمین پر اوندھے منہ پڑی تھی اور نیاز اس کے قریب کھڑا خنجر کی طرح زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خونخوار ہو رہی تھیں۔ منہ سے کف جاری تھا۔ سلطانہ نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ جلدی سے جا کر ماں کو فرش پر سے اٹھایا۔ اس کے بال خاک میں اٹے ہوئے تھے۔ چہرہ مردے کی طرح سفید ہو رہا تھا اور نچلے ہونٹ سے گاڑھا گاڑھا خون بہہ رہا تھا۔ لیمپ کی میلی میلی زرد

روشنی میں وہ بڑی ڈراؤنی نظر آرہی تھی۔

نیاز نے اُس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ کھونٹی سے کوٹ اُتار کر پہنا۔ گلے میں مفلر لپیٹا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے کے باہر چلا گیا۔ سلطانہ نے اُس کو جاتے ہوئے دیکھا مگر وہ اُس سے کچھ کہہ نہ سکی۔ اُس نے آنگن میں اُس کے بھاری بھاری قدموں کی آہٹ سُنی۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ گھر سے باہر جا چکا تھا۔

سلطانہ نے ماں کو سنبھال کر بستر پر لٹا دیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ رُک رُک کر سانسیں لے رہی تھی۔ اُس کا جسم درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح جھول رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ سلطانہ نے اُس کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا کر رونے لگی۔

ماں کئی منٹ تک بے ہوش پڑی رہی۔ سلطانہ اُس کے قریب بیٹھی آہستہ آہستہ روتی رہی۔ آخر ماں نے آنکھیں کھول کر اُس کو دیکھا اور بڑی نحیف آواز سے بولی۔

"سلطانہ"

سُلطانہ نے جلدی جلدی دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے اور اُس سے پوچھنے لگی "اب کیسی طبیعت ہے اماں؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور بڑی گہری سانس بھری۔ پھر اُس نے بڑے دُکھ سے کہا "رو کیوں رہی ہے میری بچی۔ میری قسمت میں یوں ہی لکھا تھا" سلطانہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ خاموشی کے ساتھ اُس کے سینہ پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

●

۴

نیاز نے ساری رات دوکان کے اندر جاگ کر گذاری۔ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ اُس کے پاس اوڑھنے بچھانے کو کوئی چیز نہیں تھی۔ دوکان میں ایک پُرانا فوجی اوورکوٹ پڑا تھا۔ جس کو اُس نے ٹانگوں پر ڈال لیا۔ مگر جوں جوں رات ڈھلتی گئی۔ سردی شدت اختیار کرتی گئی۔ اُس کا حلیہ بے رنگ ہو گیا۔

تمام رات وہ بیٹھا بیوی کو گالیاں دیتا رہا اور سردی سے کپکپاتا رہا۔

دوسرے دن بھی وہ گھر نہیں گیا۔

تیسرے روز شام کے وقت انو دوکان پر آیا۔ اُس کو دیکھ کر نیاز نے دل میں ایک دبی دبی مسرت کو محسوس کیا۔ ان تین دنوں میں اُس کی جو اہمیت گھٹ گئی تھی اور جس کو سوچ سوچ کر وہ بیوی پر رہ رہ کے تاؤ آ رہا تھا۔ اب اُس کا بول بالا ہو گیا تھا۔ اُس نے بڑے روکھے پن سے پوچھا۔

"کیسے آئے یہاں؟"

انو خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ اُس نے فوراً جواب دیا "اماں نے بلایا ہے"

نیاز نے دل ہی دل میں کہا کہ اب حرام زادی کو پتہ چلا ہے۔ ابھی کیا ہے چند روز بعد سالی خود بھاگی ہوئی آئے گی۔ کچھ یہی سوچ کر اُس نے انو کو گھور کر دیکھا اور ناراضگی سے کہنے لگا۔

"اپنی اماں سے کہہ دینا کہ اُس گھر سے اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا"

انو نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف تھا اور چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔ نیاز نے اُس کو خاموش دیکھکر زور سے ڈانٹا "ابے اب یہاں میرے سر پر کیوں کھڑا ہے جا کے کہدینا اُس حرامزادی سے کہ میں اب کبھی اس گھر پہ پیشاب بھی نہیں پھروں گا" لمحہ بھر کے لئے وہ رُکا اور بڑے بے ہنگم طریقے پر چلّایا۔

"ابے اب جا رہا ہے یہاں سے یا کچھ لے کے جائے گا"

وہ گالیاں دیتا ہوا انو پر جھپٹا اور وہ سہما ہوا سا چُپ چاپ دوکان سے باہر چلا گیا۔

انو کے جانے کے بعد وہ گردن اونچی کر کے بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ اُسے یقین تھا کہ اب بیوی خود اُس کو دوکان پر منانے آئے گی! اسی خیال سے وہ دوکان سے نکل کر کہیں گیا بھی نہیں اور بے چینی سے بیٹھا بیوی کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ رات دبے دبے قدموں سے آکر کوچہ د بازار پر چھا گئی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔

جب ایک پہر رات گذر گئی اور راستوں پر سناٹا چھا گیا تو اس کا انتظار اور شدید ہو گیا۔ مگر اُس کی بیوی تو وہاں آئی نہیں البتہ ڈاکٹر موٹو کا کمپاؤنڈر آ گیا۔ ڈاکٹر نے اُس کو بُلوایا تھا۔ نیاز کی طبیعت پریشان تھی، لہٰذا اُس نے کمپاؤنڈر کو ٹالنا چاہا۔ وہ کہنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ اُن کو اپنے ساتھ لانا بڑا ارجنٹ کام ہے"

نیاز نے زیادہ حیل حجّت کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی کے ساتھ اُس کے ہمراہ چلا گیا ڈاکٹر اس وقت مطب کے اندر تنہا بیٹھا تھا۔ اُس کے وہاں پہنچتے ہی وہ اٹھکر کنسلٹیشن روم میں چلا گیا اور نیاز کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

یہ ایک مختصر سا تنگ و تاریک کمرہ تھا اُس کی چھت بہت نیچی تھی اور ایک دُھندلا سا بلب روشن تھا۔ پھیکی پھیکی روشنی کے عکس میں وہ دونوں بڑے پُراسرار نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد اُس سے کہنے لگا۔

"میں کئی روز سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔

نیاز نے جھجکتے ہوئے جواب دیا: "وہ رضامند نہیں ہوتی"

ڈاکٹر کا چوڑا چکلا چہرہ لمحہ بھر کے لئے پریشان ہوگیا: "یہ تو تم نے بہت بُری خبر سُنائی۔ بھئی کسی طرح اُس کو مناؤ۔"

"وہ کسی طرح مانتی ہی نہیں۔ اسی بات پر میرا اُس سے جھگڑا ہوگیا۔ میں تو تین روز سے گھر بھی نہیں گیا۔"

ڈاکٹر اور پریشان ہوگیا۔ اُس نے کسی قدر ناراض ہوکر کہا: "میں نے تم کو منع بھی کیا تھا مگر پھر بھی تم باز نہ آئے۔ یہ تو تم نے بڑی غیر دانشمندی کا ثبوت دیا۔"

"ڈاکٹر صاحب آپ اس کو نہیں جانتے۔ وہ بڑی ضدی عورت ہے۔"

"اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔ تم کسی نہ کسی طرح اُس کو منانے کی کوشش کرو۔ یہ بہت قیمتی وقت ہے۔ اس کو ضائع نہیں ہونا چاہیے" ڈاکٹر نے رُک رُک کر نیاز کو نظر بھر کر دیکھا جو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر کہنے لگا: "تم ابھی گھر جاؤ اور اس کو شیشے میں اُتارنے کی کوشش کرو۔" اُس کا لہجہ ایک بارگی بے تکلفانہ ہوگیا۔

"تم بھی کیسے مرد ہو، اماں ایک عورت تمہارے قابو میں نہیں آتی"

نیاز روٹھے ہوئے بچّے کی طرح منہ پُھلا کر بولا: "لیکن ڈاکٹر صاحب میں اب اُس کے پاس جاؤں گا نہیں۔"

ڈاکٹر نے بگڑ کر کہا: "نہ جاؤ بھئی۔ میری ایک ہزار کی تیسری قسط دیدو اور جاکر موج کرو۔"

"دیکھیے ڈاکٹر صاحب۔ بات یہ ہے۔"——

ڈاکٹر نے اس کو کچھ کہنے کا موقعہ نہیں دیا۔ اس کی بات کاٹ کر بولا: "بات وات سے کام نہیں چلے گا۔ انجکشن زبردستی نہیں لگایا جاسکتا۔ اس کے لئے تو مریضہ کو رضامند کرنا ہی پڑے گا۔ اگر تم یہ نہیں کرسکتے تو علاج بند کردو۔ اور اگر کہیں تم اس خیال میں ہو کہ اتنے ہی انجکشنوں سے اس کا کام تمام ہوجائے گا تو یہ تمہارا مغالطہ ہے۔ اس میں زبردست قوتِ مدافعت ہے۔ کوئی اور عورت ہوتی

تو اب تک قبرستان میں ایک عدد قبر الاٹ کرا چکی ہوتی۔"

نیاز کے لئے اب انکار کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ مجبوراً اُس کو کہنا پڑا "اچھی بات ہے۔ جیسا آپ کہہ رہے ہیں وہی کروں گا۔ مگر اب آپ یہ جھنجھٹ جلد ہی صاف کر دیجئے۔"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں مجرمانہ چمک ابھر آئی۔ مسکرا کر بولا "یہ تم مجھ پر چھوڑ دو جاڑا ختم ہونے سے پہلے ہی پہلے میں اس کو ٹھکانے لگا دوں گا۔" اُس کی آنکھوں کی چمک اور خونخوار ہو گئی۔ جھکی ہوئی چھت والے اس تنگ و تاریک کمرے میں جہاں ہر طرف دھندلی دھندلی پرچھائیاں منڈلا رہی تھیں، ڈاکٹر خیرات علی المعروف بہ موٹو اپنے تنومند جسم کے ساتھ ارنا بھینسے کی طرح ڈراونا نظر آ رہا تھا۔

نیاز ڈاکٹر کے مطب سے نکل کر سیدھا گھر پہنچا۔ بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ مگر دونوں میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ نیاز چپ چاپ جا کر تھکا ہوا سا بستر پر بیٹھ گیا اور خاموشی کے ساتھ یہ سوچنے لگا کہ بیوی سے کس طرح بات کرے۔ وہ بے نیازی سے نظریں نیچی کئے خاموش بیٹھی تھی۔ لیمپ کی پیلی پیلی روشنی میں اُس کے چہرے کا نصف حصہ نظر آ رہا تھا۔ جس کی زردی سے اُس کے چہرے پر ایک روغنی چمک جھلک رہی تھی۔

نیاز کئی منٹ تک خاموش بیٹھا رہا۔ بیوی نے اُس کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اُس کی یہ حرکت نیاز کو بہت شاق گذری۔ وہ جھنجھلا کر اٹھا اور اپنا ٹرنک کھول کر اس میں سامان رکھنے لگا۔ اُس نے کھونٹیوں پر سے کپڑے اُتارے۔ پلنگ کے نیچے سے جوتے اور چپلیں نکالیں۔ اُن کو پرانے اخباروں میں لپیٹا۔ الماریوں سے کاغذات اور ضرورت کی دوسری اشیا نکالیں اور ہر چیز کو سنبھال سنبھال کر ٹرنک کے اندر رکھنے لگا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی اُس کی ہر حرکت کو دیکھتی رہی۔ کئی بار اُس کا جی بھی چاہا کہ وہ اُس سے ٹوک کے پوچھے کہ وہ یہ سب کیا کر رہا ہے۔ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اُسے نیاز سے بات کرتے ہوئے جھجک سی معلوم ہو رہی تھی۔ اس جھجک کو اس رات کے حادثہ نے اس کے اور نیاز کے درمیان ایک دیوار کی طرح کھڑا کر دیا تھا۔ ویسے وہ یہ ضرور چاہتی تھی کہ نیاز اس طرح اپنا سامان اٹھا کر اس گھر سے چلا نہ جائے اس لئے کہ بیماری نے

اس کو اپاہج کر کے ڈال دیا تھا اور اب وہ گھر میں بیٹھ کر محنت مزدوری کرنے کے بھی قابل نہیں رہی تھی نیاز کے بعد گھر کا دھندا کس طرح چلے گا۔ سارے اخراجات کس طرح پورے ہوں گے۔ یہ احساس بڑا ڈراونا تھا

وہ اسی سوچ میں غلطاں و پیچاں تھی کہ اتنے میں نیاز نے اس کو مخاطب کر کے پوچھا "میرا وہ دھوپ کا چشمہ کہاں ہے؟" اس نے گردن گھما کر دیکھا، نیاز کھلے ہوئے ٹرنک پر جھکا ہوا تھا اس کی پیٹھ بیوی کی جانب تھی۔

وہ اس کی بات سن کر بولی "یہ اس وقت دھوپ کے چشمے کی کون سی ضرورت پڑ گئی؟" اس کے لہجے میں مصالحت کا انداز تھا۔ نیاز کو شاید بیوی سے اس رویہ کی توقع نہیں تھی۔ اس نے فوراً پلٹ کر اس کی جانب دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"تمھیں معلوم ہو تو بتا دو"

وہ اس کی بات کو نظر انداز کر کے کہنے لگی "یہ اتنی رات گئے تم سارا سامان کیوں الٹ پلٹ رہے ہو؟"

اس دفعہ اس نے بیوی کی جانب نہیں دیکھا۔ بڑے پژمردہ لہجے میں بولا "اب میں یہاں سے اپنا منہ کالا کر کے جا رہا ہوں۔ تم اپنی من مانی کرنا۔ کوئی تم کو ستانے والا نہیں ہوگا" صاف لفظوں میں اب وہ گلہ کر رہا تھا۔

وہ کہنے لگی "تھوڑے دنوں اور صبر کر لو۔ نہ میں اس دنیا میں رہوں گی۔ نہ تم کو اس طرح گھر چھوڑ کر جانا پڑے گا"

اس کے بعد شکوہ و شکایت کا دفتر کھل گیا۔

نیاز آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور کسی قدر تیز لہجے میں کہنے لگا "خدا قسم تم نے میرا سارا پروگرام ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ تمھیں کیا پتہ کہ میں کیا کیا سوچ رہا تھا"

"کبھی تم نے مجھ سے کچھ بتایا بھی۔ اس قابل ہی نہیں سمجھے"

"نہیں یہ بات نہیں، میں نے سوچا تھا کہ پہلے تم اچھی ہو جاؤ تو کچھ بات کروں۔ اب بات آ ہی گئی ہے تو سن لو۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ سلطانہ کسی طرح اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ میں سب سے پہلے اس فرض سے ادا ہونا چاہتا ہوں" وہ بڑی سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔ اس کو اچھی طرح علم تھا کہ اس کی بیوی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے سلطانہ کا بیاہ کر دے۔ اس وقت وہ اس کی اس کمزوری سے

فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ نیاز کا اندازہ غلط نہ نکلا۔ بیوی یہ بات سنتے ہی چونک پڑی۔ پہلے اُس کے چہرے پر استعجاب ہویدا ہوا، پھر کسی دبی ہوئی مسرت سے اُس کا چہرہ کھِل اٹھا۔ وہ جلدی سے بولی۔ "تو پھر تم نے کہیں کوئی لڑکا دیکھا؟"

یہ کہکر وہ سوچنے لگی، کیا واقعی نیاز کو سلطانہ کے بیاہ کی اس قدر فکر ہے یا وہ محض اُس کو خوش کرنے کے لئے یہ بات کہہ رہا ہے۔ نیاز کے متعلق اُس کے دل میں جو شبہات تھے، اُن کا شیرازہ منتشر ہونے لگا۔

نیاز کہنے لگا: "لڑکا میں نے دیکھ لیا ہے۔ نہر کے محکمہ میں ملازم ہے۔ سوا سو روپے تنخواہ ہے۔ لیکن اوپر سے آمدنی اچھی ہو جاتی ہے۔ میٹرک تک انگریزی پڑھا ہے۔ اُس کا باپ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا ٹھیکیدار ہے۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ میرے پُرانے ملنے والے ہیں۔ ہزاروں روپے کا سامان مجھ سے لے چکے ہیں۔" وہ بڑے اطمینان سے جھوٹ بولتا چلا گیا۔

اُس کی باتیں سنکر، بیوی کو افسوس ہوا کہ وہ اب تک نیاز کی نیت پر کیوں شک کرتی رہی۔ ویسے وہ خاصی ہوشیار عورت تھی مگر تھی تو گھر کے اندر بیٹھنے والی، سادگی میں مار کھا گئی۔ بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں بولی۔

"تم نے کبھی اس بات کا اشارہ تک نہیں کیا"

"پہلے تم اچھی تو ہو جاؤ۔ میں کل ہی رشتہ طے کئے لیتا ہوں۔ تم میں ما یا انتظام کرنے کی ہمت ہے روز تو تم کو دورہ پڑتا ہے۔ اب میں بیٹھ کر تو جہیز تیار کرنے سے رہا۔"

اس کے بعد نیاز نے اُس رشتہ کے بارے میں اور بہت سی تفصیلات بتائیں اور وہ بچوں کی طرح ہنس ہنس کر ایک ایک تفصیل پوچھتی رہی۔ پھر تو باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ نیاز اب اُس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اور باتیں کرتے کرتے اُس کے بالوں سے کھیلتا جا رہا تھا۔ دونوں رات گئے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن ڈاکٹر موٹو انجکشن لگانے آیا۔ باوجودیکہ نیاز اس وقت گھر پر موجود نہیں تھا، مگر بیوی

نے بغیر کسی مزاحمت کے ڈاکٹر کو انجکشن لگانے کی اجازت دیدی۔ وہ اب کسی بات پر نیاز کو ناراض ہونے کا موقعہ دینا نہیں چاہتی تھی۔ اُس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا (سلطانہ کا بیاہ) پوری ہونے والی تھی۔ وہ اِن دنوں صرف اسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کی زردی مٹنے لگی تھی اور اُس پر صحت مندی کے نشانات اُبھر رہے تھے۔ اب وہ ہر وقت ہنشاش رہتی۔ بات بات پر ہنس پڑتی اور بڑی تن دہی کے ساتھ نیاز کی دیکھ بھال کرتی۔

لیکن دوسرا انجکشن لگنے کے چند ہی گھنٹے بعد اس کو پھر دورہ پڑا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہ دھوپ میں بیٹھی سلطانہ کے جہیز کا جوڑا کاٹ رہی تھی۔ باہر گلی میں بچے شور مچا رہے تھے۔ شیشم کے درخت پر ایک کوا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ سلطانہ غسل خانے میں نہا رہی تھی۔ پانی گرنے کی آواز رُک رُک کر اُبھر رہی تھی۔ فضا میں زندگی اور ہلچل تھی۔ ایکا ایکی اُس نے اپنے سینہ میں ہلچل محسوس کی۔ اُس کے پہلو میں زور کی ٹیس اٹھی۔ اُس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا اور بے حال ہو کر فرش پر گر گئی۔

تھوڑی دیر بعد سلطانہ غسل خانے سے باہر نکلی تو اُس نے دیکھا ماں زخمی پرندے کی طرح لوٹ رہی تھی۔ اُس کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا اور آنکھوں کی پتلیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ گھبرا کر اُس کے پاس پہنچی۔ جسم کو چھو کر دیکھا تو ہاتھ پاؤں برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ اُس کی یہ حالت دیکھکر سلطانہ بدحواس ہو گئی۔ خیریت یہ ہوئی کہ اسی وقت اللو آ گیا۔ سلطانہ نے فوراً اُس کو ڈاکٹر موٹو کے پاس دوڑایا کہ وہ اُس کو بلا لائے اور بے چینی سے ڈاکٹر کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

ذرا ہی دیر بعد اللو نے واپس آ کر بتایا کہ ڈاکٹر گھر پر موجود تھا، مگر آیا نہیں۔ کہنے لگا میں ایک مریض کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ سلطانہ کو ڈاکٹر پر بہت غصہ آیا۔ ماں کی طبیعت اُس وقت تک ذرا سنبھل چکی تھی۔ وہ اب آنکھیں بند کئے بے سُدھ پڑی تھی۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد آہستہ آہستہ کراہتی اور سینے کو دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیتی۔

سہ پہر تک مریضہ کی حالت اس قابل ہو گئی تھی کہ وہ آنگن سے اُٹھکر کمرے میں چلی گئی اور اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ لیکن وہ ابھی تک اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ بات چیت کر سکے۔ کئی بار اُس نے بات کرنے

کے لئے ہونٹ کھولے مگر سینے کی ٹیسوں نے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اسی عالم میں اُس کی آنکھ لگ گئی اور شام تک پڑی سوتی رہی۔

رات کو اس کی طبیعت اور سنبھل گئی۔ اُس نے گرم گرم دودھ کا ایک پیالہ پیا اور تکیہ سے پیٹھ ٹکا کر اونچی ہو کر بیٹھ گئی۔ سلطانہ سرہانے بیٹھ کر اُس کا سر دبانے لگی۔ رات کا ایک پہر گذر چکا تھا۔ سردیوں کی رات تھی۔ سرِ شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ نیاز ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ سلطانہ دیر تک بیٹھی ماں کا سر دباتی رہی اور آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرتی رہی۔

بہت دیر بعد جب ماں کی آنکھ لگ گئی تو سلطانہ خاموشی کے ساتھ اٹھ کر اپنے کمرے میں سونے کی غرض سے چلی گئی۔

آدھی رات سے کچھ دیر پہلے نیاز گھر میں آیا۔ وہ اس وقت بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بیوی گہری نیند میں سو رہی تھی۔ نیاز نے نظر بھر کر اُس کو دیکھا مگر جگانے کی کوشش نہیں کی۔ چپ چاپ کپڑے تبدیل کئے اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

۵

سلطانہ کی ماں کو اب ہر دوسرے تیسرے دن دورہ پڑنے لگا تھا۔ اور ڈاکٹر موٹو ان دوروں کو رفع کرنے کے لئے انجکشن پر انجکشن لگا رہا تھا۔ وہ عام طور پر رات گئے آتا۔ آتے کے ساتھ ہی مریضہ کا حال پوچھتا، اُس کو تسلی دیتا اور سرنج میں دوا بھر کر انجکشن لگاتا۔ اس کے بعد وہ اپنا چرمی بیگ لٹکائے ہوئے گھر سے باہر نکل جاتا۔ سنسان گلی میں اُس کے قدموں کی آواز دور تک سُنائی پڑتی۔

ایک روز سویرے ہی سویرے اس کے سینے میں درد اٹھا اور وہ بے حال ہو کر فرش پر گر پڑی۔ دن بھر میں کئی بار اُس پر غشی کا دورہ پڑا۔ ان دنوں نیاز کسی کام کے سلسلہ میں کراچی گیا ہوا تھا۔ سلطانہ نے ماں کی حالت بگڑتے دیکھی تو فوراً ڈاکٹر موٹو کو بلوایا۔ وہ آتو گیا مگر کوئی دوا نہیں دی۔ یہ کہہ کر چلا گیا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، خود بخود طبیعت سنبھل جائے گی۔

شام کو بڑا سخت دورہ پڑا۔ آنکھیں پھر گئیں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ بتیسی بیٹھ گئی۔ سلطانہ نے اُس کا یہ حال دیکھا تو رو رو کے آنکھیں سُجا لیں۔ صبح سے اُس کے منہ میں کھیل تک نہیں گئی تھی۔ دن بھر کا فاقہ اور یہ پہاڑ سا غم۔ اُس کا چہرہ کُملا گیا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑے پاگلوں کی طرح گھر میں اِدھر اُدھر دوڑتی پھر رہی تھی۔

پھر اُسے خود ہی کچھ خیال آیا۔ اُس نے جلدی سے اُٹھ کر وضو کیا۔ جزدان سے قرآن شریف نکالا اور اُس کے سرہانے بیٹھ کر سورہ یٰسین پڑھنے لگی۔

کمرے کے اندر لیمپ روشن تھا۔ اُس کی زرد' زرد روشنی میں' ماں بستر پر آنکھیں بند کیے پڑی تھی' اُس کی سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ قریب ہی کرسی پر اَنّو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ بار بار سہمی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھتا جو دھندلی دھندلی روشنی میں لاش کی طرح بے سُدھ پڑی تھی۔

کمرے کے آسیب زدہ سکوت میں سلطانہ کی آواز آہستہ آہستہ اُبھر رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے۔ کوئی بہت بڑی آفت نازل ہونے والی ہے۔ لیمپ بھڑک کر بجھ جائے گا۔ کمرے کے اندر قبر کی سی تاریکی چھا جائے گی۔ دروازہ آہستہ سے کھلے گا اور ملک الموت اندر آ جائے گی۔

سلطانہ نے سورۂ یٰسین پڑھتے پڑھتے اچانک محسوس کیا کہ باہر آنگن میں کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ قدموں کی چاپ رُک رُک کر اُبھر رہی تھی۔ سلطانہ کی آواز بے ہنگم ہو گئی۔ اُس نے خوف زدہ نظروں سے دروازہ کی جانب دیکھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ کوئی کواڑ سے لگا اندھیرے میں کھڑا ہے۔

ایک بارگی اس کی آواز گھٹی ہوئی بیخ کے ساتھ رُک گئی۔ کمرے کے اندر ہولناک خاموشی چھا گئی۔

اَنّو خوف زدہ ہو کر سلطانہ کو گھورنے لگا' جو سہمی ہوئی پتھر کے مجسمہ کی طرح خاموش بیٹھی تھی۔

اسی وقت ماں نے کروٹ بدلی۔ پلنگ آہستہ سے چرچرایا اور اُس کے ساتھ ہی ماں کی نحیف آواز اُبھری۔

"سلطانہ"

سلطانہ نے جلدی سے گردن گھما کر ماں کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھیں کھولے دیوار کو تک رہی تھی سلطانہ فوراً تخت پر سے اُتر کر ماں کے پاس آ گئی۔ اور سرہانے بیٹھ کر اُس کا سر دبانے لگی۔

رات کے آٹھ بجے تک ماں کی طبیعت خاصی سنبھل گئی۔ وہ اب آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ سلطانہ اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے پر سے افسردگی مٹ چکی تھی۔ اب وہ کسی قدر بشاش نظر آ رہی تھی۔

ماں نے باتیں کرتے کرتے ایک بار سلطانہ کو گہری نظروں سے دیکھا اور لمحہ بھر تک بغور اُس کو دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے ایک گہری سانس بھری اور اَنّو سے کہنے لگی "بیٹا' ذرا جا کر آپا کتیز کو تو بلا لا۔ کہنا اماں نے

بلایا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔ اپنے ساتھ ہی اُن کو لے کر آنا۔"

انو ایک سعادت مند بچے کی طرح اٹھکر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سلطانہ سوچنے لگی کہ یہ اس وقت اماں نے خالہ کنیز کو کیوں بلایا ہے۔ وہ ہمیشہ اُن کے نام سے چڑ جاتی تھیں۔ ایکا ایکی ان پر اتنی مہربان کیوں ہو گئیں

تھوڑی دیر بعد انو ادھیڑ عمر کی ایک عورت کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اُس کا جسم بھدا تھا اور داہنے گال پر ایک سیاہ مسا تھا۔ جو بھونرے کی طرح چہرے پر بیٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا دہانہ چوڑا تھا اور کلّے میں پان کی گلوری دبی ہوئی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے سلطانہ کی ماں کو نظر بھر کر دیکھا اور کہنے لگی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

سلطانہ کی ماں نے جواب دیا "بس اچھی ہی ہے۔ زندگی کے دن کاٹ رہی ہوں۔"

وہ جھٹ بولی "اے ہے کیا اول فول بکے جا رہی ہو۔ نہ وقت دیکھتی ہو، نہ گھڑی، جو منہ میں آیا بھڑ سے کہہ دیا۔ دشمنوں کے منہ میں خاک۔ تم کیوں زندگی کے دن کاٹنے لگیں۔ اللہ میاں تم کو اپنے بچوں کے سہرے کی بہار دیکھنا نصیب کرے۔ اے بیماری ہی تو ہے۔ کون نہیں بیمار پڑتا۔ اچھی ہو جاؤ گی۔ دل کیوں چھوٹا کرتی ہو۔" وہ روانی سے بولتی چلی گئی۔ بڑی تیز عورت تھی۔

سلطانہ نے سوچا یہ تو بڑی باتونی عورت ہے۔ گھنٹوں پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ پان چباتی جائے گی اور ہاتھ منکا منکا کر بولتی رہے گی۔ اُس کو بھوک بھی شدت سے لگ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ اٹھکر کمرے سے باہر چلی گئی۔ ماں تکیہ سے کمر ٹکائے۔ آپا کنیز سے باتیں کرنے لگی۔

دورانِ گفتگو میں سلطانہ کی ماں نے اُس سے پوچھا "آپا، حشمت آج کل کیا کر رہا ہے؟"

وہ جھٹ سے بولی "وہیں بجلی گھر میں ہے۔ اب تو وہ بڑا اچھا کاریگر ہو گیا ہے۔ تین روپے روز ملنے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ پریویٹ (پرائیویٹ)، کام سے کبھی دو کبھی ڈھائی کما لاتا ہے۔ ماشاءاللہ اس وقت وہ سب بھائیوں سے مزے میں ہے۔"

سلطانہ کی ماں ذرا دیر تک خاموش بیٹھی دیوار کو تکتی رہی، پھر اُس نے بغیر اس کی جانب دیکھے ہوئے

پوچھا "کہیں اُس کا رشتہ بھی لگایا۔ ایک زمانہ میں تو تم گھر گھر لڑکیاں پسند کرتی پھرتی تھیں"۔

"کل ہی ایک جگہ سے بات آئی تھی۔ مگر لڑکی مجھے پسند نہیں آئی۔ ہاتھی کی سونڈ کی سی ناک تھی اُس کی"۔

سلطانہ کی ماں نے کہا "اے لڑکی تھی یا ہتنی"

اس بات پر دونوں کو ہنسی آگئی۔

ذرا دیر تک کمرے کے اندر گہری خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس سکوت میں سلطانہ کی ماں کی آواز اُبھری "آپا میری سلطانہ کو حشمت کے لئے لوگی؟"

ادھیڑ عمر کی آپا کنیز نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اُس کو دیکھا۔ اس بات پر جیسے اُس کو یقین نہیں آیا تھا۔ کہنے لگی۔

"میں نے تو ہمیشہ تم سے کہا کہ گھر کا لڑکا ہے۔ دیکھا بھالا ہے۔ کوئی عیب نہیں۔ کسی فعل میں نہیں۔ ایک ذرا رنگ سانولا ہے۔ تو مرد کا کیا روپ رنگ دیکھنا۔ کماؤ پوت ہونا چاہیے۔ بیوی کو اچھی طرح رکھے۔ حشمت کو تو تم جانتی ہی ہو۔ نگوڑا لڑکا کاہے کو ہے۔ وہ تو لڑکوں سے گیا گذرا ہے۔ کیا مجال کہ کسی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھ لے" وہ اپنے منجھلے بیٹے کی خوبیاں گناتی رہی اور سلطانہ کی ماں چپ چاپ بیٹھی اُس کی باتیں سنتی رہی۔

جب وہ اپنی بات کہہ چکی تو سلطانہ کی ماں نے کہا "دیکھو آپا میں اب زندگی سے نا اُمید ہو چکی ہوں۔ نہ جانے کس وقت آنکھ بند ہو جائے۔ میں چاہتی ہوں کہ سلطانہ میری زندگی ہی میں اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ ورنہ قبر میں میری روح بلکتی رہے گی"۔ یہ کہتے کہتے وہ رو پڑی۔

"اے کیسی باتیں کر رہی ہو۔ جلد ہی اچھی ہو جاؤ گی"

"نہیں آپا۔ اب میں بچوں گی نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ جتنی جلد ہو سکے اس فرض سے ادا ہو جاؤں"

"تم کہو تو میں کل ہی لڑکے کو لے آؤں۔ نکاح پڑھوا لو۔ رخصتی چاہے بعد میں کر دینا"۔

سلطانہ کی ماں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ جس قدر جلد وہ سلطانہ کے فرض سے ادا ہو جائے۔ دہی

اچھا ہے۔ اس لئے کہ اب وہ اپنی زندگی کی طرف سے خود بھی بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا وہ نیاز کی واپسی کا انتظار کرے یا اُس کے آنے سے پہلے ہی نکاح کی رسم ادا ہو جائے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ نیاز اس رشتے کو نامنظور کردے۔ جب سے اُس نے چند پیسے کما لئے تھے، وہ اپنے خاندانی ہونے کا جھنڈا گاڑنے لگا تھا۔ اور حشمت کا باپ ضلع کچہری میں چپراسی تھا۔ وہ نچلے طبقے کا آدمی تھا اور ویسا ہی اُس کا رہن سہن تھا۔ یہی سب باتیں سوچ کر اُس نے آپا کنیز سے کہا۔

"کل کون سی تاریخ ہے؟"

"چاند کی ۱۳ تاریخ ہے۔"

"نہیں بھئی یہ ۳، ۱۳، ۲۳ ٹھیک نہیں۔ پرسوں جمعرات کا دن ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد تم حشمت کے ساتھ قاضی کو لے کر آجاؤ۔"

"اچھی بات ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔"

اس کے بعد وہ دونوں اسی سلسلہ میں باتیں کرنے لگیں۔ سلطانہ کی ماں کے چہرے پر گہرا سکون تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ اور آپا کنیز کی بات بات پر باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ وہ بڑی خوش معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کے گال کا سیاہ مسا بار بار روشنی میں آجاتا اور پھوڑے کے پر لرزتے ہوئے معلوم ہوتے۔ اسی اثنا میں انو، حشمت کے ہمراہ کمرے کے اندر داخل ہوا۔

حشمت نے سلطانہ کی ماں کو سلام کیا اور دیوار کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر خاموشی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت گہرے نیلے رنگ کی پتلون اور ڈھیلا ڈھالا سا کوٹ پہنے تھا۔ گردن میں اونی گلوبند لپٹا تھا۔ اُس کا رنگ سیاہ تھا۔ آنکھیں ماں کی طرح چھوٹی چھوٹی تھیں اور جسم مضبوط تھا۔ سلطانہ کی ماں نے گردن موڑ کر حشمت کی طرف دیکھا اور بڑے دُکھ کے ساتھ سوچا سلطانہ اس کالے کلوٹے کے قابل تو نہ تھی۔ اس کو تو کسی محل میں بیاہ کر جانا چاہیے تھا۔ وہ تو شہزادی ہے۔ اُس نے بڑی گہری سانس بھر کر دل میں کہا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ کوئی اچھا بر مل جائے مگر اللہ کی مرضی یہی تھی۔ سلطانہ کی قسمت ہی میں یہ کلوٹا لکھا تھا۔

حشمت کے آنے کے بعد سلطانہ کی ماں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ حشمت گردن جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اس وقت ماں کو لینے کے لئے آیا تھا۔ اس گھر میں اس کا آنا جانا بہت کم تھا۔ آپا کنیز سلطانہ کی ماں کی سگی رشتہ دار نہیں تھیں۔ بہت دور کا ننھیالی رشتہ تھا۔ اسی لئے میل جول بھی کم تھا۔ سلطانہ کے لئے وہ کئی بار اشاروں اشاروں میں کہہ چکی تھی۔ دوسروں کے ذریعہ بھی پیغام بھجوایا، مگر ہر بار سلطانہ کی ماں انکار کر چکی تھی۔

آپا کنیز کچھ دیر بعد حشمت کے ساتھ اٹھکر چلی گئی۔ اُن کے جانے کے بعد سلطانہ کی ماں کمرے کے اندر اکیلی لیٹی ہوئی نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ سلطانہ کا رشتہ تو اُس نے حشمت کے ساتھ طے کر دیا، مگر اُس کا دل نہیں ٹھُک رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آپا کنیز مزاج کی بڑی تیز ہے۔ بڑی بہو سے آئے دن اُس کی ٹھنی رہتی تھی۔

وہ خاموش بیٹھی ہوئی یہی سب کچھ سوچ رہی تھی کہ اتنے میں سلطانہ کمرے کے اندر آگئی۔ وہ اُس کے لئے گرم دودھ کا پیالہ لے کر آئی تھی۔ اُس نے ماں کو دودھ پلایا اور بستر پر اُس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ چند لمحے تک خاموشی چھائی رہی، پھر سلطانہ نے پوچھا۔

"اماں اب کیسی طبیعت ہے؟"

وہ بڑے دُکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب میں بچوں گی نہیں۔"

"خدا کے لئے اماں ایسی باتیں نہ کرو۔ ہمارا اب بیٹھا ہی کون ہے۔ لے دے کے ایک تمھارا دم ہے۔"

"ہاں بیٹی میں بھی یہی سوچ رہی تھی کہ میرے بعد تمھارا کیا ہوگا۔ اتو پھر بیٹا ذات ہے۔ مجھے تو سب سے زیادہ تیرا خیال رہ رہ کر ستاتا ہے۔" ماں نے ایک دل دوز آہ بھری اور سر اوپر اٹھا کر بولی۔ "یا اللہ ان لاوارثوں کا تو ہی نگہبان ہے۔"

سلطانہ نے جلدی سے کہا۔ "ایسی باتیں نہ کرو اماں میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ بے اختیار رو پڑی۔

ماں نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھکر تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "رو نہیں بیٹیا" اور اُس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ سلطانہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور سسکیاں بھر کر روتی رہی۔ ماں کہنے لگی "تو تو رونے بیٹھ گئی۔ مجھے تو تجھ سے ابھی بہت سی باتیں کرنی ہیں" اُس نے گہری سانس بھری اور لمحہ بھر رُک کر بولی۔

"میں تیری ماں بھی ہوں، باپ بھی اور سہیلی بھی۔ میرے علاوہ تیرا اور کون بیٹھا ہے۔ بہت سی باتیں جو مجھے تجھ سے نہیں کہنا چاہئیں، وہ بھی کہنا پڑتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں یہ نہیں چاہتی کہ میرے بعد تو اس گھر میں اکیلی رہ جائے۔ کوئی اتنا بھی نہیں کہ تمھارے سر پہ ہاتھ رکھ دے۔ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہوں، اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ کوئی بھی تو اپنا نہیں۔"

سلطانہ خاموش بیٹھی اُس کی باتیں سنتی رہی۔ کمرے کے اندر ماں کی آواز آہستہ آہستہ اُبھرتی رہی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "آپا کنیز نے آج پھر حشمت کا پیغام دیا تھا۔ وہ بجلی گھر میں مستری ہو گیا ہے۔ ڈیڑھ دو سو روپے ہر مہینہ کما لیتا ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی عیب نظر نہیں آیا۔ بڑا سیدھا اور سعادت مند لگتا ہے۔" سلطانہ نے گھبرا کر سوچا۔ ہائے اللہ یہ اماں کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ وہ تو ایک نمبر چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ پچھلی گرمیوں ہی کی تو بات ہے۔ وہ اُس کے گھر میلاد شریف میں گئی تھی۔ سلام پڑھتے پڑھتے اس کا گلا خشک پڑ گیا تھا۔ وہ پانی پینے کے لئے گھڑونچی کی طرف گئی۔ وہ کالا کالا بھوت کی طرح دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ کمبخت اندھیرے میں نظر بھی تو نہیں آتا۔ اس زور سے پکڑ کر دبوچا کہ اُس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ منہ سے بو کیسی آ رہی تھی۔ حرامزادے نے سارا تھوک گالوں پہ چپیڑ دیا۔ سلطانہ کو سخت کراہیت محسوس ہوئی۔ ماں کہتی رہی۔ "میں نے تو رشتہ منظور کر لیا ہے۔ وہ تو کل ہی قاضی کو لانا چاہتی تھیں۔ میں نے پرسوں عشاء کے بعد کا وقت رکھا ہے۔"

سلطانہ کے سینے پر جیسے کسی نے پتھر دے مارا۔ وہ لرز کر رہ گئی۔ اُس نے وحشت زدہ نظروں سے ماں کو دیکھا، جو تکیہ سے سر ٹکائے رُک رُک کر بول رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور آنکھیں بجھتے ہوئے چراغوں کی طرح معلوم ہو رہی تھیں۔ بات کرتے کرتے وہ رُک

کر ہانپنے لگتی۔

ماں بیٹی کی نظریں ایک بار ملیں اور ماں نے محسوس کیا کہ اُس کی بیٹی کی آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں منڈلا رہی تھیں۔ اُس کے غم کو وہ جانتی تھی اور جب اس کی شدت کو اُس نے محسوس کیا تو بیٹی کے سامنے اپنی بے بسی کا بھی اظہار کر دیا۔ سلطانہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ زخمی گائے کی طرح اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ماں کو تکنے لگی۔ ماں نے گھبرا کر بڑے بھونڈے پن سے پوچھا۔

"سلمان بہت دنوں سے نہیں آیا؟"

سلطانہ اب خاموش نہ رہ سکی۔ اُس نے دبی زبان سے کہا "انّو کہتا تھا وہ آج کل بہت مصروف ہیں۔"

ماں کہنے لگی "نہیں بٹیا، وہ بڑے گھر کا لڑکا ہے۔ ہم غریبوں کی اس کو کیا پرواہ۔ کہیں روزگار سے لگ گیا ہوگا۔ کھاتا کماتا، عیش کرتا ہوگا۔ ہمارا اس کا کیا میل جول۔ ٹاٹ کا پیوند ٹاٹ میں لگتا ہے۔"

سلطانہ سر جھکا کر بولی "آپ ان کو بلا کر بات تو کیجیے۔"

"اب بات کرنے کا وقت ہی کہاں رہ گیا ہے۔"

"اس وقت تو وہ مل جائیں گے۔ انّو کو بھیج کر بلا لیجیے۔"

ماں کہنے لگی "انّو اب اس وقت رات میں کہاں جائے گا۔ بچہ ہے اُس کو ڈر لگے گا۔"

سلطانہ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا "میں اس کے ساتھ چلی جاؤں۔"

ماں نے حیرت سے سلطانہ کو دیکھا۔ ایک بارگی اس کو محسوس ہوا کہ وہ سلطانہ کی ماں نہیں، اُس کی سہیلی ہے۔ کوئی بیٹی اپنی ماں سے ایسی بات نہیں کہہ سکتی۔ اور جب بیٹی نے منہ پھوڑ کر اُس سے سب کچھ کہہ ہی دیا ہے تو اُسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ اُسے ایک نامحرم کے پاس جانے کی اجازت دیدے۔ یہ تو بڑی بے حیائی کی بات ہے۔ اُس نے گھبرا کر سوچا۔ میرے اللہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ کیا کر رہی ہے۔ ان پریشانیوں نے اس کو کہیں کا نہ رکھا۔ نہیں اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن میری بچی تو رو رو کر بُرا حال کرے گی۔ زندگی بھر مجھے کوسنے دے گی۔ کہے گی اپنا دل چاہا تو خصم کر کے بیٹھ گئی۔ سوتیلا باپ

لاکر سر پہ بٹھا دیا۔ اُس نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ اپنی بیٹی کے سامنے گنہگار رہے۔

سلطانہ نے ماں کو خاموش دیکھکر کہا "اماں تم ناراض تو نہیں ہوگئیں؟" اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔

ماں نے بے اختیار اُس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ "نہیں میری بچی" اس کی سانس بوجھل ہوگئی اور وہ بُری طرح ہانپنے لگی۔ سلطانہ اُس کے دل کی دھڑکن کو صاف سُن رہی تھی۔ اُس کا سینہ بار بار غبارے کی طرح تن کر سمٹ جاتا۔ وہ اُس کے سینے پر سر رکھے خاموش لیٹی رہی۔

ماں ذرا دیر خاموش رہ کر کہنے لگی۔ جاؤ انّو کو جگا کر اپنے ساتھ لے لو۔ مگر دیکھو جلدی آجانا۔ اکیلے میں میرا بڑا دل گھبرائے گا۔ جب تک تم آؤ گی نہیں۔ میں جاگتی رہوں گی۔"

سلطانہ نے آہستہ سے کہا "اچھا" اس کا دل بلّیوں اُچھل رہا تھا۔ وہ پلنگ سے اُتر کر نیچے آگئی۔

جب وہ کمرے سے باہر جانے لگی تو ماں نے ایک بار پھر ٹوک کر کہا "دیکھو جلدی آجانا"

سلطانہ نے فوراً کہا "نہیں اماں میں جلدی آجاؤں گی۔"

ماں نے دیکھا۔ سلطانہ کے چہرے پر سرخی آگئی تھی اور اُس کی آنکھیں مسرت سے سنگ ستارے کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ اس کو بڑا سکون محسوس ہوا۔ اُس نے جسم کو ڈھیلا کر دیا اور کروٹ بدل لی۔

سلطانہ نے اپنے کمرے میں جاکر انّو کو بیدار کیا اور اُس کو اپنے ہمراہ لے کر باہر گلی میں آگئی۔ جاڑوں کی رات تھی۔ ہر طرف سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ راستوں پر اِکّا دُکّا راہگیر نظر آرہے تھے۔ جب وہ نلک پیما کے ہیڈ کواٹر پر پہنچی تو دس بج چکے تھے۔

سلمان اس وقت لائبریری میں بیٹھا مطالعہ میں غرق تھا۔ اچانک باہر انّو کی آواز سُنائی دی۔ وہ اُس کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ سلمان باہر آیا۔ انّو کے ساتھ سلطانہ کو اتنی رات گئے دیکھکر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اُس نے بڑے تعجب کے ساتھ پوچھا۔

"ارے تم!"

سلطانہ نے آہستہ سے کہا "آپ تو اب آتے ہی نہیں۔ میں نے کہا چلو میں ہی چلی چلوں۔"

وہ اظہار معذرت کرتے ہوئے بولا "میں آج کل بے حد مصروف ہوں۔ ذرا بھی مہلت نہیں ملتی۔

اب اماں کی طبیعت کیسی ہے ؟"

"اب تو ان کو روز دورہ پڑنے لگا ہے"

سلمان نے سوچا اس طرح بات کرنا مناسب نہیں ۔ لہٰذا اُس نے سلطانہ سے کہا " میں ابھی آتا ہوں" اور یہ کہکر اندر چلا گیا ۔ اُس نے ڈاکٹر زیدی سے ڈسپنسری کی کنجی لی اور باہر آکر سلطانہ اور الّو کو لئے ہوئے ڈسپنسری پر پہنچا ۔ قفل کھولا ۔ اور اندر جاکر موم بتی جلائی ۔

الّو کی موجودگی میں سلطانہ اُس سے باتیں کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی ۔ سلمان نے اس بات کو جلد ہی بھانپ لیا ۔ اُس نے الماری کے اندر سے ایک اور موم بتی نکالی اور سلطانہ کے ہمراہ پچھلے کمرے میں چلا گیا ۔ اس کمرے میں ایک لمبی سی میز بچھی تھی اور اُس کے گرد چند کرسیاں پڑی تھیں ۔ سلمان نے سلطانہ کو ایک کرسی پر بٹھایا اور موم بتی روشن کر کے میز پر رکھدی ۔ روشنی ہوتے ہی کمرے کی سفید سفید دیواریں جھلکنے لگیں ۔ سلطانہ سیاہ برقعہ پہنے ہوئے تھی ۔ اس کا صرف چہرہ نظر آرہا تھا ۔ موم بتی کی پوری روشنی میں اس کی دل کشی نکھر گئی تھی ۔ لانبی لانبی پلکوں کے سائے میں اس کی آنکھیں گھنے درختوں سے ڈھکی ہوئی جھیلوں کی طرح شفاف نظر آرہی تھیں ۔

سلمان لمحہ بھر تک اس کے خوبصورت چہرے کو تکتا رہا ۔ پھر اُس نے پوچھا " اب یہ بتاؤ کہ اتنی رات گئے تم کیسے یہاں آگئیں ؟ "

وہ آہستہ سے بولی " میں اس وقت یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے ؟ "

اُس نے نگاہیں اٹھا کر سلمان کی جانب نہیں دیکھا ۔ اسی طرح گردن جھکائے خاموش بیٹھی رہی ۔

سلمان تذبذب میں پڑ گیا ۔ وہ کسی ایسی بات کے لئے بالکل تیار نہیں تھا ۔ دراصل اب تک اُس نے سلطانہ کے متعلق سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا تھا ۔ لہٰذا وہ اس کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا ۔

اُس کو خاموش دیکھکر سلطانہ کا دل کسی نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگا ۔ اُس نے رُک رُک کر کہا ۔

"اب شاید مجھکو اس طرح گھر سے نکلنے کی اجازت نہ ملے"

"کیوں؟"

سلطانہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔"اماں میری شادی کر رہی ہیں۔"

سلمان کو اُس کی بات پر یقین نہ آیا۔ پوچھنے لگا۔"کب؟"

"پرسوں رات کو"

اُسے پھر بھی یقین نہ آیا۔ خواہ مخواہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا "ارے اتنی جلدی" پھر وہ زیر لب مسکرا دیا۔ "یہ ویسی ہی تو شادی نہیں ہو رہی ہے، جیسی ایک بار اور تمھاری اماں کر رہی تھیں۔"

سلطانہ نے گھور کر اُس کو دیکھا۔ سلمان کی بات اُس کو پسند نہ آئی۔ اُس نے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا "وہ اور بات تھی۔ آپ اس کی وجہ بھی جانتے ہیں" لمحہ بھر وہ خاموش رہی۔ پھر اُس نے بجھے ہوئے لہجہ میں بتایا۔"اماں کی طبیعت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ بار بار کہتی ہیں کہ اب میں بچوں گی نہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے میرا بیاہ کر دیں۔ وہ اپنی زندگی سے بڑی نا اُمید ہو چکی ہیں۔ آپ نے اِدھر اُن کو دیکھا نہیں۔ اُن کی حالت دیکھ کر تو کلیجہ پھٹتا ہے۔" سلطانہ کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس نے دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے اور گردن جھکا لی۔ موم بتی کی ہلکی ہلکی روشنی میں اُس کا چہرہ اُداس نظر آ رہا تھا۔

سلمان نے خاموشی کے ساتھ سلطانہ کے غمگین چہرے کو دیکھا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ معصوم سی لڑکی: جو سرما کی اس سنسان رات میں اُس سے ملنے آئی ہے، اس کو پسند ہے، وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ لیکن کیا وہ اس کے لئے فلک پیما کو چھوڑ سکتا ہے۔ اس جماعت کو جس میں شامل ہونے کے بعد اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی موجودہ روِش کو تبدیل کر دے گا۔ یہ زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی جد و جہد تھی۔ جس میں اس کے ارمان، اس کی خواہشیں، اس کی خوشی اور اُس کا غم پھیل کر لاکھوں اور کروڑوں انسانوں میں بٹ گیا۔ یہ ایک اسکائی لارک کی زندگی تھی۔ جس کا نصب العین خدمت خلق تھا، عوام کی بھلائی اور بہبودی کے لئے برسرِ پیکار رہنا اُس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ سلطانہ سے شادی کرنے کے بعد وہ اسکائی لارک نہیں رہ سکے گا۔ اُسے فلک پیما کو چھوڑنا ہی پڑے گا۔

وہ ایک بیوی کا شوہر بن جائے گا۔ پھر اُسے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے ملازمت کرنا پڑے گی چند سال بعد وہ باپ بن جائے گا۔ اُس کے اخراجات بڑھ جائیں گے، اس کو اور زیادہ کمانا پڑے گا ایک بچہ، دوسرا بچہ، کئی بچے۔ آمدنی، اور زیادہ آمدنی، اور زیادہ آمدنی، یہ سلسلہ ساری زندگی چلتا ہے گا صبح سے شام تک ایک ہی فکر، ایک ہی چکر۔ دنیا میں کروڑوں انسان پیدا ہوتے ہیں اور اسی چکر میں تمام عمر پھنسے رہتے ہیں۔ اور ایک روز، ایک بیوی کو، چند بچوں کو، چند بچوں کے بچوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس دنیا سے سدھار جاتے ہیں۔ زندگی کائنات کی طرح وسیع ہے، ہر لمحہ، ہر گھڑی ارتقا پذیر ہے۔ وہ اس قدر محدود نہیں ہو سکتی۔ تو کیا وہ اس لڑکی کو، جس کے لئے کبھی وہ رویا بھی ہے، پاگلوں کی طرح پریشان رہا ہے، کسی دوسرے کو سونپ دے۔ کیا مضائقہ ہے۔ زائد سے زائد یہی تو ہوگا کہ وہ اُس کی زندگی کی ایک المناک یاد بن جائے گی۔ اور یہ یادیں اسی وقت حملہ آور ہوتی ہیں۔ جب زندگی میں جدوجہد نہیں رہتی۔ جب آدمی تھک جاتا ہے۔ مگر اُس کے سامنے تو بہت بڑا پروگرام ہے۔ اتنا بڑا پروگرام کہ اگر اس کو ایسی کئی زندگیاں ملیں تو بھی اُس کا مشن ختم نہیں ہوگا۔

ایکا ایکی گہری خاموشی میں سلطانہ کی آواز اُبھری " مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے یہاں آکر آپ کو پریشان کر دیا " سلمان کا سلسلہ خیالات منقطع ہوگیا۔ اس نے چونک کر کہا۔

" نہیں تو "۔

وہ اُس کی بات پر صرف مسکرا کر خاموش ہوگئی۔

سلمان پوچھنے لگا۔ جس کے ساتھ اماں نے تمہارا رشتہ طے کیا ہے۔ وہ کیا کرتا ہے ؟ "

" بجلی گھر میں مستری ہے "

" تمہارا رشتہ دار ہے ؟ "

" ہاں "

" اماں کو وہ پسند ہے ؟ "

" کہتی تو وہ یہی ہیں "

سلطانہ بغیر غور کئے سلمان کے ہر سوال کا جواب دیتی چلی گئی۔ سلمان ذرا دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر اُس نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اُس سے شادی کر لو۔"

سلطانہ کو ایسا محسوس ہوا، گویا کمرے میں جلتی ہوئی موم بتی کی لو بھڑک کر بجھ گئی ہے۔ اُس کے چاروں طرف تاریکی کا جال پھیل گیا ہے اور اُس گھنگھور اندھیرے میں وہ آہستہ آہستہ ڈوبتی جا رہی ہے۔ اُس سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ وہ پتھر کے مجسمہ کی طرح دم بخود نظر آ رہی تھی۔

سلمان نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا "یہ ہم دونوں ہی کے لئے بہتر ہے۔"

سلطانہ نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔ میں یہاں آئی ہی کیوں۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ کم سے کم یہ بات تو نہ سنتی، جس نے اُس کے کلیجہ کو چیر ڈالا۔ یا اللہ یہ کیسی تکلیف ہے۔ یہ کیسا دُکھ ہے۔ میں کیا کروں۔ ہائے میں کیا کروں۔ اُس نے محسوس کیا کہ کہیں وہ بے ہوش نہ ہو جائے، کہیں وہ لڑکھڑا کر گر نہ پڑے۔ گھبرا کر وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی اور اُکھڑی ہوئی آواز کے ساتھ بولی۔

"اچھا اب میں چلوں گی"

سلمان نے اُس کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کہنے لگا "دیکھو سلطانہ بات یہ ہے"

لیکن سلطانہ نے اُس کی کوئی بات نہ سنی۔ اُس نے آہستہ سے کہا "بات تو اب ختم ہو چکی"

اور وہ کھوئی کھوئی نظروں سے سلمان کو تکنے لگی۔ اُس نے گہری سانس بھری اور قریب جا کر سلمان کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں لے لیا۔ پھر وہ اُس پر جھک گئی۔ اس کی پیشانی کو چوما اور علیحدہ ہو گئی۔ نہ وہ روئی نہ اُس نے زبان سے ایک لفظ نکالا۔ چپ چاپ دوسرے کمرے میں آ گئی۔

انو بیٹھا اونگھ رہا تھا اس کو دیکھ کر چونک پڑا۔ سلطانہ نے اُس کو ساتھ لیا اور ڈسپنسری کے باہر جانے لگی۔ سلمان اُس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اُس نے فوراً کہا "چلو میں تم کو گھر تک چھوڑ آؤں۔ رات بہت گذر چکی ہے۔" سلطانہ اس کی جانب دیکھے بغیر کہنے لگی "نہیں میں اس سرد رات میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتی۔"

اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ شاید وہ رو رہی تھی۔

اس کے بعد دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ سلطانہ ڈسپنسری سے باہر آگئی۔ دونوں بہن بھائی سنسان رات میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ بستی پر ہو کا عالم طاری تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی سناٹا تھا۔ رات اور بھیگ چکی تھی۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ دونوں کے جسم خنکی سے کانپ رہے تھے۔

سنسان سڑکوں کو طے کر کے جب دونوں محلے کی گلی میں داخل ہوئے تو ایک باگی کتوں کے زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ رات کے آسیب زدہ سناٹے میں اُن کی آوازیں بڑی ہیبت ناک معلوم ہو رہی تھیں دونوں سہم کر رہ گئے۔ سلطانہ کا دل زور زور دھڑکنے لگا۔

گھر پر جا کر سلطانہ نے دیکھا کہ دروازہ کھلا پڑا تھا اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ خوف زدہ سی اندر داخل ہوئی۔ اُس نے سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ گھر کے اندر گہری خاموشی چھائی تھی۔ ماں کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ سیدھی وہیں پہنچی۔ ماں تکیہ کے سہارے خاموش پڑی تھی۔ اُس کا منہ دیوار کی طرف اور ایک ہاتھ پلنگ کے نیچے جھول رہا تھا۔ وہ لپک کر اُس کے قریب پہنچ گئی۔ اُس نے ماں کے ہاتھ کو اٹھایا تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُس نے بدحواس ہو کر کہا۔

"اماں، اماں۔"

ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسی طرح خاموش پڑی رہی۔ سلطانہ نے گھبرا کر ماں کے جسم کو ہلایا اور چیخ کر بولی "اماں، اماں۔ میری اماں منہ سے تو بولو" ماں اب کیا بولتی وہ تو کب کی مر چکی تھی۔ سلطانہ چیختی رہ گئی۔ اُس کو آواز دیتی رہ گئی۔ اُس نے پہنچنے میں دیر کر دی۔

فَصل هَفتم

۱

اسکائی لارکوں کی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔

شہر کی مختلف بستیوں میں، تحریک بالغاں کے تحت 'فلک پیما' کے پانچ اسکول چل رہے تھے۔ دو دارالمطالعے قائم تھے۔ ڈسپنسری صرف ایک تھی مگر صبح و شام اس پر مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ کئی کئی میل سے چل کر مریض وہاں آتے تھے۔ ڈاکٹر زیدی کو سر اٹھانے کی مہلت نہ ملتی۔ اکثر راتوں کو لوگ، گہری نیند سے اس کو بیدار کر کے اپنے ہمراہ لے جاتے، مگر اس کی پیشانی پر کبھی شکن تک نہ آئی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا، اور کبھی کبھی تو کپڑے تبدیل کئے بغیر مریض کو دیکھنے چلا جاتا۔ اس حلیہ میں وہ ڈاکٹر کے بجائے کمپاؤنڈر معلوم ہوتا اور اس کو ڈاکٹر تسلیم کرنے میں مریضوں کو مشکل سے یقین آتا تھا۔

ان اداروں کے علاوہ فلک پیما نے گھریلو صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے ایک انڈسٹریل ہوم بھی کھولا تھا۔ اس کے دو شعبے تھے، ایک میں مرد دستکار اور کاریگر کام کرتے تھے اور دوسرا زنانہ حصہ تھا۔ اس میں بیوہ اور لاوارث عورتوں کو تربیت بھی دی جاتی اور ان سے گھریلو مصنوعات بھی تیار کرائی جاتیں۔ 'انڈسٹریل ہوم' کا بنا ہوا مال بازار میں فروخت کیا جاتا۔ فلک پیما کا پروگرام تھا کہ شہر کے کسی بازار میں، 'انڈسٹریل ہوم' کی جانب سے ایک شوروم کھول دیا جاتے۔ جہاں مصنوعات کی نمائش بھی ہو سکے اور ان کو فروخت بھی کیا جائے۔ اس طرح دوکانداروں کو جو کمیشن دیا جاتا تھا، وہ بچ جاتا۔ مگر یہ تجویز عملی جامہ نہ پہن سکی۔

ہوا یہ کہ ایک روز کوئی دو بجے شب کو ایک شخص ڈاکٹر زیدی کے پاس آیا۔ وہ آدھ گھنٹہ پہلے ہی کسی مریض کو دیکھکر آیا تھا اور تھکا ہارا بے خبر سو رہا تھا۔ اُسے مجبوراً اٹھنا پڑا۔ آنکھیں ملتا ہوا وہ ڈسپنسری میں گیا۔ ایمرجنسی دواؤں کا بیگ اُٹھایا اور اس شخص کے ساتھ ہولیا۔ اس آدمی کا چہرہ پچھلی رات کے چاند کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا اور جلدی جلدی بول رہا تھا۔ اس کی باتوں سے ڈاکٹر نے اندازہ لگایا کہ کسی عورت کا کیس تھا۔ مریضہ اس شخص کی بیوی تھی اور اُس کی حالت بہت نازک تھی۔

ڈاکٹر زیدی نے جاکر دیکھا۔ مریضہ ایک میلے ہوئے تنگ و تاریک کمرے کے اندر چٹائی پر بے سُدھ پڑی تھی۔ کمرے کے اندر چراغ جل رہا تھا۔ جس کی روشنی میں وہ لاش کی طرح نظر آرہی تھی اُس کے بال دُور تک بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ نیلا پڑگیا تھا اور منہ سے سفید سفید جھاگ نکل رہا تھا۔ ڈاکٹر نے مشتبہ نظروں سے مریضہ کو دیکھا۔ اُس نے کوئی زہریلی چیز کھاکر خودکشی کی کوشش کی تھی۔ پہلا خیال اُس کے ذہن میں یہی آیا۔ اُس نے مریضہ کا معائنہ کیا تو اُس کا خیال درست نکلا اُس نے مریضہ کے شوہر سے پوچھا۔

"تمھارا آپس میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا؟"

وہ آدمی کہنے لگا "جھگڑا وگڑا تو کوئی نہیں ہوا۔" اس کی بات میں ذرا بھی جھجک اور گھبراہٹ نہیں تھی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔

ڈاکٹر نے ذرا دیر خاموش رہ کر کہا "پھر اُس نے زہر کھانے کی کیوں کوشش کی؟"

اُس کا زرد چہرہ، حیرت و خوف کے ملے جُلے تاثر سے سیاہ پڑگیا۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو گھبراہٹ میں جلدی جلدی گردش دے کر کہا "زہر؟" لمحہ بھر کے لئے اُس نے کچھ سوچا "نہیں ڈاکٹر صاحب وہ زہر تو کھا ہی نہیں سکتی" یہ بات اُس نے بڑے یقین کے ساتھ کہی تھی۔

"تو پھر اُس نے آج کیا کھایا ہے؟"

ڈاکٹر کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ جھجکنے لگا۔ اُس کی اس حرکت سے زیدی کو ایک بار پھر

شبہ ہوا کہ یہ ضرور خودکشی کا کیس ہے اور اس آدمی کو اس کا ضرور علم ہے۔ وہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے لہٰذا اُس نے کسی قدر روکھے پن سے پوچھا۔

"بتاتے کیوں نہیں کہ اس نے کیا کھایا ہے؟"

اس شخص کا چہرہ مردے کی طرح خاکستری نظر آنے لگا۔ وہ ڈاکٹر سے نظریں نہ ملا سکا۔ وہ ملزموں کی طرح گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ اُس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور حلق سے اس طرح نکل رہی تھی، جیسے وہ سسکیاں بھر رہا ہے۔ اُس نے جو بات بتائی، اُس کو سن کر ڈاکٹر زیدی لرز کر رہ گیا۔

وہ شخص دو ماہ سے بے روزگار تھا۔ پہلے وہ کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اور عام تخفیف کے زمانہ میں اس کو علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اب تک نہ تو اس کو کوئی ملازمت ملی تھی اور نہ اتنا سرمایہ تھا، جس سے وہ کوئی چھوٹا موٹا دھندا شروع کر دیتا۔ پرسوں صبح سے دونوں میاں بیوی مسلسل فاقہ کشی کر رہے تھے۔ مگر سب سے زیادہ پریشانی شیرخوار بچے کی جانب سے تھی، جس نے دودھ کے لئے ماں کی چھاتیوں کو نوچ نوچ کر زخمی کر دیا تھا۔ آج شام وہ کہیں سے قرض اُدھار کا بندوبست کرنے گیا تھا۔ واپس آ کر اُس نے دیکھا کہ بیوی بار بار قے کر رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اُس نے بتایا کہ جب بچے نے اُس کو بہت پریشان کیا تو وہ کوڑا ڈالنے کے ڈرم میں سے کھانے کی اشیاء ڈھونڈ کر لائی تھی اور اُن کو اُس نے کھا لیا تھا۔ اس کے بعد سے اُس کی یہ حالت ہو گئی۔

ڈاکٹر زیدی نے اس شخص کو دیکھا، جو مجرموں کی طرح گردن جھکائے شرمسار کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ سانپ کے پیٹ کی طرح مٹیالا نظر آ رہا تھا۔ دیوار کے قریب اُس کی بیوی بیہوش پڑی تھی۔ اُس کے سر کے بال بڑے دہشت انگیز طریقے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک گندے سے کپڑے میں ایک بچہ لپٹا ہوا لاش کی مانند پڑا تھا۔ طاق میں رکھا ہوا چراغ بار بار بھڑکتا تو پُراسرار سائے دیواروں پر سرسراتے ہوئے معلوم ہوتے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کہیں سے بے حد خوفناک چیخیں بلند ہونے والی ہیں۔

ڈاکٹر نے مریضہ کو دوا دی اور واپس ہیڈ کوارٹر آ گیا۔ بستر پر وہ بہت دیر تک اُن کے متعلق غور

کرتا رہا۔ مہینہ کے آخر میں جب اس نے فلک پیما کے جلسہ میں اپنی رپورٹ پیش کی تو اس واقعہ پر خاص طور پر زور دیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر زیدی نے یہ تجویز پیش کی کہ چھوٹے پیمانے پر ایک امدادی بنک قائم کیا جائے۔ جس سے آسان قسطوں پر اور منافع کی بہت معمولی شرح پر ضرورت مندوں کو قرضے دیئے جائیں۔ تاکہ وہ اس سے کوئی کاروبار شروع کر سکیں۔ اس تجویز کو اسکائی لارکوں نے پسند کیا اور یہ طے کیا گیا کہ ایک کمیٹی قائم کی جائے جو بنک کے لئے ایک منصوبہ تیار کرے۔

ہفتہ بھر کے اندر ہی اندر کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ صفدر بشیر نے اس کام کے واسطے فلک پیما کو مزید ۲۰ ہزار روپیہ دیا۔ امدادی بنک قائم ہو گیا۔

فلک پیما کا کام جس قدر وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ اسکائی لارکوں کی مصروفیت اسی قدر بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر اسکائی لارک کو کئی کئی شعبوں میں کام کرنا پڑتا۔ چنانچہ مجلس عاملہ کے سامنے یہ تجویز زیر بحث آئی کہ اسکائی لارکوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ بہت سے نوجوان اس کے لئے آمادہ تھے۔ وہ سمجھدار اور تعلیم یافتہ بھی تھے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اسکائی لارکوں کی تعداد بڑھا کر ۱۵ تک کر دی جائے اس سے زیادہ تعداد بڑھانے کی گنجائش نہیں تھی۔ صفدر بشیر اب تک ۵۰ ہزار روپیہ فلک پیما کے فنڈ کے لئے دے چکا تھا۔ جماعت اس پر زیادہ بار ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ البتہ چندہ کے ذریعہ فنڈ مہیا کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا مگر اس کے لئے ہنوز کسی مہم کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ فلک پیما کو اپنے منصوبوں کے لئے روپے کی ضرورت تھی، جو روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

ان ہی دنوں جب فلک پیما کی مجلس عاملہ سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پہ غور کر رہی تھی۔ ایک رات خان بہادر کے آنے کی اطلاع ملی۔ اسکائی لارکوں کو اس کی آمد پر سخت حیرت ہوئی۔ صفدر بشیر اور علی احمد نے لائبریری میں خان بہادر سے ملاقات کی۔

یہ مارچ کی ایک خوشگوار رات تھی۔ اس وقت ۱۰ بج چکے تھے۔ خان بہادر ہلکے پھلکے لباس میں تھا۔ حسب معمول اس کے چوڑے چکلے چہرے پر مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ خوش طبع بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس سے اس کے انداز میں تصنع پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ

ایک خاص برانڈ کی سگرٹیں لایا تھا، جو بازار میں نایاب تھیں۔ اس نے دونوں اسکاؤٹ لڑکوں کو اصرار کر کے اپنی سگرٹ پلائی اور لائٹر نکال کر اُن کو سُلگایا بھی۔ یہ لائٹر خالص سونے کا بنا ہوا تھا اور اس پر ایک قیمتی پکھراج جڑا ہوا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں وہ بار بار جھلملاتا تو دیواروں پر ستارے چمک اٹھتے۔ خان بہادر نے اپنی گفتگو کا آغاز اسی لائٹر سے کیا۔ وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ کس قدر قیمتی ہے اور کس طرح اُسے ملا۔ اس بات کو وہ بہت دلچسپ بنا کر سُنا رہا تھا۔ مگر علی احمد کو ان باتوں میں ذرا بھی دلچسپی نہ معلوم ہوئی۔ خان بہادر کے آنے سے پیشتر وہ اپنی ہفتہ بھر کی سرگرمیوں کی رپورٹ تیار کر رہا تھا اور یہ سوچ کر آیا تھا کہ خان بہادر سے جلد ہی چھٹکارا حاصل کرے گا لیکن صفدر بشیر کچھ اور بھی زیادہ اس کی باتوں سے اُکتایا ہوا تھا۔ لہٰذا اُس نے خان بہادر کی بات کاٹ کر کہا۔

"معاف کیجئے گا خان بہادر صاحب، ٹھیک ساڑھے دس بجے ہماری ایک میٹنگ ہے۔"

خان بہادر جہاں دیدہ آدمی تھا۔ اُس نے ایک ہی جملے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ دونوں بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ وہ بے تکلفی سے مسکرا کر بولا "بھئی میں تو کفارہ ادا کرنے آیا تھا۔"

صفدر بشیر نے حیرت سے پوچھا "یعنی؟"

خان بہادر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی کے ساتھ اپنا پورٹ فولیو کھولا چیک بک نکالی اور ۲ہزار کا چیک کاٹ کر صفدر بشیر کے سامنے ڈال دیا۔ دونوں اسکاؤٹ لڑکے غور سے چیک کو دیکھنے لگے۔ خان بہادر بڑی مسکین سی شکل بنا کر بولا۔

"یہ آپ کی امانت ابھی تک میرے پاس محفوظ تھی۔ آج میں نے سوچا کہ چل کر اس کو واپس کر آؤں"

علی احمد نے سوچا کہ خان بہادر اس وقت ضرور کوئی نئی تکڑم لڑانے آیا ہے۔ اُس نے مشکوک نظروں سے خان بہادر کو دیکھا، جو چپ چاپ بیٹھا بلا وجہ مسکرا رہا تھا۔ اُس کے انداز سے خوشامد صاف جھلک رہی تھی۔ علی احمد نے فوراً دریافت کیا۔ "اس کے ساتھ جو شرائط ہوں، وہ بھی لگے ہاتھ بتا دیجئے۔ تاکہ ہم جلد ہی کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔"

خان بہادر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا "بھئی آپ لوگ تو میری طرف سے بڑے بدظن معلوم ہوتے

ہیں۔ دیکھئے مسجد کا مسئلہ خالص مذہبی مسئلہ تھا اور ایک باایمان مسلمان کی طرح میرا یہ فرض تھا۔"
علی احمد نے اس کو آگے کچھ کہنے کا موقعہ نہ دیا۔ اُس نے ٹوک کر کہا۔

"بہتر ہوگا کہ اس وقت ہم اُس مسئلہ پر بات چیت نہ کریں۔"

وہ کھسیانہ ہو کر ہنسنے لگا۔ "چلئے اس کے متعلق گفتگو نہیں ہوگی۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ آپ لوگ میرے متعلق کسی شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں" وہ اپنی پوزیشن صاف کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ مگر دونوں اسکائی لارک اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے اور اس قضیہ پر اس وقت قطعی بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس دفعہ صفدر بشیر بیچ میں بول پڑا۔

"اس بات کو تو فی الحال آپ چھوڑ ہی دیں۔"

"اچھا اس کے بارے میں میں پھر کسی وقت بات کروں گا۔"

علی احمد نے کہا "آپ نے اپنی شرائط نہیں بتائیں" وہ چاہتا تھا کہ خان بہادر کھل کر بات کرے تاکہ وہ یہ اندازہ لگا سکے کہ وہ آئندہ کیا کرنے والا ہے اور اُس ۲۰ ہزار روپے کی پیش کش سے اس کا اصل مقصد کیا ہے۔

"بھئی میری کوئی شرط ورط نہیں۔ جیسا کہ میں پہلی ملاقات میں کہہ چکا ہوں کہ جو آپ کی پارٹی کا پروگرام ہے۔ وہی میں چاہتا ہوں۔ خدا کا خوف ابھی دل میں باقی ہے۔ اس لئے دل میں کچھ خدمت خلق کا بھی جذبہ ہے۔ تھوڑی بہت جو زندگی رہ گئی ہے۔ چاہتا ہوں کہ اس کو عوام کی بھلائی اور بہبودی میں گذار دوں۔"

علی احمد نے کہا "یہ تو بڑا نیک جذبہ ہے۔"

خان بہادر نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "بس آپ لوگوں کے تھوڑے سے تعاون کی ضرورت ہے۔" اُس کے لہجہ میں عجز تھا۔

صفدر بشیر نے فوراً پوچھا "کس قسم کا تعاون؟"

"بات یہ ہے کہ آج سے تقریباً تین ماہ بعد، یعنی مئی میں میونسپل بورڈ کے انتخابات ہو رہے

ہیں۔ میں اس حلقے سے کھڑا ہو رہا ہوں۔ ویسے میرا اپنا کوئی ایسا ارادہ نہ تھا۔ بعض آپ ہی لوگوں جیسے کرم فرماؤں کا اصرار تھا کہ میں انتخابات میں ضرور حصہ لوں۔ چنانچہ مجبوراً مجھے آمادہ ہونا پڑا۔"

خان بہادر آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ اُس کے لہجہ میں پوری سنجیدگی تھی "سارا پروگرام بن چکا ہے، مگر آپ کی پارٹی کے بغیر یہ پروگرام ادھورا ہے۔"

صفدر لبشیر نے مسکرا کر کہا "ہمارے تعاون کے بغیر بھی آپ الکشن لڑ سکتے ہیں۔"

"آپ حضرات کا تعاون تو بہت ضروری ہے۔ آپ کی پارٹی نے اس علاقے کے لوگوں کی بہتری کے لئے جو کچھ کیا ہے، اور جس قدر آپ لوگوں کی یہاں عزت ہے، اس کو کون نہیں جانتا۔ بلکہ اگر میری بات کو آپ خوشامد نہ تصور کریں تو میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ ان بستیوں کے لوگ تو آپ حضرات کی پرستش کی حد تک عزت کرتے ہیں۔ اور وہ بے جا بھی نہیں ہے آپ کے کارنامے اسی جذبہ کے مستحق ہیں۔"

علی احمد نے کہا "دیکھئے خان بہادر صاحب ہماری جماعت کا فی الحال کوئی سیاسی پروگرام نہیں ہے۔ اس لئے اگر آپ ہم کو ان کانٹوں میں نہ گھسیٹیں تو بہت بہتر ہے۔"

اُس نے فوراً کہا "میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کی ہمدردی مجھے مل جائے۔ یہی بہت ہے۔" اُس نے چیک کی طرف اشارہ کر کے کہا "فی الحال آپ میرا یہ نذرانہ قبول کریں، آئندہ بھی جو کچھ ہو سکا خدمت کرتا رہوں گا۔"

علی احمد نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا "یہ تو آپ ایک طرح کی ہماری پارٹی کو رشوت دے رہے ہیں۔"

"نہیں صاحب یہ رشوت کیسے ہو سکتی ہے؟"

صفدر لبشیر نے کہا "چلئے رشوت نہ سہی، پارٹی کے تعاون کی قیمت تو بہر حال آپ لگا ہی رہے ہیں"

علی احمد نے صفدر لبشیر کی تائید کی "اور اگر یہ تعاون کی قیمت ہی ہے تو معاف کیجئے گا خان بہادر صاحب آپ نے ہماری پارٹی کی بہت کم قیمت لگائی، میں اس بات پر احتجاج کروں گا۔"

خان بہادر ان دونوں کی باتوں سے کسی قدر بدحواس ہو گیا۔ گھبرا کر بولا "آپ لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں تو پورے خلوص کے ساتھ آپ کی امداد کرنا چاہتا ہوں"

وہ دونوں اس کے خلوص کو ایک بار آزما چکے تھے۔ وہ تجربہ ان کے لئے بہت تلخ تھا۔ اس لئے ان کو خان بہادر کی باتوں پر ذرا بھی اعتبار نہ آیا۔ ان میں جو ذرا سی غیر سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے اس کو برقرار رہنے دیا۔ علی احمد کہنے لگا "دیکھئے خان بہادر صاحب آپ کاروباری آدمی ہیں۔ اس بات سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے۔ لہذا آپ کوشش بھی کریں تب بھی آپ کسی مسئلہ کو کاروباری انداز سے سوچے بغیر رہ ہی نہیں سکتے"

صفدر بشیر نے کہا "اور آپ تو بڑے تجربہ کار بزنس مین ہیں۔ یہ جوہر تو خدا کسی کسی کو دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر میں ایک کامیاب تاجر بننا چاہوں تو کبھی نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے تو ایک مخصوص ٹمپرامنٹ (ذہنیت) کی ضرورت ہے۔ جس کو حاصل کرنے کے لئے ایک عمر چاہیے" وہ بڑی روانی سے بول رہا تھا۔

خان بہادر بڑا سٹ پٹایا مگر وہ اتنی جلدی ہتیار ڈالنے والا نہیں تھا۔ کہنے لگا "اگر آپ حضرات نے تعاون کیا اور خدا کا فضل شامل رہا۔ میں میونسپلٹی کا ممبر منتخب ہو گیا تو آپ دیکھیں گے کہ میں عوام کی کس خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ خدمت کرتا ہوں"

"آپ کے خلوص کا تو ہم کو بخوبی اندازہ ہے" صفدر بشیر نے طنز کیا۔ علی احمد نے بھی اس کو معاف نہ کیا۔ فوراً ہی وار کیا "اور آپ کی نیت پر کون کافر شبہ کر سکتا ہے۔ آپ کے ایسے باایمان مسلمان کی نیت پر تو کسی قسم کے شبہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

خان بہادر جہاں دیدہ آدمی تھا، فوراً بھانپ گیا کہ بات بننے کے بجائے بگڑتی جا رہی ہے۔ اس نے فوراً پینترہ بدلا اور چہرہ کو باوقار بنا کر بولا "دیکھئے یہ بات تو آپ لوگ خود ہی کہہ چکے ہیں کہ آپ کی پارٹی کا کوئی سیاسی پروگرام نہیں ہے۔ لہذا آپ انتخابات میں کسی نہ کسی امیدوار کی امداد تو ضرور ہی کریں گے۔ اگر وہ امیدوار آپ مجھکو ہی مان لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ میری ذات سے آپ کی

پارٹی کو فائدہ ہی پہنچے گا۔"

علی احمد نے کہا۔ "یہی تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آپ فلک پیما کو کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں ۲۰ ہزار کی رقم تو بہت تھوڑی ہے۔ میں اس پر پہلے ہی احتجاج کر چکا ہوں۔"

خان بہادر نے جواب دیا۔ "بیس ہزار کی رقم کم نہیں ہوتی۔ اس سے آپ اپنی پارٹی کے لئے ایک بہتر دفتر تعمیر کر سکتے ہیں۔ یہ عمارت تو آپ کی پارٹی کے لئے ہرگز شایانِ شان نہیں۔ یہاں بجلی تک تو ہے نہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔ بہرحال آپ کی بات کا احترام بھی ضروری ہے۔ چلیئے ۲۵ ہزار کا میں چیک کاٹے دیتا ہوں۔"

علی احمد بدستور غیر سنجیدگی کے موڈ میں تھا۔ "نہیں خان بہادر صاحب، یہ تو بہت کم قیمت آپ نے لگائی ہے۔ کچھ اور بڑھایئے بولی۔"

خان بہادر نے اس کے طنز پر زیادہ توجہ نہ دی۔ اَب وہ قطعی کاروباری موڈ میں آگیا تھا۔ کہنے لگا۔ "جناب ۲۵ ہزار روپے میں آپ دو اچھے خاصے اسکول قائم کر سکتے ہیں۔ جن کو قاعدے سے چلایا جائے تو ۵ ہزار روپیہ ہر ماہ آسانی کے ساتھ کمایا جا سکتا ہے۔ اس رقم سے سال بھر بعد آپ دو اسکول اور کھولنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

صفدر لنبیر نے کہا۔ "خان بہادر صاحب آپ کے اس قیمتی مشورہ کا بہت بہت شکریہ۔ فلک پیما کے اس وقت پانچ اسکول قائم ہیں۔ فی الحال ہمارا مزید اسکول کھولنے کا کوئی ارادہ نہیں ہمارے سامنے ان سے بھی زیادہ اہم اسکیمیں ہیں۔ جن پر فوری طور پر کام شروع کرنے کی ضرورت ہے۔"

خان بہادر نے چندہ کی رقم اور بڑھادی۔ کہنے لگا۔ میں آپ کی جماعت کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ۴۰ ہزار تک دے سکتا ہوں۔ اس روپے سے آپ اپنی اسکیموں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ بلکہ میرا مشورہ مانیئے تو سب سے پہلے آپ کو ایک ڈیری فارم قائم کرنا چاہیئے۔ گمٹی میں گوالوں کی اچھی خاصی بستی ہے۔ آپ کو زیادہ دوڑ دھوپ بھی کرنا نہیں پڑے گی۔ تجربہ کار آدمی آسانی کے ساتھ مل جائیں گے۔ پھر اس ڈیری فارم کے ذریعہ بہت سے بیچارے بے روزگاروں کو کام مل

جائے گا۔ یہ آپ بہت بڑی خدمت کریں گے۔ خسارہ کا اس کام میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا دودھ اور مکھن کی ضرورت کو تو آپ لوگ بخوبی سمجھتے ہیں۔ اس پروجکٹ میں اتنا منافع ہے کہ آپ اپنی پارٹی کی ملک بھر میں شاخیں قائم کر سکتے ہیں۔" یہ کہتے کہتے وہ بے تکلفی سے مسکرادیا۔"میں نے بہت پہلے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ میرے مشوروں سے فائدہ اٹھایئے۔ کہیئے کیسی لاجواب اسکیم ہے؟" اس نے داد طلب نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

علی احمد نے فوراً جواب دیا۔"آپ کی سوجھ بوجھ کا تو میں پہلی ہی ملاقات سے قائل ہو گیا تھا اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑا زرخیز دماغ عطا کیا ہے۔ ضرورت پڑی تو ان بیش بہا مشوروں کے لئے ہم ضرور آپ سے درخواست کریں گے۔ مگر خان بہادر صاحب یہ ۴۰ ہزار رقم بھی کم ہی ہے۔"

اس کے بعد خان بہادر نے ۵ ہزار اور بڑھادیئے۔ دونوں اسکاؤٹ لڑکوں نے اس رقم کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر تک حیل وحجت کرنے کے بعد خان بہادر ۵۰ ہزار تک پہنچ گیا۔ کہنے لگا۔

"میں نے الیکشن کے لئے ۵۰ ہزار روپے کا بجٹ بنایا تھا۔ یہ میرا آخری آفر (پیشکش) ہے۔ اس سے زیادہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ مگر اس کے لئے یہ بنیادی شرط ہوگی کہ آپ کے تمام اراکین الکشن میں میرے رضاکاروں کی حیثیت سے کام کریں گے۔ ان کو اس کام کا کوئی معاوضہ نہیں ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو یہ آفر قبول کر لینا چاہیئے۔ ۵۰ ہزار کی رقم بہت ہوتی ہے۔ اگر آپ اسپتال ہی تعمیر کریں تو اس رقم سے ایک شاندار عمارت تیار کی جاسکتی ہے۔ یہ جو آپ نے اسپتال بنا رکھا ہے، معاف کیجئے گا یہ تو اچھا خاصا مذاق معلوم ہوتا ہے۔ کہیں سے بھی تو اسپتال نہیں لگتا"

علی احمد نے ایک لمحہ بھی اس کی پیشکش پر غور کرنے کے لئے ضائع نہ کیا۔ فوراً بولا "ہمیں افسوس ہے کہ ہم صرف ۵۰ ہزار کی رقم پر آپ کے ساتھ تعاون نہ کر سکیں گے۔"

خان بہادر کے لئے اب برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ بگڑ کر بولا "صرف ۵۰ ہزار" وہ سخت بھنایا ہوا تھا۔ بمشکل اس کی زبان سے نکلا "آخر آپ لوگ کتنی رقم لینا چاہتے ہیں۔"

دونوں اسکائی لارکوں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی چھائی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہیں۔ کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا اور خان بہادر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ گلے کی رگیں تن گئی تھیں اور چہرے کی وہ شگفتگی مٹ گئی تھی، جس سے وہ ہنس مکھ اور بشاش نظر آتا تھا۔ رخساروں کی دبیز کھال لٹکنے لگی تھی اور وہ بہت بوڑھا لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کمرے کی خاموشی میں علی احمد کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"کم از کم دو لاکھ تو آپ کو دینا ہی چاہئے"

"دو لاکھ؟" خان بہادر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔ اُس نے جھنجھلا کر کہا "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں میونسپلٹی کے بجائے سونے کی کان کھودنے جا رہا ہوں؟"

علی احمد اس کی جھنجھلاہٹ سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔ اُس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔

"خان بہادر صاحب ہمارا تو یہی خیال ہے۔"

اس بات پر وہ بہت چکرایا۔ پریشان ہو کر بولا "کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

صفدر بشیر نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی "ہمیں تو خان بہادر صاحب یہ سیدھی سادھی بزنس معلوم ہوتی ہے۔"

خان بہادر نے بلند آواز سے کہا "بھئی وہ کیسے؟" ابھی تک وہ حیرت زدہ تھا۔

علی احمد نے کہا "میرا خیال ہے کہ آپ بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ ورنہ یہ تو بہت صاف سی بات ہے۔ دیکھئے جب آپ میونسپل بورڈ کے ممبر بن جائیں گے تو آپ آسانی سے اپنے بھتیجے بھانجوں کے نام سے ٹھیکے لے سکتے ہیں۔ اگر ہر سال دو تین ٹھیکے بھی مل گئے تو دس پانچ لاکھ کما لینا کوئی مشکل کام نہیں۔ پھر آپ تو پانچ سال تک ممبری کریں گے۔ ۲۰۔۲۵ لاکھ بھی آپ کے لیے جہاں دیدہ شخص نے نہ پیدا کئے تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ رشوتوں

سے۔ جو رقم ملے گی' وہ علیحدہ رہی۔ قاعدے سے کام کیا جائے تو اعلیٰ پیمانے پر بلیک میلنگ بھی کی جا سکتی ہے۔" علی احمد بڑے اطمینان سے بول رہا تھا۔ اور خان بہادر کا چہرہ سرخ پڑتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں کو چبا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ سخت ذہنی اذیت میں مبتلا ہے۔

علی احمد نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "کسی فیکٹری پر ۱۰، ۵ لاکھ روپیہ صرف کرنے سے تو یہ کہیں اچھا پروجیکٹ ہے کہ میونسپلٹی کی ممبری حاصل کی جائے۔ بلکہ خدا توفیق دے تو...." خان بہادر سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"کیا آپ مجھے اتنا ذلیل اور کمینہ سمجھتے ہیں۔ میں اپنی یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔"

علی احمد نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا "خان بہادر صاحب کاروبار میں اس طرح جذباتی ہونے سے کام نہیں چلتا۔ پھر آپ تو ماشاء اللہ بڑے تجربہ کار بزنس مین ہیں۔"

"لاحول ولاقوۃ بزنس سے اور میونسپلٹی کے الکشن سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"

صفدر بشیر کے لئے اب برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ تیز مزاج کا نوجوان تھا۔ اس نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا "تو پھر یہ ۵۰ ہزار روپے کی رقم آپ فلک پیما کو کیوں پیش کر رہے ہیں کیا آپ اسکائی لارکوں کو ضمیر فروش، خود غرض اور اکسپلائٹر سمجھتے ہیں؟ آپ کا ابتدا ہی سے ہمارے ساتھ یہی رویہ رہا ہے مگر ہم نے کبھی آپ کی باتوں پر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ اس لئے کہ ہمارے اور آپ کے سوچنے کے انداز میں بنیادی فرق ہے۔ آپ کے نزدیک دولت، زندگی کی سب سے بڑی قوت ہے اور ہم انسانی محنت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ دولت، تبادلۂ جنس کا ایک ذریعہ ہے اور محنت سے انسان اپنی تقدیر بدل سکتا ہے۔ اس نے اس محنت کے ذریعہ ہیبت ناک دریاؤں کے رُخ بدل دیئے۔ مہیب پہاڑوں کا غرور توڑ دیا۔ سمندر کو اپنا مطیع کر لیا اور اب چاند ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔" صفدر بشیر بڑی روانی سے بولتا جا رہا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح وہ خطیبانہ انداز میں جلسوں سے خطاب کیا کرتا تھا۔

خان بہادر گھبرا کر کہنے لگا "آپ نہ معلوم کیسی باتیں کرنے لگے۔ میرا مطلب تو صرف اس

قدر ہے۔"

صفدر بشیر نے کہا "آپ کا مطلب ہم پر بخوبی واضح ہو چکا ہے۔ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کے ساتھ اس قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں دو ٹوک بات کہہ دی۔

خان بہادر نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ سگرٹ لائٹر روشن کیا اور میز پر سے ۲۰ ہزار کا چیک اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا۔ چیک جلنے لگا، بڑا سا شعلہ روشن ہوا۔ کمرے کی دیواریں جھلملائیں۔ چیک جل کر خاکستر بن گیا۔ جھلملاتی ہوئی دیواریں دھندلی پڑ گئیں۔ اس کے بعد خان بہادر نے اپنا خوبصورت پورٹ فولیو اٹھایا۔ دونوں سے الوداعی مصافحہ کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر چلا گیا۔

جب اس کے قدموں کی چاپ دور ہو کر معدوم ہو گئی تو صفدر بشیر نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور تھکا ہوا سا آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں ستائے کے سے انداز میں خاموش بیٹھے رہے پھر انھوں نے خان بہادر سے جو گفتگو ہوئی تھی، اس کی رپورٹ تیار کی اور لائبریری سے اٹھ کر سونے کے لئے چلے گئے۔

علی احمد اور صفدر بشیر کی رپورٹ پر غور کرنے کے لئے دوسرے دن فلک پیما کا ہنگامی اجلاس ہوا۔ رپورٹ پر دیر تک بحث ہوتی رہی۔ تمام اسکائی لارکوں نے متفقہ طور پر ان دونوں کے اقدام کو سراہا اور خان بہادر کی سخت مذمت کی۔

اسی اجلاس میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ فلک پیما کو میونسپلٹی کے انتخابات میں اس حلقے سے اپنا امیدوار کھڑا کرنا چاہیے۔ تین روز تک فلک پیما کا یہ اجلاس جاری رہا اور اس میں یہی تجویز زیر بحث رہی۔ اسکائی لارکوں کے ایک گروہ کی رائے تھی کہ فلک پیما کو کسی قسم کی سیاست میں حصہ لینا نہیں چاہیے۔ جو لوگ الکشن لڑنے کے حق میں تھے، ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر انتخابات میں شرکت نہ کی جائے گی تو خان بہادر یا اسی قبیل کے لوگ میونسپل بورڈ کے ممبر بنیں گے جو خدمتِ خلق کی آڑ میں ہر ناجائز طریقہ پر عمل کریں گے۔

تین روز کی بحث کے بعد اسکائی لارک آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ فلک پیما صرف اس وارڈ سے الکشن

کے لئے اپنا امیدوار کھڑا کرے۔ اس لئے کہ شہر کے دوسرے حصوں میں ابھی اُن کے کام کی رفتار سست تھی۔ اس کے علاوہ فنڈ کی کمی تھی۔ کام کرنے والے بھی زیادہ نہیں تھے۔

فلک پیما کے امیدوار کی نامزدگی کے لئے تین اسکائی لارکوں کے نام پیش کئے گئے صفدر بشیر علی احمد اور ڈاکٹر زیدی لیکن رائے شماری شروع ہونے سے پہلے ہی علی احمد نے اپنا نام واپس لے لیا۔ وہ الکشن میں حصہ لینے کے حق میں تھا۔ مگر خود امیدوار بننا نہیں چاہتا تھا۔ ووٹنگ ہوئی اور ۶ کے مقابلہ میں ۱۰ کی اکثریت سے ڈاکٹر زیدی کو منتخب کر لیا گیا۔ اس کو منتخب کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس حلقے میں وہ بے حد ہر دل عزیز تھا۔

نامزدگی کا اعلان ہونے کے بعد اسکائی لارکوں نے دیکھا کہ صفدر بشیر کا چہرہ مرجھا گیا تھا وہ اس وقت کسی قدر بے چین نظر آ رہا تھا۔ بار بار سگرٹ پر لمبے لمبے کش لگا کر بہت سا دھواں فضا میں اُگل دیتا۔ مگر ڈاکٹر زیدی کی کامیابی پر سب سے پہلے اسی نے مبارکباد پیش کی تھی۔

●

۲

اسکاؤٹ لارکوں نے اپنی دوسری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ انتخابات کی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ اس مہم کا آغاز انھوں نے ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت کیا۔ روزانہ، کسی نہ کسی بستی کے چوراہے پہ ان کا جلسہ ہوتا۔ اسکاؤٹ لارکوں کی جوشیلی تقریروں نے ہر طرف دھوم مچادی۔ لوگ اُن کی باتوں کو توجہ کے ساتھ سنتے اور جلسوں میں جوق در جوق شامل ہوتے۔

پبلسٹی کا انچارج علی احمد تھا، وہ روزانہ نت نئے پوسٹر تیار کرتا، پمفلٹ لکھتا، ہینڈ بل تیار کرتا۔ ہر ہفتے اسکاؤٹ لارکوں کو نئے نعرے دیتا، پانچ، پانچ منٹ کی چھوٹی چھوٹی تقریریں لکھکر دیتا۔ یہ تقریریں اور نعرے "اسٹریٹ کارنر میٹنگ" کے لئے ہوتیں۔ ہوتا یہ کہ اسکاؤٹ لارک کسی بھی گلی کے نکڑ پر یا سڑک کے کنارے کھڑے ہوجاتے۔ پہلے وہ اونچی آوازوں سے نعرے لگاتے۔ جب تھوڑا بہت ہجوم ہوجاتا تو مختصر سی تقریر کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔

ڈاکٹر زیدی اور خان بہادر فرزند علی کے علاوہ میونسپل بورڈ کے انتخابات میں اس حلقے سے ایک امیدوار اور بھی تھا۔ اس کا نام عبدالحمید تھا۔ وہ لمبے قد کا چھچھورا سا آدمی تھا۔ نیلام کرنے والوں کی طرح ایک بات کو کئی کئی بار دُھراتا تھا۔ اور بات بات پر قہقہہ لگاتا تھا۔ پچھلے سال تک وہ محکمہ سول سپلائی میں ایک بڑا عہدے دار تھا، مگر رشوت لینے کے جرم میں ملازمت سے برطرف کردیا گیا تھا۔ لیکن سرکاری حلقوں میں ابھی تک اس کا بڑا اثر تھا۔ ملازمت کے چھُٹ جانے کا اُس کو

ذرا بھی ملال نہ تھا۔ بنک میں اس کا ۵ لاکھ روپیہ موجود تھا۔ شہر میں چار شان دار کوٹھیاں تھیں، کئی کارخانوں میں اس کے حصے تھے اور پلاسٹک کی ایک فیکٹری کا مینجنگ ڈائرکٹر تھا۔ بڑی شاہانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر خان بہادر کے مقابلہ میں اس کا پروپیگنڈا ہلکا تھا۔

خان بہادر الکشن کی مہم پر پانی کی طرح روپیہ بہا رہا تھا۔ اُس کے کارکن جھلکتی ہوئی کاروں پر آتے اور ووٹروں کو خریدنے کے لئے نت نئے ریٹ مقرر کرتے۔ جوں جوں انتخابات کی تاریخیں قریب آتی جارہی تھیں ووٹوں کا ریٹ بڑھتا جارہا تھا۔ اس مقصد کے لئے اُس نے ہر بستی میں ٹھیکیدار مقرر کر دیئے تھے۔ جن کے ایجنٹ ووٹوں کا سودا کرنے میں مصروف تھے۔

کاغذات نامزدگی منظور ہو چکے تھے اور ہر اُمیدوار نے انتخابی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں عبدالحمید کی طرف سے ووٹروں پر سرکاری حکام کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اس حلقے کے جو با اثر لوگ تھے، ان کو آئے دن تھانوں پر بُلایا جاتا۔ اگر وہ عبدالحمید کے خلاف کسی قسم کا اظہار خیال کرتے تو پولیس کے افسران، اُن کے خلاف فرضی مقدمے چلانے کی دھمکی دیتے۔ غنڈوں کے ذریعہ ان کو پریشان کرتے۔ جو لوگ سرکاری ملازم تھے۔ ان کو اپنے محکمہ کے افسروں کی جانب سے پرائیویٹ ہدایتیں دی گئی تھیں کہ وہ عبدالحمید کی ہر طرح سے مدد کریں۔

خان بہادر نے فی ووٹ، دس روپے تک کا ریٹ مقرر کر دیا تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی بستی میں دعوت ہوتی۔ بڑی فیاضی کے ساتھ لوگوں کو مرغن کھانے کھلائے جاتے۔ جو لوگ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے والے تھے اور سیدھے سادے آدمیوں کو جھکمہ دینے کا گُر جانتے تھے، خان بہادر نے ایسے لوگ چھانٹ چھانٹ کے اپنے کارکنوں کی حیثیت سے بھرتی کر لئے تھے۔ اُن کی یومیہ اُجرت مقرر تھی اور ۵ روپے سے ۱۵ روپے تک کا ریٹ تھا۔ اس کے علاوہ ووٹروں کو دوکانوں کے الاٹمنٹ اور ملازمتیں دلوانے کا لالچ بھی دیا جاتا۔ اکثر خان بہادر خود بھی بستیوں کا دورہ کرتا۔ اس کی شان دار کار کسی بستی کے قریب آکر ٹھہرتی۔ اُس کے حالی موالی بڑی مستعدی کے ساتھ لپک کر دروازہ کھولتے زندہ باد کے نعرے لگاتے اور خان بہادر ہونٹوں میں موٹا سا سگار دبائے، ونسٹن چرچل کی طرح،

بڑے ٹھسے کے ساتھ کار سے نیچے اُترتا۔ اُس کے آگے پیچھے تنخواہ دار مصاحب ہوتے اور وہ ان کے ہجوم میں گھرا ہوا، بستی کے گلی کوچوں کا ایک چکر لگاتا۔ لوگوں سے ملتے وقت ضرورت سے زیادہ انکساری کا مظاہرہ کرتا۔

اسکاؤٹ لارکوں کا طریقۂ کار بہت سیدھا سادھا تھا۔ وہ دیسی کپڑے کا موٹا جھوٹا لباس پہنتے۔ ہاتھوں میں پٹ سن کے تھیلے لٹکے ہوتے۔ جن میں پوسٹروں، ہینڈبلوں اور پمفلٹوں کے علاوہ گڑ اور چنے بھی ہوتے تھے۔ ہر بستی کے لئے علیحدہ گروپ تھا۔ وہ صبح تاروں کی چھاؤں میں اُٹھ کر بیٹھ جاتے اور چائے کی ایک ایک گرم پیالی پی کر چاق چوبند ہو جاتے۔ سویرے ہی سویرے ہر گروپ کی میٹنگ ہوتی۔ ہر روز کے کام کا پروگرام مرتب کیا جاتا اور سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ ہیڈکوارٹر سے نکل جاتے۔ وہ میلوں پیدل چلتے۔ بستی کے لوگوں کے ساتھ فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتے۔ اُن کے ساتھ حقوں پر کش لگاتے۔ بے تکلفی سے باتیں کرتے، ان کے دُکھ درد کو سنتے اور ان کے جو چھوٹے موٹے کام ہوتے اُن کو کرتے۔ بھوک لگتی تو کسی درخت کے سائے تلے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے اپنے تھیلوں سے چنے اور گڑ نکال کر کھاتے۔ ڈٹ کر پانی پیتے اور تازہ دم ہو کر دوبارہ چل دیتے۔

فلک پیما کی سرگرمیاں طوفان کی طرح بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کی انتخابی مہم نے ہر طرف ہلچل برپا کر دی تھی۔ فلک پیما کے پاس یوں تو کل ۱۵ کارکن تھے مگر وہ بلا کے کام کرنے والے تھے۔ ایک ایک اسکاؤٹ لارک کئی کئی محاذ پر کام کر رہا تھا اور ہر کام خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔ کہیں بھی ذرا سی گڑبڑ نہ ہوتی۔ تحریک تعلیم بالغاں کے اسکولوں میں روزانہ کلاسیں ہوتیں۔ انڈسٹریل ہوم میں گھریلو مصنوعات کی پیداوار بڑھ گئی تھی اور اُس کے تیار کئے ہوئے سامان کی بازار میں مانگ بڑھتی جا رہی تھی۔ امدادی بنک کا کام اطمینان بخش تھا۔ حسابات باقاعدگی کے ساتھ رکھے جاتے۔ بنک کے بارے میں کسی قسم کی شکایت اب تک نہیں ملی تھی۔ بستی کے بہت سے لوگ اس کے قرضوں سے بے روزگاری کی لعنت سے نجات پا گئے تھے۔

فلک پیما کی ان بڑھتی ہوئی سرگرمیوں میں سلمان پیش پیش تھا۔ ہر طرف اسی کا چرچا تھا۔

وہ ان دنوں دیوانہ وار کام کر رہا تھا۔ اس کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے چند گھنٹے رات کو سونے کے لئے ملتے۔ ہفتوں اُسے شیو تک کرنے کا ہوش نہ رہتا۔ وہ روزانہ سویرے ہی سویرے اپنے گروپ کی میٹنگ کرتا اور دھوپ نکلنے سے پہلے ہی اپنے کام پر نکل جاتا۔ بستیوں میں تقریریں کرتا، پوسٹر لگاتا لوگوں میں ہینڈ بل بانٹتا، ان سے تبادلہ خیالات کرتا اور رات کو باقاعدگی کے ساتھ اسکول میں کلاس لیتا۔ اس عرصہ میں ایک روز بھی وہ اسکول سے غیر حاضر نہیں رہا۔ رات گئے ہیڈ کوارٹر کو لوٹتا تو دن بھر کے کام کی پوری رپورٹ پارٹی کو دیتا۔ ان دنوں فلک پیما کی روزانہ میٹنگ ہوتی تھی۔ سلمان ہر میٹنگ میں پوری سرگرمی کے ساتھ شریک ہوتا۔ بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔

ان مصروفیات کے علاوہ فلک پیما کی جانب سے اس کو یہ بھی ہدایت ملی کہ وہ صفدر بشیر کے ساتھ مزدوروں کی یونین میں کام کرے۔ یہ یونین کچھ ہی عرصہ ہوا کہ قائم ہوئی تھی اور اس کے قیام میں فلک پیما کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مزدور آئے دن ہیڈ کوارٹر پر اپنی کوئی نہ کوئی شکایت لے کر آتے اور اسکائی لارکوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ لہٰذا فلک پیما کے ایک جلسہ میں یہ طے کیا گیا کہ مزدوروں کی ایک باقاعدہ یونین بنا کر اس کو رجسٹرڈ کرا دیا جائے۔ اس کے تمام عہدے دار مزدور ہی تھے اور اُن کی دیکھ بھال کے لئے فلک پیما نے پہلے تو صفدر بشیر کو مقرر کیا۔ مگر جب یونین کا کام بڑھنے لگا تو سلمان کی ڈیوٹی بھی یونین میں مقرر کر دی گئی۔ اس نئے کام میں بھی سلمان نے پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لے رہا تھا۔

لیکن سلمان جس قدر سرگرم اسکائی لارک بنتا جا رہا تھا صفدر بشیر اسی قدر ڈھیلا ڈھالا ہو گیا تھا۔ اس کے انداز میں ایک بے نیازی آگئی تھی۔ اور یہ بے نیازی اسکائی لارک اس میں اس وقت سے محسوس کر رہے تھے۔ جب سے ڈاکٹر زیدی کو اس کے مقابلہ میں میونسپل بورڈ کے انتخابات کے لئے فلک پیما کا امیدوار نامزد کیا گیا تھا۔ اب وہ زیادہ تر لائبریری میں نظر آتا اور ہر وقت مطالعہ میں غرق رہتا اس کا چہرہ ان دنوں بے حد سنجیدہ نظر آتا۔ وہ بات چیت بھی کم کرتا۔ اکثر وہ اپنے سینٹر سے غیر حاضر رہتا جس سے کام میں گڑبڑ پیدا ہوتی اور ہیڈ کوارٹر پر اس کے خلاف شکایات آتیں۔ آخر فلک پیما کے ایک اجلاس

میں صفدر بشیر کی بڑھتی ہوئی بے عملی کا محاسبہ کیا گیا۔ اس کے خلاف بہت سے الزامات پیش کیے گئے اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔ صفدر بشیر، فلک پیما کا نہ صرف صدر تھا بلکہ وہ جماعت کا روحِ رواں بھی تھا، لہٰذا جنرل سکریٹری علی احمد نے اسکائی لارکوں کی رائے کی مخالفت کی اور یہ مشورہ دیا کہ فی الحال صفدر بشیر کو وارننگ دیدی جائے۔

علی احمد کی تجویز منظور کر لی گئی۔ صفدر بشیر کو وارننگ دی گئی کہ آئندہ وہ اپنی ذمہ داریوں کی جانب سے لاپرواہی نہیں برتے گا۔ صفدر بشیر نے کھڑے ہو کر اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا اور یہ یقین دلایا کہ وہ ایک اسکائی لارک کی حیثیت سے اپنا کام پوری ذمہ داری کے ساتھ کرے گا۔

اس یقین دہانی کے بعد کچھ عرصہ تک تو صفدر بشیر ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے کام کرتا رہا مگر اس کی بے نیازی رفتہ رفتہ پھر سر ابھارنے لگی! اسکائی لارک اس کے اس رویہ کو محسوس کر ہی رہے تھے کہ اسی دوران میں صفدر بشیر نے ایک ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی، جس سے اسکائی لارکوں میں اس کے خلاف، بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔

صفدر بشیر کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت کی نوعیت یہ تھی کہ ایک روز اسکائی لارکوں نے گمٹی میں ایک بہت شاندار جلسہ عام کا انتظام کیا۔ اس جلسہ کے لئے وہ کئی روز سے پبلسٹی کر رہے تھے۔ پوسٹر لگائے گئے۔ ہینڈبل تقسیم کئے گئے اور اسٹریٹ کارنر میٹنگوں کے ذریعہ اس کا اعلان کیا گیا۔ جلسہ گاہ میں ہزاروں انسانوں کا اجتماع تھا۔ لوگ دُور دور کی بستیوں سے چل کر جلسہ میں آئے تھے۔ اسکائی لارک اپنی اس کامیابی پر بے حد شاداں تھے۔

اس جلسہ عام کا خاص مقرر صفدر بشیر تھا۔ وہ اپنے خطیبانہ انداز کے باعث علاقے کی بستیوں میں بے حد مقبول تھا۔ وہ جب جوش میں آکر بولتا تو حاضرین کا تنفس تیز ہو جاتا۔ گردن کی رگیں تن جاتیں آنکھوں میں سرخی دوڑ جاتی اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتے۔ اس کی تقریر میں یہ سحر تھا کہ اگر جلسہ گاہ میں کبھی گڑبڑ مچ جاتی اور وہ ڈائس پر آجاتا تو چشم زدن میں جلسہ قابو میں آجاتا۔ تقریر کرنے کی اس کی تکنک یہ تھی کہ وہ آہستہ آہستہ اپنی آواز کا حجم بڑھاتا جاتا۔ اسی رفتار سے اس میں روانی پیدا ہوتی جاتی

تھی اور جب وہ اپنے پورے عروج پہ پہنچ جاتا تو اس کی آواز میں گھن گرج پیدا ہو جاتی۔ اس کا لہجہ الہامی معلوم ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ اُس کی آواز افق کے کسی گوشے سے بلند ہو رہی ہے۔ کائنات دم بخود ہو گئی ہے۔ ہر چیز پر سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ صرف ایک چیز زندہ ہے۔ ایک آواز اور صرف ایک آواز۔ اور وہ آواز صفدر بشیر کی ہوتی۔ جلسہ گاہ نعروں کے شور سے گرجنے لگتی، حاضرین جذبات سے بے قابو ہو کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے۔ لیکن ایسی جذبات انگیز تقریریں وہ بڑے اجتماع میں کیا کرتا تھا اور اُس روز ایسا ہی بڑا اجتماع تھا۔

جلسہ کا آغاز ڈاکٹر زیدی کی تقریر سے ہوا۔ وہ ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ اور بات کو سمجھا کر کہنے کا عادی تھا۔ اس کی تقریر میں بھی یہی رجحان کارفرما تھا جلسہ گاہ میں بددلی سی پائی جاتی تھی۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شہ نشین کی جانب صفدر بشیر کو دیکھ رہے تھے۔ ہر آنکھ اُس کی تلاش میں سرگرداں تھی اور صفدر بشیر اُس وقت بیٹھا ایک بار میں وہسکی پی رہا تھا! ان دنوں وہ ذہنی طور پر کچھ پریشان تھا اور اسکاٹی لارکوں سے چھپ کر شراب پی لیا کرتا تھا۔ یہ عادت اس کی انگلستان کے دوران قیام میں پڑی تھی۔ جب بھی وہ ذہنی انتشار کا شکار ہوتا تو بے تحاشہ شراب پیتا! اس طرح اُس نے سکون حاصل کرنے کا ایک بہانہ پیدا کر لیا تھا۔

وہ اسی عالم میں جلسہ کے اندر آ گیا۔ اس وقت وہ نشہ میں دھت ہو رہا تھا۔ اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی وہ ڈائس پہ پہنچا، جلسہ میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بکھرا ہوا مجمع اکٹھا ہونے لگا۔ لوگ صفدر بشیر کی تقریر کے انتظار میں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ وہ ایک ہیرو کی طرح اٹھکر مائیک کے سامنے آیا۔ حاضرین جلسہ نے اُس کی آمد کا پُر جوش تالیوں سے خیر مقدم کیا۔ صفدر بشیر نے اپنی تقریر شروع کی۔

"حضرات! — اس اجتماع کو دیکھکر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ گویا یہاں بہت سے کچھوے اکٹھا ہو گئے ہیں" حاضرین نے بے چینی کے ساتھ پہلو بدلے۔ صفدر بشیر کہتا رہا "جی ہاں کچھوے ایسے کچھوے جنھوں نے اپنے ہاتھ پیر سمیٹ کر پیٹ کے اندر کر لئے ہیں اور گردن نکالے یوں دیکھ

رہے ہیں، جیسے میں کوئی مداری ہوں۔ اور ابھی آپ کے سامنے کوئی شعبدہ پیش کروں گا" اُس نے ایک ہچکی لی اور ذرا سا ڈگمگایا۔ پھر وہ حاضرین کو گھورنے لگا۔ جلسہ میں سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ اُبھر رہی تھی۔ کچھ لوگ ہونق کی طرح صفدر بشیر کا منہ تک رہے تھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

صفدر بشیر نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا "تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کچھوؤں کی چال چلنے کا زمانہ نہیں ہے۔ یہ سائنس کی ترقی کا عہد ہے۔ آج ایک شخص ریڈیو سے تقریر کرتا ہے اور تمام دنیا کے لوگ اُس کو سُن سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ بولتے ہوئے۔ حرکت کرتے ہوئے۔ ہر انداز میں، ہر عالم میں اور جناب ترقی کی اس دوڑ میں آپ کہاں ہیں۔ افسوس تو یہی ہے کہ آپ کو اس کا ذرا بھی احساس نہیں۔ یہ گمراہی جرم ہے۔ آپ کچھوے نہ سہی، لیسوع کی بھیڑیں ہیں جس کا جی چاہتا ہے ہانک کرلے جاتا ہے۔ جدھر منہ اٹھ گیا، اسی طرف نکل گئے" جلسہ میں اب گڑبڑ کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ لوگوں کو اس کا اندازِ تخاطب سخت ناگوار گذر رہا تھا۔ وہ ہرگز کچھوے اور بھیڑیں بننے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ ایک طرف سے آواز آئی۔

"ابے ہم تو کچھوے ہیں، تو تو مرغے کی وہی ایک ٹانگ بنا ہوا ہے"

دوسری طرف سے کسی نے چیخ کر کہا "گھاس کھا گیا ہے۔ کانجی ہاؤس بھیجو"

کچھ نوجوان باقاعدہ مرغ کی بولی بولنے لگے "ککڑوں کوں، ککڑوں کوں"

ہر چہار جانب سے صفدر بشیر پر جو آوازے کسے گئے، تو وہ ذرا سنبھلا اور پریشان ہو کر بولا "دیکھئے میں پورے ہوش وحواس کے ساتھ بول رہا ہوں" اس بات پر ایک زوردار قہقہہ پڑا اور اس کے بعد قہقہوں کی آواز دیر تک جلسے میں گونجتی رہی۔

جلسہ بالکل درہم برہم ہو چکا تھا۔ لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور ملی جلی آوازوں کا شور گونج رہا تھا۔ علی احمد قریب ہی بیٹھا تھا، اس نے صفدر بشیر کا دامن پکڑ کر کھینچا۔ تمام اسکاؤٹ لڑکے جو ڈائس پر موجود تھے۔ جلسہ کا یہ عالم دیکھ کر بدحواس ہو گئے تھے۔ صفدر بشیر تقریر کرنے پر بضد تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ بری طرح نشہ میں جھوم رہا تھا۔ اب اُس نے

اول غول بکنا شروع کر دیا تھا اور یہ تمام آوازیں لاؤڈ اسپیکر سے نکل نکل کر گونج رہی تھیں۔ حاضرین جلسہ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ علی احمد نے گھبرا کر امیلی فائر کی بیٹری بند کر دی اور جلسہ گاہ کے تمام لاؤڈ اسپیکر خاموش ہو گئے۔ اسکائی لارکوں نے بڑی مشکل سے صفدر بشیر کو بٹھایا۔

علی احمد جلسہ کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اُس نے فوراً سلمان کو اشارہ کیا۔ وہ مائیک پر پہنچ گیا۔ بیٹری کا سوئچ کھول دیا گیا۔ جلسے گاہ میں لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکروں پر سلمان کی آواز ابھرنے لگی۔ وہ حاضرین سے معذرت کر رہا تھا۔ سلمان نے اُن کو بتایا کہ صفدر بشیر ایک عرصہ سے بیمار ہیں۔ دن بھر اُن کو تیز بخار چڑھا رہا۔ چونکہ حاضرین جلسہ کو اُن کی تقریر سننے کا بے حد اشتیاق تھا۔ اس لئے اُن کو بخار کی حالت میں یہاں لایا گیا۔ بخار بہت تیز تھا۔ لہٰذا سرسامی کیفیت پیدا ہو گئی اور وہ ذہنی توازن پر قابو نہ رکھ سکے۔ سلمان نے یہ سب کچھ اس انداز سے کہا کہ بات بن گئی۔ ورنہ اُس روز صفدر بشیر نے اسکائی لارکوں کو سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

اس افسوس ناک حادثہ نے اسکائی لارکوں کو صفدر بشیر کی جانب سے سخت برگشتہ کر دیا تھا۔ وہ فلک پیما کے آئندہ جلسہ میں اس کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرنے والے تھے ان ہی دنوں صفدر بشیر نے اپنی غیر ذمہ دارانہ روش کا ایک اور ثبوت دیا۔ یہ بات اس طرح پیش آئی کہ جوبلی ٹکسٹائل ملز کے منتظمین نے ۴ قلیوں کو برطرف کر دیا تھا۔ یونین نے منتظمین کے اس رویہ کے خلاف سخت احتجاج کیا اور یہ دھمکی دی کہ چاروں مزدوروں کو ہفتہ بھر کے اندر کارخانے میں واپس نہ بلایا گیا تو عام ہڑتال شروع کر دی جائے گی۔

جوبلی ملز کے منتظمین نے یونین کے نوٹس کو مسترد کر دیا اور برطرف شدہ مزدوروں کی ملازمت بحال کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی روز رات کو یونین کا جلسہ ہوا۔ اس میں صفدر بشیر اور سلمان دونوں شریک ہوئے۔ جلسہ میں ہڑتال شروع کرنے کی قرارداد پیش کی گئی۔ سلمان نے قرارداد کی پوری پوری تائید کی مگر صفدر بشیر ہڑتال کا مخالف تھا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ مزدوروں کی تنظیم ابھی مضبوط نہیں ہے۔

لہذا کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے لیکن مزدوروں میں بڑا جوش وخروش پایا جاتا تھا انھوں نے صفدر بشیر کی رائے سے اتفاق نہ کیا اور ہڑتال کی قرارداد متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

ہڑتال کے دوسرے دن مزدوروں نے کارخانے کے سامنے مظاہرہ کیا اور ان مزدوروں کو روکنے کی کوشش کی جو ڈیوٹی پر جانا چاہتے تھے۔ کارخانے کے جنرل منیجر نے فوراً پولیس بلوائی۔ مگر کوئی ہنگامہ کوئی گڑبڑ نہ ہوئی۔ مظاہرین پُرامن تھے۔ ہڑتال بہت کامیاب جارہی تھی۔ منتظمین کو یہ پُرامن مظاہرہ خطرناک معلوم ہوا۔ چنانچہ انھوں نے سہ پہر کو اپنے کچھ غنڈے بھیج کر بلوہ کرا دیا۔ پولیس نے نقصِ امن کے پیشِ نظر ہڑتالی مزدوروں پر تین بار لاٹھی چارج کیا۔ اس لاٹھی چارج سے ۸ مزدور زخمی ہوئے۔ مظاہرین کو منتشر ہونا پڑا۔ اسی روز کارخانے کے علاقہ میں دفعہ ۱۴۴ لگادی گئی۔

اس تمام صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے رات کو یونین کا ہنگامی جلسہ طلب کیا گیا۔ خطرہ یہ تھا کہ یونین کے دفتر پر پولیس چھاپہ مارنے والی ہے اور کچھ گرفتاریوں کی افواہ بھی گرم تھی۔ صفدر بشیر نے اُس روز شام ہی سے طبیعت خراب ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ دراصل وہ جلسہ میں شریک ہونا نہیں چاہتا تھا۔ یوں بھی اُسے یونین کے کاموں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ فلک پیما کو اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے اُس نے ایک بار اس بات پر بھی زور دیا تھا کہ اسکائی لارکوں کو مزدور تحریک میں حصہ لینا نہیں چاہیے۔ ان کو اپنی سرگرمیاں صرف سماجی کاموں تک محدود رکھنا چاہیے۔

سرِشام ہی وہ ہیڈ کوارٹر سے اپنی کوٹھی چلا گیا اور یونین کے جلسہ میں شرکت نہیں کی۔ جلسہ سے غیر حاضری کے لیے اُس نے بیماری کا عذر پیش کیا مگر اسکائی لارکوں نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ وہ خان بہادر فرزند علی کے ساتھ اس شب کو ایک بار میں موجود تھا اور بادہ و ساغر کا دَور چل رہا تھا۔

صفدر بشیر کے اس رویہ نے اسکائی لارکوں کو بے حد مشتعل کر دیا۔ ان کے مطالبہ پر فلک پیما کا ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا۔ صفدر بشیر جلسہ میں موجود تھا۔ وہ ایک ملزم کی طرح خاموش بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ نہ اس نے کسی سے بات کی نہ کسی بے چینی کا مظاہرہ کیا۔ پتھر کے مجسمہ کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔

اس جلسہ کی صدارت نعیم اللہ کر رہا تھا۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی تو سلمان نے صفدر بشیر کے خلاف چارج شیٹ پیش کی۔ بہت سے الزامات کے علاوہ اس کے خلاف سب سے بڑا چارج یہ تھا کہ وہ خان بہادر فرزند علی سے سازباز کر کے فلک پیما کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ صفدر بشیر نے یہ سنگین الزام سنا تو غصہ سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ وہ فلک پیما کا صدر تھا۔ اس کا بانی تھا اور اس کو ایک باقاعدہ تحریک کی شکل دینے میں، اس نے ۷۰ ہزار روپیہ دیا تھا، سخت جدوجہد کی تھی اور عیش و آرام کی زندگی کو تج کر کے روکھی پھیکی بے مزہ زندگی اختیار کی تھی۔ فلک پیما کے خلاف سازش کرنے کا الزام عائد کر کے اس کے ساتھ سخت زیادتی کی گئی تھی۔ یہ بات کبھی اس کے ذہن میں بھی نہیں آئی تھی۔ اس کو فلک پیما سے صرف اس قدر اختلاف تھا کہ ڈاکٹر زیدی کے بجائے اس کو فلک پیما کا امیدوار نامزد کیا جانا چاہیے تھے۔ اس لئے کہ وہ ڈاکٹر زیدی سے زیادہ خود کو بہتر امیدوار سمجھتا تھا! ہسکائی لارڈز نے یہ فیصلہ کر کے اس کے ساتھ بےانصافی کی تھی۔ جہاں تک خان بہادر کے ساتھ سازباز کرنے کا سوال تھا، صفدر بشیر کو خود خان بہادر سے شدید نفرت تھی۔ بات صرف اس قدر تھی اس شب، جب یونین کا جلسہ ہوا تھا، وہ بار میں شراب پینے گیا۔ اتفاق سے خان بہادر بھی وہاں موجود تھا اور وہ اٹھ کر اس کی میز پر آگیا تھا۔ خان بہادر نے الکشن کے متعلق اس سے گفتگو کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر اس نے خان بہادر کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی اور فوراً موضوع بدل دیا۔

چارج شیٹ پیش کرنے کے بعد سلمان نے یہ مطالبہ کیا کہ صفدر بشیر کو صدر کے عہدے سے ہٹا دیا جائے اور اس کے خلاف باقاعدہ تحقیقات کر کے سخت کارروائی کی جائے۔ صدر نے صفدر بشیر کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقعہ دیا۔ مگر وہ غصہ سے اس قدر بے قابو ہو رہا تھا کہ اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا اور احتجاجاً جلسہ سے واک آؤٹ کر گیا۔

صفدر بشیر کے چلے جانے کے بعد بھی جلسہ کی کارروائی جاری رہی۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد صفدر بشیر کا ڈرائیور آیا۔ وہ جنرل سکریٹری علی احمد کے نام اس کا ایک خط لایا تھا۔ یہ صفدر بشیر کا استعفیٰ تھا۔ اس نے فلک پیما سے علیحدگی اختیار کرنے کی درخواست کی تھی۔ علی احمد کو یہ علم نہیں تھا کہ جذبات کی

رَو میں وہ اس حد تک چلا جائے گا۔ اس نے استعفےٰ پڑھ کر سُنایا اور اسکائی لارکوں سے اپیل کی کہ فی الحال اس پر کوئی کارروائی نہ کی جائے اور فلک پیما کے آئندہ اجلاس میں اس پر غور کیا جائے۔ اس کی تجویز کو مان لیا گیا اور صفدر بشیر کے استعفےٰ پر اس روز کوئی بحث نہ ہوئی۔

●

۳

مئی کی شروع تاریخیں تھیں۔ میونسپلٹی کے انتخابات میں صرف دو ہفتے رہ گئے تھے۔

تمام دن ریگ زاروں سے آنے والی باد سموم چلتی۔ آسمان پر گہرا زرد غبار چھایا رہتا۔ درختوں کے پتّے جھلس گئے تھے اور چلچلاتی دھوپ میں جسم موم بتی کی طرح پگھلتے ہوئے معلوم ہوتے۔ ایک پہر دن گذرتے ہی شہر میں سناٹا پڑ جاتا۔ دوپہر تک کوچہ و بازار سنسان ہو جاتے۔

گرمیوں کی ایک ایسی ہی سنسان دوپہر تھی۔ علی احمد کمرے میں بیٹھا ایک نیا پوسٹر تیار کر رہا تھا اچانک کمرے کا دروازہ کھول کر سلمان اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ دھوپ کی تمازت سے تمتما رہا تھا۔ بالوں پر گرد کے ذرات بکھرے تھے اور بدن پسینہ سے شرابور تھا۔ علی احمد نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

"کیا خبر لائے ہو اسکائی لارک سلمان"

سلمان نے ہاتھ میں دبا ہوا تھیلا میز کے ایک کونے پر رکھ دیا اور چہرے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہنے لگا "ابھی ابھی ایک بڑی شان دار خبر ملی ہے"

"شان دار خبر ہے تو ضرور سناؤ"

"ایک حریف تو میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا"

علی احمد چونک پڑا۔ اُس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا "کیا؟"

"عبدالحمید تو اڑن چھو ہو گیا" سلمان اس وقت بڑی بے تکلفی سے بات کر رہا تھا "آج اُس نے کاغذات نامزدگی بھی واپس لے لئے۔ یہ مجھے میونسپل بورڈ کے ایک ملازم نے بتایا ہے۔ اطلاع بالکل صحیح ہے۔" لمحہ بھر کے لئے اُس نے توقف کیا۔ کہئے ہے نا زوردار خبر۔ اب تو صرف خان بہادر ہی میدان میں رہ گیا ہے۔ اور وہ بھی گیا" یہ کہکر سلمان نے ایک قہقہہ لگایا۔

مگر اس اطلاع پر علی احمد نے کسی مسرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ اُس کو اس طرح خاموش دیکھکر سلمان کو کسی قدر تعجب ہوا۔ پوچھنے لگا "آپ خاموش کیوں ہو گئے"۔

علی احمد نے آہستہ سے کہا "بھئی یہ تو کچھ اچھی خبر نہیں ہے"

سلمان حیرت سے چونک پڑا "کیوں؟"

"میرے اندازے کے مطابق اس کو دو ہفتے پہلے ہی اس بات کا اعلان کر دینا چاہیئے تھا۔ مجھے خود حیرت تھی کہ عبدالحمید ابھی تک کیوں ڈٹا ہوا ہے"

سلمان اُس کی بات کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ پوچھنے لگا "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا"

علی احمد اس کو سمجھانے لگا "تم نے غالباً یہ غور نہیں کیا کہ عبدالحمید کے بیٹھ جانے سے فائدہ کس کو پہنچے گا۔ اگر عبدالحمید الکشن لڑتا تو خان بہادر کے ووٹ تقسیم ہو جاتے۔ اس کے زیادہ تر ووٹر نچلے متوسط طبقے میں ہیں۔ جس پر مجھے بہت زیادہ اعتماد نہیں۔ یہ لوگ کسی وقت بھی اپنا ووٹ فروخت کر سکتے ہیں۔ کسی وقت بھی جذباتی نعروں سے گمراہ ہو کر ہمارے بدترین مخالف بن سکتے ہیں بنیادی حقیقت ان میں شعور کی کمی ہے۔ نہ اُن کو اپنے حقوق کی اہمیت کا احساس ہے اور نہ وہ اپنے مسائل کو سمجھتے ہیں۔ یہی مجھکو صفدر لبشیر سے اختلاف تھا" وہ لمحہ بھر کے لئے رکا اور سلمان سے پوچھنے لگا۔

"یہ تو بتاؤ صفدر لبشیر کس عالم میں ہے"

سلمان نے مختصر سا جواب دیا "مجھے ان کے متعلق کوئی خاص اطلاع نہیں۔ صرف اتنا سُنا ہے کہ اب وہ شراب کثرت سے پینے لگے ہیں اور اُن کا مزاج بہت چڑچڑا ہو گیا ہے"

علی احمد کا چہرہ افسردہ ہوگیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کو اس خبر سے بہت صدمہ پہنچا ہے۔ اُس نے افسردہ لہجے میں کہا "وہ اپنی جذباتیت کا شکار ہو گیا۔ ہائے بے چارہ صفدر بشیر!" وہ ذرا دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے سلمان کو مخاطب کرکے کہا "تو اسکائی لارک سلمان بات دراصل یہ ہے عبدالحمید کی الکشن سے کنارہ کشی کسی صورت میں ہمارے لئے مفید نہیں۔ اس کے سارے ووٹ خان بہادر کے حق میں جائیں گے۔ فلک پیما کی جڑیں کہیں مضبوط ہیں تو وہ کارخانوں کے مزدور ہیں۔ وہ ہمارے سولڈ (مستحکم) ووٹ ہیں۔ اسکائی لارکو، کو یونین میں اپنا کام تیز کرنا چاہیئے۔ یوں بھی اب ہمیں اپنی انتخابی مہم ادر تیز کرنا پڑے گی۔"

سلمان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ علی احمد نے سگرٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگرٹ سلمان کو دی، دوسری اپنے ہونٹوں میں لگائی اور اس کو سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگانے لگا۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی چھا گئی۔ باہر لُو کے جھکڑ غراتے ہوئے چل رہے تھے۔ قریب کے اصطبل میں بندھا ہوا گھوڑا بار بار ہنہنا رہا تھا۔ سنسان دوپہر کی ویرانی میں اس کی آواز کسی پاگل کی چیخوں کی طرح خوفناک معلوم ہو رہی تھی۔

ذرا دیر بعد کمرے کی خاموشی میں علی احمد کی آواز اُبھری، وہ کہہ رہا تھا "معلوم ہوتا ہے خان بہادر نے عبدالحمید کو لمبی رقم دی ہے، ورنہ وہ آسانی سے بیٹھنے والا امیدوار نہیں تھا۔ بہر حال خان بہادر کی قوت اب کسی قدر مضبوط ہو گئی ہے" وہ اسی طرح سنجیدگی کے ساتھ سلمان کی اطلاع پر تبصرہ کرتا رہا۔ چند منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد گفتگو ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئی۔

سلمان کو ابھی کئی جگہ جانا تھا، لہٰذا اُس نے اپنا تھیلا اٹھایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ علی احمد پوسٹر تیار کرنے میں مشغول ہو گیا۔ کمرے میں ایک بار پھر سکوت ہو گیا۔ باہر لُو کے جھکڑوں کی سرسراہٹیں ابھرتی رہیں اور کمرے کی کھڑکی کا ایک پٹ آہستہ آہستہ بجتا رہا۔

علی احمد کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ دوسرے ہی دن عبدالحمید کی جانب سے جاری کئے ہوئے بڑے بڑے پوسٹر ہر بستی کے اندر نظر آنے لگے۔ ان پوسٹروں میں عبدالحمید نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ

خان بہادر کے حق میں انتخابات سے دست بردار ہوگیا ہے۔ اُس نے اپنے ووٹروں سے اپیل کی تھی کہ وہ خان بہادر کی پوری حمایت کریں۔

اس اعلان کا فوری ردعمل یہ ہوا کہ خان بہادر کے حامیوں کی ہمتیں بڑھ گئیں اور وہ بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے لگے۔ چند ہی روز بعد انھوں نے ایک شان دار جلسہ کا بندوبست کیا۔ یہ انتخابی مہم کے سلسلہ میں خان بہادر کی جانب سے پہلا جلسہ تھا۔ اس سے قبل وہ کسی بستی میں جلسہ کراتے ہوئے ڈرتا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہیں جلسہ ناکام نہ ہو جائے تو رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہتی۔ اس طرح اس کے کارکنوں کے حوصلے پست ہو جاتے۔

اس جلسہ کو کامیاب بنانے کے واسطے بڑے زور شور کے ساتھ تیاریاں کی گئیں۔ تمام بستیوں میں قدآدم پوسٹر چپکائے گئے۔ ہر روز نت نئے ہینڈ بل تقسیم کئے جاتے۔ دو جیپ کاریں روزانہ رات گئے تک لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ جلسہ کا اعلان کرتی پھرتیں۔

ان تیاریوں کو دیکھ کر اسکاؤٹ لارکوں میں بڑی بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ فلک پیما کے ایک جلسہ میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ خان بہادر کے اس جلسہ کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ ورنہ ووٹروں پر اس کا بُرا اثر پڑے گا۔ چند جوشیلے اسکاؤٹ لارک اس حد تک کمربستہ تھے کہ وہ جلسہ گاہ کے اندر گھس کر بجلی کا تار کاٹ دیں گے۔ ہڑبونگ مچا کر جلسہ کو درہم برہم کر دیں گے۔ مگر علی احمد نے اس تجویز کی سخت مذمت کی۔ اس نے کہا کہ اگر اسکاؤٹ لارک اپنے مخالفین کو قوت کا مظاہرہ کرنے کا موقعہ نہیں دیں گے تو وہ اپنی صفوں کو حریفوں کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے کبھی تیار نہ کر سکیں گے۔ اُن کو اپنی کمزوریوں کا اندازہ نہ ہو سکے گا۔ اس کے نزدیک یہ بزدلی کی نشانی تھی۔ علی احمد اور بعض دوسرے اسکاؤٹ لارکوں کی مخالفت پر اس تجویز کو مسترد کر دیا گیا۔

خان بہادر نے اس جلسہ کے انتظام پر بے دریغ روپیہ صرف کیا تھا۔ پنڈال کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ چپہ چپہ پر رنگ برنگی برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ شہ نشین کئی گز اونچی بنائی گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف زرتار پردوں کی محرابیں تھیں اور اُن کے بیچ میں فانوس لٹک رہے تھے۔ دبیز قالینوں

کا فرش تھا، جس پر صدر کے لئے آبنوس کی بنی ہوئی اونچی سی کرسی رکھی تھی۔ اُس پر سرخ مخمل کا غلاف پڑا تھا۔ ہوا چلتی تو محرابوں کے زرتار پردے لہراتے، ہر طرف ستاروں کی افشاں بکھر جاتی۔ شہ نشین دُور سے کسی بارہ دری کے حجرے کی طرح نظر آتی۔ اُس کو دیکھ کر مغل شہزادوں کے شبستانوں کی یاد تازہ ہو جاتی، جن کو جشنِ نوروز پر بقعۂ نور بنایا جاتا تھا۔

جلسہ گاہ کا انتظام رفعت علی دلگیر کے سپرد تھا۔ وہ پستہ قد کا آدمی تھا۔ چہرہ پر چگی سی ڈاڑھی لمبی کاکلیں اور ہاتھ میں سانپ کی طرح بل کھایا ہوا عصا اس حلیہ میں وہ ان صوفیوں کی طرح نظر آتا تھا جن کو محفلِ سماع کی زینت کے لئے خاص طور پر بلایا جاتا ہے۔ جو قوالوں کو پیسہ کوڑی تو کبھی نہیں دیتے، مگر عالمِ وجد میں آکر وہ کرتب دکھاتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے۔ لیکن دلگیر کا تصوف کے کشف و کرامات سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ یہ وضع قطع اُس نے محض اپنی شخصیت کو باوقار بنانے کے لئے اختیار کی تھی۔

دلگیر جلسوں کو کامیاب بنانے کا ماہر تھا۔ ویسے شہر میں اس کا ایک چھوٹا سا دردی خانہ تھا۔ مگر الیکشن کے دنوں میں وہ جلسہ کرانے کا کام بھی کرتا تھا اور ہمیشہ ٹھیکے پر کام کرتا تھا۔ ایک زمانہ میں اس کی باقاعدہ ٹولی تھی، جن میں نعرہ لگانے والے، نعرہ اٹھانے والے، تالیاں بجانے والے بھی تھے اور ایسے مضبوط غنڈے بھی تھے، کہ اگر کسی نے ذرا بھی جلسہ میں گڑبڑ کی تو فوراً اس کی گردن دبوچ لیتے۔ مگر اب اس کی ٹکڑی منتشر ہو گئی تھی۔ البتہ پرانی ساکھ باقی تھی۔

جلسہ شروع ہونے کا جو وقت مقرر تھا۔ رفعت علی دلگیر اس سے گھنٹہ بھر پہلے ہی جلسہ گاہ میں پہنچ گیا۔ اُس نے پنڈال کا گھوم پھر کر باقاعدہ معائنہ کیا۔ اس کے ہمراہ ۲۵ آدمیوں کی ایک ٹیم بھی تھی۔ ان میں سے دلگیر نے ہر ایک کو مختلف مقامات پر مقرر کیا۔ نعرہ لگانے والوں کو ہدایتیں دیں کہ پہلے کون ابتدا کرے گا اور اس کے بعد کس طرح سب مل کر نعرہ لگائیں گے۔ تالیاں پیٹنے والے کس موقعہ پر تالیاں بجائیں گے۔ جب تک وہ سگنل نہیں دے گا، نہ کوئی نعرہ لگے گا، نہ تالیاں بجیں گی۔ وہ دو روز قبل ان کے کئی ریہرسل کرا چکا تھا۔ مگر وہ سب اناڑی تھے اس لئے وہ ان کو بار بار ہدایتیں دے رہا تھا اور ڈانٹتا

بھی جارہا تھا۔ "دیکھو بے کسی نے الٹی سیدھی حرکت کی تو دھیلا نہیں دوں گا" ان لوگوں کے ریٹ کچھ اس طرح مقرر تھے۔

نعرہ لگانے والے فی کس پانچ روپیہ

نعرہ اٹھانے والے۔ فی کس دو روپیہ

تالیاں بجانے والے فی کس ایک روپیہ

اس کے علاوہ دستگیر نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ جو گرما گرم زوردار نعرہ لگائے گا اس کو انعام بھی ملے گا۔

ان سے فارغ ہونے کے بعد دستگیر نے غنڈوں کی ڈیوٹیاں مقرر کیں اور اُن کو اچھی طرح سمجھا بجھا کر خان بہادر کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

ساڑھے سات بجے شام ہی سے لوگ جلسہ گاہ میں آنا شروع ہو گئے تھے۔ گھنٹہ بھر کے اندر اندر پنڈال کھچا کھچ بھر گیا۔ ۸ ہزار سے زیادہ لوگوں کا اجتماع تھا۔ ۹ بجے سے کچھ دیر قبل خان بہادر کی کار جلسہ گاہ کے بڑے پھاٹک پر آکر رکی۔ اس کے کارکن چیلوں کی طرح کار کی جانب جھپٹے۔ ایک نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ خان بہادر بڑے وقار کے ساتھ باہر آیا۔ رضا کاروں نے اٹینشن ہو کر سلامی دی۔ دستگیر نے فوراً نعرہ بازوں کو اشارہ کیا اور جلسہ گاہ "خان بہادر زندہ باد" کے نعروں سے گونجنے لگی۔

خان بہادر کے عقیدت مند بڑھ بڑھ کر معانقہ کر رہے تھے۔ مزاج پرسی کر رہے تھے۔ اور وہ لوگوں کے ہجوم میں گھرا ہوا، ہر ایک سے انکساری کے ساتھ پیش آرہا تھا۔ خلقت اُس کے چاروں طرف اس طرح ٹوٹ رہی تھی کہ شہ نشین تک پہنچنے میں دس منٹ لگے۔

شہ نشین پر پہنچ کر خان بہادر نے جلسہ پر نظر ڈالی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اتنا عظیم اجتماع اُس کے سان وگمان میں بھی نہ تھا۔ مسرت سے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے پنڈال میں، وہ دولھا کی طرح سجا سجایا، کرسیِ صدارت پر رونق افروز تھا۔ ہر نگاہ اس

کی جانب اٹھ رہی تھی۔ ہر زبان پر اسی کا تذکرہ تھا۔ اور اس حقیقت کا اس کو شدت کے ساتھ احساس تھا۔

خان بہادر کے ساتھ نیاز بھی جلسہ گاہ میں آیا تھا۔ اُس نے جو یہ آن بان اور دبدبہ دیکھا تو خان بہادر کی شخصیت سے بہت زیادہ مرعوب ہوا۔ اُس کے سامنے دور تک انسانی چہرے ہی چہرے نظر آرہے تھے اور یہ سب خان بہادر کی تقریر سننے آئے تھے۔ اس کے حامی اور عقیدت مند تھے۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا کہ واقعی خان بہادر بہت بڑا آدمی ہے۔ وہ بار بار خان بہادر کی جانب دیکھتا۔ جو اس کے قریب ہی اونچی سی کرسی پر کسی فرماں روا کی طرح فروکش تھا۔ اُس کی گردن فخر سے اوپر اٹھی ہوئی تھی اور چہرے پر وقار چھایا تھا۔

جلسہ کی کارروائی کا آغاز ہوا تو ایک پیشہ ور مقرر نے کھڑے ہو کر تقریر کی۔ اُس نے خان بہادر کی شان میں وہ وہ قصیدہ خوانی کی کہ اکثر تو خان بہادر بھی شرما گیا۔ اس کے بعد دو اور مقررین کی تقریریں ہوئیں۔ ہر ایک کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ خان بہادر عوام کا بے حد مخلص لیڈر ہے۔ ایک سچا اور پاک باز مسلمان ہے، اس کے سینے میں ایمان کی حرارت اور غریبوں کی خدمت کا جذبہ موجزن ہے۔ لہٰذا وہ اُن کے ووٹوں کا صحیح حق دار ہے (مقررین کو دیگر مراعات کے علاوہ نقد رقمیں بھی ملی تھیں)۔ خان بہادر کو عوام کا نمائندہ ثابت کرنے کے لئے انھوں نے فصاحت اور بلاغت کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ خان بہادر کے پیسے وصول ہو گئے اور کم از کم دو مقررین نے تو آئندہ جلسوں کے لئے پوری پوری گنجائش پیدا کرلی۔

لیکن جوں جوں خان بہادر کے بولنے کا وقت آرہا تھا اُس کے دل کی دھڑکن بڑھتی جارہی تھی۔ اُس نے آج تک کسی جلسے سے خطاب نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ گھر سے یہ سوچ کر نکلا تھا کہ اپنی تقریر سے وہ دھوم مچا دے گا۔ یہ تقریر اُس نے ایک اخبار کے ایڈیٹر سے لکھوائی تھی اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر کئی روز تک اُس کو ادا کرنے کی مشق کی تھی۔ ایک بار کنبے کے تمام افراد کو جمع کر کے اُس نے تقریر کا ریہرسل بھی کیا تھا۔ مگر اتنا بڑا مجمع دیکھ کر وہ گھبرا سا گیا تھا۔

آخر خان بہادر بولنے کے لئے کھڑا ہوا۔ تقریر شروع کرنے سے پیشتر اُس نے پورا ایک گلاس برف کے پانی کا پیا۔ سگار پر کئی لمبے لمبے کش لگائے۔ مگر وہ تقریر جو وہ رٹ کے لایا تھا، وہ اُس کے ذہن

سے نکلتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی یادداشت پر زور دے کر اس کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسی اثناً میں ایک طرف سے نعرہ بلند ہوا۔

"نعرۂ تکبیر"

اور اُس کے ساتھ ہی مختلف گوشوں سے آوازیں آئیں "اللہ اکبر"

"خان بہادر، زندہ باد!"

"خان بہادر، زندہ باد"

ان نعروں سے جلسہ گاہ گونجنے لگی۔ خان بہادر کی یادداشت بالکل جواب دے گئی۔ بدحواس ہو کر اُس نے سگار کے دو تین اور لمبے لمبے کش لگائے۔ اس کے پیر آہستہ آہستہ کپکپا رہے تھے۔ تنفس تیز ہو گیا تھا اور سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔ اُس نے اسی عالم میں گھبرا کر تقریر شروع کر دی

"برادران اسلام! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے آپ سے صرف چند ضروری باتیں کہنا ہیں" یہ دو جملے اُس نے بڑی مشکل سے ادا کئے۔ اس کی آواز قدرے بھرائی ہوئی تھی۔ مگر وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میں آپ کا ایک خادم ہوں، آپ کی کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں" ایک بارگی اس کو اپنی تقریر کا کچھ حصہ یاد آ گیا۔ اُس نے فوراً کہا "لیکن یہ بات تو ہر امیدوار آپ سے آکر کہتا ہے۔ ہر ایک کے دل میں آپ کی خدمت کا جذبہ ہے، ہر ایک آپ کے غم میں گھلا جاتا ہے۔ تو پھر آپ میری بات پر یقین کیوں کرنے لگے۔ آپ کہیں گے کہ خان بہادر ووٹ لینے کے لئے یہ سب ڈھونگ رچا رہا ہے وہ پرلے درجے کا عیار اور مطلبی آدمی ہے" خان بہادر اپنی تقریر کو ٹوسٹ (TWIST) دے کر حرف مطلب پر آنا چاہتا تھا کہ حسن اتفاق سے رفعت علی دلگیر کو سر میں کھجلی کا احساس ہوا۔ اُس نے کھجانے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ ایک تالی بجانے والے کی اس پر نظر پڑ گئی۔ وہ سمجھا دلگیر سگنل دے رہا ہے۔ اُس نے قریب بیٹھے ہوئے اپنے ساتھی کو کہنی سے ٹہوکا دیا اور زور زور سے تالی بجانے لگا۔ اُس کے دوسرے ساتھی بھی تالی بجانے لگے۔ تالیوں کا شور سن کر مشرقی کونے پر کھڑے ہوئے نعرہ زن نے اپنی مستعدی کا ثبوت دیا۔ اُس نے فوراً گلا پھاڑ کر نعرہ لگایا۔

"سچ کا بول بالا"

جلسے سے کئی ملی جلی آوازیں اُبھریں "جھوٹے کا منہ کالا"

"دھاندلی بازی"

"نہیں چلے گی، نہیں چلے گی"

"دولتوں کی دلالی"

"نہیں چلے گی، نہیں چلے گی"

حاضرین جلسہ بھی ان نعروں میں شریک ہو گئے اور ان کی آوازوں کے شور سے جلسہ گاہ گونجنے لگی۔ یہ نعرے دراصل اسکائی لارکوں کے تھے اور خان بہادر کے کارکنوں نے انہی کے خلاف استعمال کرنے کے لئے دلگیر کے آدمیوں کو رٹائے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت دی گئی تھی کہ خان بہادر جب اسکائی لارکوں کی مذمت کریں تو وہ یہ نعرے لگانا شروع کر دیں۔

خان بہادر نے جو یہ نعرے سنے تو اس نے گھبرا کر سوچا کہ جلسے میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس کی مخالفت میں نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ تقریر کا وہ حصہ جو اس کو یاد آیا تھا۔ وہ بالکل اس کے ذہن سے نکل گیا دوسری طرف دلگیر کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ خان بہادر کی نظروں سے بچتا پھر رہا تھا۔ غصہ سے بڑبڑا رہا تھا "سالوں نے میری ناک کٹوا دی۔ کسی حرام کے تخم کو ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ یار و غضب ہو گیا"۔ مارے طیش کے اس کی چگی ڈاڑھی بکرے کی دم کی طرح ہل رہی تھی اور نتھنوں سے سانس "شوں، شوں" کر کے نکل رہی تھی۔ اس وقت وہ اچھا خاصہ ناٹک کا مسخرا نظر آ رہا تھا۔

خان بہادر غضبناک ہو کر کہنے لگا "بعض لوگ جلسے میں گڑبڑ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم موم کے بنے ہوئے نہیں ہیں۔ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں"۔

دلگیر نے دیکھا موقعہ غنیمت ہے۔ اس نے فوراً سگنل دیا اور جلسہ "نعرۂ تکبیر اللہ اکبر" کے نعروں سے گونجنے لگا۔

دلگیر کو سرخرو ہونے کا موقعہ ملا تھا۔ لہٰذا وہ ایسے مقام پر کھڑا ہو گیا۔ جہاں سے خان بہادر اس کو

دیکھ سکتا تھا۔ ان نعروں نے واقعی اثر کیا۔ خان بہادر اور بھی جوش میں آ کر کہنے لگا: "میں اپنے متعلق خود اپنی زبان سے کچھ کہنا نہیں چاہتا مگر میری خدمات کو آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ بارٹے کی مسجد کس نے بنوائی؟" شامت اعمال کسی دل جلے کی زبان سے نکل گیا۔

"مسجد کی دو کانوں کی دو لاکھ پگڑی کس نے لی؟"

دلگیر کے گرگے گِدھوں کی طرح اس شخص پر جھپٹے اور اس کو لاتوں اور گھونسوں سے مارتے ہوئے جلسے کے باہر لے جانے لگے اس طرزِ عمل پر حاضرین جلسہ نے احتجاج کیا۔ جلسہ میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے غنڈوں کی گرفت سے اس شخص کو چھڑانے کی کوشش کی تو ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ اور اس کے بعد تو اس قدر شور و ہنگامہ برپا ہوا کہ بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا، اسی طرف بھاگا۔ خان بہادر نے جو یہ عالم دیکھا تو وہ بھی بدحواس ہو گیا۔ وہ چپکے سے شہ نشین سے اترا اور پچھلے گیٹ سے نکل کر جلسہ گاہ کے باہر آ گیا۔ کار منگوائی اور اس میں بیٹھ کر سیدھا گھر کی جانب چل دیا۔

بھگدڑ پڑنے کے بعد آناً فاناً پنڈال خالی ہو گیا۔ جلسہ گاہ میں الّو بولنے لگا۔ اب صرف چند کارکن اور دلگیر شامیانے کے نیچے رہ گئے تھے۔ وہ سخت برہم نظر آ رہا تھا۔ اس کے گرگے سر جھکائے ملزموں کی طرح کھڑے تھے۔ وہ ان کے سامنے بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ جب اس کو زیادہ تاؤ آتا تو ان پر برسنے لگتا۔

"ابے تم نے مجھ کو کہیں کا نہ رکھا۔ اب میں خان بہادر کے پاس کس منہ سے جاؤں۔ یاد رکھنا کسی سالے کو ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ میرا تو بیڑا غرق ہو ہی گیا۔ مگر تم کو بھی نہیں بخشوں گا۔ ابے تم کو کس کس طرح سمجھایا۔ مگر سب نے اپنا حرامی پن دکھایا۔ یارو ذرا تو عقل سے کام لیا ہوتا۔ تُف ہے تم پر اتنے بڑے بڑے ڈھو جوان ہو کر تمہاری یہ حرکتیں۔"

وہ دیر تک اُن کو ڈانٹتا رہا اور بے چینی سے ٹہلتا رہا۔

رفعت علی دلگیر شرم کے مارے خان بہادر کے پاس نہ گیا اور پنڈال سے نکل کر سیدھا درزی خانے گیا۔ لیکن خان بہادر کو اُس سے ذرا بھی شکایت نہ تھی۔ اُس نے جلسے کے درہم برہم

ہو جانے کی ساری ذمہ داری اسکاؤٹ لارکوں پر عائد کی اور اس وقت اپنے کارکنوں کے ساتھ بیٹھا ہوا سارا غصہ اسکاؤٹ لارکوں پر اُتار رہا تھا۔

کارکن بھی اُس کی تائید کر رہے تھے۔

رات گئے تک خان بہادر کی کوٹھی پر بھی یہی چرچا رہا۔ آئندہ کے لئے نت نئے ہتھکنڈے اور اسکیمیں سوچی گئیں اور یہ طے کیا گیا کہ کام اور بھی زور شور کے ساتھ کیا جائے۔

۴

چند روز بعد کا ذکر ہے۔ اسکاؤٹ لارکوں نے ایک بستی میں جلسہ کیا۔ حاضرین کی تعداد بھی اچھی تھی اور ان میں جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ سلمان تقریر کر رہا تھا اُس کا لہجہ تیکھا اور آواز میں خاصی گھن گرج تھی۔ انتخابی مہم کے سلسلہ میں تقریریں کر کے وہ اب منجھ گیا تھا۔ لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا اپنا اسٹائل بنتا جا رہا تھا۔ وہ اسکاؤٹ لارکوں میں ایک کامیاب مقرر سمجھا جانے لگا تھا۔

سلمان نے دوران تقریر میں ایک بار اپنی آواز اونچی کر کے کہا "آپ کی پریشاں حالی اور دکھوں کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ مجبور ہیں بے سہارا ہیں، کمزور ہیں۔ آپ کی پریشانیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اپنی قوت کا اندازہ نہیں۔ آپ اپنے حقوق اور اُن کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔"

سلمان بڑی روانی کے ساتھ بول رہا تھا۔ اچانک جلسہ کے اندر سے کئی ملی جلی آوازیں اُبھریں۔

"جھوٹ بولتا ہے"

"بہرو پیا ہے"

"سب ووٹ مانگنے کا ڈھونگ ہے"

"ہم تقریر نہیں سنیں گے"

"واپس جاؤ، واپس جاؤ"

اس کے ساتھ ہی جلسہ گاہ میں شور ہونے لگا۔ اس میں چیخ چیخ کر بولنے والوں کی آوازوں کے ساتھ مرغوں اور بلیوں کی بولیاں بھی سُنائی پڑ رہی تھیں۔ سلمان کسی قدر گھبرا گیا۔ اس لئے کہ یہ اس کے ساتھ پہلا اتفاق تھا۔ اُس نے لوگوں کو خاموش کرنے کی درخواست کی تو شور مچانے والے اور بھی زیادہ اونچی آواز سے چیخنے لگے۔ یہ آوازیں کچھ اس طرح آپس میں گھُل مل گئی تھیں کہ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

جلسے میں پہلے تو کچھ سراسیمگی پھیلی، کچھ لوگ بھاگنے لگے، کچھ پنجوں کے بل اونچے ہو ہو کر اس طرف دیکھنے لگے جس طرف شور ہو رہا تھا۔ یہ ۱۵، ۲۰ آدمیوں کا غول تھا، جس میں ہر شخص ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر، گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ مگر وہ اس طرح زیادہ دیر تک شور نہ مچا سکے۔ جلسہ کے اندر سے کچھ جوشیلے نوجوان نکلے اور ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش۔ مگر وہ جھگڑا کرنے پر آمادہ ہو گئے اور یہی اُن کے حق میں بُرا ہوا۔ ایک بارگی اُن پر چاروں طرف سے مار پڑنے لگی۔ کچھ تو یہ رنگ دیکھکر نکل گئے مگر جن کو لوگوں نے پکڑ لیا تھا، ان پر دھڑا دھڑ جوتے پڑنے لگے۔ ذرا ہی دیر میں اُن کی اچھی خاصی مرمت ہو گئی۔ اسکاؤٹ لارکوں نے منت سماجت کر کے بڑی مشکل سے اُن کی گلو خلاصی کی۔

ہنگامہ ختم ہونے کے بعد جلسہ پھر شروع ہو گیا اور رات گئے تک جاری رہا۔ سلمان نے اور بھی زیادہ جوش کے ساتھ تقریر کی اور یہ واقعہ ہے کہ اس کی یہ تقریر بڑی ولولہ انگیز تھی۔ لوگ بار بار نعرے لگا رہے تھے اور ان نعروں کی آوازیں، رات کے سناٹے میں میلوں تک سنائی پڑ رہی تھیں۔

اسی شب فلک پیما کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا۔ جس میں جلسہ کے اندر ہونے والی گڑبڑ پر غور کیا گیا۔ اس لئے کہ یہ ابتدا تھی اور آئندہ کے واسطے اسکاؤٹ لارکوں کو تنبیہ تھی۔ اجلاس میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ اسکاؤٹ لارک اس واقعہ پر بہت برہم تھے اور اونچی آوازوں سے بول رہے تھے۔

کمرے کے اندر سگرٹوں کا دھواں منڈلا رہا تھا۔ لیمپ کے چاروں طرف سرمئی غبار کا جال پھیل گیا تھا۔ اس کی روشنی دھندلی پڑ گئی تھی اور اس دھندلی روشنی میں اسکاؤٹ لارکوں کے چہرے خوابوں میں چلنے پھرنے والی پرچھائیوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ فضا کچھ ایسی ہی پُراسرار تھی، اچانک

دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھل گیا۔ کمرے کے اندر ایک بارگی خاموشی چھا گئی! اسکائی لارکوں نے چونک کر دیکھا۔ دروازے کے بیچوں بیچ صفدر بشیر کھڑا تھا اُس کے بال پٹ سن کے ریشوں کی طرح خشک تھے۔ پیشانی پر گہری لکیریں تھیں، چہرے کا رنگ خاکستری ہو رہا تھا اور رخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیوں کے درمیان دھنسی ہوئی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

صفدر بشیر لمحہ بھر تک دروازے پر کھڑا رہا۔ اُس نے کوئی بات نہیں کی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس کے قدموں کی آہٹ پختہ فرش پر کھٹ کھٹ ابھرتی رہی۔ وہ علی احمد کی پشت پر آکر چٹان کی طرح ایستادہ ہو گیا۔ ذرا دیر بعد کمرے کی خاموشی میں صفدر بشیر کی آواز اُبھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"جناب صدر اور اسکائی لارک دوستو! میں اس بے جا مداخلت کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ آپ کے جلسے میں مجھے اس طرح آنے کا کوئی حق نہیں۔ فلک پیما سے ایک جذباتی لگاؤ تھا جو مجھ کو کشاں کشاں یہاں کھینچ لایا۔ شاید یہ میں آخری بار اسکائی لارکوں کو، ان کے ہیڈ کوارٹر کو اور اس کے در و دیوار کو دیکھ رہا ہوں۔" صفدر بشیر ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ اس کی آواز تھکی ہوئی سی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہانپ رہا ہے۔ "میں اس ملک کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہا ہوں میں نے اپنی تمام جائداد فروخت کر دی ہے اور لندن کی کسی کاؤنٹی میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا پروگرام ہے۔ کل میں اپنے اس سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔" اس کا خوبصورت چہرہ، پت جھڑ کے پتوں کی طرح زرد پڑتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک دھندلی پڑ گئی تھی۔ "مجھے فخر ہے کہ میں فلک پیما کا ایک کارکن رہ چکا ہوں اور مجھے دکھ ہے کہ میں آپ کے ساتھ اس جدوجہد میں نہ چل سکا۔ جو زندگی کا سب سے بڑا نصب العین ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے لرز رہے تھے۔ وہ بیماروں کی طرح نڈھال ہو رہا تھا۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی چھا گئی۔ ہر اسکائی لارک اُداس اور کھویا کھویا لگ رہا تھا۔ ایکا ایکی علی احمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لمحہ بھر تک وہ صفدر بشیر کے چہرے کو تکتا رہا۔ پھر اُس نے اپنے دونوں بازو پھیلائے اور بڑے جذباتی انداز میں صفدر بشیر کے سینے سے چمٹ گیا۔

کچھ دیر تک دونوں اسی عالم میں کھڑے رہے۔ کمرے کی خاموشی میں دبی دبی سسکیوں کی آواز اُبھری۔ صفدر بشیر رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئی تھیں اور اُس کی سانس اُلجھی ہوئی تھی۔ علی احمد نے اس کی پیٹھ کو آہستہ آہستہ تھپتھپا کر کہا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر جذباتی ہو۔ صفدر بشیر ابھی تم بہت بچے ہو"

صفدر بشیر اس کے شانے پر جھکا ہوا آنسو بہاتا رہا۔ ذرا دیر بعد اُس نے علی احمد سے کہا "اچھا اب میں چلوں گا" علی احمد علیحدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"کہاں جاؤ گے؟"

"ہوٹل، کوٹھی تو میں نے پچھلے ہفتے فروخت کر دی"

علی احمد نے اس دفعہ ڈانٹ کر کہا "کل ہوٹل سے اپنا سامان یہاں لے آنا"

"لیکن میں تو لندن جا رہا ہوں"

"تم کہیں نہیں جاؤ گے"

کئی اسکاؤٹ لڑکوں کی ملی جلی آوازیں اُبھریں "صفدر بشیر لندن نہیں جا سکتے"

صفدر بشیر مسکرانے لگا۔ اس کا چہرہ بچوں کی طرح معصوم نظر آ رہا تھا۔

اسکاؤٹ لڑکوں نے کھڑے ہو کر زور سے نعرہ لگایا "صفدر بشیر زندہ باد" وہ اس وقت بے حد مسرور نظر آ رہے تھے۔ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے اور اونچی آوازوں سے بول رہے تھے۔ صفدر بشیر کی کمی کو انھوں نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا اور آج اُسے پا کر وہ خوشی سے کھلنڈرے نوجوانوں کی طرح اچھل رہے تھے۔ سب نے صفدر بشیر کو گھیرے میں لے لیا تھا اور اس کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ رات گئے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

اسی رات کا ذکر ہے۔ ۱۲ بجے کا عمل ہو گا۔ بستی پر ہو کا عالم طاری تھا۔ دن بھر دہکتی ہوئی صحرائی ہوائیں چلتی رہیں مگر اس وقت موسم کسی قدر خوش گوار تھا۔ ہیڈ کوارٹر کے اندر اسکاؤٹ لڑکے گہری نیند سو رہے تھے۔ اچانک باہر گلی میں شور بلند ہوا۔ ملی جلی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ

بہت سے لوگ اونچی آواز سے باتیں کر رہے ہیں۔ شور برابر بڑھتا گیا۔

علی احمد کا کمرہ باہری رُخ پر تھا۔ شور بلند ہوا تو اس کی آنکھ کُھل گئی۔ ذرا دیر تک وہ اِن آوازوں کو چپ چاپ لیٹا سنتا رہا۔ پھر گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ کمرے کے دوسرے سرے پر صفدر بشیر سو رہا تھا۔ علی احمد نے اس کو آواز دی۔ شور سے اُس کی نیند بھی اچاٹ ہو گئی تھی۔ وہ خوف زدہ معلوم ہو رہا تھا۔ دونوں نے کان لگا کر آوازوں کو سُنا مگر سوائے شور کے وہ اور کچھ نہ سُن سکے۔

شور اب بہت بڑھ گیا تھا اور آوازیں عین ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے سامنے بلند ہو رہی تھیں۔ اچانک سلمان دروازہ کھول کر کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اُس کے ہمراہ اور بھی کئی اسکائی لارک تھے۔ وہ بہت سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ اُس نے علی احمد سے کہا۔

"ہیڈ کوارٹر پر حملہ ہونے والا ہے"

حملے کا لفظ سُن کر سب گھبرا گئے۔ سلمان کہنے لگا "گرمی زیادہ تھی، اس لئے میں چھت پر سو رہا تھا۔ شور سن کر آنکھ کُھل گئی۔ میں نے جھانک کر گلی میں دیکھا۔ وہاں بہت سے آدمی اکٹھا ہیں۔ وہ اسکائی لارکوں کے خلاف باتیں کر رہے ہیں" اُس نے بتایا کہ پوری گلی حملہ آوروں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ تعداد میں ۴۰۰۔۔۔ ۵۰۰ سے کم نہیں ہوں گے۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈاکٹر زیدی بھی وہاں آگیا۔ اُس نے بھی سلمان کی تائید کی۔ وہ ابھی ابھی کچی نیند سے اٹھا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور سر کے بال گھاس کی طرح کھڑے تھے۔ رفتہ رفتہ کمرہ اسکائی لارکوں سے بھر گیا۔ سب سہمے ہوئے تھے اور اُن کے بشرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

ایکا ایکی دروازہ ٹوٹنے کی آواز سُنائی دی۔ شور ایک بارگی تیز ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی شیشوں کے ٹوٹنے کی جھنکاریں اُبھرنے لگیں۔ ڈاکٹر زیدی نے چیخ کر کہا "ڈسپنسری تباہ ہو گئی"۔ یہ کہہ کر گھبرایا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اسکائی لارک اور بھی پریشان ہو گئے۔ شیشوں کے ٹوٹنے کی آوازیں دھڑا دھڑ ابھرتی رہیں۔

شور اس قدر تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اسی اثنا میں ہیڈ کوارٹر کے بڑے دروازے پر زور زور سے کھٹکھٹاہٹ اُبھری۔ اس دفعہ دروازہ پر حملہ ہوا تھا۔ آوازوں کا شور قریب آ گیا۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر پاگلوں کی طرح اسکائی لارکوں کو گندی گندی گالیاں دے رہے تھے۔

اسکائی لارکوں کے سامنے اب دو ہی راستے رہ گئے تھے۔ یا تو وہ باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا پھر اندر بیٹھے رہیں اور دروازے کی حفاظت کریں۔ مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ ان کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ اُن کے ذہن ماؤف ہو چکے تھے اور وہ بے حد پریشان نظر آ رہے تھے ایکاایکی صفدر بشیر سب کے بیچ میں سے گذر کر دروازے کی جانب لپکا۔ قبل اس کے کہ اسکائی لارک یہ غور کریں کہ وہ کیا کرنے والا ہے، وہ صدر دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اُس نے دروازہ کھول دیا اور دروازے کے بیچوں بیچ کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے حملہ آوروں کو مخاطب کر کے بلند آواز سے کہا۔

"بھائیو! پاگل مت بنو۔ اسکائی لارک تمھارے دشمن نہیں ہیں۔ وہ تمھارے خادم ہیں۔ وہ تمھارے ہی لیے" عین اس وقت اُس کی کنپٹی پر ایک بڑا سا پتھر آ کر لگا۔ صفدر بشیر جملہ پورا نہ کر سکا اس کا سر چکرا گیا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ خون کی ایک دھار کنپٹی سے نکل کر اُس کے رخسار پر پھیل گئی۔ اُس نے اس طرف توجہ دیئے بغیر اپنا ہاتھ بلند کر کے کہا۔

"بھائیو۔ اس دواخانے کو برباد نہ کرو۔ یہ ہزاروں نادار مریضوں کا سہارا ہے تم . . . . . " فوراً ایک لاٹھی اُس کے سر پر پڑی۔ وہ شرابی کی طرح جھوم کر لڑکھڑایا۔ اُس نے دروازے کا ایک پٹ پکڑ لیا اور اس کا سہارا لے کر ہانپنے لگا۔ اُس نے لڑکھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔ "لوگو! خدا کے لئے میری بات تو سنو۔ پاگل مت بنو" مگر کسی نے اس کی بات نہ سُنی۔ وہ دیوانوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ ایک بارگی انھوں نے اس پر ہلہ بول دیا اور چاروں طرف سے لاٹھیاں اُس پر برسنے لگیں۔ اُس نے گھبرا کر دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ اسی وقت کسی حملہ آور نے داہنی طرف سے جھپٹ کر اس پر بلّم سے حملہ کیا۔ بلّم کا تیز چمکتا ہوا پھل اس کے پہلو کو چیرتا ہوا جسم کے اندر اُترتا چلا گیا۔ صفدر بشیر بلبلا کر چیخا "ہائے!" اور لڑکھڑا کر گرنے لگا۔

سلمان اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور صفدر بشیر کو سنبھال لیا۔ وہ اُس کے بازوؤں پر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح جھولنے لگا۔ سلمان نے چاہا کہ وہ صفدر بشیر کو اٹھا کر اندر لے آئے مگر حملہ آوروں نے اتنا موقعہ ہی نہ دیا۔ انھوں نے اندھا دھند اس پر لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں۔

اب اسکائی لارکوں کے لئے ہیڈ کوارٹر کے اندر رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ ان دونوں کو بچانے کے لئے باہر نکل آئے۔ حملہ آوروں نے ان کو نرغے میں لے لیا اور ہر طرف سے بڑھ بڑھ کے حملے ہونے لگے۔ وہ زخم پر زخم کھا رہے تھے اور تکلیف سے بلبلا بلبلا کر چیخ رہے تھے۔ اُن کے جسموں سے خون پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے گہری دھند پھیلتی جا رہی تھی۔

حملہ آور وحشیوں کی طرح حملہ کر رہے تھے۔ وہ اس طرح شور مچا رہے تھے، جیسے کسی جنگلی جانور کا شکار کر رہے ہوں۔ وہ بلم اور لاٹھیوں سے اسکائی لارکوں کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے تھے۔ اُن کی آنکھیں شکاری چیتوں کی طرح چمک رہی تھیں اور چہرے بھوتوں کی طرح خوفناک نظر آرہے تھے۔

بستی بھر میں کھلبلی پڑ گئی۔ ہر گھر میں جگار ہو گئی تھی۔ لوگ مکانوں کی چھتوں پر اور دروازوں پر سہمے ہوئے کھڑے تھے اور خوف زدہ نظروں سے ہیڈ کوارٹر کی جانب دیکھ رہے تھے۔ جہاں اسکائی لارکوں کے چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی۔ مگر کوئی اس طرف نہ گیا۔ ہر شخص دم بخود تھا۔ ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور شور سے دل دھڑکنے لگتا تھا۔

اندھیری رات میں ایکا ایکی آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ ہوا تیز تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شعلے بھڑک کر پھیلنے لگے۔ ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں آگ لگ گئی۔ جس میں نادار مریضوں کا دواخانہ تھا۔ ضرورت مندوں کا امدادی بنک تھا۔ کتابوں کی لائبریری تھی اور اسکائی لارکوں کا دفتر تھا، جو زندگی سے گمراہی اور غریبی مٹانے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ جو خان بہادر کے زرخرید غنڈوں کے نرغے میں گھرے ہوئے، بلموں اور لاٹھیوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور زخموں سے نڈھال ہو ہو کر

گرتے جا رہے تھے۔

ہیڈکواٹر کے در و دیوار جل رہے تھے۔ دروازے چیخ رہے تھے' الماریاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ شیشے موم کی طرح پگھل رہے تھے۔ کتابیں چتا کی طرح بھڑک رہی تھیں۔ یہ امن کے پیامبر ٹالسٹائی کی لاش تھی۔ یہ شکسپیئر کا جنازہ تھا۔ یہ ارسطو کا ذہن' یہ گورکی کا شعور تھا۔ سب آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ عظیم مصنف، عظیم مفکر۔ انسانی ارتقا کے علمبرداروں کے ذہن و فکر شعلہ بداماں تھے۔ کتابیں جل رہی تھیں۔ کتابیں تباہ ہو رہی تھیں (خان بہادر فرزند علی تمہارا بول بالا ہو۔ خدا تمہارا اقبال بلند کرے۔ تم سفیر بنو' وزیر بنو۔ حاکم وقت بنو۔ تم نے اپنے حریف کو روند کر ڈال دیا۔ وہ دیکھو ڈاکٹر زیدی زخموں سے نڈھال پڑا سسک رہا ہے)

اسکائی لارکوں کے ہیڈکواٹر کی عمارت جلتی رہی۔ شعلے اژدہوں کی طرح سرخ سرخ زبانیں نکال کر لپکتے رہے' بھڑکتے رہے۔ آسمان کی بلندیوں پر دور دور تک سرخی کا غبار پھیل گیا تھا۔ دیواروں میں شگاف پڑ گئے تھے اور دروازے اوندھے منہ گر رہے تھے۔ ہر چیز جل رہی تھی' ہر چیز تباہ ہو رہی تھی۔ اسکائی لارک زخموں سے بے حال ہو کر گر پڑے تھے۔

حملہ آور کچھ دیر تک کھڑے اسکائی لارکوں کے خلاف نعرے لگاتے رہے۔ پھر وہ فوجی مہم سے پلٹنے والے تاتاریوں کی طرح شور مچاتے ہوئے گلی سے نکل کر سڑک پر آگئے۔ وہاں کئی ٹیکسیاں اور ٹرک کھڑے تھے۔ سب ان پر سوار ہو گئے۔ انجن کھڑکھڑائے اور ٹیکسیاں اور ٹرک روانہ ہو گئے۔

ہیڈکواٹر کی جلتی ہوئی عمارت کے سامنے زخمی اسکائی لارک بے سدھ پڑے تھے۔ صفدر بشیر نہ جانے کب دم توڑ چکا تھا۔ سلمان اکھڑی اکھڑی سانسیں بھر رہا تھا۔ ڈاکٹر زیدی اور کئی دوسرے اسکائی لارک خون میں ڈوبے ہوئے بے ہوش پڑے تھے۔

پولیس اس وقت پہنچی جب حملہ آور جا چکے تھے۔ ہیڈکواٹر جل کر تباہ ہو چکا تھا۔ لال لال انگاروں کی گہری سرخ روشنی میں خاک میں لتھڑی ہوئی صفدر بشیر کی لاش پڑی

تھی۔ اس کا چہرہ لہولہان ہوگیا تھا۔ نچلا ہونٹ لٹک رہا تھا۔ آنکھیں کھُلی ہوئی تھیں۔ اور وہ بے نور نظروں سے ہیڈ کواٹر کی جُھلسی ہوئی عمارت کو تک رہا تھا۔

فصل هشتم

۱

پہرے دار نے آہنی پھاٹک کھولا اور وہ دونوں ریمانڈ ہوم سے باہر آ گئے۔

یہ گرمیوں کی ایک سانولی سلونی شام تھی۔ بحیرہ عرب سے آنے والی تیز سمندری ہوائیں چل رہی تھیں۔ اور آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے بوندا باندی ہو چکی تھی بھیگے ہوئے راستوں پر بارش کہیں کہیں اپنے نشان چھوڑ گئی تھی۔ وہ دونوں کیچڑ سے بچتے بچاتے پرانی نمائش کی چہار دیواری کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ گلی میں دور تک گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور اُن کے قدموں کی آہٹ آہستہ آہستہ اُبھر رہی تھی۔

نوشا پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مگر آج اس کے ہمراہ راجہ نہیں کوکر تھا۔ کئی مہینے پہلے کا ذکر ہے۔ ایک ایسی ہی شام تھی۔ ریمانڈ ہوم کا بوڑھا ماسٹر، بیٹھ موٹے تختہ سیاہ پر چاک سے پاکستان کا نقشہ بنا رہا تھا۔ اتنے میں ایک طرف سے بندر کی طرح زور زور سے خوخیانے کی آواز اُبھری۔ ماسٹر بد حواس ہو کر اس طرح اُچھلا کہ اُس کا پیر پھسل گیا اور وہ دھڑام سے کروٹ کے بل گر پڑا۔ بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔ وہ کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ سب کے چہرے زرد پڑ گئے۔ ماسٹر تیزی کے ساتھ اپنی انگلیاں رگڑ رہا تھا۔ یہ اس بات کی پہچان تھی کہ کسی کی شامت آنے والی ہے۔ وہ جب مارنے پر آتا تھا تو پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا تھا۔ حسبِ معمول اُس نے عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے کلاس کو خونخوار نظروں سے گھور کر دیکھا۔ اس وقت وہ کچھ ایسا ہونق نظر آ رہا تھا کہ راجہ

بے ساختہ ہنس پڑا۔ ماسٹر نے اُس کو ہنستے ہوئے دیکھ لیا۔ اُس نے بید اٹھایا اور چیل کی طرح راجہ پر جھپٹا۔ راجہ نے سہم کر گردن جھکالی۔ ماسٹر نے اندھا دھند بید مارنا شروع کر دیئے اور چیخ کر بولا۔

"کیوں بے، بندر بننے کا تجھے بڑا شوق ہے۔ تجھے بندر ہی بنا کے چھوڑوں گا" وہ سڑاک سڑاک بید مارتا چلا گیا اور ہر بار بڑے تال سُر کے ساتھ کہتا "بندر کی بولی بول۔ بندر کی بولی بول ....." راجہ ذرا دیر تک تو مار کھاتا رہا۔ پھر تکلیف سے بلبلا کر وہ چیخنے لگا۔ "میں نے بندر کی آواز نہیں نکالی تھی"

ماسٹر نے پینترا بدل کے ایک زنّاٹے کا ہاتھ گھمایا "خبیث جھوٹ بولتا ہے"

راجہ کہنے لگا "اللہ قسم ماسٹر صاحب میں نے آواز نہیں نکالی تھی"

وہ پوچھنے لگا "پھر کون تھا؟"

راجہ بات کہتے کہتے جھجک کر چُپ ہو گیا۔ اسی وقت اُس کے بازو پر سڑاک سے بید پڑا۔ وہ گھبرا کر بول پڑا "ماسٹر صاحب پوکر تھا"

پوکر کا نام تو محمد علی تھا مگر سب اُس کو پوکر کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ہمیشہ کلاس میں ایسی ہی حرکتیں کرتا تھا۔ وہ حلق کے اندر سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا تھا۔ زور زور سے تالیں بجاتا تھا کتابیں غائب کر دیتا تھا، چٹکیاں بھرتا تھا۔ نہ وہ خود کبھی پڑھتا تھا اور نہ کسی کو پڑھنے دیتا تھا۔ اسی لئے وہ روزانہ پٹتا تھا۔ مگر سب اُس سے ڈرتے بہت تھے اس لئے کہ وہ بڑا شورہ پشت تھا۔ بوڑھے ماسٹر نے راجہ کو چھوڑ دیا اور دانت کچکچاتا ہوا پوکر پر جھپٹا۔ پوکر مار کھانے کے معاملہ میں تجربہ کار تھا۔ اُس نے ماسٹر کے پہنچنے سے پہلے ہی گھٹنوں کے اندر سر چھپا لیا اور جھک کر بیٹھ گیا۔ ماسٹر نے اُس کے قریب پہنچتے ہی بید مارنا شروع کر دیئے۔ پوکر چُپ چاپ پٹتا رہا۔ اُس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔

جب کلاس ختم ہو گیا اور ماسٹر کمرے سے باہر چلا گیا تو پوکر لپک کر راجہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا راجہ سہمی ہوئی نظروں سے اُس کو دیکھنے لگا۔ پوکر نے اُس کو ایک گندی سی گالی دی اور چیخ کر بولا ...

"اب بتاؤ سالے خاں کیا کہتے ہو" راجہ نے خوف زدہ ہو کر گردن جھکالی۔ پوکر نے ڈانٹ کر کہا "سیدھا کھڑا

"تیری تو ــــ" گالی دے کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور حلق سے آواز نکالی "ڈھیں" اور اُس کے ساتھ ہی اُس نے اُچھل کر راجہ کے سر پر ایک ٹکر ماری، پھر دوسری، پھر تیسری۔ لوکر حلق سے آوازیں نکالتا رہا "ڈھیں، ڈھیں، ڈھیں۔" راجہ چکرا کر گر پڑا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ خون ٹپک کر ہاتھ پر گرا تو راجہ کو تاؤ آگیا۔ وہ اُٹھ کر اس پر کتے کی طرح جھپٹا مگر لوکر نے ہاتھ گھما کر کنپٹی پر ایسا گھونسہ مارا کہ وہ دور جا کر گرا۔ وہ سنبھل کر اُٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ لوکر نے ایک زور کی ہٹ لگائی اُس کے جوتے کی بھرپور ٹھوکر راجہ کے گھٹنے پر جا کر بیٹھ گئی۔ بڑے زور کی چوٹ آئی تھی۔ راجہ تکلیف سے چیخ پڑا۔

اس کے بعد لوکر کی پیشی بھی ہوئی۔ سزا بھی ملی۔ مگر راجہ کے گھٹنے پر ایسا زخم آیا کہ وہ اچھا نہ ہوا کئی بار زخم دھو کر پٹی بھی باندھی گئی۔ لیکن گھاؤ اچھا ہونے کے بجائے اور پھیلتا گیا۔ راجہ لنگڑا لنگڑا کر چلتا اور اکثر بیٹھا زخم کو کریدا کرتا۔ پھر اس زخم سے ذرا نیچے پنڈلی پر بھی ایک زخم پیدا ہو گیا۔ یہ زخم کسی چوٹ سے نہیں آیا تھا، خود بخود ہو گیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے راجہ کے جسم پر جگہ جگہ سرخ داغ پڑ گئے۔ جن کو وہ برابر کھجاتا رہتا۔ ایک بار ڈاکٹر معائنہ کے لئے ریمانڈ ہوم آیا۔ اُس نے راجہ کے داغوں کو دیکھا تو دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر علیحدہ کمرے میں لے جا کر اُس نے راجہ سے بہت سے سوالات کئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک اس کا خوب معائنہ کیا۔

دوبارہ ڈاکٹر معائنہ کے لئے ریمانڈ ہوم آیا تو راجہ کے جسم کی کھال جگہ جگہ سے پھٹنے لگی تھی اور زخموں میں سے رطوبت بہا کرتی۔ راجہ کا چہرہ بھدا ہو گیا تھا۔ کان پھول گئے تھے۔ اُس کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ اب اُس نے چلنا پھرنا بھی بند کر دیا تھا۔ ہر وقت نڈھال سا پڑا رہتا اور زخموں کو کھجایا کرتا۔ ڈاکٹر نے اس دفعہ اُس کو دیکھا تو اُس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ اُس روز اُس نے راجہ سے کوئی بات چیت نہیں کی، اور چپ چاپ اُس کے پاس سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اُسی دن، دوپہر سے کچھ دیر پہلے ریمانڈ ہوم کے آہنی پھاٹک پر ایک ایمبولنس کار آکر ٹھہری اور راجہ کو اس میں بٹھا کر اسپتال بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد راجہ پھر ریمانڈ ہوم واپس نہ آیا۔

نوشا کو اب یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ راجہ اسپتال میں ہے یا اسپتال سے کہیں اور چلا گیا۔ لیکن وہ

برابر راجہ کو یاد کرتا رہا اور آج جب وہ رہا ہو کر ریمانڈ ہوم سے نکلا تو اُس کو بار بار راجہ یاد آ رہا تھا۔ وہ تنگ و تاریک گلی سے گذرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ نہ معلوم راجہ اب کہاں ہوگا۔ کس طرح ہوگا۔ وہ اس کو کہاں تلاش کرے۔ اُس سے کس طرح ملے۔

نمائش کی چہار دیواری کے اس پار روشنیوں کا جال پھیلا ہوا تھا اور گلی کے اندر اندھیرا تھا۔ نوشا سنبھل سنبھل کے قدم اٹھا رہا تھا۔ اُس کے آگے آگے پوکر چل رہا تھا۔ اس کی اور پوکر کی دوستی راجہ کے ریمانڈ ہوم سے جانے کے بعد ہوئی تھی اور اُس کی ابتدا ایک حادثہ سے ہوئی تھی۔

پوکر گٹھے ہوئے مضبوط جسم کا لڑکا تھا۔ اُس کی عمر سولہ سال سے کچھ اوپر تھی مگر دیکھنے میں ابھی وہ کم سن لگتا تھا۔ اُس کا قد ٹھگنا اور رنگ سانولا تھا۔ اُس نے ایک رکشا ڈرائیور کو چاقو مار کر زخمی کر دیا تھا۔ اس جرم میں اُس کو سزا ہوئی تھی اور وہ ریمانڈ ہوم بھیج دیا گیا تھا۔ وہ بڑے فخر کے ساتھ اپنا یہ کارنامہ سنایا کرتا تھا "سالے کی ایک ہی ہاتھ میں انتڑیاں نکال دی تھیں۔ نہ جانے کیسے بچ گیا، ورنہ میں نے تو اُس کا کام ہی تمام کر دیا تھا" اس بات سے ریمانڈ ہوم کے سزا یافتہ لڑکوں پر اس کا بڑا رعب پڑا! اور چند ہی روز میں اُس کی دھاک بیٹھ گئی۔

وہ بات بات پر گالی دیتا تھا اور ہر وقت لڑائی جھگڑا کرنے پر تلا رہتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ بلا وجہ لڑکوں کو چھیڑ کر مار پیٹ کرتا۔ اس وقت وہ ترنگ میں آ کر آواز لگاتا "ابے کوئی ہے مائی کا لال، ذرا ہو جائیں دو دو ہاتھ" وہ بار بار انگڑائیاں لے کر ایک ایک کو دیکھتا۔ جب وہ نیا نیا ریمانڈ ہوم آیا تو ایک دو جرائم پیشہ لڑکوں نے اُس کا چیلنج بھی قبول کیا۔ خوب خوب فری اسٹائل اور مکہ بازی ہوتی۔ پوکر غضب کا پھرتیلا تھا۔ لڑتے وقت اُس کا جسم بجلی کی طرح تڑپتا معلوم ہوتا۔ کبھی داہنی طرف سے جھکائی دے کر نکلا تو گردن پر بھرپور ہاتھ دیا۔ بائیں طرف سے گھسا تو ایک ہی لات میں منہ کے بل گرا دیا۔ جب تک حریف کے سامنے رہتا، اُس کا جسم بید کی مانند لچکتا رہتا۔ ایک مقام پر نہ ٹکتا، کبھی یہاں کبھی وہاں۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بجو کی طرح چمکتی تھیں۔ وہ مرغ کی طرح اچھل اچھل کر حملہ کرتا۔ عام طور پر اس کی تکنک یہ ہوتی کہ وہ پہلے اپنے مقابل کو تھکا دیتا اور جب وہ ہانپنے لگتا تو پوکر لڑکا کو مینڈھے

کی طرح ایک قدم پیچھے ہٹتا۔ منہ سے "ڈھیں" کی آواز نکالتا اور زمین سے فٹ بھر اچھل کر زنّاٹے کے ساتھ مکّہ مارتا اور لڑنے والے سے کہتا "ابے منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ چل چل" جب وہ حملہ کرتا تو لوکر اُس کا ہاتھ صاف بچا جاتا اور مسکرا کر اُس کو بار بار اکساتا "ایک اور، بے ایک اور!" وہ بڑھ بڑھ کر حملہ کرتا اور اپنے حریف کو اُکسنا تا بھی جاتا۔

کوئی دن ایسا نہ جاتا، جب اُس کی پٹیئی نہ ہوتی ہو۔ ہر روز اس کو ریمانڈ ہوم میں سزا ملتی ۔ مگر جس طرح وہ مارنے کے معاملہ میں نڈر تھا اسی طرح مار کھانے میں سخت جان تھا۔ اس پر ہنٹر اسٹریپ پڑا کرتے اور وہ چپ چاپ اُن کو سہ جاتا۔ سزا پا کر آتا تو بڑی بے حیائی سے ہنس کر کہتا "خواہ مخواہ سالے اپنا ہاتھ تھکاتے ہیں" پھر وہ کسی لڑکے کو اشارہ کرتا "لے یار ذرا کمر پر دو ایک مکیاں تو لگا دے۔ ادھر ایک آدھ ہاتھ گرم پڑ گیا تھا" وہ اسی طرح ریمانڈ ہوم کے لڑکوں پر اپنا حکم چلاتا تھا۔ ذرا بھی کوئی حکم عدولی کرتا، اس کی شامت آجاتی۔

اس کا حکم نہ ماننے پر ایک بار نوشا کی بھی دُرگت بن چکی تھی۔ اس روز اُس نے کسی بات پر ناراض ہو کر ایک لڑکے کو مرغا بنا دیا تھا۔ اور نوشا کو حکم دیا کہ وہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ جائے۔ نوشا اس کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ لوکر نے اٹھ کر نوشا کے منہ پر ایک مکّہ جڑ دیا۔ وہ چکرا کے رہ گیا، اسی وقت لوکر نے دوسرا وار کیا۔ سنبھلتے سنبھلتے تیسرا وار ہوا تو نوشا کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ ہاتھ پیر کپکپانے لگے۔ لوکر کے پورے تین مکّے سہہ جانا مذاق نہیں تھا۔ اچھے اچھے جی دار لڑکوں کے چھکّے چھوٹ جاتے تھے۔ نوشا توان دنوں نیا نیا ریمانڈ ہوم میں داخل ہوا تھا، اس کے لئے یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہ چکرا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ لوکر نے اس لڑکے کی خطا معاف کر دی اور نوشا کو مُرغا بنا کر اس کی پیٹھ پر اس لڑکے کو بٹھا دیا۔

نوشا نے اسی دن توبہ کر لی تھی کہ اب وہ کبھی لوکر کے منہ نہیں لگے گا۔ وہ بلا چون وچرا اس کی ہر بات مان لیا کرتا۔ البتہ راجہ نے اُس کی لیڈری کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا تھا۔ کئی بار اس کا اور لوکر کا مچیٹا ہوا اور ہر بار راجہ کی بڑی دُرگت بنی۔ پہلی بار دونوں کا جھگڑا کسی خاص بات پر نہیں ہوا

تھا۔ پوکر نے حسب معمول لڑکوں کو چیلنج دیا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ اونچا کر کے آواز لگا رہا تھا "ابے ہے کوئی مائی کا لال۔ ذرا ہاتھوں میں کھجلی ہو رہی ہے۔ ہو جائے کچھ رگڑم رگڑا" اس وقت سارے لڑکے ریمانڈ ہوم کی بیرک کے سامنے والے میدان میں اکٹھا تھے اور درختوں میں پانی دے رہے تھے۔

جب کسی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ گالیاں دینے لگا "ابے تم سب سالے نامرد ہو۔ ایک بھی مرد کا بچہ نہیں" یہ کہکر اس نے سب کو اور بھی گندی گندی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ وہ اس طرح اُن کو مشتعل کیا کرتا تھا۔ راجہ بھی وہاں موجود تھا۔ اُس نے کمر پر دونوں ہاتھ رکھکر پوکر کو گھور کر دیکھا اور لڑک کر کہا "ابے ذرا زبان سنبھال کے بات کر۔ ساری ہیکڑی ابھی نکال کے رکھدوں گا" پوکر اس کو دیکھکر مسکرایا "تو پھر آجا بے طرّم خاں کے سالے" اور اس کے روبرو جا کر کھڑا ہو گیا۔ راجہ نے چھوٹتے ہی ایک زنّاٹے کا ہاتھ پوکر کے منہ پر رسید کیا۔ راجہ ایک تو تھا بھی کچھ تگڑا اور اس وقت وار بھی اُس نے جھنجھلا کر کیا تھا۔ پوکر اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھا۔ مکّا اس کے جبڑے پر بھرپور بیٹھ گیا اُس کے ہونٹ سے خون بہنے لگا۔ اُس نے پیچھے ہٹ کر ایک ہاتھ سے خون صاف کیا اور ہنس کر بولا "اچھا ہاتھ تھا۔ لونڈا کس بل کا معلوم ہوتا ہے" پھر وہ دونوں ہاتھ تول کر راجہ کے سامنے ناگ کی طرح لہرانے لگا "کم آن، کم آن" وہ اسی طرح شروع میں اپنے حریف کو اکساتا تھا۔ راجہ نے دانت بھینچ کر ایک اور وار کیا۔ پوکر صاف بچا گیا۔ اُس نے ایکٹروں کی طرح ایک مصنوعی قہقہہ لگایا "ہے ہے" اور راجہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"ایک اور میری جان۔ کم آن، کم آن"

وہ اپنے بائیں کندھے کو بار بار اچکا رہا تھا اور ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا "کم آن، کم آن"

راجہ نے پھر مکّہ مارا۔ وہ بھی خالی گیا۔ جھنجھلا کر اُس نے پے بہ پے وار کرنا شروع کر دیے۔ پوکر اُس کے سارے حملے خالی دیتا چلا گیا۔ ذرا دیر میں راجہ ہانپنے لگا۔ اسی وقت پوکر نے اچھل کر وار کیا۔ ہاتھ بھرپور پڑا۔ راجہ نے تکلیف سے منہ بنا لیا مگر وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پوکر نے تابڑ توڑ وار کرنا شروع کر دیے پانچویں مکے پر راجہ فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔

اس کے بعد بھی کئی بار پوکر سے راجہ کا جھگڑا ہوا۔ شروع شروع میں تو وہ اس سے ذرا ذرا سی بات پر لڑنے کے لئے مقابلہ پر آجایا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں وہ پوکر سے خائف ہو کر ڈرنے لگا تھا۔ اب وہ اس سے اسی وقت لڑتا تھا۔ جب وہ بے حد جھنجھلا جاتا تھا۔

پوکر ریمانڈ ہوم کے لڑکوں کا سرغنہ تھا سب پر اُس کی حکومت چلتی تھی۔ کوئی بھی اُس کی حکم عدولی کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ وہ کسی بات پر ناراض ہو کر مارتا بھی تو لڑکے چپ چاپ اُس کی مار کھا لیتے اور خوشامد الگ کرتے۔ اس لئے کہ اُس کی ناراضگی بے حد خطرناک ہوتی تھی۔

ریمانڈ ہوم کے قیدی لڑکوں پر پوکر کی حکومت اسی طرح چلتی رہی۔

پھر ایک تپتی ہوئی سہ پہر کو پولیس کی لاری ریمانڈ ہوم کے پھاٹک پر آکر رکی۔ پہرے دار نے تالا کھولا اور تین مسلح کانسٹبلوں کی حراست میں ایک چھریرے جسم کا لڑکا ریمانڈ ہوم کے احاطے کے اندر داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ٹخنوں سے اونچی نیلی پتلون پہنے تھا۔ جسم پر چھوٹی چھوٹی آستینوں کی ریشمی قمیص تھی۔ جس پر اژدہوں اور چیتوں کے علاوہ کچھ عورتوں اور مردوں کی تصویریں چھپی تھیں۔ جو بڑے شہوت انگیز انداز میں بوس و کنار میں مصروف تھے۔ اُس کی کمر کے گرد پیتل کے گوکھروؤں سے جڑی ہوئی چمڑے کی پیٹی تھی۔ آنکھوں پر چوڑے چوڑے حلقوں کا سبز چشمہ تھا۔ وہ ہالی وڈ کی مار دھاڑ سے بھرپور فلموں کا کردار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی وضع قطع بالکل امریکی کاؤبوائز (Cow Boys) کی سی تھی۔

اس کا نام تو کسی کو معلوم نہ ہو سکا، البتہ سب سے اُس نے اپنا تعارف ٹارزن کہہ کے کرایا تھا اور وہ اسی نام سے ریمانڈ ہوم میں مشہور ہو گیا۔ سن و سال کے اعتبار سے وہ نابالغ لگتا تھا مگر اُس پر زنا بالجبر کا مقدمہ چل رہا ہے۔ عدالت سے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا اور اس کی ضمانت بھی نہ ہو سکی تھی، لہٰذا اس کو ریمانڈ ہوم بھیج دیا گیا تھا۔ اس کا مشغلہ غنڈہ گردی اور سنیما کے ٹکٹوں کی بلیک مارکیٹنگ تھا۔ شہر میں اُس کے ساتھیوں کا ایک باقاعدہ گروہ تھا، جو اکثر اُس سے ملنے کے لئے آیا کرتے تھے اور ہمیشہ اس کے لئے کوئی نہ کوئی سوغات لے کر آتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ پہرے داروں کے

ذریعہ چوری چھپے سگریٹیں منگواتا تھا اور ریمانڈ ہوم کے اندر چھپ چھپ کر خود بھی سگرٹ پیتا تھا اور دوسرے قیدی لڑکوں کو بھی پلاتا تھا۔

سگرٹوں کی بدولت ٹارزن ریمانڈ ہوم میں جلد ہی ہر دل عزیز ہو گیا۔ اُس نے اپنی پسند کے لڑکوں کی ایک ٹولی بنالی تھی، جو ہر وقت اس کے دائیں بائیں پھرتے۔ ہر بات میں اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی اور وہ سیٹی پر کوئی انگریزی دھن الاپتا ہوا، ٹھاٹھ سے ریمانڈ ہوم میں گھومتا پھرتا۔ ہاتھ پیروں میں کس بل تھا اور جھگڑا فساد کرنے کی مشق رہ چکی تھی۔ اس لئے اُس کی دھاک اور بھی زیادہ تھی۔

پوکر کچھ دنوں تک تو خاموشی کے ساتھ ٹارزن کی بڑھتی ہوئی ہر دل عزیزی کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے ٹارزن سے مراسم بڑھانا چاہے مگر وہ اپنی ہوا میں تھا۔ اُس نے پوکر کو زیادہ لفٹ نہیں دیا بلکہ ایک بار سگرٹ مانگنے پر اُس نے پوکر کو بُری طرح ڈانٹا اور اسی بات پر دونوں میں ٹھن گئی۔ پوکر اس وقت تو چپ ہو گیا، اس لئے کہ خطا اس کی تھی، اُس نے ٹارزن سے سگرٹ کا مطالبہ ہی کیوں کیا۔ مگر دو ہی ایک دن کا عوض دے کر اُس نے ٹارزن کو چھیڑا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ ٹارزن کی عادت تھی کہ وہ بات بات پر انگریزی گالیاں بکتا تھا جو امریکی فلمیں دیکھ دیکھ کر اُس نے ازبر کرلی تھیں۔

اُس روز ٹارزن کچھ موڈ میں تھا۔ اُس نے ایک لڑکے کو یونہی تفریحاً "بلیڈی باسٹر" کہہ دیا۔ وہ لڑکا تو کچھ نہیں بولا۔ البتہ پوکر اس کی حمایت میں آکر کہنے لگا "دیکھو جی ٹارزن تم اس طرح گالی گفتاری نہ کیا کرو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔" ٹارزن نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ بے نیازی سے بولا۔

"گٹ آؤٹ یو فکن"

پوکر نے تڑسے اُس کے جبڑے پر فوراً ایک مکہ جڑ دیا اور چیخ کر بولا "سالے میں منع کر رہا ہوں تو ہی اپنا حرامی پن کر رہا ہے" ٹارزن نے خونخوار نظروں سے گھور کر اس کو دیکھا اور دونوں ہاتھ تول کر فلمی مکہ بازوں کی طرح پوکر کے سامنے آکر جھومنے لگا۔ پھر اُس نے دائیں طرف جُھک کر پوکر کے منہ

پر ایک مکہ لگایا۔ ہاتھ چھچلتا پڑا۔ کوئی اور ہوتا تو پوکر صاف کا وادے کر نکل جاتا لیکن اس پہلے ہی وار سے پوکر کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا مدِ مقابل اناڑی نہیں ہے۔ اچھی خاصی مکہ بازی جانتا ہے۔ لہٰذا وہ بچ بچ کر حملہ کرنے لگا۔

دونوں مینڈھوں کی طرح جھوم جھوم کر لڑ رہے تھے۔ بڑے زوروں کا معرکہ تھا۔ سارے لڑکے دونوں کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ برابر کی جوڑ تھی۔ دونوں پینترے بدل بدل کر ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے۔ پوکر کمزور پڑ رہا تھا۔ کئی بھرپور ہاتھ اس کی کنپٹی پر اور رخساروں پر پڑ چکے تھے۔ اور ایک بار تو ٹارزن نے ایسا زناٹے کا مکہ مارا کہ پوکر لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ پھر لڑکوں نے زور زور سے تالیاں پیٹنا شروع کر دیں۔ ان میں زیادہ تر ٹارزن کے حمایتی تھے۔

ٹارزن اس کو برابر دباتا جا رہا تھا اور پوکر چوٹ پر چوٹ کھا رہا تھا۔ اب اس کے ہاتھ بھی الٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔ پوکر پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ اور پیچھے اور پیچھے۔ وہ ریمانڈ ہوم کی چہار دیواری کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی پشت بالکل دیوار سے لگ گئی۔ اُس نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ راہ فرار اختیار کرنے کا موقعہ تلاش کر رہا ہے۔ اُس کے رخسار جگہ جگہ سے سوج کر نیلے پڑ گئے تھے اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ خچر کی طرح منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ ٹارزن اب اُس پر پوری طرح چھا گیا تھا۔

پوکر نے ایک بارگی اپنی گردن جھکائی حلق کے اندر سے "دھیں" کر کے ایک بھیانک آواز نکالی اور مینڈھے کی طرح پنجوں کے بل اچھل کر ٹارزن کی ٹھوڑی پر زور کی ٹکر ماری۔ وہ اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھا۔ چوندھیا کر رہ گیا۔ پوکر نے اس کو سنبھلنے کا بھی موقعہ نہ دیا۔ دوسری ٹکر پھر تیسری۔ اُس نے تابڑ توڑ کئی ٹکریں ایسی ماریں کہ ٹارزن ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر جھومنے لگا۔ پوکر تیزی کے ساتھ اس کی دائیں بغل سے نکلا اور گھوم کر ٹارزن کے رخسار کی پچھلی ہڈی پر ایک زور دار مکہ جڑ دیا۔ وہ چکر کھا کر رہ گیا۔ اب دیوار ٹارزن کی پشت پر تھی اور پوکر اُس کے سامنے تھا۔ اس کے بعد پوکر نے اُچھل اُچھل کر دو تین بھرپور مکے مارے تو ٹارزن لڑکھڑا کر وہیں گر پڑا۔ اُس کی ٹانگیں

فرش پر پھیلی ہوئی تھیں۔ پیٹھ دیوار سے ٹکی تھی اور وہ منہ کھولے زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔

اُس روز کے معرکے کے بعد ٹارزن کی ہوا بگڑ گئی۔ اس کو اپنی بے عزتی کا شدت سے احساس تھا۔ وہ کئی روز تک اسی دھن میں رہا کہ کس طرح پوکر کو نیچا دکھایا جائے تاکہ انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو۔ ایک دن موقعہ پا کر اُس نے پوکر کو گھیر لیا۔ اس کے ہمراہ کئی منتخب کئے ہوئے لڑکے تھے۔ پروگرام کے مطابق پہلے ایک لڑکے کو بھیجا گیا۔ وہ پوکر کے برابر سے بغلیں بجاتا ہوا گذرا۔ غنڈوں کی اصطلاح میں اس کا مقصد پوکر کی بے عزتی کرنا تھی۔

پوکر نے گھور کر اس لڑکے کو دیکھا اور چیخ کر بولا "سالے چمگادڑ تیری تو ایسی کی تیسی"

اس کے بعد وہ اس کو گالیاں دیتا ہوا جھپٹا اور اس کی گردن جا کر دبوچ لی۔ آناً فاناً ٹارزن اور اُس کے ساتھی پوکر کے اوپر جا کر ٹوٹ پڑے۔ وہ اس اچانک حملے کے لئے قطعی تیار نہ تھا۔ سب نے مل کر اس کو گرا دیا اور ٹارزن سینہ پر چڑھ بیٹھا۔ اُس نے اوپر سے اندھا دھند پوکر کے منہ پر گھونسے مارنا شروع کر دیئے۔ پوکر نیچے دبا ہوا بے بسی سے گالیاں بکتا رہا۔

نوشا اس وقت قریب ہی موجود تھا۔ وہ لپک کر وہاں پہنچ گیا۔ ذرا دیر تک وہ پوکر کو پٹتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ ٹارزن سے کہنے لگا "اتنے بہت سے مل کر اکیلے کو مار رہے ہو۔ ابے یہ بھی کوئی مردانگی ہے" ٹارزن نے گھور کر اس کو دیکھا اور چیخ کر گالی دی۔

"شٹ آپ یو بلیڈی"

نوشا نے بے پرواہی سے کہا "اکیلے اکیلے لڑ لو" اُس کی مراد یہ تھی کہ ٹارزن اکیلا پوکر سے لڑے مگر ٹارزن یہ سمجھا کہ وہ اس کو چیلنج کر رہا ہے۔ اُس نے پوکر کو چھوڑ دیا اور جھپٹ کر نوشا کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"آ وے سالے پہلے تم ہی آ جاؤ"

نوشا لڑائی جھگڑے سے ہمیشہ گھبراتا تھا۔ آہستہ سے بولا "ابے میرے سر کیوں ہوئے جا رہا ہے"

ویسے نوشا ایسا کمزور بھی نہیں تھا۔ اب وہ خاصا لمبا چوڑا ہوگیا تھا۔ لمبے لمبے بے ڈول ہاتھ پاؤں، اونچا قد اور موٹا تگڑا جسم۔ دیکھنے میں وہ خاصا مشٹنڈا لگتا تھا۔

ٹارزن نے اس کی بات کا تو کوئی جواب نہیں دیا۔ جھپٹ کر اس کے منہ پر ایک زوردار مکہ جڑ دیا۔ نوشا بوکھلا کے پیچھے ہٹا۔ ٹارزن نے ایک اور زناٹے کا ہاتھ دیا۔ نوشا مکہ بازی کا عادی نہیں تھا۔ جھنجھلا کر وہ ٹارزن پر جھپٹا۔ ایک مکا اس کی کنپٹی پر اور پڑا مگر وہ اس سے لپٹ ہی گیا۔ دونوں گتھم گتھا ہوکر کچھ دیر تک تو زور آزمائی کرتے رہے۔ پھر ایک بار نوشا نے "لنگڑی لگا کر" ٹارزن کو دے مارا اور اس کے سینہ پر گھٹنا رکھ کر دو تین کس کس کے رگڑے جو دیئے تو وہ لگا غیں غیں کرنے۔

پوکرا بھی تک ٹارزن کے ساتھیوں کے نرغے میں گھرا ہوا لڑ رہا تھا اس پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ وہ اکیلا سب کے وار روک رہا تھا۔ ٹارزن کا نوشا نے حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اب وہ لڑنے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ نوشا نے اس کو تو وہیں چھوڑا اور لپک کر پوکر کے قریب پہنچا۔ اس وقت اس کو واقعی بڑا جوش آگیا تھا۔ سب کو چیلنج دے کر بولا "آجاؤ سالوں ایک ایک کی ایسی کی تیسی کر دوں گا" یہ کہہ کر وہ ان پر جھپٹا جس کے اس نے ہاتھ مارا اس کی سٹی گم ہوگئی، ذرا ہی دیر میں وہ سب نکل بھاگے۔

پوکر نے اس کو بڑھ کر گلے سے لگا لیا "ابے واہ میرے شیر۔ کیا بات ہے تیری۔ یار تو تو چھپا رستم نکلا" وہ دیر تک اس کو بڑھاوا چڑھاوا دیتا رہا۔

بس اسی وقت سے ان دونوں کی دوستی ہوگئی۔ پھر آپس میں ایسی گاڑھی چھننے لگی کہ دونوں ہر وقت ایک ساتھ نظر آتے۔ ریمانڈ ہوم سے راجہ کے جانے کے بعد نوشا جو اکیلا پن محسوس کر رہا تھا اس کمی کو پوکر نے پورا کر دیا تھا۔ پھر اس کے ساتھ رہنے میں ٹھاٹھ بھی بہت تھے۔ سب پر حکم چلتا تھا۔

ٹارزن زیادہ دنوں تک ریمانڈ ہوم میں نہیں رہا۔

ایک رات زبردست طوفان آیا اور موسلا دھار بارش ہوئی۔ ہوا کے جھکڑ اس طرح شور کرتے

ہوئے چلتے تھے' جیسے بہت سے آدمی ملی جلی آوازوں کے ساتھ سسکیاں بھر رہے ہوں۔ بجلی بار بار کڑکتی اور بارش کے موٹے موٹے قطرے بیرک کی چھت پر جلترنگ کی مانند بجتے۔ سویرے اٹھ کر سب نے دیکھا "تارزن غائب تھا۔ تلاش ہوئی تو میدان میں کیچڑ پر بڑے بڑے قدموں کے نشان نظر آئے جو احاطہ کی دیوار تک چلے گئے تھے۔ "تارزن راتوں رات دیوار پھاند کر فرار ہو گیا تھا۔

اس کے بعد دو ایک اور قیدی لڑکے ریمانڈ ہوم سے نکل بھاگے۔ ایک رات پوکر اور نوشا نے بھی فرار ہونے کی کوشش کی مگر پکڑے گئے۔ بڑی سخت سزا ملی اور اُن کی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔

ریمانڈ ہوم میں نوشا نے اور تو کچھ نہیں سیکھا 'البتہ پوکر کی صحبت میں رہ کر اُسے لڑنے کی تکنک معلوم ہو گئی تھی۔ اب وہ ایسے موقعوں کے تمام ہتھکنڈے جان گیا تھا اور آئے دن کسی نہ کسی بات پر لڑکوں سے جھگڑا کرتا رہتا۔ اُس میں پہلے جو ایک جھجک اور خوف تھا' وہ جاتا رہا تھا اور وہ بالکل نڈر ہو کر لڑتا تھا۔ اس کے علاوہ پوکر بڑا اچھا جیب کترا تھا۔ اس فن کے تمام گُر اُس نے نوشا کو بتا دیئے تھے۔

ریمانڈ ہوم میں بیشتر تعداد ایسے لڑکوں کی تھی' جو جرائم پیشہ تھے۔ ان میں افلاطون بھی تھا۔ جو تالا توڑنے کا ماہر تھا اور وہ اس فن کو بڑی فیاضی کے ساتھ سب کو سکھایا کرتا تھا۔ نوشا بھی کچھ عرصہ اس کا شاگرد رہا اور کسی حد تک اس فن کو سیکھ گیا۔ تجربہ کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ ورنہ جس طرح پوکر جیب تراشی میں کئی بار اس کا امتحان لے چکا تھا۔ تالا توڑنے کے ہنر کا مظاہرہ بھی ہو جاتا۔

پہلے وہ ریمانڈ ہوم میں بے حد اُداس رہا کرتا تھا۔ اکثر راتوں کو اٹھ اٹھ کر رو دیا کرتا۔ گڑگڑا کے گھنٹوں دعائیں مانگا کرتا۔ سب سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا اور ریمانڈ ہوم کا ماسٹر جو سبق دے جاتا اُس کو جی لگا کے پڑھتا۔ جب تک ریمانڈ ہوم میں راجہ رہا۔ اُس کا یہی رویہ رہا۔ مگر جب پوکر سے اُس کے مراسم بڑھے تو وہ رفتہ رفتہ اُس کے رنگ میں رنگتا چلا گیا۔ اور یہ محض اتفاق تھا کہ ریمانڈ ہوم سے دونوں کی رہائی ایک ہی روز ہوئی۔

۲

دونوں اندھیری گلی میں آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ شام نکھرتی جا رہی تھی۔ دریچوں پر روشنیاں جھلملا رہی تھیں اور شہر کی دیواروں پر سائے لہرانے لگے تھے۔ وہ گلی کو عبور کر کے جب پرانی نمائش کے سامنے پہنچے تو اچانک پیچھے سے آواز آئی۔

"ابے او نوکر، کدھر منہ اٹھائے چلا جا رہا ہے"

نوکر نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹین کی جھکی ہوئی چھت والے ایک چائے خانے کے سامنے اُستاد پیڈرو کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ باجو بھی تھا۔ نوکر ٹھٹک کر رُک گیا۔ اُستاد پیڈرو اپنی اُجلی شلوار کھڑکھڑاتا ہوا اُس کی طرف لپکا۔ اُس کے پیچھے پیچھے باجو بھی آ رہا تھا۔ اُستاد نے دور ہی سے اپنے بازو پھیلا دیئے اور نوکر کو بڑے جوش سے اپنے دونوں بازوؤں میں بھینچ کر اوپر اُٹھا لیا اور ہنستے ہوئے بولا۔

"سالوں نے اب چھوڑا ہے۔ میں تو ۹ بجے کا یہاں آیا بیٹھا ہوں۔ حرام کے جنوں نے بیسیوں چکر لگوا ڈالے۔ ابھی ابھی تو ہو کر آ رہا ہوں۔"

اُستاد دیر تک اُس کو اپنے بازوؤں میں بھینچے ہوئے اس کی پیٹھ کو شفقت سے تھپتھپاتا رہا۔ جب وہ دونوں علیحدہ ہوئے تو باجو نے رومال میں لپٹا ہوا مہکتا ہوا پھولوں کا گجرا نکالا اور نوکر کے گلے میں ڈال دیا۔ گجرا پہننے کے بعد نوکر کو فوراً شنا کا خیال آیا، جو اس کے برابر خاموش کھڑا تھا۔ اُس نے

استاد سے نوشا کا تعارف کرایا۔

"اُستاد یہ نوشا بھی اپنا یار ہے۔ میرے ساتھ ہی چھوٹ کر آیا ہے۔"

نوشا نے گردن کو ذرا سا خم دے کر بڑی سعادت مندی کے ساتھ استاد کو سلام کیا۔ اس کے انداز پر استاد پیڈرو کا دل خوش ہو گیا۔ بزرگوں کی طرح اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا "جیتے رہو" اس کے بعد وہ باجوا کو مخاطب کر کے بولا۔

"جا بے ذرا ایک وکٹوریا تو پکڑ، میں جب تک لمڈوں کو چا۔ پلا دوں"

باجوا وکٹوریا لینے سڑک کی جانب چل دیا اور استاد پیڈرو ان دونوں کو اپنے ہمراہ لے کر چائے خانہ پر پہنچا اور سامنے پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھتے ہوئے چائے خانہ کے مالک سے بولا "سیٹھ دو فسٹ کلاس ڈبل چائے تو مارو۔ ذرا بالائی اچھی ڈلوانا۔ لمڈا دُبلا ہو کر آیا ہے" اُس نے محبت سے پوکر کے بازو کو دبایا اور اُس سے کہنے لگا۔

"ابے کچھ کھانے دانے کو بھی مل رہا تھا: تیری تو ہڈیاں نکل آئیں"

پوکر ریمانڈ ہوم کی تکلیفیں سُنانے لگا۔ استاد کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھ رہا تھا۔ نوشا خاموش بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ دونوں نے چائے پی اور وہاں سے اٹھ کر سڑک کی سمت روانہ ہو گئے۔ باجوا وکٹوریہ لے آیا تھا اور ان کا انتظار کر رہا تھا۔ سب وکٹوریہ کے اندر جا کر بیٹھ گئے اور وہ عثمان آباد کی طرف چل دی، جہاں اُستاد پیڈرو کا اڈہ تھا۔

مگر استاد پیڈرو ابھی اڈے پر جانا نہیں چاہتا تھا۔ کہنے لگا "یار ذرا بندر روڈ کی رونق دیکھ لو۔ کیا بہار آئی وی ہے۔ سالی سڑک جھما جھم ہو رئی ہے" چنانچہ وکٹوریا پٹیل پارک کی جانب مڑنے کے بجائے سیدھی سڑک پر چلنے لگی۔

بندر روڈ پر ہلکی نیلگوں روشنیوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ وکٹوریہ میں جُتے ہوئے گھوڑے کے نعل سُرمئی سڑک پر ٹپا ٹپ بج رہے تھے۔ رات ہولے ہولے کراچی کی فلک بوس عمارتوں سے نیچے اُتر رہی تھی۔ اُستاد بڑے ٹھاٹھ سے گردن اونچی کئے بیٹھا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ سر کے بال کھچڑی

ہو گئے تھے اور مونچھیں بہت گھنی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں بڑی پُراسراری چمک تھی۔ اُس کا قد میانہ تھا اور جسم پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔

میری ویدر ٹاور تک وکٹوریہ پر ایک چکر لگانے کے بعد جب وہ اڈے پر پہنچے تو ایک پہر رات گذر چکی تھی۔ یہ اڈہ ایک تنگ و تاریک گلی کے اندر تھا۔ اُس کے چاروں طرف کچی دیواروں والے چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ البتہ اڈہ جس مکان میں تھا اس کی دیواریں پختہ تھیں۔ اس میں ۲ کمرے اور ایک لمبا سا دالان تھا۔ صحن بڑا کشادہ تھا مگر اس کا فرش کچا تھا۔ صحن کے ایک گوشہ میں نیم کا ایک کُبڑا سا درخت تھا، جس پر کوّے بسیرا کرتے تھے اور اکثر چاندنی راتوں میں اُڑ اُڑ کر شور مچایا کرتے۔

جب وکٹوریہ گلی کے نکڑ پر جا کر رُکی اور استاد پیڈرو کرایہ ادا کرکے نیچے اُترآیا تو اُس نے مشکوک نظروں سے نوشا کو دیکھا اور پوکر کو علیحدہ لے جا کر بولا "کیوں جی یہ لونڈے کا کیا معاملہ ہے؟"

پوکر نے فوراً جواب دیا۔

"اُستاد وہ تو اب اپنے ہی ساتھ رہے گا۔"

اُستاد کہنے لگا "اپنے ساتھ تو رکھ لوں گا پر وہ کچھ اپنے کینڈے کا بھی ہے"

"کیا پوچھتے ہو استاد، بڑا جی دار لونڈا ہے۔ ویسے میں نے اس کو کاریگری کے دو چار ہاتھ سکھا دیئے ہیں۔"

اُستاد پیڈرو نے اس کو ڈانٹ دیا۔ "ابے تو کیا سکھائے گا۔ ابھی تو تیرا ہاتھ خود نہیں صاف ہوا۔ سالے چلے ہیں استادی کرنے۔"

پوکر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

اس کے بعد اُستاد نے راجا اور نوشا کو اشارہ سے قریب بلایا اور ان کو اپنے ہمراہ لے کر گلی کے اندر داخل ہو گیا۔ اڈے پر جا کر اُس نے دیکھا۔ بڑے کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ اور چکرم دیوار سے پیٹھ لگائے خاموش بیٹھا تھا۔ اُستاد پیڈرو کو دیکھ کر وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ اُستاد نے

اس سے پوچھا " یہ لمڈے ابھی واپس نہیں لوٹے ؟" وہ بولا۔

" قادر اور پنچھی آئے تھے۔ چائے پینے گئے ہیں"۔

اُستاد نے ایک لمبی سی 'ہوں' کی اور کمرے کے اندر بچھی ہوئی دری پر تھکا ہوا سا بیٹھ گیا اور نوشا کو مخاطب کر کے بولا " ابے تیرے چکر نے تو آج اپنا پلیتھن کر دیا"۔

چکرم نے مسکرا کر نوشا کو دیکھا اور دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ چکرم کہنے لگا "یار تیرے بغیر تاش کھیلنے کا لطف جاتا رہا۔ خدا قسم تجھے روز یاد کرتے تھے"

نوشا ہنس کر بولا " تو پھر آج ہی جمے گی۔ یار بہت دن ہو گئے تاش کھیلے ہوئے۔ بڑی مشکل سے تاشوں کی ایک گڈی ہاتھ لگی تھی۔ ایک دن سالوں نے دیکھ لیا۔ اسی وقت چھین کر لے گئے"

اس کے بعد وہ چکرم کو ریمانڈ ہوم کی باتیں سُنانے لگا۔ نوشا چپ چاپ بیٹھا ان کی باتیں سُنتا رہا۔ نوشا نے اس کو چکرم سے ملایا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے ملا۔ استاد پیڈرو اب بازو پر سر ٹکائے چت لیٹا تھا اور راجا بڑی پھرتی کے ساتھ اس کی پنڈلیوں پر مکیاں لگا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بڑے سدھے ہوئے تھے اور تیزی کے ساتھ چلتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد کمرے کے دروازے پر دو بیس' بائیس سال کے نوجوان لڑکے نمودار ہوئے۔ ان میں ایک کا رنگ سیاہ تھا۔ اُس کے بالوں میں خوب تیل چپڑا ہوا تھا۔ وہ پتلون اور بش شرٹ پہنے تھا۔ دوسرا اُس سے مختلف تھا۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ گلے میں ریشمی رومال بندھا تھا اور وہ خوب گھیردار لٹھے کی شلوار پہنے تھا۔ دونوں بے تکلفی سے قہقہے لگا رہے تھے۔ اُستاد نے دونوں کو گھور کر دیکھا اور گرج دار آواز سے بولا۔

" ابے بڑی چہچہیں ہو رہی ہیں۔ بہت دن سے تمھاری کندی نہیں ہوئی"

دونوں سہم کر رہ گئے۔ انھوں نے جلدی جلدی اُستاد کو سلام کیا اور ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ اُستاد کہنے لگا " ابے ادھر منہ چھپا کر کیوں بیٹھ گئے۔ تم اب تک رہے کہاں؟"

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش بیٹھے رہے۔

اس دفعہ اُستاد نے ڈانٹ کر کہا "ابے منہ پھوٹ گئے تمھارے بولتے کیوں نہیں" پھر اُس نے جس کا رنگ سیاہ تھا، اس نوجوان کو مخاطب کر کے پوچھا "تو بتا بے کالے"؟

وہ مری ہوئی آواز سے بولا "اُستاد ذرا دیر ہو گئی"

استاد کو جلال آگیا "ابے یہ ذرا دیر ہو گئی۔ دس بج رہا ہے۔ اور تو ذرا ہی دیر کہے رہا ہے۔ تمھاری دونوں کی ڈیوٹی تو پاسپورٹ کے دفتر پر تھی۔ وہ تو چار بجے بند ہو جاتا ہے۔ اب تو وہاں کتنے لوٹ رَئے ہوں گے"

"ذرا کلفٹن چلے گئے تھے" اس دفعہ دوسرے نے جواب دیا استاد کہنے لگا۔ "تو یوں کہو سیریں ہو رہی تھیں۔ ابے تم کو کیوں ہوا لگی ہے سالوں کھال میں رہو کھال میں" پھر استاد چکرم کی طرف پلٹا اور ڈانٹ کر بولا۔

"چل بے چکرم۔ بہت ہو چکی یاری۔ کام بھی کرے گا یا باتیں ہی ہوتی رہیں گی"

چکرم گھبرا کر اٹھا۔ اُس نے کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے چیڑ کے صندوق کو کھول کر ایک لمبا سا رجسٹر اور قلمدان نکالا اور لالٹین کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اُستاد نے ان دونوں نوجوان لڑکوں سے کہا "کلیلیں تو تم دونوں بہت بھر رئے تھے۔ اب دیکھوں تم دونوں کیا تیر مار کر آئے ہو"

کالے نے پتلون کی جیب سے کئی نوٹ اور کچھ ریزگاری نکال کر چکرم کے سامنے ڈال دی

استاد پیڈرو نے پوچھا "کیوں بے چکرم کتنی رقم ہے۔ یہ تو سالے اپنی زبان سے بتائیں گے نہیں"

چکرم نے پوری رقم گن کر کہا "۵۵ روپے ۹ آنے ہیں" اور رجسٹر میں رقم درج کرنے لگا۔

استاد پیڈرو نے کہا "بس! کل تو تم دونوں بڑے فرسٹ گئے تھے۔ آج کیا ہوا؟"

"آج تو صرف ایک ہی موقعہ لگا۔ کل چار دفعہ کاریگری کی تھی"

استاد کہنے لگا "نہیں بے، اتنی تیزی ٹھیک نہیں۔ تم نے کل یہ بات کیوں نہیں بتائی۔ بس ایک دفعہ کاریگری دکھایا کرو۔ ورنہ دھر لیے جاؤ گے۔ جتنا ملے گا نہیں اتنا الٹے کھا جائیں گے"

استاد پیڈرو کی ناراضگی رفع ہو چکی تھی اور وہ ان دونوں کو بزرگوں کی طرح جیب تراشی

کے فن پر نئے نئے نکتے سمجھانے لگا۔ وہ دونوں سر جھکائے اس کی باتیں سنتے رہے۔ اسی اثنا میں تین نوعمر لڑکے کمرے کے اندر داخل ہوئے۔

"اُستاد سلام"

"اُستاد سلام"

"اُستاد سلام"

تینوں اس کو سلام کر کے کمرے میں ایک طرف بیٹھ گئے۔ چند ہی منٹ بعد ایک لمبے قد کا نوجوان آیا۔ اُس نے بھی سلام کیا اور خاموشی سے کمرے کے اندر بیٹھ گیا۔ اُستاد فرش پر لیٹا رہا اور باجوا لمیاں لگاتا رہا۔ اب جیب کتروں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ گیارہ بجے تک کمرے کے اندر خاصی بھیڑ ہو گئی۔ وہ تعداد میں سولہ تھے۔ ان میں کم سن لڑکے بھی تھے۔ کڑیل نوجوان بھی تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو سن و سال کے لحاظ سے خرانٹ ہو گئے تھے۔ جو بھی جیب کترا آتا، وہ پوکر سے بڑے جوش کے ساتھ بغل گیر ہوتا اور ریمانڈ ہوم کا حال پوچھنے لگتا۔

کمرے کے اندر ملی جلی آوازوں کا شور مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہا تھا۔ استاد پیڈرو کروٹ کے بل خاموش لیٹا تھا۔ آخر وہ انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھا۔ سارے جیب کترے سنبھل کر بیٹھ گئے۔ چکرم نے لالٹین اور رجسٹر اٹھایا اور اُس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ استاد جیب کتروں سے کہنے لگا۔

"چلو بے حساب دو"

ایک ایک جیب کترا باری باری اُس کے سامنے آتا اور جیب سے نوٹ اور ریزگاری نکال کر اُس کے سامنے ڈالتا جاتا۔ استاد پیڈرو اونچی آواز سے جیب کترے کا نام لیتا اور خود رقم کو گنتا جاتا۔ چکرم فوراً رجسٹر میں اندراج کر لیتا۔

استاد پیڈرو کسی کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دیتا۔ کسی کو گالیاں دیتا۔ کسی کو جیب تراشنے کے فن پر لکچر دیتا۔ دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جب سب جیب کترے اپنی اپنی آمدنی جمع کرا چکے تو اُستاد نے ساری رقم میں سے ایک تہائی حصہ نکال کر چکرم کو دے دیا۔ یہ اڈے کا حصہ تھا۔ بقیہ رقم میں

سے استاد نے ہر ایک کی روزن داری' بانٹ دی۔ جیب کتروں کے مختلف مدارج تھے۔ جو سینیئر تھے ان میں ۵۰ فی صدی حصہ تقسیم کر دیا گیا' جو اُن سے کم درجے کے تھے ان کو روپے میں ۵ آنے کا حصہ ملتا اور جو بالکل جونیئر تھے' ان کے حصہ میں ۳ آنے کا حصہ آیا۔

جب استاد پیڈرو روزن داری تقسیم کر چکا تو اُس نے باجوا کی طرف اشارہ کر کے چکرم سے کہا۔ "اس کو بیس روپے دیدیجیو۔" پھر باجوا کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"جا بے نیاز کے لیے سامان لے آ۔ مٹھائی تازی لائیو۔ اس سالے حنان کے ہاں نہ جائیو' پتہ نہیں گھی میں کیا ملاوٹ کرتا ہے۔ اس دن جو تو بالو شاہی لایا تھا' ایسا گلا پکڑا کہ اب تک طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی۔"

باجوا نے چکرم سے بیس روپے لئے اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

استاد بھی زیادہ دیر تک وہاں نہ ٹھہرا اور اُٹھکر خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔

اُس کے جاتے ہی جیب کتروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ گالیاں دے دے کر باتیں کر رہے تھے' ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ بے تکلفی سے قہقہے لگا رہے تھے۔ سب کھسک کھسک کر نوکر کے گرد حلقہ بنا کر اکٹھا ہو گئے تھے اور اس سے اُلٹے سیدھے سوالات پوچھ رہے تھے۔ نوشا چپ چاپ بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ وہ سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہر جیب کترا اس کو مشتبہ نظروں سے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اُن کے اس انداز نے اس کو اور بھی پریشان کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اُستاد پیڈرو کمرے کے اندر داخل ہوا۔ وہ اس وقت صرف سفید تہبند باندھے ہوئے تھا۔ اور اپنے بھیگے ہوئے بدن کو تولیہ سے پونچھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی غسل کر کے آیا ہے۔

جب وہ بدن پونچھ چکا تو اُس نے چکرم کے آگے کنجی پھینک کر کہا: "ذرا جا کے ٹرنک سے ایک دھلا ہوا جوڑا تو نکال کے لا۔" کنجی لے کر چکرم جانے لگا تو اُس نے ٹوک کر کہا۔ "اور ہاں میری ٹوپی اور مصلاّ بھی لائیو۔"

چکرم باہر چلا گیا۔

استاد پیڈرو نے اشارے سے نوشا کو قریب بلایا۔ وہ سہما ہوا سا اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ استاد کہنے لگا۔ "ذرا اپنا داہنا ہاتھ تو دکھا یو" نوشا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ استاد اس کا ہاتھ تھام کر انگلیوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ نوشا کی انگلیاں لانبی لانبی تھیں اور آرٹسٹوں کی طرح ان کا انداز مخروطی سا تھا۔ اُستاد کہنے لگا۔

"انگلیاں تو تیری ٹھیک ہیں۔ کچھ دن زور پنجہ کرانا پڑے گا۔ کھنچاؤ کم ہے"۔

وہ اس کی انگلیاں دیکھتا رہا اور اپنی مخصوص اصطلاحات میں ان پر تبصرہ بھی کرتا رہا۔ جب وہ اس کی اُنگلیاں دیکھ چکا تو نوشا اٹھکر جانے لگا۔ اُستاد نے ڈانٹ کر کہا "ابے ڈرا کیوں جارہا ہے۔ یہ ڈھو کا ڈھو بدن دیکھو اور ابھی سے اس کی سٹی گم ہے" نوشا چپ چاپ اُس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔

اُستاد کچھ اور کہنے جا رہا تھا۔ اتنے میں پنچھی بول پڑا۔ کہنے لگا "کل کھارادر والے اُستاد احمد جان ٹکر گئے تھے۔ آج کل تو اُن کے بڑے ٹھسے ہیں۔ بڑے زوروں پہ جا رہے ہیں"۔

پیڈرو نے اُس کی بات میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا "کیا کہ رہا تھا؟"

پنچھی کہنے لگا "بڑی ہوا باندھ رہے تھے۔ کہنے لگے کراچی میں تو سب اُٹھائی گیرے ہیں۔ کاریگر ایک بھی نہیں ہے۔ جس کو دیکھو وہی استاد بنا پھرتا ہے" استاد پیڈرو کو فوراً تاؤ آگیا تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

"استاد تو وہی سالا شہر بھر میں رہ گیا ہے۔ سالا خواہ مخواہ کی فنٹی مارتا پھرتا ہے۔ بس کپڑا ماری، کے دو چار اُلٹے سیدھے ہاتھ جانتا ہے۔ وہ تو ذرا ذرا سے لونڈے بھی کر لیتے ہیں۔ جس کو جیب کاٹنا کہتے ہیں، وہ تو اُس کے سالے اُستاد کو بھی نہ آتا ہوگا۔ سالا اب تک تیسری انگلی انار طو کی طرح چلاتا ہے۔ انگوٹھا چلانا تو اُس کو آج تک نہیں آیا۔ وہ کیا بمبئی کے سیکھے ہوئے جتنے کاریگر ہیں، وہ سب سالے اناڑی ہیں" استاد پیڈرو بڑے جوش کے ساتھ بول رہا تھا۔ سارے جیب

کترے دم بخود بیٹھے اُس کی باتیں سُن رہے تھے۔ اُستاد گردن کو بار بار خم دے دے کر کہتا رہا "کام کرنے والے تو کلکتہ سے بڑھکر روئے زمین پر نہ ہوں گے۔ یہاں کا سا حساب تھوڑی ہے کہ کچھو کٹ بیں ہنر سیکھ لو۔ اپنے اُستاد تھے شیخ نبی بخش، ، سے اوپر سن تھا۔ دکھائی بھی کم دیتا تھا۔ اُن کا باقاعدہ اسکول تھا۔ پورے سو روپیہ نذرانہ لیتے تھے اور پھر کام سکھانے میں ان کے نو سو نخرے جھیلنا پڑتے تھے۔ ذرا کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ چھٹتے ہی منہ پر ہاتھ پڑتا تھا۔ کیا مجال کہ کوئی چوں کرجائے۔ کھڑے کھڑے نکال باہر کرتے۔ مگر اپنے کام کا ماہر تھا۔ دھاک اتنی تھی کہ اُن کے پیشاب میں چراغ جلتا تھا۔ سالے بڑے بڑے مانے ہوئے اُستاد آکر کان پکڑ گئے "۔

استاد پیڈرو کا غصہ ختم ہوگیا تھا اور اب وہ موج میں آکر بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ اسی اثنا میں چکرم کپڑے کر آگیا۔ اُستاد پیڈرو نے اٹھکر وہیں کھڑے کھڑے کپڑے تبدیل کئے۔ دری پر مصلّا بچھایا اور اُس کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔

ذرا دیر بعد باجوا سامان سے لدا پھندا کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اور سارا سامان استاد پیڈرو کے سامان لاکر ڈھیر کر دیا۔ چکرم نے اگربتیاں لیکر سلگائیں۔ کمرے میں دھوئیں کے ہلکے ہلکے مرغولے لہرانے لگے اور فضا میں خوشبو پھیل گئی۔ استاد نے اپنی ترکی ٹوپی پہنی۔ شیرینی کو مصلّے پر رکھا اور آنکھیں بند کرکے اُس پر نیاز دینے لگا۔

نیاز سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے نوشا کو اپنے قریب بُلایا۔ اُس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور اپنی ٹوپی اتار کر اُس کے سر پہ رکھدی۔ شاگردی کی رسم ادا ہو چکی تھی۔ نوشا اب استاد پیڈرو کے حلقے میں باقاعدہ شامل ہو چکا تھا۔ اُستاد نے اپنے ہاتھ سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اُس کے منہ میں رکھا اور مٹھائی تمام جیب کتروں میں تقسیم کردی گئی۔

نوشا اٹھ کر ہر جیب کترے سے مل رہا تھا۔ وہ اس اڈے کا سترھواں جیب کترہ تھا۔

اس کے بعد منجھی نے استاد پیڈرو کی فرمائش پر ایک فلمی گیت سنایا۔ اُس کی آواز اچھی تھی اور وہ خوب لہک لہک کر گا رہا تھا۔ قادر گیت کے ساتھ ساتھ منہ سے طبلہ بجاتا رہا۔

اچھا خاصا سماں بندھ گیا۔

آدھی رات تک یہ جشن رہا۔ اس کے بعد جیب کترے سونے کے لئے اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ ان میں زیادہ تر ایسے تھے جو اڈے پر رہتے تھے اور ایک کمرے میں کئی کئی کی رہائش تھی پلوکر اور نوشا نے اپنے ٹھہرنے کا بندوبست ایک ہی کمرے میں کیا۔

ہفتہ بھر تک استاد پیڈرو، نوشا کو جیب تراشی کی تکنک سکھاتا رہا۔ زور پنجہ کی مشق کرا کے اس کی انگلیاں مضبوط اور پھرتیلی بنائی گئیں اور پھر ایک روز چکرم کی نگرانی میں اس کی ڈیوٹی مقرر کر دی گئی۔

چکرم چھریرے جسم کا بڑا طرح دار نوجوان تھا۔ وہ اپنے کام میں بڑا چوکس اور پھرتیلا تھا اُستاد پیڈرو اُس پر اس قدر مہربان تھا کہ بہت سے سنیئر جیب کتروں کی موجودگی میں، اُس نے چکرم کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ وہ اس پر اس قدر اعتماد رکھتا تھا کہ جیب کتروں کا سارا حساب کتاب وہی لیتا اور ساری رقم اس کی تحویل میں رہتی۔ دل کا بھی وہ اچھا تھا۔ نوشا کی ہر طرح دل جوئی کرتا۔ خوب خاطر مدارات کرتا۔ دن میں کئی بار چائے اور لسی کا دَور چلتا۔ ٹھاٹھ سے سگریٹیں پی جاتیں۔

نوشا چند ہی روز میں چکرم سے مانوس ہو گیا۔ دونوں کی آپس میں خوب پٹنے لگی۔ ان دنوں چکرم کی ڈیوٹی شہر کے ایک گنجان علاقہ کے بس اسٹینڈ پر تھی۔ مہینہ کی شروع تاریخیں تھیں۔ پہلے ہی دن چکرم نے ایک تگڑا مرغا ذبح کیا (جیب کتروں کی اصطلاح میں اس سے مراد جیب کاٹنا ہے) دو سَو سے اوپر رقم ہاتھ لگی۔

جس وقت چکرم نے جیب کاٹی۔ نوشا اس کے برابر کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ آغا پلپلی بھی ان کے ساتھ تھا۔ چکرم نے جس دیدہ دلیری کے ساتھ کاریگری کا ہاتھ دکھایا۔ نوشا دنگ رہ گیا اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب اُس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ اُسے تو اس بات کا اُس وقت علم ہوا جب چکرم نے چمڑے کا بٹوہ اُس کے ہاتھ میں دے کر نکل جانے کا اشارہ کیا۔ ایسی تمام ہدایتیں استاد پیڈرو اس کو پہلے ہی دے چکا تھا۔ اور باقاعدہ امتحان لے چکا تھا۔ نوشا

بٹوہ سنبھال کر، سیدھا اسی چائے خانے میں پہنچا، جہاں چکرم روزانہ جاکر بیٹھتا تھا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد چکرم اور آغا بلبلی بھی مسکراتے ہوئے چائے خانے میں آگئے۔ یہ سب کچھ اتنی پھرتی اور آسانی کے ساتھ ہوا کہ نوشا کے دل میں جیب تراشی کا جو خوف تھا وہ پہلے ہی تجربہ میں بہت حد تک زائل ہوگیا۔

۳

نیاز کو جب سے بیوی کے انشورنس کا روپیہ ملا تھا اُس کی بالکل کایا پلٹ ہوگئی تھی۔ پچاس ہزار کا چک وصول کرنے کے چند ہی روز بعد اُس نے مضافات میں ایک مختصر سی کوٹھی لے لی۔ اور پرانے مکان کو چھوڑ کر اس میں منتقل ہوگیا۔

جس جگہ یہ کوٹھی واقع تھی، وہ بڑا ویران سا علاقہ تھا۔ اس کے مشرق میں اونچے نیچے کھورے کھورے ٹیلے تھے، جو اژدہے کی طرح دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ قرب و جوار میں چند پرانی وضع کے بنگلے تھے۔ جن میں کبھی فوجی افسروں کی رہائش تھی۔ مگر جب سے یہ بنگلے عام شہریوں کے تصرف میں آئے تھے، اس وقت سے تعمیرات کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا اور روز بروز نت نئی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن شام ہوتے ہی ہر طرف ہو کا عالم ہو جاتا۔ راستوں پر آمد و رفت کم ہو جاتی۔ ایک پہر رات گذرنے کے بعد ساری آبادی قبرستان کی طرح ہیبتناک معلوم ہوتی۔ کوٹھیوں کے گرد گیدڑ بولنا شروع کر دیتے۔ رات کے سناٹے میں اُن کی تیز آوازیں بڑی وحشت ناک معلوم ہوتیں۔

اس کوٹھی میں پانچ کمرے تھے، جن کو نیاز نے نیلام میں خریدے ہوئے سکنڈ ہینڈ فرنیچر سے خاصا آراستہ کر دیا تھا۔ چاروں طرف بڑا سا احاطہ تھا، جس میں درخت لگے تھے۔ عرصہ سے اُن کی دیکھ بھال نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا وہ جھاڑ جھنکاڑ کی طرح نظر آتے تھے۔ رات

کے وقت شاخوں سے خشک پتے جھڑ جھڑ کر گرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی دبے قدموں درختوں تلے چل رہا ہے۔

کوٹھی میں آکر نیاز کو ہر طرح کی آسائش مل گئی تھی۔ مگر آمدورفت کی بڑی تکلیف تھی۔ کام اس کا شہر میں رہتا تھا۔ سویرے ہی سویرے وہ کوٹھی سے نکل جاتا مگر بس کے انتظار میں کبھی کبھی تو گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا۔ صرف چند بسیں اس راستے پر چلتی تھیں۔ وہ بھی بہت پرانی تھیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بس خراب ہو جاتی۔ اس پریشانی کا حل اس کی سمجھ میں ایک ہی آیا۔ وہ یہ کہ اس نے ساڑھے چار ہزار میں ایک کار خرید لی۔ یہ سرخ رنگ کی ٹوسٹیر سنگر تھی۔ کئی سال پرانا ماڈل تھا، مگر کنڈیشن اچھی تھی۔ پٹرول بھی کم خرچ ہوتا تھا۔

کار خریدنے کے ساتھ ہی نیاز کے پر لگ گئے۔ اس نے شلوار اور قمیص کا لباس چھوڑ کر پتلون اور بش شرٹ پہننا شروع کر دی۔ مونچھیں صفا چٹ کرا دیں اور اپنی ٹوسٹیر میں ٹھاٹھ سے بیٹھ کر اڑا اڑا پھرتا۔ کباڑ خانے کی دوکان بھی اس نے فروخت کر دی اور ایک روز اس کی کوٹھی پر ایک پلاسٹک کی بنی ہوئی تختی بھی لگ گئی جس پر انگریزی حروف میں لکھا تھا۔

"شیخ محمد نیاز، گورنمنٹ کنٹریکٹر"

ویسے وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا۔ مگر گورنمنٹ کنٹریکٹر ضرور ہو گیا تھا۔ اس کو پی۔ ڈبلو۔ ڈی کی نئی بیرکوں میں بجلی کی فٹنگ کا ٹھیکہ مل گیا تھا۔ کام بڑا نہیں تھا۔ مگر بی کلاس گورنمنٹ کنٹریکٹر کی حیثیت سے اس کا نام ٹھیکیداروں کی فہرست میں رجسٹر ہو گیا تھا۔ اور اسی کے بل بوتے پر اس کو میونسپلٹی کے نئے مارکٹ کی تعمیر کا ٹھیکہ بھی مل گیا۔ اس کا ٹینڈر سات لاکھ تھا۔ دوسرے کنٹریکٹروں کے ٹینڈر کم تھے۔ مگر خان بہادر فرزند علی ان ہی دنوں نیا نیا میونسپلٹی کا چیرمین بنا تھا۔ الکشن پر اس کا بہت روپیہ صرف ہوا تھا۔ لہٰذا وہ اس کی وصول یابی کی تگ و دو میں تھا۔ نیاز سے اس کے مراسم بھی تھے۔ اس نے ۳۳ فی صدی کا حصہ رکھ کر نیاز کا ٹینڈر منظور کرا دیا۔

نیاز کو تعمیرات کے کام کا پہلے سے کوئی تجربہ نہیں تھا اور نہ اس کے پاس اتنے بڑے کنٹریکٹ کے لئے سرمایہ تھا۔ لہٰذا اس نے ساڑھے پانچ لاکھ روپے میں، سارا کام دوسرے ٹھیکیداروں کو دے دیا۔ اب اس کام میں اس کی دلچسپی صرف اس قدر رہ گئی تھی کہ ٹھیکے کے نام پر اس نے سیمنٹ اور لوہے کا جو سرپلس کوٹا مقرر کرا لیا تھا، اس کو بلیک مارکٹ میں فروخت کرتا تھا۔

خان بہادر فرزند علی سے اس کے مراسم پہلے ہی سے تھے۔ اس ٹھیکے کی وجہ سے اُن کے تعلقات اور بھی گہرے ہو گئے۔ نیاز کا زیادہ تر وقت خان بہادر ہی کے ساتھ گذرتا۔ خان بہادر ہی کے توسط سے شہر کے اعلیٰ افسروں تک اُس کی رسائی ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ ایک معزز شہری بنتا جا رہا تھا۔

تقریباً ہر شب خان بہادر کے یہاں اس کی نشست ہوتی۔ اس محفل میں شراب کا دور بھی چلتا۔ برج اور رمی ہوتی۔ خان بہادر کو رمی کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ میونسپلٹی کا چیرمین منتخب ہونے کے بعد اس کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں، مگر رمی کے پروگرام میں ایک روز بھی فرق نہ آیا۔ رات ہوتے ہی، کچھ سرکاری افسر اور شہر کے کچھ بڑے تاجر اس کی کوٹھی پر اکٹھا ہو جاتے اور روزمرّہ کا مشغلہ شروع ہو جاتا۔ اس طرح خان بہادر کا ڈرائنگ روم ایک پرائیوٹ قسم کا کلب بن گیا تھا، جس کا ایک رُکن نیاز بھی تھا۔ شروع شروع میں تو وہ پینے پلانے کے شغل سے کتراتا رہا۔ مگر کب تک جان بچاتا۔ ایک دن سب نے اصرار کر کے زبردستی اس کو تھوڑی سی وہسکی پلا دی۔ یہ گویا ابتدا تھی۔ اس کے بعد تو وہ لہک لہک کے پینے لگا۔

نیاز کی زندگی بڑے ٹھاٹھ سے بسر ہو رہی تھی۔ سلطانہ اور الّو اس کے ساتھ ہی کوٹھی میں آ گئے تھے۔ دونوں جاتے بھی کہاں۔ اُن کا بیٹھا ہی کون تھا جو سرپرستی کا دم بھرتا۔ مگر نیاز کا رویہ سلطانہ کے ساتھ بڑا نارمل تھا۔ ماں کو مرے ہوئے کئی ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا، مگر اس تمام عرصہ میں نہ تو نیاز نے اس کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی اور نہ کوئی ایسی بات پیدا ہونے کا موقعہ دیا، جس سے اس کو دُکھ پہنچتا۔ وہ عام طور پر سویرے ہی سویرے کار لے کر کوٹھی سے نکل جاتا تھا۔

اور رات گئے واپس لوٹتا تھا۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رات کو واپسی کے بعد اُس نے سلطانہ سے کوئی بات چیت کی ہو۔ وہ چپ چاپ جاکر اپنے کمرے میں سو جاتا تھا۔ رات کا کھانا وہ خان بہادر ہی کے ساتھ کھاتا تھا۔ شروع شروع میں سلطانہ نیاز کا کھانا، اس کے کمرے میں رکھوا دیا کرتی تھی مگر جب نیاز نے خود ہی منع کر دیا تو اُس نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔

نیاز کی صحت بھی اب اچھی ہو گئی تھی۔ کباڑ خانے کی دوکان پر دن بھر بیٹھے رہنے سے اُس کے جسم میں جو بھدا پن آگیا تھا، وہ دوڑ دھوپ کرنے سے کم ہو گیا تھا۔ اُس کی رنگت نکھر گئی تھی اور شراب پینے سے رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی جھلکتی رہتی۔ وہ جب نائیلون کی بش شرٹ اور اعلیٰ درجے کی سلی ہوئی پتلون پہن کر گھر سے بن سنور کر نکلتا تو خاصا اسمارٹ لگتا تھا۔ ایک بار تو سلطانہ نے بھی اس کو دیکھ کر سوچا تھا کہ نیاز روز بروز خوبصورت ہوتا جا رہا ہے۔

یہ گرمیوں کی ایک خوش گوار شام کا ذکر ہے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ مغرب میں گہری نارنجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں کے طویل سائے خوابوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سامنے سڑک پر اونٹوں کا ایک مختصر سا کارواں گذر رہا تھا۔ اُن کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں شام کے سناٹے میں آہستہ آہستہ بج رہی تھیں۔ سلطانہ اپنے کمرے کی کھڑکی پر کھڑی تھی۔ یہ کھڑکی باہر لان میں کھلتی تھی۔ گھنٹیوں کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ آفتاب کی نارنجی شعاعیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ سامنے ایک درخت کے پاس نیاز کھڑا تھا۔ اس وقت وہ کہیں جانے کے لئے نکلا تھا۔ ڈرائیور کار میں پٹرول ڈلوانے گیا تھا۔ وہ اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی لالہ گوں روشنی میں وہ خاصا دیدہ زیب نظر آرہا تھا۔ سلطانہ نے اُس کو دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ عین اسی وقت نیاز نے اس کی جانب نظریں اٹھائیں۔ لمحہ بھر کے لئے دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا۔ سلطانہ فوراً کھڑکی پر سے علیحدہ ہٹ آئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ مگر اس واقعہ کے بعد بھی نیاز کے رویہ میں کوئی تبدیلی نمودار نہ ہوئی۔

اتوار کو نیاز عموماً گھر پر رہتا تھا مگر اس کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے کے اندر گذرتا تھا۔ یا

پھر ملنے جلنے والے آجاتے تو وہ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا باتیں کیا کرتا۔ سلطانہ سے اُس کی بات چیت بہت سرسری ہوتی تھی۔ کئی بار وہ اس کو اور انو کو کار میں بٹھا کر شاپنگ کے لئے شہر لے گیا اور ہمیشہ سامان سے لدا پھندا لوٹا۔ اس سامان میں زیادہ تر سلطانہ کے بنڈل ہوتے۔

وہ اس کے ساتھ بڑی نرمی اور خوش اخلاقی کا برتاؤ کرتا تھا۔ بات کرتا تو عام طور پر اس کی نظریں جھکی ہوتیں۔ یہ گفتگو عام طور پر بڑی رسمی سی ہوتی تھی۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوا جب اس نے کوئی ذاتی سوال اس سے کیا۔ وہ بھی کچھ اس قسم کا ہوتا۔

"تمہارا دل تو یہاں نہیں گھبراتا؟"

"رات تمہاری کھانسی کی آواز آ رہی تھی۔ جا کر ڈاکٹر کو دکھا دو۔"

"کسی بات کی تکلیف تو نہیں ہے؟"

گھریلو اخراجات کے لئے وہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو سویرے ہی سویرے انو کو بلاتا اور اس کے ذریعہ سلطانہ کو تین سو روپے بھجوا دیتا۔ بجلی کا بل، نوکروں کی تنخواہ اور دھوبی کا حساب وہ خود اپنے پاس سے ادا کرتا تھا۔ بڑے مزے میں گذر بسر ہو رہی تھی۔ اس آسائش نے ماں کا غم سلطانہ کے دل میں دھندلا کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ تابناک ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں برسات کی شاموں کا سہانا پن اور جسم پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح لچکتا۔ اس کے حسن میں نرالی سج دھج آ گئی تھی۔

لیکن سلطانہ کے ساتھ نیاز کا رویہ جتنا نرم تھا، اسی قدر وہ انو سے بے رخی کے ساتھ پیش آتا۔ بات بات پر اس کو ڈانٹتا۔ کبھی کبھار کسی بات پر زیادہ ناراض ہو جاتا تو گالیاں بھی دینے لگتا۔ دو بار انو کے منہ پر اس نے تھپڑ بھی مارے تھے اور ایک دفعہ تو وہ ایسا غضبناک ہو گیا کہ پانی کا گلاس کھینچ مارا، مگر وہ بال بال بچ گیا اور شیشے کا گلاس دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔

انو فطرتاً ڈرا سہما رہتا تھا۔ نیاز کے اس رویہ نے اس کو اور خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت چپ چپ سا رہتا اور کم سنی میں بڑے بوڑھوں کی طرح سنجیدہ نظر آتا تھا۔ نیاز گھر میں آتا تو انو کی یہی کوشش ہوتی کہ وہ اس کے سامنے نہ پڑے۔ اگر نیاز کسی کام کے لئے بلاتا تو اس کا چہرہ زرد پڑ جاتا۔ وہ سہما ہوا سا گھبرایا سا کترایا

اُس کے پاس جا کر خاموش کھڑا ہو جاتا۔ وہ کسی کام کو کہتا تو بدحواسی میں کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی حرکت ہو جاتی۔ نیاز پاگل کتے کی طرح دانت کچکچا کے اس کی جانب لپکتا اور اُس پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتا۔

انّو کے ساتھ نیاز کا جو رویہ تھا، اس کو سلطانہ بارہا شدت کے ساتھ محسوس کر چکی تھی مگر کبھی اس کے خلاف احتجاج کرنے کی اُس کو جرأت نہ ہوئی۔ ایک بار جب نیاز نے انّو کے منہ پر تھپڑ مارا اور وہ روتا ہوا اُس کے پاس آیا، تو وہ بے چین ہو گئی۔ انّو کے رخسار پر انگلیوں کا نشان صاف نظر آ رہا تھا وہ سسکیاں بھر بھر کر بڑی بے چارگی سے رو رہا تھا۔ سلطانہ نے اُس کو تسلی دینے کی کوشش کی تو اپنی بیکسی پر خود اُس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ انّو کو سینہ سے لگا کر بے اختیار رو پڑی۔ اس سے بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرے بھائی صبر کر۔ اللہ کے لئے اس طرح بلک بلک کر نہ رو، میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے"

وہ اس کو سینے سے لگائے ہوئے دیر تک ہچکیاں لے کر روتی رہی۔ انّو سے اُس کو بچپن ہی سے بڑی محبت تھی اور اب تو اس بھری دنیا میں وہ اس کا واحد سہارا رہ گیا تھا۔ ماں باپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایک بھائی ایسا گیا کہ یہ بھی خبر نہ ملی کہ زندہ ہے کہ مر گیا۔

انّو کے ساتھ نیاز کا رویہ روز بروز سخت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس کو خواہ مخواہ ایذا پہنچانے کی کوشش کرتا۔ اس کا کام کاج کرنے کے لئے گھر میں ایک ادھیڑ عمر کا ملازم موجود تھا، مگر وہ اپنا سارا کام انّو ہی سے کرواتا تھا اور ذرا سی غلطی پر اس کو گندی گندی گالیاں دیتا۔ اس کے چہرے پر تھوک دیتا۔ بازو پکڑ کر اس میں آلپن چبھوتا۔ وہ تکلیف سے بلبلا کر چیختا تو اس کو بے رحمی کے ساتھ مارتا۔

انّو نے بارہا سلطانہ سے فریاد کی، وہ اس کو دلاسا دے کر رہ جاتی۔ نیاز سے کچھ کہنے کی اس کو کبھی جرأت نہ ہوئی۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ انّو نے نیاز کے خلاف کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ چپ چاپ اُس کی مار سہہ لیتا اور گھر کے کسی گوشہ میں جا کر چپکے چپکے رو لیتا۔ نیاز سے تو اس کو چڑ تھی ہی، اب وہ سلطانہ سے بھی بیزار بیزار سا رہنے لگا۔ اس کو تنہائی سے رغبت ہوتی جا رہی تھی۔ جب دیکھو، کہیں نہ کہیں اکیلا بیٹھا ہے اس وقت وہ بڑی اوٹ پٹانگ سی باتیں سوچا کرتا۔ اس کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ جسم کے ہر ہر جوڑ کی ہڈیاں

نکل آئی تھیں اور ان پر منڈھی ہوئی کھال چکنی چکنی معلوم ہوتی۔ اس مریل سے لڑکے سے نیاز کو نہ معلوم کیوں اس قدر نفرت تھی کہ اس کو دیکھتے ہی، وہ جھنجھلا جاتا۔ اُس کی آنکھیں سرخی مائل ہو جاتیں اور ہونٹ کانپنے لگتے۔ اس کو ایذا پہنچا کر اُسے عجیب سی تسکین پہنچتی۔

انو جب بھی اس کے سامنے جاتا تو اس طرح گھگھیا کر بولتا کہ وہ خارش زدہ کتے کی طرح حقیر نظر آتا۔ اس نفرت کی بنیادی وجہ کسی حد تک خود سلطانہ تھی۔ اس کو انو سے بے تحاشہ پیار تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت اس کی دیکھ بھال میں گذرتا تھا۔ وہ اُس کو اپنے سامنے بٹھا کر ناشتہ کراتی، اصرار کرکے کھانا کھلاتی اور اپنے کمرے ہی میں اس کو سُلاتی تھی کبھی بیٹھی اس کے کپڑوں میں بٹن ٹانک رہی ہے۔ اُس کی کتابیں قرینے سے لگا رہی ہے۔ اس کے جوتوں پر پالش کر رہی ہے۔ اس کا بستر درست کر رہی ہے۔ وہ سویرے بہت تڑکے اٹھ جاتی اور دیر تک بیٹھی انو کو بیدار کرتی رہتی۔ وہ اس وقت گہری نیند میں ہوتا بار بار کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیتا، مگر ناراض ہونے کے بجائے، وہ اس کو چمکارتی رہتی۔ آخر جب وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا تو اس کو غسل خانے لے جاتی۔ جب تک وہ نہاتا رہتا، وہ باہر دروازے پر تولیا لئے کھڑی رہتی۔ وہ غسل خانے کا دروازہ کھول کر باہر نکلتا تو وہ اُس کا بھیگا ہوا بدن پونچھتی اور خود کنگھا لے کر اُس کے بال بناتی۔ ذرا دیر بعد وہ اُس کے لئے گرم گرم دودھ کا گلاس لے کر آتی اور زبردستی اس کو پورا گلاس دودھ کا پلاتی۔ وہ اسکول جاتا، تو کوٹھی کے دروازے پر کھڑی دور تک اُس کو دیکھا کرتی۔

سلطانہ نے اپنی ساری توجہ کا مرکز انو کو بنا لیا تھا۔ نیاز کبھی کبھار اُس کے کمرے سے گذرتا تو وہ یہی دیکھتا کہ وہ انو کا کوئی نہ کوئی کام کر رہی ہے۔ وہ اس میں اس قدر منہمک ہوتی کہ نیاز کی جانب نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔

انو کی تنہا پسندی نے سلطانہ کو بے چین کر دیا تھا۔ وہ اس کو کبھی باغیچہ کے گھنے درختوں کے نیچے سے، کبھی باورچی خانے کی کوٹھری سے، کبھی کوٹھے پر جانے والے زینے سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتی۔ مگر انو اس کی نظر بچتے ہی کہیں نہ کہیں چھپ کر بیٹھ جاتا، وہ گھبرائی گھبرائی اس کو تلاش کرتی پھرتی۔ اُس کے پیار میں ماں کی ممتا کا جذبہ تھا اور اُس کی دیکھ بھال میں سلطانہ کو ایک طرح کا سکون ملتا تھا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ سلطانہ بیمار پڑ گئی۔ معمولی سا موسمی بخار تھا۔ نیاز نے اصرار کر کے اُس کو بوڑھی نادمہ کے ساتھ ڈاکٹر کے یہاں بھجوا دیا اور خود کار کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ شام کا وقت تھا اتو باہر لان میں درختوں تلے حسب عادت تنہا بیٹھا تھا۔ جب اندھیرا خوب پھیل گیا تو وہ اٹھ کر گھر کے اندر گیا۔ اسی وقت نیاز نے اس کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اتو کا خون خشک ہو گیا، چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ سہما ہوا سا اس کے پاس پہنچا۔ نیاز اس کو دیکھتے ہی غرایا۔

"ابے کہاں مر گیا تھا۔ کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں۔"

اتو نے حسب معمول اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ نیاز نے جل کر کہا "سور کے بچے منہ سے کیوں نہیں بولتا۔ اب تک کہاں آوارہ گردی کر رہا تھا؟"

اتو نے مری ہوئی آواز سے کہا "باہر درختوں کے نیچے بیٹھا تھا"

نیاز نے ایک سڑی ہوئی سی گالی دے کر کہا "اب تو جھوٹ بولنا بھی سیکھ گیا ہے۔ سمجھ لینا کھال ادھیڑ کے رکھ دوں گا۔ اس گھر میں رہنا ہے تو ٹھیک ٹھیک رہو، ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ۔ میں نے کوئی یتیم خانہ نہیں کھول رکھا ہے۔" وہ دیر تک اُس پر برستا رہا۔ پھر اُس سے کہنے لگا "ذرا الماری سے گلاس تو نکال اور وہ جو کونے میں لمبی سی بوتل رکھی ہے، وہ بھی لیتا آ۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے ذرا سی دوا پیوں گا۔" اتو چپ چاپ الماری کی طرف چلا گیا۔

جھٹ پٹا وقت تھا۔ ہوا سنکی ہوئی تھی۔ موسم سہانا ہو رہا تھا۔ نیاز کا بدن ٹوٹ رہا تھا طبیعت کچھ بھاری بھاری ہو رہی تھی۔ اُس نے سوچا اس وقت ایک آدھ پگ وسکی کا لگا لیا جائے تو طبیعت بشاش ہو جائے گی۔ اب وہ کبھی کبھار گھر پر بھی پی لیا کرتا تھا۔ وہ شراب پینے کا موڈ بنا کر کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

اتو نے الماری سے گلاس نکالا۔ بوتل اٹھائی۔ اسی وقت نیاز نے چیخ کر کہا "ابے کہاں مر گیا" اتو ایک بارگی گھبرا گیا۔ بدحواسی میں بوتل ہاتھ سے چھوٹ پڑی اور فرش پر گرتے ہی اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے وہسکی برسات کے پانی کی طرح بہنے لگی۔ کمرے بھر میں اس کی تیز بو پھیل گئی۔ نیاز لمحہ بھر تک تو خونخوار نظروں سے اس کو گھورتا رہا۔ پھر اُس نے وحشیوں کی طرح جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے اتو کے بال پکڑ لیے۔ کئی

بار زور زور سے اُس کو جھنجوڑا اور پھر پوری طاقت سے اس کو دھکیل دیا۔ وہ گیند کی طرح دیوار سے ٹکرا کر وہیں گر پڑا۔ نیاز نے قریب پہنچ کر اندھا دھند اس کی کمر، پیٹ، سینے پر لاتیں مارنا شروع کر دیں۔

انو کے سینے پر ایک بھرپور لات پڑی تو وہ درد سے بلبلا کر فرش پر دوہرا ہو گیا۔ نیاز نے ایک اور کس کے لات دی تو وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ نیاز بھینسے کی طرح منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپنے لگا انو ذرا دیر تک تو لاش کی مانند بے سدھ پڑا رہا۔ پھر اس نے اٹھ کر کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر نیاز نے اس کو جانے نہ دیا۔ اس نے لپک کر کمرہ کا دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا۔ انو خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔

نیاز آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب گیا اور گریبان پکڑ کر اس کو زور زور سے جھنجوڑنے لگا۔ پہلی بار انو نے اپنے میں جرائت پیدا کی اور جل کر اپنا پورا منہ نیاز کی کلائی پر رکھ کر گوشت چبا ڈالا۔ نیاز نے تکلیف سے گھبرا کر بڑا گھناؤنا سا منہ بنایا اور زور سے چلایا "مار دیا سالے نے" اور پھر انو کو فرش پر گرا کر اس کے سینہ پر سوار ہو گیا۔ وہ اس کے بھاری بھرکم جسم کے نیچے مچھلی کی طرح تڑپا تو نیاز نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ کر زور لگایا۔ انو کے حلق سے بلبلوں کے غرانے کی سی آواز نکلی اور اس کی آنکھیں اُبل پڑیں۔

نیاز نے گھبرا کر اُس کو چھوڑ دیا۔ انو آنکھیں پھاڑے دیر تک اس کو تکتا رہا۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھیں اور آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح سرخ ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر وہ اسی طرح سکتے کے عالم میں پڑا رہا۔ پھر وہ درد سے کراہنے لگا۔ نیاز نے چیخ کر کہا۔

"تو ابھی میرے گھر سے نکل جا، ورنہ میں تجھکو جان سے مار دوں گا۔"

انو نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ڈگمگا کر پھر فرش پر گر پڑا۔ اس کا جسم پسینہ سے شرابور ہو رہا تھا اور سانس الجھی ہوئی چل رہی تھی۔

کئی منٹ اسی عالم میں گذر گئے۔

ایکا ایکی نیاز نے گالی دے کر کہا "ابے اب جاتا ہے کہ سالے کچھ اور دے گا" یہ کہہ کر وہ اس کی جانب

خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا لپکا۔ انو جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے بڑی بے بسی کے ساتھ دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور گھگھیا کر کہنے لگا۔

"اب نہیں۔ اب نہیں"

نیاز بولا "تو پھر نکل یہاں سے" اُس نے دروازے کا بولٹ کھول دیا اور اس سے کہنے لگا "دیکھ اب لوٹ کے نہیں آنا۔ ورنہ میں تجھکو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میرے گھر میں تیری اب گذر نہیں۔"

انو اٹھکر کھڑا ہو گیا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ کمرے کے باہر چلا گیا لیکن وہ کوٹھی ہی نہیں ٹھیرا۔ لان کو عبور کرتا ہوا وہ پھاٹک سے نکلا اور آہستہ آہستہ سنسان سڑک پر چلنے لگا۔

۴

رات نے اپنے پر پھیلا دیئے اور کوچہ و بازار پر تاریکی پھیل گئی۔ اتو سنسان سڑکوں پر کئی گھنٹے تک آوارہ گردی کرتا رہا۔ وہ مسلسل سوچتا رہا کہ اس کو کہاں جانا چاہیے۔ مگر وہ کہیں نہیں گیا اور ایک سڑک کے نٹ پاتھ پر تھک کر سو گیا۔

آدھی رات سے کچھ دیر پہلے اتو کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ مینہ برس رہا ہے۔ اس کو اپنا بدن بھیگتا ہوا معلوم ہوا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ایکا ایکی اندھیرے میں کسی کی تیز آواز ابھری۔

"مار دیا سالے نے۔ ابے تجھ کو یہیں مرنے کو جگہ رہ گئی تھی"

اتو نے دیکھا ایک شخص اس کے سر پر کھڑا اطمینان سے پیشاب کر رہا تھا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور سہمی ہوئی نظروں سے اس آدمی کو دیکھنے لگا۔ وہ شخص اسی طرح اطمینان سے کھڑا پیشاب کرتا رہا ذرا دیر بعد وہ فارغ ہوا تو ازار بند باندھتا ہوا اس کے قریب آیا اور اتو سے پوچھنے لگا۔

"ابے یہاں کیوں سو رہا تھا۔ گھر میں سونے کی جگہ نہیں تھی؟"

اتو نے کوئی جواب نہیں۔ خاموش بیٹھا اس کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔

اس نے دوبارہ پوچھا "یہیں کہیں رہتا ہے؟"

اس دفعہ اتو نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا "نہیں"

ذرا دیر تک وہ شخص خاموش کھڑا رہا۔ اندھیرے میں وہ سائے کی طرح دھندلا نظر آ رہا تھا۔ اتو

اس کے حلیہ کے اندازہ نہ لگا سکا۔ اس کی آواز بھاری تھی۔ لب و لہجے سے وہ گھٹیا قسم کا آدمی لگتا تھا چند لمحوں بعد اس کی آواز ابھری۔

"ابے تو یہاں کیوں پڑا ہے"؟

انو نے کوئی جواب نہ دیا، کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی۔ نہ آواز، اور اندھیرا بہت گہرا تھا۔ اچانک رات کی خاموشی میں گھوڑے کے زور سے ہنہنانے کی آواز ابھری۔ انو نے گھبرا کر دیکھا۔ چند قدم کے فاصلہ پر ایک تانگہ کھڑا تھا۔ گھوڑا ہنہنا ہنہنا کر سڑک پر ٹاپیں مار رہا تھا۔

وہ آدمی گھوڑے کو چمکارنے لگا۔ "ارے ذرا دم لے بادشاہ، میں ابھی آیا" پھر اس نے پلٹ کر انو سے کہا "ابے یہاں کوڑے کے ڈھیر پر کیوں پڑا ہے۔ چل میرے ساتھ چل"۔

انو خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اس دفعہ وہ آدمی جو غالباً تانگہ والا تھا۔ بے تکلفی سے بولا "ابے اب کھڑا بھی ہو" یہ کہہ کر اس نے انو کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

انو اس کے ساتھ ساتھ تانگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے چابک ہوا میں لہرایا، باگیں کھینچیں اور گھوڑا روانہ ہو گیا۔ دور تک سرمئی سڑک پھیلی تھی جس پر گھوڑے کے پیروں میں لگے ہوئے نعل ٹپا ٹپ بج رہے تھے۔ ہوا سنکی ہوئی چل رہی تھی۔ انو کچھ دیر تک تو بیٹھا ہچکولے کھاتا رہا، پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر تک پڑا سوتا رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ تانگہ ایک تنگ سے بازار کے اندر آہستہ آہستہ گذر رہا تھا۔ بازار سنسان پڑا تھا۔ نہاریوں اور شیر فروشوں کی اکا دکا دکانیں ابھی تک کھلی تھیں، جن پر تیز روشنی ہو رہی تھی۔

تانگے والے نے ایک دودھ والے کی دوکان کے سامنے جا کر تانگہ ٹھہرایا اور نیچے اتر کر دوکان پر پہنچ گیا۔ دودھ والا بھاری بھرکم جسم کا آدمی تھا۔ بڑی بے تکلفی سے بولا "اماں نوروز خاں کہاں سے آرہے ہو۔ آج تو تم نے بڑی دیر لگا دی"۔

نوروز بولا "یار چھاؤنی کی ایک سواری لے گیا تھا۔ پلٹتے میں نکل گیا اپنا تو"۔ لمحہ بھر توقف کر کے

اُس نے کہا "لا یار سیر بھر دودھ تو دے بڑے آبخورے میں دینا"

"یہاں نہیں پیو گے؟"

"نہیں یار ساتھ لے جاؤں گا"

نوروز کا جواب سن کر دودھ والا چونک پڑا۔ اُس نے جھک کر تانگہ کی جانب دیکھا، جس میں انّو خاموش بیٹھا تھا۔ وہ نوروز سے کہنے لگا "تو یوں کہونا! ابے کہاں سے چھنا لایا"

نوروز مسکرا کر بولا "بس پوچھو نہ، چڑھ گیا ہتھے پر۔ اللہ سب کو رزق دیتا ہے پہلوان"

دودھ والے نے ایک بار پھر انّو کو دیکھا اور ران کھجاتے ہوئے کہنے لگا "لونڈا تو صورت شکل کا اچھا دکھے ہے۔ پر یار یہ تو بہت چھوٹا ہے۔ ابے یہ تو مر جائے گا۔ سالے کھنچے کھنچے پھرو گے۔ میرا کہنا مان، یہ چکّر اب چھوڑ دے گھر و ر بسا لے"

وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا "ابے کیا رکھا ہے گھر بسانے میں۔ خواہ مخواہ کاٹنا ہے"

پہلوان بولا "تم کو تو سالے چاٹ ہی اور لگ گئی ہے"

"یار پہلوان تو زیادہ باتیں نہ بنایا کر۔ لا دودھ دے۔ ربڑی ہو تو ایک آدھ سیر وہ بھی دیدے"

یہ کہہ کر نوروز نے ایک پانچ روپیہ کا نوٹ نکال کر دودھ والے کو دیا "ربڑی نہ ہو تو کچھ اور میٹھا دیدے"

دودھ والا بولا "آج تو بڑا زوروں پر جا رہا ہے" نوروز صرف مسکرا کر رہ گیا۔

پہلوان نے دودھ سے بھرا ہوا آبخورہ اُس کو دیا۔ کہنے لگا۔ "ربڑی تو ہے نہیں۔ جلیبیاں دیدوں؟"

"لا یار وہی دے۔ دیر نہ کر"

پہلوان نے آدھ سیر جلیبیاں اور پانچ روپے کے نوٹ سے بچی ہوئی رقم اُس کے حوالے کر دی۔

نوروز نے تانگہ کے برابر آکر دودھ کا آبخورہ اور جلیبیوں کا پُڑا۔ انّو کو دیا اور خود اُچک کر تانگے پر سوار ہو گیا۔ ذرا دیر میں گھوڑے نے حرکت کی اور تانگہ بازار سے گذرنے لگا۔

مختلف راستوں کے چکّر کاٹنے کے بعد، تانگہ ایک احاطہ کے اندر داخل ہو گیا۔ احاطہ کی چہار دیواری بوسیدہ تھی۔ اندر کھپریل کی چھتوں والے چھوٹے چھوٹے کئی گھر تھے۔ ان ہی میں نوروز کی کوٹھری

تھی۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ نوروز نے تالا کھولا۔ ماچس جلا کر ایک چندھی سی لالٹین روشن کی، جس کی چمنی ٹوٹی ہوئی تھی۔ کوٹھری میں ایک طرف پلنگ بچھا تھا۔ جس پر ایک میلے سے بستر کے علاوہ نوروز کے کپڑے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک ٹرنک رکھا تھا، جس پر کنگھا، تیل کی شیشی اور ایسی ہی ایک دو چھوٹی موٹی چیزیں رکھی تھیں۔

نوروز نے لالٹین روشن کر کے، بستر پر سے کپڑے ہٹائے اور انو سے کہنے لگا "تم یہاں بیٹھو، میں ذرا گھوڑا کھول کر تھان پر باندھ دوں۔ بس ابھی آیا۔ گھبرانا نہیں" یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر چلا گیا۔ کوٹھری کی فضا مرطوب تھی اور ایک عجیب سی لسباندھ پھیلی ہوئی تھی۔ انو خاموشی کے ساتھ پلنگ پر دونوں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا اور کوٹھری کی ایک ایک چیز کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ ابھی تک گم صم تھا۔ ہر چیز اس کے لیے اجنبی تھی، ہر بات انوکھی تھی۔ گذشتہ ۲۰، گھنٹوں میں اس کی زندگی میں، کچھ اس طرح پے بہ پے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں کہ وہ سکتے کے سے عالم میں آ گیا تھا۔ اُس کے چاروں طرف خوابوں کا دھندلکا چھایا ہوا تھا، جس میں اس کی اپنی ذات روپوش ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر احساس دم بخود ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد نوروز آیا۔ اُس نے کوٹھری کے دروازے کی کنڈی لگائی۔ المونیم کے بڑے سے کٹورے میں بھرا ہوا دودھ اور جلیبیاں لے کر اُس کے پاس آ گیا۔ انو نے سہ پہر کی چائے پی تھی، سخت بھوک لگ رہی تھی۔ نوروز نے اصرار کیا تو اُس نے دودھ میں بھیگی ہوئی جلیبیاں پی لیں۔ نوروز نے ہاتھ بڑھا کر طاق سے لالٹین اٹھائی اور پھونک مار کر اُس کو بجھا دیا۔

نوروز سویرے بہت تڑکے اٹھ کر کوٹھری سے باہر چلا گیا۔

انو کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ نہ جانے کب سے جاگ رہا تھا۔ اور بستر پر لاش کی طرح بے سُدھ پڑا تھا۔ اُس نے نوروز کو باہر جاتے دیکھا۔ اور روشن دان سے اُبھرتی ہوئی ہلکی ہلکی سفید سفید کافوری روشنی کو دیکھا۔ سویرا ہو رہا تھا۔ کہیں قریب ہی مسجد میں اذان ہو رہی تھی۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر

اب احاطے میں ملی جلی آوازیں اُبھرنے لگی تھیں۔ بچوں کے رونے کی آوازیں، بوڑھوں کے کھانسنے کی آوازیں، عورتوں کے چیخنے کی آوازیں۔ اور یہ سب آوازیں گھل مل کر ہلکے ہلکے شور میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔ انّو چپ چاپ پڑا اس شور کو سنتا رہا۔ روشن دان سے اُبھرنے والی روشنی کو دیکھتا رہا۔

نوروز جب واپس آیا تو اُس کے ہاتھوں میں گرم گرم پوریوں کا پڑا دبا ہوا تھا۔ اُس نے انّو پر ایک نظر ڈالی اور کہنے لگا "ابے تو ابھی تک لیٹا ہوا ہے۔ منہ ہاتھ تو دھو لیا ہوتا" انّو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پلنگ سے نیچے اُترا تو اُس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ اُس نے کونے میں رکھے ہوئے لوٹے میں گھڑے سے پانی بھرا اور کوٹھری کے دروازے پر جا کر منہ دھونے لگا۔

اُس کا جی متلا رہا تھا۔ مگر نوروز نے اصرار کر کے اس کو دو پوریاں زبردستی کھلا ہی دیں۔ چار پوریاں اُس نے انّو کے دوپہر کے کھانے کے لئے رکھ دیں اور اُس سے کہنے لگا "موقعہ لگا تو میں دوپہر کو آ جاؤں گا نہیں تو رات کو واپسی ہوگی۔ گھبرانا نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دے۔"

انّو نے کھوئی کھوئی نظروں سے اس کو دیکھا اور زبان سے کچھ نہ کہا۔ نوروز نے اُس کی پیٹھ تھپتھپا کر کہا "اب تو اطمینان سے پڑ کر سو۔ طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ بھوک لگے تو پوریاں کھا لینا۔ رات کا کھانا میں لے کر آؤں گا۔ ٹھیک ہے" اُس نے انّو کے رخسار میں ہولے سے چٹکی بھری اور مسکرا کر بولا "وکیل صاحب کو دیر ہو رہی ہوگی، مجھے ان کے لئے تانگہ لے کر جانا ہے۔ گھبرانا مت" یہ کہہ کر وہ کوٹھری سے باہر آیا۔ دروازہ بند کیا اور اس میں تالا لگا دیا۔

انّو دن بھر کوٹھری کے اندر نڈھال پڑا رہا۔ سہ پہر کو ذرا بھوک لگی۔ مگر ایک پوری بھی نہ کھائی گئی نہ جانے کیسی طبیعت ہو رہی تھی۔ اُس نے گلاس بھر کر پانی پیا اور پھر بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

رات کو دس بجے کے قریب نوروز آیا۔ وہ اپنے ساتھ خمیری روٹیاں اور سالن لایا تھا۔ اس کے علاوہ وہ انّو کے لئے ایک پھول دار ریشمی بش شرٹ بھی لایا تھا۔ اُس نے بڑے شوق کے ساتھ بش شرٹ اسی وقت انّو کو پہنائی اور ہنس کر بولا۔

"بچ گیے اُستاد۔ اے میرے ساتھ رہا تو عیش کرادوں گا"

الّو کو بش شرٹ کے پہننے سے کوئی خاص مسرت نہ ہوئی۔ مگر نوروز بڑا خوش نظر آرہا تھا۔ بار بار بش شرٹ کی تعریف کرتا۔ اُس کی اپنی قمیص خاصی میلی تھی اور شلوار اس سے بھی زیادہ میلی تھی۔ وہ دوہرے بدن کا لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ ۳۰، ۳۲ کے لگ بھگ عمر تھی۔ رنگ سانولا تھا۔ سر پر لمبے لمبے بال تھے۔ آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ جب وہ ہنستا تو آنکھیں بند ہوجاتیں اور چہرہ کچھ ایسا بے ڈھنگا ہوجاتا کہ وہ اچھا خاصا اُلو کا پٹھا معلوم ہوتا۔ لیکن وہ الو کا پٹھا ہرگز نہیں تھا، روزانہ ۱۰، ۱۲ روپے اور کبھی کبھی تو اٹھارہ اٹھارہ، بیس بیس روپے کما لاتا تھا طبیعت میں چٹورپن تھا، اس لئے ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتا ہی رہتا تھا۔ شہر کے تانگے والوں میں وہ بڑا سرکش مشہور تھا۔ ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کے لیے آمادہ ہوجاتا۔ ہاتھ پاؤں اچھے تھے، اس۔ لئے لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا، جب اڈے پر کسی تانگے والے سے اس کی تو تکار نہ ہوتی اور اکثر اس کو لم گلوچ میں ہاتھا پائی تک کی نوبت آجاتی۔

لیکن الّو کے ساتھ نوروز کا رویہ بڑا اچھا تھا۔ وہ اس سے بڑی نرمی سے پیش آتا تھا اور الّو نے بھی کبھی اس کو ناراضگی کا موقعہ نہ دیا۔ ایک تو وہ فطرتاً خاموش پسند تھا۔ اب اُس نے اور بھی زیادہ بولنا بند کردیا تھا۔ ہر وقت چپ چپ رہتا۔

نوروز روزانہ صبح کوٹھری میں تالا لگا کر چلا جاتا اور رات کو آکر اس کو کھولتا۔ واپسی پر وہ الّو کے لئے کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ، اکثر اور بھی کچھ نہ کچھ لے آتا۔ کھانا کھانے کے بعد نوروز زور زور سے ڈکاریں لیتا اور دھم سے بستر پر گر جاتا اور الّو کو آواز دے کر کہتا۔

"لے بے ذرا ٹانگیں تو دبا دے"

الّو پائینتی بیٹھکر چپ چاپ اُس کی موٹی موٹی پنڈلیاں دبانے لگتا۔ نوروز اُس وقت باتیں کرنے کے موڈ میں ہوتا تھا۔ وہ الّو سے پوچھتا "کیوں بے کوئی تکلیف تو نہیں تجھکو؟"

الّو اپنا چھوٹا سا سر انکار میں ہلادیتا۔

وہ اصرار کر کے پوچھتا " دیکھ بے کسی بات کی ضرورت ہو تو فوراً کہہ دیا کر۔"

"اچھا" اَنّو کا مختصر سا جواب ہوتا۔

نوروز کو اس کی یہ خاموشی کبھی کبھی بڑی گراں گزرتی۔ وہ کسی قدر تیکھے لہجے میں کہتا۔

" ابے تو نے کوئی چپ کا روزہ رکھا ہے۔ ذرا بات چیت کیا کر۔ یہ کیا کہ ہونٹ سیے بیٹھا ہے۔ اور دیکھ جو تیرا جی چاہے بے خوف مجھ سے کہہ دیا کر۔ دیکھ تو میں تیری بات پوری کرتا ہوں کہ نہیں۔"

اس کے اسی اصرار پر آخر ایک روز انّو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

" مجھے اسکول میں داخل کرا دو"

نوروز حیرت سے چونک پڑا " اسکول میں داخل کرا دوں؟" وہ لمحہ بھر خاموش رہا " ابے کیا کرے گا اسکول جا کر، وہاں تو لڑکے جا کر ایک نمبر آوارہ ہو جاتے ہیں۔ جا بے تو بھی یونہی رہا۔"

اس کے اس جواب سے انّو کو بڑی نا امیدی ہوئی۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ وہ اسکول میں داخل ہو جائے گا۔ خوب پڑھے گا۔ پھر ایک اچھی سی نوکری کرے گا اور سلطانہ کو جا کر اپنے پاس بُلا لائے گا۔ اُسے سلطانہ بہت یاد آتی تھی اور اُس کو یاد کر کے وہ اکثر رو پڑتا۔ اب وہ اس کے پاس جا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ نیاز دیکھ لیتا، تو اُس کو زندہ نہ چھوڑتا۔

نوروز کے پاس رہتے ہوئے انّو کو ہفتہ بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ نوروز اُس کو روزانہ کوٹھری میں بند کر کے چلا جاتا اور رات گئے واپس لوٹتا۔ وہ دن بھر کوٹھری میں قید رہتا۔ کبھی کبھی دل گھبراتا تو اٹھ کر بے چینی سے چکر کاٹنے لگتا۔ پھر اپنی بے کسی پر اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتیں اور وہ سسکیاں بھر کر دیر تک روتا رہتا۔ نوروز سے اُس کو کراہیت محسوس ہونے لگی تھی۔ اُس کے دانت غلیظ تھے۔ منہ سے بڑی خراب بو آتی تھی۔ ابابیل کے پروں کی طرح گھنی مونچھیں تھیں، جب وہ اس کو پیار کرتا، تو انّو کا جی متلانے لگتا، اس کا بس چلتا تو وہ نوروز کے منہ پر تھوک دیتا۔

ایک روز نوروز رات کو واپس آیا تو وہ نشے میں دُھت ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں چڑھی

ہوئی تھیں اور قدم بہکے ہوئے پڑ رہے تھے۔ اُس نے کوٹھری کے اندر داخل ہوتے ہی گھور کر انّو کو دیکھا اور جھوم کر بولا۔

"کنڈی لگا دے"

اس کی آواز اس وقت پھٹے بانس کی طرح بے ڈھنگی ہو رہی تھی۔ انّو نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ نوروز کوٹھری کے بیچوں بیچ کھڑا جھولتا رہا۔ اُس نے گہری نظروں سے انّو کو دیکھا "ادھر آبے" انّو چپ چاپ اُس کے پاس چلا گیا۔

نوروز ہونٹ بھینچ کر چیخا "اے جیو میری جان" یہ کہہ کر اُس نے انّو کو دونوں بازوؤں پر اٹھا لیا اور دھم سے بستر پر اٹھا کر پھینک دیا۔ پھر اس نے لالٹین پر ایک لات ماری جو دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ لالٹین کی لَو ذرا ایک بار بھڑکی اور بجھ گئی۔ کوٹھری کے اندر گہرا اندھیرا چھا گیا۔

صبح اٹھ کر نوروز نے دیکھا تو انّو غائب تھا۔ اس کی نظر فوراً دروازے پر گئی۔ کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر جا کر دیکھا انّو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ رات کو نہ جانے کب اٹھ کر فرار ہو گیا تھا۔

نوروز دن بھر پاگلوں کی طرح تانگہ پر بیٹھا انّو کو تلاش کرتا رہا مگر کہیں اس کا سُراغ نہ ملا۔ کئی روز تک وہ اس کو جگہ جگہ تلاش کرتا رہا مگر انّو ایسا غائب ہوا کہ کہیں نظر تک نہ آیا۔

کئی ہفتے گزر گئے اور نوروز اس کو قریب قریب بھول چکا تھا کہ ایک رات وہ اس کو اچانک نظر آ گیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ بازاروں کی رونق اُجڑ چکی تھی اور نوروز تھکا ہوا سا واپس لوٹ رہا تھا۔ ایکا ایکی سڑک کے ایک موڑ پر اُس نے دیکھا کہ بجلی کے کھمبے کے پاس انّو کھڑا ہے۔ وہ اس وقت بوسکی کی قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں پھولوں کا گجرا تھا۔ کلے میں پان تھا۔ آڑی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ بجلی کی روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کے ہمراہ تین آدمی تھے۔ وہ اُجلے لباس پہنے ہوئے تھے اور وضع قطع سے شوقین مزاج لگتے

تھے۔ اتّو مسکرا مسکرا کر اُن سے باتیں کر رہا تھا۔

نوروز نے اُس کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس نے تانگے کو آگے بڑھایا اور عین ان لوگوں کے سامنے جا کر تانگہ کو روک کر نیچے اتر پڑا۔ اتّو نے اس کو دیکھا تو اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ نوروز نے نتھنے پُھلا کر اس کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔

"کیوں بے حرام کے تخم" نوروز کے منہ سے جھاگ اُڑنے لگا اور اس کی مونچھیں خطرناک طریقے پر پھڑ پھڑانے لگیں۔ اُس نے لپک کر اس کا بازو دبوچ لیا اور ڈانٹ کر بولا "منہ کیا تک رہا ہے۔ سیدھی طرح چلتا ہے کہ دوں ایک ہاتھ۔"

وہ تینوں شخص لمحہ بھر کے لئے تو حیرت سے آنکھیں پھاڑے نوروز کو تکتے رہ گئے پھر ایک نے آگے بڑھ کر کہا "بات کیا ہے جی"

نوروز کہنے لگا "اسی سے پوچھ لو۔"

"اس سے تو بعد میں پوچھیں گے، پہلے تم بتاؤ"

نوروز بگڑ کر بولا "دیکھو جی بہت دن تم نے میرا لونڈا رکھ لیا۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ چپ چاپ الگ کھڑے رہو۔ ورنہ اچھا نہ ہو گا۔"

وہ شخص مسخرے پن سے بولا "اچھا" اور اپنے ساتھ والے سے کہنے لگا "لو جی یہ لونڈا ان کا ہو گیا"

نوروز کہنے لگا "اس سے پوچھ کر تو دیکھو"

وہ شخص بولا "اس سے کیا پوچھنا ہے۔ ہزار روپیہ نقد خرچ کیا ہے۔ تانگہ گھوڑا تک بک جائے گا۔ جا کر بتّو ہیجڑے سے پوچھ لو کیا رقم دی ہے اس لونڈے کی۔" بات بھی وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اتّو، نوروز کی کوٹھری سے نکل کر بھاگا تو راستے میں بتّو ہیجڑے سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ بتّو اب بن سے اُتر چکا تھا اور اُس نے نائیکہ کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ گھیر گھار کر نوخیز لڑکوں کو لاتا۔ کچھ دن اُن کی کمائی کھاتا اور جب کوئی مال دار شوقین مزاج مل جاتا تو اُس کے

ہاتھ فروخت کر دیا کرتا۔ انو کو خوف زدہ دیکھکر نبو کی تجربہ کار نگاہیں تاڑ گئیں کہ وہ گھر سے بھاگا ہوا ہے۔ اس نے انو کو دلاسا دیا اور بہلا پھسلا کر اپنی کوٹھری میں لے آیا۔ کچھ دن اس کو اپنے پاس رکھا۔ پھر احمد جان کے ہاتھ اس کو ہزار روپے میں بیچ دیا۔

اس وقت لوزروز سے احمد جان ہی بات کر رہا تھا۔ وہ کھالوں کا کاروبار کرتا تھا۔ آمدنی اچھی تھی۔ جی کھول کر عیاشی کرتا تھا۔ خود بھی مزاج میں غنڈا پن تھا اور دو چار بدمعاشوں کو ساتھ رکھتا تھا۔

لوزروز اس سے کہنے لگا "میں کسی سالے نبو و نو کو نہیں جانتا میں تو اس کو ابھی لے کے جاؤں گا"

احمد جان نے کہا "لے جایا جائے تو لے جاؤ"

لوزروز نے گردن اونچی کرکے کہا "دیکھوں تو میں کون مائی کا لال مجھے روکتا ہے" یہ کہکر اُس نے انو کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا "چل بے"

اسی وقت احمد جان کا ایک ساتھی بڑھ کر آگے آیا اور لوزروز کو آہستہ سے دھکا دے کر بولا "الگ ہٹ کے بات کرو" لوزروز نے خونخوار نظروں سے اُس کو دیکھا اور چیخ کر بولا۔

"یہ مت سمجھنا کہ اکیلا ہوں، تم تینوں پر بھاری ہوں"

مگر وہ شخص مشتعل نہ ہوا نرمی سے بولا "جا بھئی اپنا کام کر کیوں خواہ مخواہ سر ہوئے جا رہا ہے"

لوزروز نے پھر انو کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ احمد جان کے ساتھی نے ریشمی کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑا سا چاقو باہر نکال لیا۔ کڑکڑ کرکے چاقو کے کھلنے کی آواز اُبھری۔ لوزروز نے دیکھا، چاقو کی جھلکتی ہوئی نوک اُس کے پیٹ پر تھی۔ وہ آدمی کہنے لگا "اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔ ورنہ لاش کبھی تمھاری ڈھونڈے سے نہ ملے گی"

لوزروز چپ چاپ کھڑا جھلکتے ہوئے چاقو کو دیکھتا رہا۔

احمد جان نے نوروز کو گالی دے کر کہا "ابے اب یہاں سے ٹلے گا بھی، یا ہتیا کرانے کا ارادہ ہے۔" نوروز پسپا ہونے کے سے انداز میں پیچھے ہٹ آیا اور گردن جھکا کر تانگہ کی طرف چل دیا جب وہ تانگہ پر سوار ہونے لگا تو احمد جان نے کہا۔

"آئندہ ادھر کا رخ نہ کرنا، ورنہ ٹھنڈے پڑے ہوگے۔"

نوروز کو ان پر تاؤ تو بہت آیا مگر وہ ایک نہیں تین تھے اور مسلح تھے۔ وہ بالکل نہتا تھا لہٰذا اُس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا، اُس نے گھوڑے کی راسیں کھینچیں اور تانگے کو آگے بڑھا دیا۔ کولتار کی پختہ سڑک پر اُس کے تانگے کی آہٹ دور تک اُبھرتی رہی۔

انّو، احمد جان اور اُس کے ساتھیوں کے بیچ میں خاموش کھڑا تھا۔

۵

انو گھر سے نکلنے کے بعد پھر واپس نہ آیا۔

سلطانہ روزانہ اس کا انتظار کرتی۔ اُسے امید تھی کہ انو ایک نہ ایک دن ضرور واپس آئے گا۔ اس نے انو کی ایک ایک چیز سنبھال کر الماری میں سجا کر رکھدی تھی۔ اُس کے لئے کپڑوں کے کئی نئے جوڑے سلوائے تھے۔ وہ بھی الماری میں رکھے تھے۔ جب کبھی انو بہت یاد آتا تو وہ الماری کھول کر کھڑی ہو جاتی اور ساری چیزوں کو حسرت سے دیکھتی۔ پھر ایکا ایکی اُس کا دل بھر آتا اور وہ بے اختیار رو پڑتی۔ انو سے اُس کو بڑی ڈھارس تھی۔ اُس کے جانے کے بعد تنہائی کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح گھر کے چکر کاٹا کرتی۔ گھنٹوں دریچے پر کھڑی سڑک کی جانب خوابناک نظروں سے تکا کرتی، شاید انو آتا ہوا نظر آجائے۔

اس کو اس قدر پریشان دیکھکر گھر کی بوڑھی خادمہ نے مشورہ دیا تھا کہ گمٹی میں ایک بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ وہ فال نکال کر ایسی پتے کی باتیں بتا دیتے ہیں کہ آدمی دنگ رہ جائے اور اُن کا تعویذ تو ایک پر ایک ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے کئی حیرت انگیز واقعات بھی بتائے، جن کو سُن کر سلطانہ کا اشتیاق اس قدر بڑھا کہ ایک دن، جب نیاز اپنے کام پر گیا ہوا تھا اُس نے خادمہ کو اپنے ہمراہ لیا اور ان شاہ صاحب کے پاس جا پہنچی وہاں جا کر اُس نے دیکھا کہ عقیدت مندوں کا ایک جمگھٹا لگا تھا۔ دور دور سے لوگ اُن کے پاس آئے تھے۔ اُن کا قیام پہاڑی کے

دامن میں تھا۔ یہ لکڑی کا بنا ہوا مختصر سا مکان تھا۔ جس میں کُل دو کمرے تھے۔ آگے سائبان تھا جس میں مردوں کے لئے انتظام تھا۔ ایک کمرے میں پردہ دار خواتین بیٹھی تھیں۔ سلطانہ وہیں جاکر بیٹھ گئی۔ وہ ۹ بجے دن کو وہاں پہنچی تھی۔ دوپہر کے وقت اُس کی طلبی ہوئی۔

یہ کمرہ خاصہ کشادہ تھا۔ شاہ صاحب غالیچہ پر مسند سے لگے بیٹھے تھے۔ کمرے کے اندر لوبان سُلگ رہا تھا۔ ہر طرف تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ بڑی گھیردار ڈاڑھی تھی، سر پر کاکلیں تھیں اس وقت وہ زعفرانی رنگ کا کرتا اور ویسا ہی تہبند باندھے ہوئے تھے۔ چہرے پر جلال تھا۔ جب سُلطانہ وہاں پہنچی تو وہ آنکھیں بند کئے مراقبے میں بیٹھے تھے۔

وہ غالیچہ کے ایک سرے پر مودب ہوکر بیٹھ گئی۔ شاہ صاحب آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے کمرے کے اندر گہرا سکوت طاری تھا۔ ایکا ایکی شاہ صاحب کی آواز اُبھری۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"لڑکی تیرا بھائی شمال مشرق کی جانب گیا ہے۔ وہ ایک شخص کے چنگل میں بُری طرح پھنسا ہوا ہے۔"

سلطانہ نے چونک کر دیکھا وہ بدستور آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ سلطانہ کو سخت حیرت ہوئی کہ اُن کو کس طرح یہ پتہ چل گیا کہ وہ اپنے بھائی کے لئے معلوم کرنے یہاں آئی ہے۔ اُن سے تو اس کی ابھی بات تک بھی نہیں ہوئی تھی۔ عقیدت سے اُس کی گردن جھک گئی۔ کمرے کے اندر عود و لوبان کے مرغولے لہرا رہے تھے۔ گہری خاموشی اور تیز خوشبو (ؤں) کی مہک نے ماحول کو آسیب زدہ بنا دیا تھا۔

ذرا دیر بعد شاہ صاحب نے آنکھیں کھول دیں اور سلطانہ کو گھور کر دیکھا اور حیرت زدہ ہوکر بولے "تم دونوں کب آئیں؟" سلطانہ تو خاموش رہی۔ البتہ بوڑھی خادمہ نے کہا۔

"ہم کو تو آئے ہوئے دیر ہوگئی۔ بلکہ آپ نے بی بی جی سے کچھ کہا بھی تھا۔"

"کاہے کے بارے میں؟"

"ان کا چھوٹا بھائی بہت دنوں سے لاپتہ ہے۔ اس کے لئے آپ نے کہا تھا۔"

شاہ جی آہستہ سے مسکرائے "اچھا اچھا، میں تو نہ جانے کہاں پہنچ گیا تھا" لمحہ بھر رک کر انھوں نے کہا "حاجیوں کا ایک جہاز طوفان میں گھر گیا تھا۔ مجھے حکم ملا کہ فوراً جا کر حاجیوں کو بچاؤ۔ اللہ غنی کیا عالم تھا۔ جہاز کے اندر کہرام برپا تھا۔ ہر شخص موت کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ موجیں دھاڑتی ہوئی اٹھ رہی تھیں۔ جہاز درخت کے پتے کی طرح ان میں ہچکولے کھا رہا تھا" وہ اس طرح آہستہ آہستہ بول رہے تھے کہ جیسے خواب میں بڑبڑا رہے ہوں۔

خادمہ کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سلطانہ کا سر عقیدت سے اور جھک گیا۔

شاہ صاحب نے خاموشی کے ساتھ زعفران سے دو تعویذ لکھے اور سلطانہ کو دیتے ہوئے بولے "یہ لو، ایک، گھر کے شمالی کونے میں زمین کھود کر دفن کر دینا۔ دوسرا کسی اونچے درخت پر دھاگے سے لٹکا دینا۔ جیسے جیسے ہوا سے تعویذ ہلے گا، ویسے ہی لڑکے کے دل میں ہول اٹھے گا اور گھر کی یاد ستائے گی۔ انشاء اللہ شام تک واپس آجائے گا۔"

سلطانہ نے تعویذ لے کر پرس سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر نذر کرنا چاہا تو شاہ صاحب ہنس پڑے۔ "تمھارا بھائی آجائے تو ایک سیاہ بکرا منگا کے صدقہ کر دینا۔ اس کا گوشت مساکین اور محتاجوں میں تقسیم کرا دینا۔"

سلطانہ نے نوٹ پرس میں واپس رکھ لیا۔ اس کے بعد اس نے شاہ صاحب سے جانے کی اجازت لی اور تعویذ لے کر خوشی خوشی گھر آگئی۔ شاہ صاحب کی ہدایت کے مطابق، اس نے ایک تعویذ زمین میں دفن کرا دیا اور دوسرا باغیچہ میں لگے ہوئے پیپل کے پیڑ کی ایک اونچی شاخ پر لٹکوا دیا۔ اسے یقین تھا کہ انو ضرور آجائے گا۔ شاہ صاحب کی شخصیت کا طلسم اس پر پوری طرح چھا گیا تھا۔

اس روز اس نے، خانساماں کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے سامنے کھیر تیار کرائی اس لیے کہ انو کھیر بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ شام تک وہ بڑی خوش خوش رہی۔ جب دن ڈھلنے لگا اور دھوپ کا رنگ گہرا بسنتی ہو گیا تو وہ بے چین ہو گئی۔ بار بار دریچے پر جا کر دیکھتی۔

سورج غروب ہو گیا۔ دن کا الاؤ سرد پڑ گیا۔ اور اندھیرا پھیلنے لگا۔ شام ہو گئی۔ مگر انو نہ آیا۔

رات ہوگئی۔ اندھیرا گہرا ہوگیا۔ راستے سنسان پڑ گئے۔ مگر اَنّو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ ساری رات جاگتی رہی اور اَنّو کا انتظار کرتی رہی۔

پھر بہت سی شامیں آئیں اور گذر گئیں اور شاہ صاحب کا تعویذ پیپل کی اونچی شاخ پر لہراتا رہا۔ خادمہ نے دوبارہ شاہ صاحب کے پاس جانے کے لئے کہا، مگر سلطانہ پھر اُن کے پاس نہ گئی۔ اُس کی عقیدت کا طلسم درہم برہم ہوچکا تھا۔

نیاز کو سلطانہ کے دکھ کا پورا پورا احساس تھا اور وہ ہر طرح اُس کی نازبرداری کی کوشش کرتا۔ ان دنوں وہ روزانہ کچھ نہ کچھ اس کے لئے خرید کر لاتا۔ اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا اور اَنّو کے چلے جانے پر اظہارِ افسوس کرتا۔ لیکن سلطانہ اُس سے بیزار سی رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ اَنّو نے صرف اسی کی وجہ سے گھر چھوڑا ہے، حالانکہ بوڑھے خانساماں نے صرف اس قدر بتایا تھا کہ اُس نے نیاز کو اَنّو پر ناراض ہوتے سنا تھا۔ اس کے بعد اَنّو کوٹھی کا پھاٹک کھول کر چپ چاپ باہر چلا گیا۔

جب وہ اس بات پر غور کرتی تو اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی اور نیاز کے خلاف اُس کے دل میں شدید نفرت کا طوفان اٹھتا۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ اس کوٹھی سے کہیں چلی جائے۔ وہ ہر طرف نظریں دوڑاتی مگر اس کو کوئی بھی اپنا غم گسار نظر نہ آتا۔ ایسے عالم میں کبھی کبھار اُسے سلمان کا بھی خیال آیا مگر اُس کی یاد کے ساتھ ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ اُس کا جی چاہتا کہ اگر سلمان مل جائے تو وہ اس کا منہ نوچ لے، اُس کے چہرے پر تھوک دے اور ہزاروں کوسنے دے۔ پھر وہ سوچتی۔ کاش ایک بار سلمان اُس کو مل جائے اور وہ اُس کو یہاں لاکر دکھائے کہ اب سلطانہ وہ لڑکی نہیں ہے، جس کو غریب اور لاوارث جان کر اُس نے ٹھکرا دیا تھا۔ اب وہ شاندار کوٹھی میں رہتی ہے، اُس کے پاس موٹر ہے۔ بیش قیمتی فرنیچر ہے، نوکر ہیں، خدمت گار ہیں، جن پر اُس کا حکم چلتا ہے۔ اُس کے پاس ریشمی کپڑوں سے بھرے ہوئے ٹرنک ہیں۔ جڑاؤ زیورات ہیں۔ جوتوں کی درجنوں جوڑیاں ہیں۔ وہ جس ٹھاٹھ باٹ سے رہتی ہے۔ اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

انہی دنوں ایک بار اصرار کر کے نیاز اس کو خان بہادر فرزند علی کے ہاں لے گیا۔ خان بہادر بڑی

شاندار کوٹھی میں رہتا تھا۔ اس کا رہن سہن بڑا شاہانہ تھا۔ ہر کمرے میں اعلیٰ درجے کا فرنیچر تھا۔ کام کاج کے لیے نوکروں کی پلٹن کی پلٹن تھی۔ مگر اس کی بیوی بڑی چھچھوری عورت تھی۔ اترا اترا کر بات کرتی تھی۔ اس کے ہر انداز سے نودولتیا پن ٹپکتا تھا۔ البتہ دونوں لڑکیاں بڑی شائستہ تھیں اور بڑا لڑکا بہت ہنس مکھ تھا۔ شام کی چائے اُس نے ان تینوں کے ساتھ پی۔ لڑکے کا نام شاہد علی تھا نکلتا ہوا لمبا قد، مضبوط ہاتھ پاؤں، تیکھے نقوش، بڑی بڑی روشن آنکھیں، وہ خاصا خوبصورت نوجوان تھا۔ ایم۔ اے کر چکا تھا اور اسکالرشپ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جا رہا تھا۔ چائے پر بھی امریکہ کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی۔ اچانک اُس نے سلطانہ کو مخاطب کر کے کہا۔

"مسز نیاز، آپ کو دیکھ کر تو بڑی حیرت ہوئی"

سلطانہ کو اس کے مسز نیاز کہنے پر سخت تعجب ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس غلط فہمی کو دور کر دے۔ پھر یہ سوچ کر چپ ہو گئی کہ نیاز نے نہ جانے اس کے متعلق ان لوگوں سے کیا کہا ہے۔ سلطانہ کو بڑا غصہ آیا۔ کمبخت نے کم سے کم اشارہ ہی کر دیا ہوتا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اس نے شاہد سے کہا۔

"آپ کو حیرت کیوں ہوئی؟"

وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھتا تھا کہ آپ نہ جانے کیسی ہوں گی۔" اُس کے انداز میں بچوں کی سی سادگی تھی۔ سلطانہ کو اُس کی یہ ادا بڑی پیاری معلوم ہوئی۔ مسکرا کر کہنے لگی۔

"کیا مطلب؟"

وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ "میں سمجھتا تھا کہ آپ کچھ عجیب سی ہوں گی"

اسی وقت شاہد کی بہن نے کہا۔ "آپ کو دیکھ کر تعجب تو مجھے بھی ہوا"

سلطانہ کی سمجھ میں ان کی باتوں کا مطلب نہیں آیا۔ پوچھنے لگی۔ "کیوں؟"

وہ بولی۔ "ہم تو سمجھتے تھے کہ نیاز صاحب کی مسز تو کچھ دہقانی سی ہوں گی، موٹی موٹی، کالی سی۔ مگر آپ اتنی زیادہ خوبصورت ہوں گی، یہ تو ہم لوگوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا" پھر وہ اپنے بھائی کو مخاطب کر کے کہنے لگی "کیوں بھائی جان (یہی) بات ہے نا؟"

وہ مسکرا کر بولا "سچ مچ آپ بڑی گرینڈ معلوم ہوتی ہیں"۔

سلطانہ کا ایک بار پھر جی چاہا کہ وہ اُن کی غلط فہمی کو رفع کر دے۔ مگر اس میں نیاز کی ناراضگی کا ڈر تھا اور وہ اُس کو ناراض نہ کرنا چاہتی تھی۔

اپنی کوٹھی پر آ کر وہ بہت دیر تک خان بہادر کے گھر والوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ اُس کی نک چڑھی بیوی۔ ملنسار بیٹیاں اور ہنس مکھ شاہد، جس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔ نہ جانے کیوں اُس کی باتیں، سلطانہ کو بار بار یاد آتی رہیں۔

چند روز بعد کا ذکر ہے۔ رات کے کوئی آٹھ بجے اچانک شاہد آ گیا۔ نیاز اس وقت کوٹھی پر موجود نہیں تھا۔ عام طور پر وہ اس وقت غیر حاضر رہتا تھا۔ سلطانہ چاہتی تو نیاز کے دوسرے ملنے جلنے والوں کی طرح اس کو بھی ٹال دیتی۔ مگر وہ شاہد سے ملنے خود ڈرائنگ روم میں گئی۔ وہ کسی کام سے نیاز کے پاس آیا تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے سلطانہ کو پھر مسز نیاز کہہ کر مخاطب کیا۔

سلطانہ نے ایک بارگی سوچا کہ وہ اس غلط فہمی کو اب برداشت نہیں کر سکتی۔ کہنے لگی۔ "آپ مجھے مسز نیاز نہ کہا کریں"۔

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا "کیوں؟"

سلطانہ نے دبی زبان سے کہا "شاید آپ کو پتہ نہیں، نیاز صاحب رشتے میں میرے سوتیلے والد لگتے ہیں"۔

شاہد تعجب سے منہ پھاڑ کر بولا "ارے" لمحہ بھر تک وہ اس کو ہکا بکا ہو کر تکتا رہا "تو پھر اُس روز آپ نے یہ بات کیوں نہ بتائی"

"آپ لوگوں نے بتانے کا موقعہ ہی کہاں دیا؟"

شاہد معذرت کرنے لگا "ہم لوگ تو یہی سمجھے ہوئے تھے۔ یہ تو بہت بُری بات ہو گئی۔ آپ نے بُرا تو نہیں مانا"۔ پھر اُس نے گھبرا کر خود ہی کہا "آپ نے ضرور بُرا مانا ہو گا"

اس کو پریشان دیکھ کر سلطانہ کہنے لگی "وہ تو غلط فہمی تھی اس کا کیا بُرا ماننا"؟

شاہد نے اس کے بعد کچھ نہ کہا اور چپ چاپ بیٹھا سگرٹ پیتا رہا۔ پنکھے کی ہوا سے اس کے بال بکھر کر پیشانی پر آ گئے تھے اور چہرہ سوچتا ہوا معلوم ہو رہا تھا! اس عالم میں وہ بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ سلطانہ نے کئی بار اُس کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور ہر بار وہ اُس کو بڑا پیارا معلوم ہوا۔ معصوم سا چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں اور بھرے بھرے گلابی ہونٹ۔

کمرے کے اندر خاموشی چھا گئی۔ باہر لان میں درختوں کے پتے آہستہ آہستہ کھڑکھڑا رہے تھے رات کا اندھیرا بڑھ گیا تھا۔

سلطانہ نے اس کو خاموش دیکھ کر پوچھا "آپ کیا سوچنے بیٹھ گئے؟"

وہ چونک سا پڑا "کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی ذرا سوچ رہا تھا"

"کیا؟" سلطانہ نے بڑے پیار سے کہا۔ شاہد نے اس کو نظر بھر کر دیکھا اور بے چینی سے سر کے بال کریدنے لگا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا "میں آپ ہی کے متعلق سوچ رہا تھا"

"میرے متعلق؟"

شاہد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بہت بے چین معلوم ہو رہا تھا۔ وہ گھبرایا ہوا سا کمرے کے دروازے تک گیا۔ پھر دہلیز پر ٹھٹک کر رک گیا۔ اُس نے پلٹ کر سلطانہ کی جانب دیکھا۔ لمحہ بھر کے لئے دونوں کی نظریں ملیں۔ شاہد مبہوت سا کھڑا رہا۔ پھر وہ کسی سحر زدہ انسان کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا سلطانہ کے قریب آیا۔ اُس کی سانس تیز تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہانپ رہا ہے۔ سلطانہ ایک بارگی کھڑی ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب تھے کہ سلطانہ نے اُس کی گرم گرم سانسوں کی حرارت اپنے رخساروں پر محسوس کی۔ اسی وقت شاہد نے اُس کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اور اُس کے لبوں کو، رخساروں کو، گردن کو، شانوں کو، دیوانوں کی طرح چومنے لگا۔ سلطانہ کئی بار اُس کے بازوؤں کی گرفت میں کلبلائی، پھر اُس نے نڈھال ہو کر اپنا سر اُس کے کندھے پر ٹکا دیا۔ پھر شاہد کی آواز اُبھری۔

"میں امریکہ نہیں جاؤں گا"

"کیوں ؟"

"میں تمھیں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔"

شاہد بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ کہنے لگا "میں پہلے تم سے شادی کروں گا۔ خدا کی قسم میں آج ہی امی جان سے کہوں گا۔ میں اب تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم میری ہو، تم میری ہو" اُس نے پاگلوں کی طرح سلطانہ کی گردن کو چومنا شروع کر دیا۔

جب شاہد چلا گیا تو سلطانہ نے کمرے کے اندر جا کر آئینہ میں اپنے عکس کو دیکھا اور دیر تک دیکھتی رہی۔ کیا وہ واقعی بہت خوبصورت ہے۔ کیا وہ اس قابل ہے کہ شاہد اس سے بیاہ کرے گا اس کی خوب صورت آنکھیں بار بار آئینہ میں جھپکتیں اور ہونٹ لرز کر رہ جاتے۔ وہ رات اور ایسی کئی راتیں اُس نے انگڑائیاں لے لے کر اور مسکرا مسکرا کر گذاریں۔

پھر ایک روز نیاز نے باتوں باتوں میں بتایا کہ شاہد نیویارک چلا گیا۔ سلطانہ کے دل پہ زبردست گھونسہ لگا۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔ زندگی ایک بار پھر اس کو جُل دے گئی تھی۔

اس صدمے نے اس دُکھ نے اُس کو نڈھال کر کے رکھ دیا۔ وہ بہت سے سُہانے خواب جو اُس نے چند دنوں میں دیکھ ڈالے تھے، تارِ عنکبوت کی طرح بکھر کر رہ گئے۔ اُس کے چاروں طرف اندھیرے کا جال پھیل گیا۔ پھر وہی لق و دق سی زندگی تھی۔ تنہا اور بے سہارا۔

گرمیاں ختم ہو رہی تھیں اور ساون کا مہینہ لگ چکا تھا۔ آسمان پر اودی اودی بدلیاں گھر گھر آتیں۔ مینہ برستا اور ہر طرف جل تھل ہو جاتا۔ برسات کی ایک ایسی ہی رات تھی پچھم سے گھٹائیں اُمنڈیں۔ ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

بارش کے موٹے موٹے قطرے کھڑکی کے شیشوں پر ٹپ ٹپ بج رہے تھے اور ہوا کی سر سراہٹیں سیٹیوں کی طرح رات کے سناٹے میں چیخ رہی تھیں۔ گیارہ بجے کا عمل تھا۔ سلطانہ اس وقت تک جاگ رہی تھی سا چانک بجلی فیل ہو گئی۔ جھلکتی ہوئی روشنیاں ایک دم اندھیرے میں ڈوب گئیں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہو گئی۔ سلطانہ خوف زدہ ہو گئی۔ اندھیرے کمرے کے اندر اس کو پُراسرار سائے رینگتے

ہوئے معلوم ہوئے ہوائیں سسکیوں کی طرح اُبھرتیں اور بارش کے قطرے درختوں کے پتّوں پر گرتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی دروازے کو کھٹکھٹا رہا ہے۔

وہ دیر تک اسی طرح سہمی ہوئی پڑی رہی۔ موسلادھار بارش برابر ہوتی رہی۔ پھر اُس نے برساتی میں کار رکنے کی آواز سُنی۔ نیاز واپس آگیا تھا۔ اُس کے قدموں کی آواز پختہ فرش پر سنائی دی۔ پھر گھنٹی زور سے بجی۔ دروازہ کُھلنے کی آواز اُبھری۔ نیاز اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ کئی بار اُس کے کھانسنے کی آواز اُبھری اور پھر کوٹھی پر گہرا سناٹا چھا گیا۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ بارش برابر ہو رہی تھی اور ہوا درختوں میں چیخ رہی تھی۔ سلطانہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ بجلی کی روشنی ابھی واپس نہیں آئی تھی۔ اندھیرے سے اس کو وحشت ہو رہی تھی۔ ایکا ایکی تیز ہوا کی سرسراہٹوں میں اُس نے سُنا کہ باہر برانڈے میں کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ قدموں کی چاپ رُک رُک کر اُبھر رہی تھی۔ سلطانہ لرز کر رہ گئی۔

قدموں کی آہٹ رُک رُک کر اُبھرتی رہی۔ بارش کا زور ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا۔ اور ہوا کے شور سے دل دہلتا تھا۔ اچانک کمرے کے دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ کھٹ کھٹ کھٹ ڈر کے مارے سلطانہ مسہری کی پٹی سے چمٹ گئی۔ پھر ایک بھاری سی آواز اُبھری۔

"سلطانہ۔ سلطانہ!"

نیاز اُس کو آہستہ آہستہ پکار رہا تھا۔ سلطانہ نے پوچھا۔ کون؟"

نیاز نے کہا "ذرا دروازہ کھولو"

کئی لمحے تک سلطانہ خاموش پڑی سوچتی رہی کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ دروازے پر آہستہ آہستہ کھٹ کھٹاہٹ کی آواز اُبھرتی رہی اور نیاز رُک رُک کر اس کو آواز دیتا رہا۔ آخر سلطانہ نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ نیاز اندر آگیا۔ ذرا دیر وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اُس نے سلطانہ سے کہا۔

"دیکھو ذرا ہوشیار سونا"

اُس نے جلدی سے پوچھا "کیوں؟"

وہ کہنے لگا "مجھکو ابھی ابھی کچھ ایسا محسوس ہوا کہ کوئی ورانڈے میں چل رہا ہے"۔ آواز سلطانہ نے بھی سُنی تھی۔ وہ خوف سے لرز کر رہ گئی۔ نیاز کہتا رہا۔ "پہلے تو میں پڑا پڑا اُس آہٹ کو سنتا رہا۔ پھر نکل کے دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ اندھیرا اس قدر ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ تم نے موم بتیاں بھی منگا کر نہیں رکھیں"۔ اُس کی آواز اندھیرے میں آہستہ آہستہ اُبھرتی رہی۔

خوف کے مارے سلطانہ کی آواز تک نہ نکلی۔ وہ سہمی ہوئی کھڑی رہی۔

نیاز کہنے لگا "تم کو ڈر تو نہیں لگے گا؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر سلطانہ کا بازو آہستہ سے پکڑ کر کہنے لگا "چلو آج تم میرے کمرے میں چل کر سو جاؤ"

سلطانہ نے آہستہ سے کہا "نہیں" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

نیاز نے اس کو پیار سے ڈانٹا "پاگل مت بنو آؤ" اور اُس کو اپنے دونوں بازوؤں پہ اٹھا لیا۔ سلطانہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ سہمی ہوئی سی اس کے سینے سے لگ گئی۔ نیاز اس کو بازوؤں پر اٹھائے ہوئے کمرے کے باہر آ گیا۔ بارش کے قطرے کھڑکی کے شیشوں پر درختوں پر، چھتوں پر بج رہے تھے۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی درختوں سے گذرتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی زور زور سے تھپتھپے لگا رہا ہے۔ اندھیرا بہت گہرا تھا اور اس گھنگھور اندھیرے میں نیاز کے بوجھل قدموں کی آواز ورانڈے کے پختہ فرش پر آہستہ آہستہ اُبھرتی رہی۔ کھٹ، کھٹ، کھٹ۔ آواز دور ہوتی چلی گئی۔ پھر آواز بارش کے شور میں ڈوب گئی۔

●

فصل نہم

سلمان کئی مہینے تک اسپتال میں پڑا رہا۔ اس کے جسم پر تیرہ زخم آئے تھے۔ تین روز تک وہ اسپتال کے سرجیکل وارڈ میں مردوں کی طرح بے ہوش پڑا رہا۔ جب اُسے ہوش آیا تو آنکھوں کی بینائی دھُندلی تھی اور نقاہت اس قدر تھی کہ منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ پہلو میں تیسری پسلی کے نیچے بلّم کا ایسا مہلک زخم تھا، جس نے کئی روز تک ڈاکٹروں کو پریشان رکھا۔

شروع شروع میں علی احمد اور دوسرے اسکائی لارک اسپتال میں اس کی عیادت کو آیا کرتے تھے۔ پھر اچانک انھوں نے اسپتال آنا چھوڑ دیا۔ یہ بات اس کو بڑی حیرت انگیز معلوم ہوئی یہ سوچ سوچ کر اس کو اسکائی لارکوں پر غصہ بھی آیا اور اپنی بے کسی پر دُکھ بھی ہوا۔

اسپتال سے باہر آکر جب وہ اسکائی لارکوں کے ہیڈکوارٹر پہنچا تو وہ بہت جھنجھلایا ہوا تھا۔ راستہ بھر وہ یہ سوچتا رہا کہ فلک پیما کے آئندہ اجلاس میں وہ اس بات پر احتجاج کرے گا کہ اسکائی لارکوں نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا۔؟

لیکن جب گمٹی میں جاکر اُس نے ہیڈکوارٹر کو دیکھا تو وہ سب کچھ بھول گیا۔ ہیڈکوارٹر کی دیواریں ابھی تک جھلسی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ جلے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کی جگہ نئی کھڑکیاں اور دروازے لگا دیئے گئے تھے۔ مگر آگ کے نشانات جگہ جگہ دھوئیں کی سیاہی کے روپ میں بکھرے

ہوئے تھے۔ لائبریری کی ایک دیوار چٹخ گئی تھی اور اس میں کئی انچ چوڑا شگاف پڑ گیا تھا سلمان جس وقت وہاں پہنچا تو دن ڈھل چکا تھا۔ شام کے اُبھرتے ہوئے ہلکے ہلکے دھندلکوں میں ہیڈ کوارٹر کی عمارت کسی کھنڈر کی طرح ویران نظر آرہی تھی۔

سلمان نے اندر داخل ہو کر دیکھا، کمروں کے اندر سناٹا تھا۔ نہ وہ پہلی سی چہل پہل تھی نہ اسکائی لارکوں کی مصروف زندگی کی گہما گہمی۔ ہر طرف آسیب زدہ سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ گیلری سے گذرتا ہوا دفتر کی طرف چل دیا۔ دفتر کا دروازہ کھلا تھا۔ کمرے کے اندر دن کی ڈوبتی ہوئی روشنی مدھم پڑ چکی تھی اور اس نیم تاریکی میں ایک بیمار سا شخص میز پر جھکا ہوا کسی دستاویز کو پڑھنے میں منہمک تھا۔ اُس نے قریب جا کر دیکھا تو وہ چونک پڑا۔ یہ ڈاکٹر زیدی تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں، بال کنپٹیوں پر سے سفید پڑ گئے تھے۔ وہ خاصا بوڑھا نظر آرہا تھا۔

ڈاکٹر زیدی کا یہ حال دیکھ کر سلمان کے دل کو دھکا سا لگا۔ وہ ٹھٹک کر دروازے پر رک گیا اور اس کو غور سے دیکھنے لگا کہ آیا وہ ڈاکٹر زیدی ہی ہے یا کوئی اور۔ واقعی وہ اب بہت تبدیل ہو گیا تھا۔ اچانک ڈاکٹر نے گردن اٹھا کر سلمان کی طرف دیکھا اور حیرت سے چیختا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"ہیلو اسکائی لارک سلمان"

سلمان گرمجوشی سے اُس کے سینے سے لگ کر کہنے لگا "ڈاکٹر تم نے اپنا یہ کیا حلیہ بنا لیا"

ڈاکٹر صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی پژمردہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کو سلمان کے اس سوال سے ذہنی اذیت پہنچی ہے۔ سلمان نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ دونوں کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے۔ کمرے کے اندر اب خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اٹھ کر لیمپ روشن کیا۔

سلمان نے پوچھا "اور اسکائی لارک کہاں ہیں؟"

"اپنے اپنے فرنٹ پر کام کرنے گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے"

ڈاکٹر زیدی کے اس جواب سے سلمان کو بڑی ڈھارس پہنچی۔

اس کے بعد باتوں کا طویل سلسلہ چھڑ گیا۔ ڈاکٹر زیدی نے بتایا کہ صفدر شبیر حملہ کی رات ہی کو

ہلاک ہو گیا تھا۔ اُس کے جسم پر زخموں کے ۲۴ نشانات تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے اسکائی لارک بھی زخمی ہوئے تھے۔ صرف علی احمد دو اسکائی لارکوں کے ساتھ پچھلی دیوار پھاند کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر بلندی پر سے کودنے کے باعث اُس کی ٹانگ میں ایسی چوٹ آئی کہ وہ ابھی تک لنگڑا کر چلتا ہے۔ پولس موقعۂ واردات پر اس وقت پہنچی جب حملہ آور فرار ہو چکے تھے۔ حالانکہ علی احمد نے ہیڈ کوارٹر سے نکلتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ پولس کو حملے کی اطلاع کر دی تھی۔

پولیس کی تحقیقات شروع ہونے کے چند ہی روز بعد قریب قریب سارے اسکائی لارک گرفتار کر لئے گئے۔ ہیڈ کوارٹر کی تلاشی لی گئی اور تمام کاغذات کو پولس نے اپنے قبضہ میں لے لیا اور عمارت کو سر بمہر کر دیا گیا۔ اسکائی لارکوں پر صفدر بشیر کے قتل کا الزام لگایا گیا۔ پولیس کی رپورٹ کے مطابق الزام کی نوعیت یہ تھی کہ صفدر بشیر فلک پیما کی رکنیت سے استعفےٰ دے چکا تھا اور لندن جانے والا تھا۔ حملہ کی شب وہ فلک پیما کے ہیڈ کوارٹر آیا تھا اور پارٹی کے فنڈ میں اُس کی جو رقم موجود تھی اس کی واپسی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ علی احمد اور بعض دوسرے اسکائی لارکوں نے رقم واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بات بڑھ گئی۔ اسکائی لارکوں میں صفدر بشیر کے بھی چند حمایتی موجود تھے۔ پہلے تکرار ہوئی، پھر اُس نے باقاعدہ فساد کی صورت اختیار کر لی۔ بعض اسکائی لارکوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ صفدر بشیر اپنے حمائیتوں کے ساتھ حملہ کرنے کی نیت سے آیا تھا۔ ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں آگ لگا دی۔ پولس کی اس رپورٹ کی تائید فہیم اللہ اور علیم احمد نے کی، جو سرکاری گواہ بن گئے تھے۔ ان کے علاوہ پولیس نے بستی سے بھی کچھ گواہ مہیا کر لئے۔ بعض لوگوں نے اسکائی لارکوں کی حمایت میں شہادت دینا چاہی تو پولیس نے ان کو اس قدر تنگ کیا کہ انھوں نے خوف زدہ ہو کر اس خیال ہی کو چھوڑ دیا۔

سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ پولنگ سے قبل کسی اسکائی لارک کی ضمانت تک نہ ہو سکی ووٹنگ کے وقت پولنگ اسٹیشنوں پر اسکائی لارکوں کا کوئی کارکن موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر زیدی

اس وقت جیل میں تھا اور اس کے حق میں ایک بھی ووٹ بیلٹ باکسوں میں نہیں ڈالا گیا۔ لہذا خان بہادر فرزند علی بلا مقابلہ میونسپل بورڈ کا اس حلقے سے ممبر منتخب ہوگیا۔ اس کا بڑا شاندار جلوس نکالا گیا۔ بستی میں جگہ جگہ مٹھائی تقسیم ہوئی۔ اس کے کارکنوں نے اپنے گھروں پر چراغاں کیا۔

خان بہادر فرزند علی کے الکشن میں کامیاب ہونے کے چند ہی روز بعد اسکائی لارکوں کی ضمانتیں منظور ہونا شروع ہوگئیں۔ مقدمہ ابھی تک عدالت میں زیر سماعت تھا۔ بہت سے اسکائی لارک جیل سے نکلنے کے بعد اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ انھوں نے فلک پیما سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اب صرف ۸ اسکائی لارک رہ گئے تھے۔ افراتفری میں سارے محاذوں کا کام بند ہوگیا۔ انڈسٹریل ہوم پر بعض موقعہ پرستوں نے زبردستی قبضہ کرلیا تھا۔ تحریک تعلیم بالغاں کے اسکول رہائشی مکانوں میں تبدیل ہوگئے۔ دارالمطالعوں میں سے ایک میں کسی تانگے والے نے اپنا گھوڑا باندھنا شروع کردیا اور اس کو باقاعدہ اصطبل بنا دیا۔ بقیہ دارالمطالعے قماربازوں کے اڈے بن گئے۔ فلک پیما کا جو کچھ فنڈ تھا اس کو بھی ضبط کرلیا گیا۔

رہائی کے بعد اسکائی لارکوں کے سامنے ہزاروں مشکلات تھیں۔ جن کے خلاف وہ ابھی تک پوری تن دہی سے جد وجہد کر رہے تھے۔ انھیں اپنی تحریک کے لئے از سرِنو فضا پیدا کرنا پڑ رہی تھی۔

ڈاکٹر زیدی کی زبانی یہ تمام حالات سُن کر سلمان غم و غصہ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بولا۔

"یہ سب مصیبتیں خان بہادر کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ بڑا کمینہ شخص ہے۔"

ڈاکٹر کہنے لگا "اقتدار کی ہوس انسان کو اندھا کردیتی ہے۔"

سلمان نے پوچھا "نعیم اللہ اور علیم احمد سے کبھی کبھی ملے؟"

"نہیں سنا ہے، خان بہادر نے دونوں کو میونسپل بورڈ میں ملازمت دلوادی ہے۔ آمدنی اچھی ہے۔ بڑے ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔"

اسی دوران میں علی احمد بھی آگیا۔ اس کے ہمراہ دو اسکائی لارک اور تھے۔ علی احمد نے سلمان کو

گلے سے لگالیا اور ہنس کر بولا" میں تو سمجھا تھا کہ جس طرح اور اسکائی لارک ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ تم نے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی"۔

سلمان نے جواب دیا" میں آج ہی تو اسپتال سے نکلا ہوں۔ آپ لوگوں نے یہ بھی تو نہیں پوچھا کہ میں کس حال میں رہا۔ زندہ بچا کہ مر گیا"۔

علی احمد معذرت کے سے انداز میں بولا" بھئی معاف کرنا، کچھ ایسا افراتفری کا زمانہ گذرا کہ کسی کو ایک دوسرے کا ہوش نہ رہا۔ تمھاری شکایت بالکل درست ہے۔ مجھے اس کا بے حد افسوس ہے"۔

اس کے بعد دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

آٹھ بجے تک سارے اسکائی لارک دفتر میں اکٹھا ہو گئے۔ ہر ایک نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ سلمان کا خیر مقدم کیا۔ وہ سب اس کی آمد سے بہت خوش تھے۔ ان میں ایک نئی توانائی اور مستعدی نظر آرہی تھی۔

اس روز سب نے مل کر ایک ساتھ کھانا کھایا۔ ۱۰ بجے کے قریب فلک پیما کا جلسہ ہوا، جس میں آئندہ کام کا پروگرام تیار کیا گیا۔ ان کی راہ میں جو دشواریاں تھیں۔ ان کے خلاف جدو جہد کرنے پر غور کیا گیا۔ جلسہ آدھی رات تک جاری رہا اور اس عرصہ میں ہر مسئلہ پر بحث ہوئی۔ ہر اسکائی لارک نے اس بحث میں حصہ لیا۔ کچھ نئی تجاویز پیش کی گئیں، جن میں سب سے زیادہ اس تجویز پر زور دیا گیا کہ فلک پیما کے کچھ نئے کارکن بنائے جائیں۔ مگر علی احمد نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس لئے کہ فلک پیما کے پاس اب قلیل فنڈ رہ گیا تھا۔ اور وہ بھی علی احمد نے اپنا مکان ۱۲ ہزار میں فروخت کرکے مہیا کیا تھا، جس کا بیشتر حصہ، مقدمہ بازی اور ضروری اشیاء کی خریداری میں خرچ ہو چکا تھا۔ علی احمد نے البتہ اس بات پر اسکائی لارکوں کی توجہ دلائی کہ فنڈ مہیا کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کیا جائے۔ بعض اسکائی لارکوں کا خیال تھا کہ فلک پیما کے ہمدردوں سے چندہ لیا جائے۔ سلمان نے مشورہ دیا کہ تحریک تعلیم بالغاں کے اسکولوں میں پڑھنے والے طلباء سے فیس لی جائے جو بہت

معمولی ہو۔ ڈاکٹر زیدی نے بھی اس کی رائے سے اتفاق کیا اور اس سلسلہ میں یہ رائے دی کہ ڈسپنسری سے جو دوائیں دی جاتی ہیں مریضوں سے اُن کی کچھ نہ کچھ قیمت لی جایا کرے۔ لیکن ان میں سے کسی مشورے کو قبول نہیں کیا گیا اور فنڈ کے مسئلہ کو آئندہ میٹنگ کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

ڈاکٹر زیدی نے سلمان کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ دن آرام کرے ابھی اس کی صحت اس قابل نہیں ہے کہ وہ کوئی کام کر سکے۔ مگر اُس نے ڈاکٹر کی ایک نہ سُنی۔ دوسرے ہی دن وہ اپنے اسکول پر پہنچا۔ پُرانے شاگردوں سے ملا۔ جس جگہ اسکول تھا، اس کو جاکر دیکھا، وہاں ایک قصائی نے گوشت کی دوکان کھول دی تھی اس کا گھر بھی قریب ہی تھا۔ سلمان اس سے جاکر ملا اور یہ مطالبہ کیا کہ وہ دوکان کہیں اور اُٹھا کرلے جائے۔ مگر وہ بڑا سرکش آدمی تھا۔ یہ بات سنتے ہی گالیاں بکنے لگا۔ سلمان کے ساتھ محلے کے جو لوگ تھے اُن کو بھی غصہ آگیا۔ اچھی خاصی فساد کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔

سلمان نے بات کو آگے نہ بڑھنے نہ دیا اور یہ طے کیا گیا کہ اسکول کسی اور جگہ قائم کر لیا جائے اور کہیں جگہ نہ ملے تو کسی کھُلی جگہ پر ٹاٹ پٹیاں بچھا کر اور گیس بتی جلا کر کلاسیں شروع کر دی جائیں۔

دوسرے دن سلمان وہاں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ ایک مکان کی دیوار کے سہارے پُرانے ٹین کے ٹکڑوں کا ایک سائبان ڈال دیا گیا تھا گیس بتی جل رہی تھی اور فرش پر ٹاٹ پٹیاں بچھی تھیں۔ یہ دیکھکر اس کو بڑی خوشی ہوئی اور وہ دن یاد آگیا جب خلیک میاں نے تحریک تعلیم بالغان کا پہلا اسکول جاری کیا تھا۔

چند ہی روز میں اسکول میں آنے والے طلباء کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ مجبوراً اس کو داخلہ بند کرنا پڑا۔ جب اسکول اچھی طرح چلنے لگا تو اُس نے ایک اسکائی لارک کی ڈیوٹی وہاں لگائی اور دوسرے اسکول کو منظم کرنے کا کام شروع کر دیا۔

مہینہ بھر میں سلمان نے دوڑ دھوپ کرکے تحریک بالغان کے تمام اسکول قائم کر دیئے اور ان میں باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

علی احمد کو سلمان کے آجانے سے بڑی مدد ملی۔ اب ہر کام معمول پر آتا جا رہا تھا۔ انڈسٹریل ہوم کو

اسکاتی لارکوں نے اپنی نگرانی میں از سرِ نو لے لیا تھا۔ دارالمطالعے پھر سے جاری کئے گئے۔ ڈسپنسری کو بھی درست کیا گیا۔ مگر سب سے بڑی دقت فنڈ کی تھی۔ جس کے بغیر کام چلانا بہت مشکل تھا۔ اسکائی لارک ابھی تک یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ فنڈ کس طرح مہیا کیا جائے۔ فنڈ کی قلت کے باعث اسکائی لارکوں نے ایک وقت کا کھانا بند کر دیا تھا اور اپنی تمام ضروریات کم سے کم کر دی تھیں۔ سگریٹوں کے بجائے انھوں نے بیڑیاں پینا شروع کر دی تھیں جن کے کپڑے پھٹ گئے وہ دوسرے اسکائی لارکوں کے کپڑوں سے کسی نہ کسی طرح اپنا کام چلا رہے تھے۔

سلمان کی صحت اسپتال سے نکلنے کے بعد یوں ہی خراب تھی سخت مشقت اور مناسب غذا نہ ملنے کے باعث، اس کا جسم اور لاغر ہو گیا تھا۔ چہرے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں، آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں اور خشک بال تنکوں کی طرح کھڑے رہتے۔ اس کے چہرے پر ویرانی سی برسنے لگی تھی۔ مگر وہ اپنے آپ سے بے خبر کام کرنے کی دھن میں مگن تھا۔

ان ہی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک شام وہ بڑے بازار سے گذر رہا تھا۔ اچانک نیاز سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ نیاز کے ساتھ سلطانہ بھی تھی۔ وہ بڑی ماڈرن لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔ جدید طرز کا ریشمی لباس اور ہلکا ہلکا میک اپ۔ وہ کسی شہزادی کی طرح پُر وقار نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوکان کے اندر سے نکل رہے تھے۔ سلمان نے چاہا کہ وہ ان کی نظریں بچا کر نکل جائے مگر نیاز نے اس کو دیکھ لیا اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔

"ہیلو مسٹر سلمان"

مجبوراً اس کو رکنا پڑا۔ نیاز اس کے قریب آ کر بولا "ارے بھئی آپ کہاں ہیں۔ کہیں نظر ہی نہیں آتے؟"

سلمان نے جواب دیا "میں تو یہیں تھا"

"مگر آپ نے یہ اپنا کیا حلیہ بنا لیا ہے"؟

سلمان اس کی اس بات سے گھبرا سا گیا۔ واقعی اس کا عجیب حلیہ تھا۔ خشک بال، بڑھا ہوا

شیو، چہرے پر گرد۔ لباس گندہ، جس کی ایک آستین کندھے پر سے اس طرح پھٹ گئی تھی کہ اندر کی جلد نظر آتی تھی۔ اور نیاز ایسا لگتا تھا، جیسے کسی لانڈری سے ابھی ابھی دھل دھلا کر نکلا ہے۔ اس وقت وہ نائیلون کی ہوائی بش شرٹ اور کارڈورائی کی پتلون میں بڑا گرینڈ لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت نکھر گئی تھی، رخساروں پر ہلکی ہلکی سُرخی تھی اور آنکھیں شفاف تھیں۔ سلطان کے ہمراہ کسی طرح بھی وہ ناموزوں نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ سلمان نے اُس کے روبرو خود کو کوڑے کے ڈھیر سے نکلے ہوئے چوہے کی طرح حقیر محسوس کیا۔

نیاز کہنے لگا۔

"کہیں نوکری ووکری بھی ملی یا ابھی تک بے روزگاری کا چکر ہے"

وہ آہستہ سے بولا "نوکری کا ارادہ تو مدت ہوئی میں نے ترک کر دیا"

"تو پھر کیسے کام چل رہا ہے؟"

"کچھ سوشل کام کر رہا ہوں آج کل"

نیاز ہنسنے لگا "ارے بھئی اس سوشل کام وام کے چکر میں کہاں پڑے ہو۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھو کہ کیا ہو رہی ہے۔ میں پہلے تو تم کو پہچان بھی نہیں سکا"

سلمان اس کی باتوں سے پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا "بیمار پڑ گیا تھا"

نیاز بڑے مشفقانہ انداز میں بولا "بھئی یہ لیڈری ویڈری تم کو زیب نہیں دیتی۔ یہ تو بڑے آدمیوں کے کام ہیں۔ میرا کہا مانو تو اس جھنجھٹ پر لعنت بھیجو اور کل کسی وقت آکر مجھ سے مل لو، میں تمھارے لیے نوکری کا بندوبست کرا دوں گا۔ میرا دفتر پاور ہاؤس کے برابر والی سڑک پر ہے۔ وہاں پہنچ کر جس کسی سے پوچھو گے، وہ دفتر کا پتہ بتا دے گا۔ میں عام طور پر ۱۰ بجے دفتر پہنچ جاتا ہوں اور دو بجے تک دفتر رہتا ہوں"

سلمان کو اس کی باتوں پر سخت جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی۔ اُس نے سوچا یہ سالا کباڑیہ، جس نے نہ جانے کیا چار سو بیس کر کے ایک بڑی رقم پیدا کر لی ہے۔ اب اس طرح بات کرنے لگا ہے جیسے دولت

کے ساتھ اُس کی سمجھ بھی بڑی ہو گئی ہے۔ کچھ یہی سوچ کر اس نے کسی قدر بے رخی سے کہا "آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ، فی الحال مجھکو ملازمت کی ضرورت نہیں۔ اگر کبھی ایسا پروگرام ہوا تو آپ سے ضرور ملوں گا"
سلمان نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بیڑی کا بنڈل نکالا اور ایک بیڑی ہونٹوں سے لگا کر سلگانے ہی والا تھا کہ نیاز نے اپنا سنہری سگرٹ کیس نکال کر کھولا اور اس کو سلمان سامنے کر کے بولا۔

"لو یہ 555 پیو"

سلمان کہنے لگا "شکریہ، میں بیڑی ہی پیوں گا"

وہ بے تکلفی سے بولا "اماں اس خواہ مخواہ کے تکلف میں کیا رکھا ہے۔ اچھی چیزیں استعمال کیا کرو تو باتیں بھی اچھی ہی اچھی سوجھتی ہیں"۔

اسی وقت سلطانہ نے بیزاری سے کہا "چلئے دیر ہو رہی ہے"

نیاز نے پلٹ کر سلطانہ کی جانب دیکھا اور اس سے کہنے لگا "یہ مسٹر سلمان میرے پرانے ملنے والے ہیں۔ پڑھے لکھے آدمی ہیں، لیڈری کے چکر میں پڑ کر اپنی ریڑھ مار لی ہے" وہ سلمان کی جانب سے صفائی پیش کرنے لگا۔ مگر سلطانہ نے سلمان کا ذرا بھی نوٹس نہ لیا۔ چپ چاپ اپنے لمبے لمبے سرخ ناخنوں کو دیکھتی رہی۔

سلمان کو ایک ایک لمحہ دشوار ہو رہا تھا۔ جلدی سے بولا "اچھا تو میں چلوں گا۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے"

نیاز بولا "اچھا اچھا۔ جی چاہے تو کبھی دفتر کی طرف چلے آنا" یہ کہکر وہ آگے بڑھ گیا۔
سلطانہ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس کی گردن اٹھی ہوئی تھی اور چال میں تمکنت تھی دونوں جا کر قریب کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ گئے۔ کار نیاز ڈرائیو کر رہا تھا۔ سلطانہ کے اس کے برابر ہی بیٹھی تھی سلمان چپ چاپ کھڑا ان کو دیکھتا رہا۔ اُسے یقین تھا کہ سلطانہ ایک بار تو اس کی جانب ضرور دیکھے گی۔ مگر سلطانہ نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور بڑے لاڈ سے نیاز کے شانے پر جھک کر اس کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا اور دونوں مسکرا پڑے۔

کار اسٹارٹ ہوئی اور سڑک پہ دوڑنے لگی۔ سلمان دور تک اس کو خوابناک نظروں سے دیکھتا رہا اس نے آگے بڑھتے ہوئے سوچا "سلمان! سلطانہ اب بہت دور جا چکی ہے اور تم کیچڑ میں گر پڑے ہو اور اس کیچڑ میں گرنا تم نے خوشی سے منظور کیا ہے، اس لئے کہ تم زندگی سے غلاظت صاف کر دینا چاہتے ہو۔ تمھیں حسین چیزوں کے متعلق نہیں سوچنا چاہیئے۔ خواہ وہ سلطانہ ہو یا چودھویں رات کی چاندنی۔ تمھیں یہ غور کرنا چاہیئے کہ خوبصورتی کیا ہے۔ تم تو بدصورتی کو حسن میں ڈھالنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہو۔"

سلمان نے کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھا تو لیا مگر وہ یہ نہ بھول سکا کہ اس کی زندگی میں ایک لڑکی سلطانہ بھی آئی تھی۔ جس نے ایک رات اس کے پاس آکر محبت کی بھیک مانگی تھی اور جس نے آج اس کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ ایک نگاہِ غلط انداز ہی ڈال دیتی۔ کیا وہ اس سے انتقام لے رہی تھی یا واقعی سلطانہ نے اس کو حقیر سمجھا تھا۔ یہ اور ایسے ہی کتنے سوال اس کے ذہن میں اُبھرتے رہے، ڈوبتے رہے، ڈوبتے رہے، اُبھرتے رہے۔ اس اُلجھن میں وہ اُس روز اسکول میں سنتجدی کے ساتھ پڑھا بھی نہ سکا۔

وہ رات اُس نے بڑی بے چینی میں گذاری۔ پھر اس کی کئی راتیں بے چینی میں کٹیں۔ آخر ایک روز وہ اسی بے چینی کے عالم میں علی احمد کے پاس پہنچا اور اس سے کہا کہ اُس کی ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ کچھ روز کے لئے گھر جانا چاہتا ہے۔ علی احمد نے صرف اُس سے اتنا کہا کہ جس قدر جلد ہو سکے وہ واپس لوٹ آئے۔ اُس نے سلمان کو ۲۰ روپے راہ خرچ کے لئے دیئے اور ایک بار پھر جلد واپس آنے کی تاکید کی۔

دوسرے دن سلمان، رات کی ٹرین سے سفر پر روانہ ہو گیا۔

۲

اگست کی ایک دھندلی صبح کو سلمان چپ چاپ اپنے گھر پہنچ گیا! اس کے ہاتھ میں ایک بوسیدہ سا اٹیچی کیس لٹک رہا تھا اس کا لباس ملگجا تھا اور سر کے خشک بال بکھرے ہوئے تھے، وہ اپنی وضع قطع سے کسی دواخانے کا ایجنٹ معلوم ہوتا تھا۔

اس کی آمد پر کوئی ہنگامہ نہیں ہوا کنبہ کا ہر فرد اُس کے ساتھ ناخواندہ مہمان کی طرح سرد مہری کے ساتھ پیش آیا۔ باپ نے تو بات تک کرنا گوارہ نہ کی، البتہ ماں کی ممتا اُس کو دیکھ کر بلک اٹھی، وہ اس کو سینے سے لگا کر دیر تک روتی رہی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تھا، تو ہر آنکھ نے اُس کو حیرت سے دیکھا تھا۔ کچھ دیر تک اُس کے چاروں طرف ہجوم رہا اور پھر ہر شخص خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ نہ کسی نے اس سے زیادہ بات چیت کی اور نہ اُس پر سوالات کی بوچھاڑ ہوئی۔ اُس کے جھُلسے ہوئے چہرے، دھنسی ہوئی آنکھوں اور ڈھیلے ڈھالے لباس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔

سلمان نے غور کیا کہ اس کی غیر حاضری میں گھر میں بہت سی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ اُس کا باپ ریٹائر ہو کر پنشن پر آگیا تھا۔ اس نے لمبی سی ڈاڑھی رکھ لی تھی۔ وہ بڑی پابندی کے ساتھ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا۔ سویرے تاروں کی چھاؤں میں اٹھ بیٹھتا اور دیر تک کلام پاک کی تلاوت کیا کرتا۔ رات کو تہجد کی نماز پڑھتا۔ اس کا بیشتر وقت اپنے کمرے میں گذرتا تھا۔ جہاں

وہ خاموش بیٹھا حقہ گڑگڑایا کرتا اور شریعت پر موٹی موٹی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا۔ ہم ۲ گھنٹوں بیں، وہ صرف نمازِ مغرب کے بعد اپنے کمرے سے باہر نکلتا اور صحن سے چپ چاپ گزرتا ہوا بیٹھک میں جا کر بیٹھ جاتا۔ اس وقت تک اس کے کچھ ہم سن بوڑھے وہاں اکٹھا ہو جاتے تھے۔ وہ سب حقہ پیتے، پان چباتے اور باتیں کیا کرتے۔ ان کی گفتگو کا حلقہ بہت محدود ہوتا۔ چھوٹی چھوٹی نجی باتیں۔ کچھ ذاتی الجھنیں اور کبھی کبھار گرد و پیش کی زندگی پر سرسری سا تبصرہ۔

اُس کے باپ کی باتوں سے یہ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کو اطمینانِ قلب حاصل ہے۔ اُسے فخر تھا کہ اُس نے ۳۶ سال تک بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سرکاری ملازمت کے فرائض انجام دیئے۔ ہمیشہ اپنے افسروں کو خوش رکھا۔ اس کا ریکارڈ ہمیشہ صاف ستھرا رہا۔ جس کے صلے میں اُسے سوا تین سو روپے ماہانہ پنشن مل رہی تھی۔ بڑے مزے سے گذر بسر ہو تی تھی۔ اُس نے اپنی تمام اولادوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ ایک اچھی زندگی گذار سکتے تھے۔ اُس کو دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ اُس کا بڑا لڑکا (سلمان) نالائق نکل گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ نائب تحصیلدار نہیں تو کم از کم سب انسپکٹر پولیس ہی بن جاتا۔

ماں اپنے سن سے زیادہ بوڑھی لگتی تھی۔ اُس کے مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا تھا اور وہ بات بات پر روپڑتی تھی۔ کبھی اس گھر پر اُس کی حکومت چلتی تھی۔ مگر اب اس کو ردی سامان کی طرح گھر کے کاٹ کباڑ میں شامل کر لیا گیا تھا۔ وہ ایک کوٹھری نما مختصر سے کمرے میں پڑی کھالنسا کرتی، پان کے لئے چھالیہ کترا کرتی۔ بلغم اور پان کی پیکوں سے اُس نے دیواروں پر خوب خوب گلکاریاں کی تھیں۔ وہ اپنی اولادوں کو سرکش اور بدتمیز سمجھتی تھی اور اولادیں اُس کو جاہل اور کوڑھ مغز سمجھتی تھیں۔ گھر میں جب کوئی "معزز مہمان" آتا تو اُس کے کمرے میں باہر سے تالا لگا دیا جاتا۔ اس لئے کہ وہ بڑی بے سروپا باتیں کرتی تھی۔ اُس کے لہجے سے نفاست اور شائستگی کے بجائے کھُردراپن ٹپکتا تھا۔ وہ باتوں کی دُھن میں اکثر ایسی باتیں کہہ جاتی، جو بہت معیوب تھیں اور جن سے گھر کے وہ راز افشا ہو جاتے جن کو سات پردوں میں چھُپانے کی کوشش

کی جاتی تھی۔

لیکن یہی ایک ایسا وقت ہوتا تھا، جب وہ اپنی اولادوں سے انتقام لے سکتی تھی۔ وہ اپنا ملگجا لباس پہنے، جوتیاں گھسیٹتی ہوئی اُدبدا کے مہمانوں کے سامنے آجاتی، دونوں لڑکیوں اور بہو کے چہرے سفید پڑ جاتے اور وہ دانت کٹکٹا کر اُس کو گھورتیں تاکہ وہ جلد سے جلد نظروں سے دُور ہوجائے۔ لیکن وہ سب کچھ نظر انداز کرکے عین مہمان کے سامنے آکر بیٹھ جاتی اور دنیا جہان کے قضیے چھیڑ دیتی۔ بعد میں گھر بھر میں ایک کہرام مچتا، ہر طرف سے اُس پر لتاڑ پڑتی اور وہ چیخ چیخ کر روتی، کوسنے دیتی اور اپنی بہن کے گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے جانے کی دھمکی دیتی۔ پھر ٹرنکوں میں سے کپڑے نکلتے، بستر بند کستا اور اسٹیشن جانے کے لئے تانگہ بلایا جاتا۔ یہ گویا سارے ڈرامے کا نقطۂ عروج ہوتا تھا۔ جانے سے قبل ماں ہر اولاد کے گلے سے مل مل کر سسکیاں بھرتی اور یہیں سے حالات معمول پر آنا شروع ہوجاتے اور سارا معاملہ رفع دفع ہوجاتا۔

جب کبھی گھر میں مہمان آتے، اُن کے جانے کے بعد یہی ڈراما ہوتا۔ اکثر مہمانوں کی آمد سے پہلے ماں کے ڈھیروں مکھن لگایا جاتا، سو سو طرح سے اُس کی خوشامدیں ہوتیں۔ بار بار ہدایتیں دی جاتیں اور اس طرح اُس کو کمرے کے اندر بند کردیا جاتا۔ مگر یہ اُس کی مرضی پر منحصر تھا۔ اس لئے کہ وہ کمرے کے اندر سے بھی شور مچا سکتی تھی اور اس کا وہ اقدام بہت ہی خطرناک ہوتا تھا۔ لہٰذا کبھی تو ہنگامہ ٹل جاتا اور کبھی پاس پڑوس والوں کو بھی مہمانوں کی آمد کا پتہ چل جاتا۔

ماں کو سب سے زیادہ شکایت اپنی چھوٹی بیٹی سے تھی، جس کے پاس ان دنوں گھر کا چارج تھا۔ یہ ذمہ داری سنبھال کر اُس نے ماں کے حق پہ ڈاکہ ڈالا تھا۔ جس کو وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اپنا یہ حق کھونے کے بعد اُس کی حیثیت گھر میں ملازموں سے بدتر ہوگئی تھی۔ اب چھوٹی بیٹی کی حکمرانی چلتی تھی۔ وہ انٹر میڈیٹ کے فائنل ایئر میں تھی۔ اُس کو جدید طرز کے بھڑک دار لباس، میک اپ اور اپنی پروفیسروں کو نت نئے تحفے دینے کا بے حد شوق تھا۔ اس فضول خرچی

کا اثر گھر کے بجٹ پر پڑتا تھا اور ہمیشہ نزلہ ماں کے پاندان پر گرتا تھا جو اُس کا مونسِ تنہائی رہ گیا تھا ۔ ماں ہر بات سے بے نیاز ہو چکی تھی ۔ اُس کو صرف پانوں سے دلچسپی تھی اور جب ان کے مہیا ہونے میں بھی دشواری پیش آتی تو وہ بھڑک اُٹھتی ۔

سلمان کی بڑی بہن لاہور کے کسی کالج میں لکچرار تھی اور ان دنوں چھٹیوں پر گھر آئی ہوئی تھی۔ اُس نے فلسفہ میں ایم ۔ اے کیا تھا ۔ لیکن وہ خود ایک ہی فلسفہ میں یقین رکھتی تھی ۔ اور وہ فلسفہ یہ تھا کہ کسی گزٹیڈ آفسر سے اُس کی شادی ہو جانے اور اسی انتظار میں اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی اور لاکھ میک اپ کے باوجود آنکھوں کے نیچے ہلکی ہلکی جھرّیاں صاف نظر آتی تھیں ۔ وہ گھر میں کسی سے بہت کم بات چیت کرتی تھی اور سب پر اس طرح حکم چلاتی تھی کہ گویا وہ اس کے تابعدار تھے ۔

گزٹیڈ افسر شوہر سے مایوس ہو کر اب وہ غیر ملکی اسکالرشپ کے لئے کوشاں تھی ۔ ان دنوں اُس پر یہی ایک دُھن سوار تھی اور اس کو حاصل کرنے کے لئے اُس نے وزارت تعلیم کے ایک بڑے افسر کے بنگلے کے اتنے طواف کئے تھے کہ اس کے متعلق بہت سے اسکنڈل مشہور ہو گئے تھے۔

منجھلا بھائی نہر کے محکمے میں ملازم تھا ۔ وہ سرتاپا تصنع تھا اس پر مغربیت دیوانگی کی حد تک سوار تھی ۔ اُس کی بیوی میٹرک تک پڑھی ہوئی تھی، لہٰذا وہ اور بھی انگریز بنتا جا رہا تھا ۔ وہ سویرے اُٹھکر بڈ ٹی (BED TEA) پیتا ۔ ناشتے کے ساتھ اخبار کا مطالعہ کرتا اور اخبار میں ہمیشہ ایسی خبریں تلاش کرنے کی کوشش کرتا جن میں ان افسروں کا ذکر ہوتا جن سے اُس کی شناسائی تھی ۔ دفتر جاتے وقت بیوی اس کو دروازے تک چھوڑنے جاتی تھی، جہاں وہ اس کی پیشانی کا بوسہ لیتا اور بائی بائی کہتا ہوا چلا جاتا ۔ بیوی کو ہمیشہ ڈارلنگ کہتا تھا اور ہالی وڈ کی فلمیں دیکھ دیکھکر نئے نئے انداز کے لباس پہنتا اور بڑا عجیب و غریب نظر آتا ۔

وہ گھر میں روزانہ نت نئی تبدیلیاں کرتا رہتا ۔ ایک روز پیتل کی ایک گھنٹی لے آیا جو کھانے کی میز پر رکھدی گئی ۔ ناشتے اور کھانے کے وقت اُس کو بجا کر باقاعدہ اعلان کیا جاتا ۔ کبھی بیوی

کے لئے جمنازیم کا کوئی سامان لے آتا اور سویرے سویرے بہت تڑکے اپنی نگرانی میں اس سے کسرت کرواتا اور عجیب و غریب ہدایتیں دیتا۔ عام طور پر وہ اپنا ہر تجربہ بیوی پہ آزماتا تھا۔ جب وہ موٹی ہوجاتی تو ڈائٹنگ کرواتا، دبلی ہوجاتی تو مکھن اور دودھ کی مقداریں ناپ ناپ کر اضافہ کرتا۔ وہ اپنے بچوں سے ہمیشہ انگریزی میں بات چیت کرتا تھا۔ اگر کبھی اُن کی زبان سے اُردو کا لفظ سُن لیتا تو آگ بگولہ ہوجاتا۔ اس کے دو بچے تھے، جو ابھی بہت کم سن تھے مگر اُن کو کانونٹ میں داخل کرانے کے لئے اُس نے ابھی سے کوشش شروع کر دی تھی۔ وہ کوئی بڑا عہدے دار نہیں تھا۔ آمدنی کم تھی اور اخراجات بڑھتے جارہے تھے۔ جن کو پورا کرنے کے لئے وہ رشوت لینے کے نت نئے طریقے ایجاد کیا کرتا تھا۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی، وہ یہ کہ اُس کو بڑا آدمی سمجھا جائے لیکن ماں اس کو بڑا آدمی سمجھنے کے بجائے اُلّو کا پٹھا سمجھتی تھی۔ جس کا انتقام وہ رات کو بیئر کا ایک گلاس پی کر، ماں کو گالیاں دے کر لیتا تھا۔

چھوٹا بھائی بی۔ اے کر چکا تھا۔ وہ ۲۴ گھنٹے پڑھنے میں جٹا رہتا۔ اُس کی زندگی کا ایک ہی مشن تھا کہ کسی طرح سی۔ ایس۔ پی بن جائے۔ شاندار بنگلہ، جھلکتی ہوئی کار، اردلی اور یس سر (YES SIR) کہنے والے ماتحتوں کی ٹیم۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنی بینائی خراب کرچکا تھا اور موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگاتا تھا۔ اُسے اپنے گردوپیش کی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ وہ ہر وقت اپنے کمرے کے اندر کتابوں پر جھکا ہوا نظر آتا۔

سلمان کئی سال بعد آیا تھا اور ان کئی سالوں میں اتنی بہت سی تبدیلیاں ہوچکی تھیں کہ وہ اپنے ہی گھر میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔ بظاہر اس کے بہن بھائیوں کے پروگرام مختلف تھے مگر سب کی منزل ایک ہی تھی وہ اس سیڑھی تک پہنچ جانا چاہتے تھے، جس پر چڑھ کر وہ اوپر والے طبقے میں شامل ہو سکتے تھے۔ مگر وہ ہوا میں معلّق ہو کر رہ گئے تھے۔ اُن کے سر نیچے اور ٹانگیں اوپر تھیں تاکہ وہ نیچے نہ دیکھ سکیں۔ صرف بلندی ہی کو تکا کریں۔ وہ نیچے اُترنا نہیں چاہتے تھے اور اوپر پہنچنا اُن کے بس میں نہیں تھا۔ انھیں ایک ایسے بازو کے سہارے کی ضرورت تھی، جو ان کا

ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لے۔

سلمان اس لئے گھر آیا تھا کہ وہاں اُس کی صحت کچھ سنبھل جائے گی اور وہ جس ذہنی انتشار میں مبتلا تھا اس میں کمی پیدا ہو جائے گی۔ مگر اس کو آئے ہوئے ہفتہ بھی نہ گذرا کہ وہ ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو گیا۔ ایسا بیمار پڑا کہ ہفتوں بستر پر پڑا رہا۔ یہ اُس کی زندگی کا بڑا اذیت ناک دور تھا۔ اس کے بہن بھائیوں کا رویہ اُس کے ساتھ بڑا افسوس ناک تھا۔ کوئی اُس کے قریب بھی آکر نہ پھٹکتا۔ وہ اس سے اس طرح پرہیز کرتے، جیسے وہ مجسم ٹائیفائڈ کی بلا بن گیا تھا، جو قریب آتے ہی اُن کے چمٹ جاتی۔

وہ سب مل کر خوشی سے قہقہے لگاتے، فلموں پر تبصرے کرتے، لباسوں کے نئے نئے ڈیزائنوں پر بحث کرتے مگر کبھی کوئی اُس کی علالت کے متعلق بات بھی نہیں کرتا۔ وہ بخار میں بے سدھ پڑا تپتا رہتا، بے چینی سے کروٹیں بدلا کرتا۔ ایک ایک چیز کو ترسا کرتا۔ منجھلے بھائی کو تو اپنی نت نئی مصروفیات کے باعث اُس کے متعلق سوچنے تک کی فرصت نہیں تھی۔ چھوٹا بھائی سی۔ ایس۔ پی بننے کی تیاری میں غرق تھا۔ وہ سلمان کے لئے صرف ایک بار ڈاکٹر کے پاس گیا تھا اور واپس آکر اس قدر احسان جتایا تھا کہ وہ دوبارہ اس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ بڑی بہن کبھی کبھار بھولے بھٹکے اس کی طرف آجاتی تھی مگر وہ بھی اس طرح کہ ناک پر رومال رکھ کر دروازے ہی پر رک جاتی اور کھڑے کھڑے اشاروں سے اس کی طبیعت کا حال پوچھتی اور اُلٹے قدموں واپس لوٹ جاتی۔

لے دے کے ایک ماں کی مامتا تھی، جو ہر وقت بے چین رہتی۔ وہ رات رات بھر اُس کے سرہانے بیٹھ کر آنکھوں میں کاٹ دیتی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وقت پر دوا پلاتی، اُس کا سر دبایا کرتی، بخار کی شدت ہوتی تو اس کے تلوے سہلایا کرتی تھی، پیشانی پر برف کے پھاہے رکھتی۔ ہر طرح اس کو تسلی دیتی۔ کبھی کبھی وہ اپنی بیکسی پر بے چین ہو کر آب دیدہ ہو جاتا تو وہ اس کو سمجھاتی اور سمجھاتے سمجھاتے خود بھی رو پڑتی۔

مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ گھر کے سارے اخراجات قرض پر چل رہے تھے۔ سلمان کے لئے

دوا بھی فرض پر آ رہی تھی۔ وہ موسمبی کا عرق پینا چاہتا تھا۔ طویل علالت نے اُس کو بچوں کی طرح ضدی بنا دیا تھا۔ وہ ماں سے بار بار موسمبیاں منگوانے کے لئے اصرار کر رہا تھا۔ ماں پہلے تو اس کو ٹالتی رہی، پھر اپنی مجبوری پر رو پڑی اور آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ سلمان کو اپنی غلطی کا اچانک شدت کے ساتھ احساس ہوا۔ اس کے کمرے کے سامنے صحن تھا اور صحن کے مشرقی کونے پر اُس کے منجھلے بھائی کا کمرہ تھا۔ جو کھلی ہوئی کھڑکی سے نظر آتا تھا۔

بیٹھے بیٹھے سلمان کی نظر منجھلے بھائی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اُس نے دیکھا کمرے کے اندر میز پر بہت سے تازہ پھل رکھے تھے اور اُس کا بھائی اونچی آواز سے بول رہا تھا۔ وہ بیوی کو ساتھ لے کر اپنے ایک افسر کی عیادت کے لئے اسپتال جا رہا تھا اور یہ پھل جن میں سرخ سرخ موسمیاں بھی تھیں۔ اُس کے لئے بطور خاص منگوائی گئی تھیں۔ اس لئے کہ خالی ہاتھ جانا بڑی معیوب بات تھی۔ سلمان نے سب کچھ خاموش نظروں سے دیکھا اور کسی اندرونی چوٹ سے بلبلا کے رہ گیا۔

ایک رات اُس کو بخار کی شدت سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اُس کا بدن انگیٹھی کی طرح سلگ رہا تھا اور پیاس کی شدت سے اُس کا حلق خشک پڑ گیا تھا۔ اُس نے کئی بار ماں کو اپنی نحیف آواز سے پکارا۔ مگر شام سے ماں کو بھی بخار ہو گیا تھا۔ کوئی خطرناک مرض نہیں تھا۔ مسلسل شب بیداری سے وہ بیمار پڑ گئی تھی اور اُس وقت اس قدر گہری نیند سو رہی تھی کہ اس کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

سلمان کچھ دیر تک تو پڑا پڑا آوازیں دیتا رہا۔ پھر وہ ہمت کر کے پلنگ سے نیچے اُتر آیا۔ گھر بھر پر سناٹا چھایا تھا۔ رات کا پچھلا پہر تھا اور ڈوبتے چاند کی زرد زرد چاندنی چھت کی منڈیر پر پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا سرد تھی اور آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ سلمان کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ دیوار کے سہارے چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ پھر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے صحن کو عبور کر کے اس کمرے کے دروازے پر پہنچ کر زور زور سے ہانپنے لگا؛ جہاں کھانے کی میز بچھی تھی۔ کمرے میں دھندلی دھندلی روشنی تھی اور اس روشنی میں اُس نے میز پر رکھا ہوا تھرماس دیکھ لیا۔

چند لمحوں تک وہ دروازے کا سہارا لئے ہانپتا رہا۔ اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے رینگ رہے تھے اور حلق کے اندر پیاس کی شدت سے کانٹے چبھ رہے تھے۔ وہ دیوار کے سہارے سہارے چلتا ہوا میز کے قریب پہنچا۔ تھرماس کھولا اور اس میں سے برف کا ایک ٹکڑا نکالا۔ اسی وقت اس کے پیر زور زور سے کپکپائے اور آنکھوں کے سامنے کالے کالے پردے لہرانے لگے۔ وہ چکرا کر وہیں گر پڑا۔ اُسے نہیں معلوم کہ وہ کب تک کمرے کے سرد فرش پر پڑا رہا۔ کب وہ اپنے بستر پر آیا' کون اُسے اٹھا کر لایا۔ جب اُسے ہوش آیا تو سب سے پہلی آواز جو اُس نے سُنی' وہ اُس کی بھاوج کی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔

"تھرماس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ پچھلے ہی مہینے تو ۸۰ روپے کا خریدا تھا"

اُس کے شوہر نے اس سے صرف اس قدر کہا "ڈارلنگ تم اس طرح افسوس کر کے اپنا وزن کم کر لوگی۔ میں دوسرا تھرماس لے آؤں گا"

مگر وہ دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ اور سلمان بستر علالت پر پڑا اس کی آواز سنتا رہا۔ یہ اور ایسے ہی کتنے اور زخم اُس نے بیماری کے دنوں میں اپنے دل پر کھائے اور ہر بار وہ دُکھ سے بلبلا کر رہ گیا۔

اُس کا باپ فجر کی نماز مسجد میں جا کر پڑھتا تھا اور واپسی پر سلمان کے کمرے میں کبھی آتا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی جھک کر سلمان کی پیشانی چھوتا' نبض ٹٹول کر دیکھتا مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالتا اور اُس کے سرہانے کھڑا کھڑا زیرِ لب کوئی دعا پڑھتا رہتا۔ اب اس کا یہ روزانہ کا معمول ہو گیا تھا۔

جب کبھی وہ آتا' سلمان کی آنکھ کھل جاتی۔ اس وقت اس کو اپنے باپ کے چہرے پر ایک مقدس نور نظر آتا۔ اس کی سفید ڈاڑھی آہستہ آہستہ حرکت کرتی اور آنکھوں میں انسان کی ازلی مظلومیت جھلکتی۔ سلمان سوچنے لگتا کہ یہ بوڑھا آدمی کس قدر بدقسمت ہے۔ اس نے اپنی ساری جوانی موٹی موٹی فائلوں میں گذار دی۔ افسران کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دس' دس' بارہ بارہ گھنٹے دفتر میں کاٹے۔ ہمیشہ موٹا جھوٹا پہنا اور روکھا سوکھا کھایا۔ نہ کسی بالا خانے پر جانے کی اُس کو توفیق ہوئی

نہ اُسے مے خانے سے نکلتے دیکھا گیا۔ نہ کسی نازنیں کی بانکی چتون نے اُس کو گھائل کیا اور نہ سہانی راتوں میں اُس کی جوانی نے انگڑائیاں لیں۔ اُس نے زائد سے زائد مشقت کی، کم سے کم خرچ کیا اور زائد سے زائد پس انداز کیا۔ اور یہ سب کچھ اُس نے صرف اس لئے کیا کہ اُس کی اولاد کا مستقبل بہتر ہو جائے۔

وہ ہزاروں روپیہ جو اُس نے اپنی خوشیاں نیلام کر کے کمایا تھا، اولاد کی تعلیم پر لگا دیا اور اس کی تعلیم یافتہ اولاد میں اور ان پڑھ نیاز میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سلمان سوچا کرتا کہ یہ بدقسمت بوڑھا کس قدر احمق ہے۔ اس سے زیادہ سمجھدار تو نیاز کا باپ تھا، جس نے اس کو کوئی تعلیم نہیں دی۔ اپنی گاڑھی کمائی کا ایک پیسہ اُس پر صرف نہیں کیا۔ نیاز کو بھی اسی سم سم کی تلاش تھی جس کی تلاش میں اس کے بھائی بہن سرگرداں تھے۔ لیکن نیاز نے اس سم سم کا سراغ لگا لیا۔ اَن پڑھ کباڑیا، تین گریجویٹوں سے بازی لے گیا تھا۔ کوٹھی، کار اور بنک بیلنس، جیت کے تینوں کارڈ تین یکے۔ اُس کے پاس تھے۔ وہ بڑا آدمی بن چکا تھا اور وہ تینوں ابھی تک جیت کے ان تین کارڈوں کے خواب ہی دیکھ رہے تھے۔

سلمان کو نیاز سے بھی نفرت تھی اور اپنے بہن بھائیوں سے بھی۔ نیاز نے اُس کو اس لئے حقارت سے دیکھا تھا کہ وہ قیمتی سگرٹ نہیں پی رہا تھا۔ شاندار سوٹ نہیں پہنے تھا اُس کے پاس کار نہیں تھی۔ وہ مفلوک الحال انسانوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اُن کی زندگی کو سنوارنا چاہتا تھا۔ اور اُس کے بہن بھائی، اس لئے اُس کو ذلیل سمجھتے تھے کہ اُس نے بڑا عہدہ ہتیانے کو شش نہیں کی بنک بیلنس کیوں نہ بڑھایا۔ اُن کے نزدیک عوام کی خدمت محض پاگل پن تھا۔ اس لئے کہ وہ بلندی ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انھیں یہ پتہ نہ تھا کہ نیچے کروڑوں ننگے بھوکے رینگ رہے تھے، جو ان ہی کی طرح انسان تھے۔ جن کی خوشیاں اور غم ان سے مختلف نہیں تھے۔

بیماری کے دنوں میں وہ مسلسل ایسی ہی باتیں سوچتا رہا اور اُس کے اندر چھپا ہوا خود سر انسان بیدار ہونے لگا۔ وہ پریشان حال انسانوں کا دکھ درد بھول کر اپنے بہن بھائیوں سے انتقام لینے کی

سوچنے لگا۔ ان کو نیچا دکھانے کا پروگرام بنانے لگا۔ وہ اپنی ذلت کا ان سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔

صحت یاب ہونے کے بعد اُس نے فلک پیما کے ہیڈ کوارٹر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور یہ سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے۔ ان ہی دنوں اُس کی ماں نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ وہ بیاہ کرلے۔ ماں کی خواہش تھی کہ اُس کی زندگی ہی میں وہ اپنا گھر بسالے۔ یہ پروگرام دراصل اُس کے باپ کا تھا اور بیوی کے ذریعہ اُس نے سلمان تک پہنچایا تھا۔ متوسط طبقے کے ایک عام باپ کی طرح اُس کو سلمان کے راہ راست پر لانے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا اور وہ شادی کا پروگرام تھا۔

سلمان نے صاف انکار کر دیا مگر جب ماں نے بتایا کہ لڑکی کا چچا ایم۔ ایل۔ اے ہے اور چونکہ اس کا باپ مرچکا ہے اس لئے اُس نے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔ وہ پانچ ہزار روپیہ نقد اور اس کے علاوہ ملازمت بھی دلوا دے گا، تو سلمان کو اس مسئلہ پر غور کرنا پڑا۔ اُس نے سوچا زندگی میں آگے بڑھنے کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ صرف چور دروازے سے داخل ہوا جا سکتا ہے۔ اور ایم۔ ایل۔ اے کے پاس اس چور دروازے کی کنجی ضرور ہوگی۔ لہٰذا وہ چند روز تک غور و خوص کرنے کے بعد شادی کے لئے رضامند ہو گیا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اُس کے باپ نے روپیہ قرض لے کر خرچ کیا، اس لئے کہ وہ ایک ایم۔ ایل۔ اے کا سمدھی بننے جا رہا تھا۔ شادی میں شہر کے اعلیٰ حکام اور معززین کے علاوہ تین وزیر بھی شریک ہوئے۔ لہٰذا تمام مقامی اخبارات میں شادی کی تقریب کے فوٹو شائع ہوئے جن میں اُس کے بجائے وزیر دولھا معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ ایک اخبار نے جس کو سرکاری اشتہارات کی اشد ضرورت تھی، دولھا (سلمان) کو بھی نکال دیا اور فوٹو میں صرف وزیر ہی وزیر رہنے دیئے۔

سلمان کو شب عروسی ہی پر اندازہ ہو گیا کہ اُس کی بیوی سیدھی سادھی گھریلو لڑکی تھی۔ اُس نے آٹھویں جماعت تک تعلیم پائی تھی۔ اُس کا ذہن گیلی مٹی کی طرح تھا، جس کو وہ کمہار کی طرح جس سانچے میں چاہتا ڈھال سکتا تھا۔ وہ اُس کی توقع سے زیادہ دل کش اور معصوم نکلی۔ وہ

خوش تھا کہ اُس نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ جہیز کے علاوہ پانچ ہزار روپے اُس کو نقد ملے تھے اور ملازمت کے لئے اُس کے ایم۔ایل۔اے سسر نے کوشش شروع کر دی تھی۔

شادی کے تیسرے ہی ہفتہ اُس کے سسر کا کراچی سے خط آیا کہ فوراً کراچی پہنچو۔ ملازمت کا بندوبست ہوگیا ہے۔ سلمان نے بیوی کو گھر پر چھوڑا اور اُسی دن پہلی ٹرین سے کراچی روانہ ہوگیا۔

●

۳

گلابی جاڑوں کی ایک تھکی ہوئی سی دوپہر تھی ۔ نوشا ٹرام کے انتظار میں فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ اس وقت وہ اکیلا ہی تھا ۔ چکرم کی ڈیوٹی استاد پیڈرو نے نمائش پر لگا دی تھی اور نوشا کو پوکر کی ٹیم میں کر دیا تھا ۔ ۴ بجے اُس کو پوکر سے ایک ایرانی چائے خانے میں ملنا تھا ۔ ابھی کئی گھنٹے باقی تھے وقت گذارنے کے لئے اُس نے سوچا ٹرام پر کیماڑی تک کا ایک چکر ہی لگا لیا جائے ۔ ممکن ہے کوئی شکار پھنس جائے ۔ اب وہ کبھی کبھار اکیلے بھی کام کر جاتا تھا ۔ حالانکہ استاد پیڈرو کی سخت ہدایت تھی کہ بغیر ٹیم کے کوئی کاریگری نہ دکھائی جائے ۔ اس میں خطرہ بہت تھا ۔ مگر اب نوشا جیب تراشنے کے فن میں خاصا منجھ گیا تھا اور اس قدر نڈر ہو گیا تھا کہ سیکڑوں آدمیوں کے ہجوم میں جیب صاف کر دیتا تھا ۔

نوشا خاصی دیر سے ٹرام کا انتظار کر رہا تھا ، مگر کوئی ٹرام آتی نظر نہیں آ رہی تھی ۔ اُکتا کر وہ پیدل ہی چل دیا ۔ راہگیر تھکے تھکے نظر آ رہے تھے ۔ دو کانوں پر سناٹا تھا ۔ دور رکشا والے فٹ پاتھ کے قریب اپنی اپنی رکشاؤں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے ۔ فضا بڑی بوجھل تھی ۔ نوشا نے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال دیئے اور ہوئے ہوئے سیٹی بجاتا ہوا بلا مقصد ایک طرف چل دیا ۔ وہ کچھ دور تک اپنی دھن میں مگن اسی طرح چلتا رہا ۔ اچانک ایک موڑ پر کسی گداگر نے صدا لگائی ۔

"بابا اللہ کے نام پر اس محتاج کو کچھ دیتے جاؤ ۔"

نوشا اس صدا پر توجہ دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ پھر ایکا ایکی اس کو محسوس ہوا کہ یہ آواز اس کی پہچانی ہوئی ہے۔ وہ چلتے چلتے ٹھٹک کر رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا۔ ایک دیوار کے سائے میں فٹ پاتھ پر ایک گداگر سکڑا سکڑایا پڑا تھا۔ اُس کے جسم پر بے حد غلیظ لباس تھا۔ بڑے بڑے بال بکھر کر منہ پر آ گئے تھے۔ اُس کی ایک ٹانگ غائب تھی اور داہنا ہاتھ خیرات کے لیے آگے بڑھا تھا۔

نوشا نے غور سے گداگر کے چہرے کو دیکھا اور وہ تکلیف سے کانپ اٹھا۔ یہ راجہ تھا۔ اُس کی دونوں آنکھیں بند تھیں اور اُس کا سکڑا سکڑایا جسم کسی مردہ جانور کی سڑتی ہوئی لاش کی طرح گھناؤنا نظر آ رہا تھا۔ نوشا نے گہری سانس بھری اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ قدموں کی آہٹ پا کر راجہ نے ایک دردناک صدا بلند کی۔ اُس کے بدن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں جگہ جگہ پھنسیاں تھیں، جن سے رطوبت بہہ رہی تھی۔

نوشا نے آہستہ سے اس کو آواز دی "راجہ"

راجہ نے آنکھیں کھول دیں اور نوشا کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر وہ خوشی سے چیخ پڑا۔

"نوشا!"۔ وہ ہاتھ کا سہارا لے کر اُٹھ بیٹھا۔ نوشا نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"یار یہ تیری کیا حالت ہو گئی؟"

اُس کی بات سے راجہ کو دُکھ پہنچا۔ اُس کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے مسرت کی جو رمق اُبھری تھی اُس نے فوراً دم توڑ دیا۔ وہ مری ہوئی آواز سے کہنے لگا۔ "میری قسمت میں یہی لکھا تھا" اُس کا لہجہ بڑے بوڑھوں کی طرح سنجیدہ تھا اور آواز میں اس قدر کرب تھا، جیسے کسی غیر مرئی قوت نے اُس کے کلیجہ کو دبوچ لیا ہو۔

نوشا نے کہا "پر یار تجھکو تو اسپتال بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں علاج نہیں ہوا"

راجہ کے ہونٹوں پر بڑی تلخ مسکراہٹ اُبھری۔ کہنے لگا "اسپتال والوں نے میری ایک ٹانگ کاٹ ڈالی اور کوڑھیوں کے اسپتال بھیج دیا۔ کئی روز تک وہاں پڑا رہا مگر اسپتال میں جگہ نہیں تھی۔ ایک روز چوکیداروں نے زبردستی اٹھا کر مجھے ایک درخت کے نیچے ڈال دیا۔ جب سے یونہی

دربدر کی خاک چھانتا پھرتا ہوں" نوشا خاموش بیٹھا رہا۔ راجہ آہستہ آہستہ کہتا رہا۔

"ایک حکیم جی کو دکھایا تھا' وہ کہنے لگے تم کو پرانی آتشک ہے"

نوشا نے پوچھا "یہ آتشک کیا بیماری ہوتی ہے؟"

"سنا ہے رنڈی بازوں کو یہ بیماری ہو جاتی ہے"

نوشا نے پریشان ہو کر کہا "یار تو نے تو کبھی ایسی حرکت کی نہیں"

"میں نے حکیم جی سے یہی بات کہی تو وہ بولے تمھارے باپ کو یہ مرض ہوگا۔ یہ خاندانی بیماری ہوتی ہے"

"تو پھر تم نے کچھ علاج ولاج کروایا؟"

ایک بارگی اس سڑتی ہوئی لاش میں سے پرانا راجہ جاگ اٹھا' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "یار تو بھی کمال کرتا ہے۔ ابے علاج کوئی پھوکٹ میں ہو جاتا ہے۔ اس میں رقم لگتی ہے" نوشا اس کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے فوراً بات کا رُخ بدل دیا۔

"یہ تو بتاؤ تم آج کل رہتے کہاں ہو؟"

راجہ بڑی گھناؤنی ہنسی ہنس کر بولا "اپنا کبھی کوئی گھربار ہے۔ جہاں جی چاہا پڑ رہا۔ کوئی ہفتہ بھر سے تو یہیں پڑا ہوں" لمحہ بھر کے لئے وہ رکا "مگر یہ تو بتا نوشا تو آج کل کیا کر رہا ہے۔ ویسے تو تیرے بڑے ٹھاٹھ دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں نوکری ووکری کر لی"

نوشا اس سے صاف بات نہ بتا سکا۔ "ہاں یار ایک جگہ نوکری ہی کر لی ہے"

"مزے میں گذر بسر ہوتی ہے؟"

"بالکل"

راجہ نے جھجکتے ہوئے کہا "نوشا تو مجھے ایک بیساکھی دلوادے" اس نے پاس پڑے ہوئے ڈنڈے کی طرف اشارہ کیا "اس سالے سے دو قدم چلنا مصیبت ہو جاتا ہے۔ میں نے اس کے لئے ۔ ار وپے جمع کئے تھے' کوئی سالا چوٹٹا سوتے میں نکال لے گیا" راجہ نے اس کو ایک گندی سی

گالی دی اور بڑے دُکھ کے ساتھ بولا۔

"نوشا تو مجھے بیساکھی ضرور بنوادے، تیرا بہت بڑا احسان ہوگا۔ مجھے بہت تکلیف ہے۔"

نوشا نے فوراً کہا "یار اس میں احسان کی کونسی بات ہے۔ میں جلدی ہی بیساکھی بنوادونگا"

وہ گھنٹہ بھر تک راجہ کے پاس رہا اور اس سے دنیا بھر کی باتیں کرتا رہا۔ چلتے وقت اُس نے راجہ کو ایک روپیہ دیا اور کھانے کے لئے اُس نے جو کچھ مانگا، وہ خرید کر اُس کو دے دیا۔ وہ صبح سے بھوکا پڑا تھا۔

راجہ سے مل کر نوشا کی طبیعت مکدر ہوگئی تھی۔ اُس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ بار بار اس کو راجہ کی بے کسی کا خیال آتا۔ اُس نے سوچا کہ اس کو راجہ کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ دوسرے دن وہ پھر اس کے پاس گیا۔ اس دفعہ وہ اس کے لئے کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے گیا تھا۔

اب وہ اکثر راجہ کے پاس جاتا اور کچھ نہ کچھ اس کو دے کے آتا۔ راجہ کے لئے اُس نے ایک بیساکھی بھی خرید دی تھی۔ جس کے سہارے وہ چلنے لگا تھا۔ چوہے کی کھال کا سا اس کا گھناؤنا لباس اُتروا کر نیا جوڑا پہنا دیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ کہیں رہنے کو جگہ مل جائے، تو اس کے ایک حصہ میں راجہ کی رہائش کا بندوبست کردے۔ اس لئے کہ سردی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ راجہ رات بھر شبنم میں پڑا بھیگا کرتا اور سردی سے کانپتا رہتا۔ نوشا کو رہنے کا مکان تو نہ مل سکا، البتہ ایک مکان کی دیوار کے ساتھ ترپال لگا کر اُس نے سائبان بنا دیا تھا، جس کے نیچے راجہ رہنے لگا۔

راجہ کے لئے وہ جو کچھ کر رہا تھا اس کام میں اس کو بڑی خوشی ہوتی۔ یہ عجیب سی خوشی تھی۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی زندگی کا بھی کوئی مقصد ہے۔ وہ محض جیب کترا نہیں ہے، بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ اس کی اب سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ راجہ کی بیماری دور ہوجائے۔

ایک روز وہ راجہ کو ایک ڈاکٹر کے پاس لے کے گیا۔ مگر وہ اس کا علاج کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ کہنے لگا۔ اس کو کوڑھ ہوگیا ہے، کوڑھیوں کے اسپتال لے جاؤ۔ مگر نوشا اس کو کسی اسپتال نہ لے گیا۔ اُسے خوف تھا کہ جس طرح اسپتال والوں نے مما کی ٹانگ کاٹ کر لنگڑا بنا دیا، وہ اس کے جسم کا کوئی

اور حصہ نہ کاٹ دیں۔ ڈاکٹروں کی جانب سے مایوس ہو کر وہ راجہ کو ایک حکیم کے پاس لے گیا۔ اُس نے دونوں کی بہت ڈھارس بندھائی۔ اس کا خیال تھا کہ راجہ کا مرض لاعلاج نہیں ہے، اگر پابندی سے علاج کرایا جائے تو وہ صحت یاب ہو سکتا ہے۔ اس علاج کے لیے اس نے ڈھائی سو روپے مانگے تھے۔

نوشا اس وقت تو راجہ کو خاموشی کے ساتھ واپس لے آیا مگر اب اس پر یہ دھن سوار تھی کہ کسی طرح ڈھائی سو روپے مہیا کیے جائیں۔ تاکہ راجہ کا باقاعدگی کے ساتھ علاج ہو سکے۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ پوکر کے ساتھ جیب تراشی کرنے کے علاوہ۔ وہ اکیلا بھی کاریگری کے ہاتھ دکھانے لگا اور اس رقم کو استاد پہیڈ روسے پوشیدہ رکھتا۔ اس کو ڈھائی سو روپے کی ضرورت تھی تاکہ وہ راجہ کا علاج کرا سکے۔

انہی دنوں ایک روز اُس نے ایک شخص کو بھانپا، اس کے پاس لمبی رقم تھی۔ نوشا نے سوچا کہ اگر داؤں چل جائے تو آج ہی راجہ کے علاج کی پوری رقم نکل آئے گی۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ سردی بڑھ چکی تھی۔ راستوں پر سناٹا پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ دوبار نوشا نے اس شخص کو گھیرا، مگر وہ ہتے نہیں چڑھا۔ مگر نوشا برابر اس کا پیچھا کرتا رہا۔ آخر وہ آدمی سڑک سے مڑ کر ایک گلی میں گھس گیا۔ گلی سنسان تھی اور روشنی بھی کم تھی۔ نوشا سائے کی طرح اس کے برابر چلتا رہا۔ اُس نے پتلون کی جیب میں پڑے ہوئے چاقو کو نکال کر آہستہ سے کھول لیا اور جب وہ آدمی ایک ایسی جگہ پہنچا، جہاں اندھیرا زیادہ تھا۔ نوشا لپک کر اچانک اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور کھلا ہوا چاقو اس کے سینے پر رکھ کر بولا۔

"جو کچھ پاس ہے نکال کر چپ چاپ دے دو۔"

اس شخص نے گھبرا کر نوشا کو دیکھا، وہ اندھیرے میں بھوتوں کی طرح خوفناک نظر آ رہا تھا۔۔ اُس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا جو عین سینہ پر رکھا تھا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی۔ اُس نے خوف سے منہ پھاڑ دیا۔ مگر آواز نہ نکلی۔ نوشا نے اس کو خاموش دیکھ کر، خود ہی اس کی جیب سے پرس نکال لیا۔

ابھی نوشا نے پرس نکال کر جیب میں رکھا ہی تھا کہ گلی میں قدموں کی آہٹ اُبھری۔

دو سائے، ایک فلیٹ کی کھڑکی سے چھن چھن کر آنے والی روشنی میں، نظر آئے۔ نوشا نے اس آدمی کا بازو پکڑ کر اندھیرے میں گھسیٹا تاکہ وہ دونوں گذر جائیں اور اُس سے کہنے لگا۔

"آواز نکلی تو پورا چاقو اُتار دوں گا سینے میں"

وہ آدمی خوف سے کانپ رہا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے نوشا کو گھور رہا تھا۔

اب وہ دونوں اندھیرے میں ایک دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ راہگیروں کے قدموں کی آہٹ گلی کے پتھریلے فرش پر زور زور سے اُبھر رہی تھی۔ ان کے جوتے فوجیوں کی طرح وزنی تھی اور اُن سے نوشا کو شبہ ہوا کہ کہیں وہ پولیس کے کانسٹبل تو نہیں ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کسی قدر گھبرا گیا۔

بھاری بھاری قدموں کی آہٹ قریب آتی جا رہی تھی، کھٹ، کھٹ، کھٹ، قریب اور قریب اور قریب۔ ایکا ایکی نوشا کے کھلے ہوئے چاقو کی زد میں کھڑے ہوئے خوف زدہ آدمی نے حلق سے ایک بھیانک آواز نکالی۔ یہ آواز اتنی ہیبتناک تھی کہ تنگ و تاریک گلی کے در و دیوار لرز کر رہ گئے اور اس کے ساتھ ہی وہ چلانے لگا۔

"بچاؤ، بچاؤ"

نوشا نے اس کے کھلے ہوئے منہ پر پوری قوت سے ایک مکہ مارا، وہ آدمی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔ مگر سنبھلتے کے ساتھ ہی اس نے پھر دہاڑنا شروع کر دیا۔ اب نوشا کے لئے وہاں ٹھہرنا بے حد خطرناک ہو گیا تھا۔ اُس نے ایک بار گی اندھیری گلی میں بھاگنا شروع کر دیا۔ اس وقت تک فلیٹوں کے دروازے اور کھڑکیاں کھلنا شروع ہو گئی تھیں اور گھبرائے ہوئے لوگ بالکونیوں سے نیچے گلی میں جھانک رہے تھے۔ بعض نے اونچی آوازوں سے بولنا شروع کر دیا۔

گلی کے اندر داخل ہونے والے دونوں راہگیر، واقعی پولیس کانسٹبل تھے۔ شور سُن کر پہلے تو وہ ٹھٹکے اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ اسی وقت اُن کی آنکھوں کے سامنے ایک سایہ تیزی سے لہرایا۔ کوئی گلی میں تیز رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ یہ نوشا تھا۔ ان دونوں نے

فوراً اس کا تعاقب شروع کر دیا۔

نوشا کچھ دور تک گلی میں بھاگتا رہا۔ پھر وہ داہنے ہاتھ کو مڑنے والی ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ گلی بھی تاریک تھی۔ اُس کے قدموں کی آوازیں گلی کے پتھریلے فرش پر اُبھر رہی تھیں۔ وہ گلی میں پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ سے ٹھوکریں کھاتا، لڑکھڑاتا، بے تحاشہ بھاگتا رہا۔ اُس کی پشت پر ملی جلی آوازوں کا شور اُبھر رہا تھا۔ تعاقب کرنے والوں کے قدموں کی آہٹ نزدیک آتی جا رہی تھی۔ کانسٹیبل زور زور سے سیٹیاں بجا کر خطرہ کا اعلان کر رہے تھے۔

دوڑتے دوڑتے نوشا کی سانس پھول گئی تھی اور قدم ڈگمگانے لگے تھے۔ ایکا ایکی ایک نئی مصیبت اس کے سامنے آ گئی۔ اب گلی کے دوسرے نکڑ پر بھی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ دھندلی روشنی میں انسانی شکلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ اُس نے قدموں کی رفتار سست کر دی اور ایک دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے قریب ہی دیوار میں کھڑکی تھی۔ نوشا نے کھڑکی پر ہاتھ رکھا اور ایک اُمید موہوم کے ساتھ سوچا کہ شاید کھڑکی کھل جائے۔ اور کھڑکی کا ایک پٹ ہاتھ رکھتے ہی کھل گیا۔ وہ جھٹ سے اُچک کر اس پر چڑھ گیا اور اندر کود گیا۔ اُس نے فوراً کھڑکی بند کر دی اور اُس سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

نوشا جس جگہ کھڑا تھا، وہ ایک تنگ سی گیلری تھی۔ گیلری جہاں ختم ہوتی تھی، وہاں سے جنوبی سمت کو ایک زینہ تھا، جس کی سیڑھیاں اوپر کی منزل کو جاتی تھیں۔ اوپر سے ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی، جو ایک زرد دھبے کی طرح دیوار پر بکھری ہوئی تھی۔ نوشا اس دھندلی روشنی میں دم بخود کھڑا تھا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے اور وہ منہ کھولے ہوئے بری طرح ہانپ رہا تھا۔

باہر گلی میں ابھی تک ملی جلی آوازوں کا شور اُبھر رہا تھا۔ گلی کے پتھریلے فرش پر بھاری بھاری قدموں کی آہٹ گونج رہی تھی اور تیز تیز بجتی ہوتی سیٹیاں چیختی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اچانک کسی کے کھانسنے کی آواز اُبھری اور اُس کے ساتھ ساتھ زینے میں روشنی پھیلنے لگی۔ کوئی آہستہ آہستہ چوبی

سیڑھیوں پر سے اُتر رہا تھا۔

قدموں کی آہٹ اُبھرتی رہی۔ روشنی زینے سے نکل کر گیلری کی دیواروں پر پھیلنے لگی۔ پھر زینہ پر ایک سایہ اُبھرا۔ ایک بوڑھا آدمی نمودار ہوا۔ اس کی مختصر سی سفید ڈاڑھی تھی۔ سر گنجا تھا۔ آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا۔ وہ ایک لمبا سا گاؤن پہنے تھا۔ وہ لمبے قد کا آدمی تھا۔ اُس کے داہنے ہاتھ میں موم بتی تھی۔ وہ کمر کو ذرا خم دے کر چل رہا تھا۔ نوشا بدحواس ہو کر دیوار سے چمٹ گیا۔ اُس نے کھلا ہوا چاقو مضبوطی سے تھام لیا اور اس بوڑھے کو خوف زدہ نظروں سے گھورنے لگا۔

زینہ سے اُتر کر وہ شخص گیلری میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ جب وہ نوشا سے چند قدم کے فاصلہ پر رہ گیا تو اچانک اُس کی نگاہ نوشا پر پڑی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا اور اس کا ہاتھ کانپ اٹھا۔ موم بتی کی لو زور سے تھرتھرائی اور گیلری کے اندر بہت سی دُھندلی پرچھائیں جھومنے لگیں۔ نوشا نے ایک لمحہ کا بھی انتظار نہ کیا اور جھپٹ کر اُس کے سامنے کھلا ہوا چاقو بڑھا کر بولا۔

"آواز نکلی تو پورا چاقو سینے کے اندر ہوگا"

بوڑھے آدمی نے حیرت زدہ نظروں سے نوشا کو دیکھا، کھلے ہوئے چاقو کو دیکھا اور اُس کے جھرّیوں بھرے چہرے پر خوف کا ہلکا سا سایہ پھیل گیا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ نہ اُس نے جسم کو کوئی حرکت دی اور نہ زبان سے ایک لفظ نکالا۔ نوشا ابھی تک ہانپ رہا تھا۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ چہرہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا اور اُس کے جس ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا، اس میں کپکپاہٹ تھی۔ بوڑھے آدمی نے اُس کی گھبراہٹ اور ہاتھ کی کپکپاہٹ کو محسوس کیا اور آہستہ سے بولا۔

"گھبراؤ مت تم یہاں قطعی محفوظ ہو"

نوشا کھلا ہوا چاقو تانے اسی طرح کھڑا رہا لیکن وہ آدمی اس کو بڑا عجیب و غریب ضرور معلوم ہوا وہ لمحہ بھر رک کر بولا۔ "ڈرو مت" اس دفعہ اس کا لہجہ صاف اور نرم تھا "میں بوڑھا آدمی ہوں، مجھ سے تم اس قدر کیوں ڈر رہے ہو۔ آؤ میرے ساتھ آؤ" یہ کہہ کر وہ مُڑا۔ لیکن نوشا اُس کے ہمراہ جاتے ہوئے جھجکنے لگا۔ البتہ اُس نے چاقو نیچے کر لیا تھا۔

بوڑھا آدمی بڑے مشفقانہ انداز سے بولا "بھئی تم مجھ سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہو آؤ، گھبراؤ مت"

اُس کے لہجہ میں اس قدر نرمی اور سادگی تھی کہ نوشا کے قدم خود بخود اٹھ گئے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں نے زینے کی سیڑھیاں طے کیں اور اوپر پہنچ گئے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ زینے کے عین مقابل ایک دروازہ تھا۔ وہ شخص اس میں داخل ہو گیا، نوشا بھی اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ یہ ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ اس کے سامنے ایک پتلی سی گیلری تھی۔ دونوں کمرے سے گذر کر گیلری میں آ گئے۔ گیلری کے مشرقی کونے پر دروازہ تھا، جس سے روشنی پھوٹ کر باہر آ رہی تھی۔ مگر وہ اس طرف نہیں گیا اور دوسری طرف مڑ گیا، کچھ دور آگے چل کر اُس نے ایک دروازہ کھولا اور اُس میں چلا گیا۔ نوشا نے دیکھا کمرہ خاصا کشادہ تھا اور اس میں کتابوں سے بھری ہوئی تین الماریاں دیوار سے لگی ہوئی کھڑی تھیں۔ ایک لمبی سی میز تھی، جس پر بہت سی کتابیں اور کاغذات بکھرے تھے۔ اس شخص نے موم بتی میز پر رکھدی اور ایک کرسی پر تھکا ہوا سا بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے نوشا کو برابر والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نوشا کسی سحر زدہ انسان کی طرح چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔

کمرے کے اندر خاموشی چھا گئی۔ بوڑھے آدمی نے میز پر رکھا ہوا پائپ اٹھایا۔ اس میں تمبا کو بھری اور پھر اس کو سلگا کر آہستہ آہستہ پائپ پر کش لگانے لگا۔ ایکا ایکی کراہنے کی آواز رات کے سناٹے میں ابھری۔ کوئی رُک رُک کر کراہ رہا تھا۔ اس آواز کو سُن کر نوشا نے چوکنا ہو کر کان کھڑے کئے۔ آواز کہیں قریب ہی سے آ رہی تھی۔ نوشا کسی نامعلوم خوف سے لرزا ٹھا۔ بوڑھا آدمی خاموشی کے ساتھ پائپ پر کش لگاتا رہا اور تمباکو کا تیز بودار دھواں کمرے کے اندر بکھیرتا رہا۔

ذرا دیر بعد کمرے کے باہر قدموں کی چاپ اُبھری۔ ۱۶، ۱۷ برس کی ایک دبلی تپلی لڑکی کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ اُس کا جسم اونی شال میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بوڑھے آدمی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اور اُس سے کہنے لگی۔

"پاپا ابھی تک بجلی نہیں آئی۔ سارے گھر میں اندھیرا پڑا ہے"

وہ ایک بارگی چونک پڑا "اوہ بجلی، میرا خیال ہے، مجھے ڈاکٹر رفیق کے ہاں سے پاور ہاؤس کو ٹیلیفون کر دینا چاہیے" لمحہ بھر کے لئے اُس نے توقف کیا "مگر اب تو وہ سو گیا ہوگا"

وہ کہنے لگی "آپ تھوڑی دیر پہلے ٹیلیفون ہی کرنے تو گئے تھے"

وہ گھبرا سا گیا "ہاں گیا تو بس ضرور تھا" وہ کچھ سوچنے لگا پھر اُس نے نوشا کو دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر بولا "تم یعنی تم؟ میرا مطلب ہے" وہ ہکلانے لگا "او ہو بھئی معاف کرنا، میں بالکل بھول گیا تھا کہ تم میرے سامنے بیٹھے ہو۔ دیکھو نادرہ یہ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ تم ان کو گرم دودھ لا کر پلا دو اور بھئی مجھے بھی ایک گرم پیالہ کافی کا مل جائے تو کیا بات ہے" وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔

نادرہ نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی اور کمرے سے باہر جانے کے لئے مڑی۔ بوڑھے آدمی نے اس کو جاتے جاتے ٹوک کر پوچھا "کیا تمھاری ماں کو پھر دورہ پڑا ہے؟"

وہ بولی "جی ہاں۔ مگر اب اُن کو نیند آگئی ہے"

بوڑھا آدمی خاموش ہو گیا اور وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

کمرے کے اندر ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور آہستہ آہستہ پائپ پر کش لگانے لگا۔ موم بتی کی روشنی میں اس کا گنجا سر چمک رہا تھا اور موٹے موٹے چشموں کے پیچھے اُس کی آنکھیں اونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

ذرا دیر بعد نادرہ دونوں ہاتھوں میں ایک تکونا سا طشت لئے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ طشت میں دودھ سے بھرا ہوا گلاس اور کافی کی پیالی رکھی تھی۔ اُس نے میز پر جھک کر طشت رکھا اس کا چہرہ موم بتی کی زرد زرد روشنی کے سامنے آگیا۔ نوشا نے غور سے دیکھا اور سوچنے لگا، "لونڈیا زوردار ہے"۔ اس کے خدوخال بڑے سُبک تھے آنکھیں کلیوں کی طرح شفاف تھیں، لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ ہلکی ہلکی سی سنجیدگی چھائی تھی۔ اُس نے گلاس

اٹھایا اور بڑی بے باکی سے نوشا کو دیدیا۔ نہ وہ جھجکی، نہ شرمائی۔

وہ کمرے میں زیادہ دیر تک نہ رکی۔ نوشا نے دودھ کا گلاس ختم کیا تو اس کو اپنے جسم میں کسی قدر تازگی محسوس ہوئی۔ اُس نے سوچا اب خطرہ ٹل چکا ہے۔ رات بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ اسے چلنا چاہیے۔ اسی وقت بوڑھے آدمی نے اس سے پوچھا۔

"تم نے کسی کو قتل کیا ہے؟"

"نہیں"

"چوری؟"

نوشا نے آہستہ سے کہا "ہاں" اور ندامت سے گردن جھکالی۔

بوڑھے آدمی نے گہری سانس بھری۔ ذرا دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس سے کہنے لگا "تمھاری عمر زیادہ نہیں معلوم ہوتی، مگر تم جرائم پیشہ کیسے بن گئے؟" پھر خود ہی چونک کر اس نے کہا "میرا خیال ہے کہ مجھے تم سے ایسا سوال نہیں پوچھنا چاہیے۔ یہ بات تو تمھیں خود بھی نہیں معلوم ہوگی۔ تمھیں ابھی بہت سی باتیں نہیں معلوم ہوں گی۔ مثلاً یہ کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ تم ڈاکٹر، قانون داں، سائنس داں، ماہر تعلیم، مصنف اور مصور بن سکتے ہو، تو یہ تمھارے لئے بڑی حیرت کی بات ہوگی۔" نوشا کو واقعی اس کی اس بات پر تعجب ہوا، وہ ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر اس کا چہرہ تکنے لگا۔ وہ کہتا رہا "کیا تم اپنی زندگی کی اس نہج کو نہیں بدل سکتے" اُس نے رُک کر ایک بار پھر اپنے جملے کو دہرایا "نہج تمھارے لئے مشکل لفظ ہے۔ مجھے یہ لفظ نہیں استعمال کرنا چاہیے تھا۔ یوں سمجھو۔!" وہ پھر اُلجھا "بھئی معاف کرنا ہم نے ایک دوسرے سے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔ میرا نام کلیم اللہ ہے۔ میں ایک مقامی کالج میں فلسفہ کا پروفیسر ہوں۔ کیا میں تمھارا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"نوشا"

پروفیسر نے مسکرا کر کہا "نوشا یعنی دولھا۔ بھئی تمھارا نام تو خوب ہے۔ گو میں اس بات کا قائل نہیں کہ نام کا اثر کردار پر پڑتا ہے۔ مگر اس میں بڑی رجائیت ہے۔ غالب کی عرفیت بھی مرزا نوشا

تمھیں تو شاعر ہونا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ جس نے یہ نام رکھا ہو گا اس کا مزاج ضرور شاعرانہ ہو گا۔" کہتے کہتے وہ رُک گیا اور حسبِ معمول چونک کر بولا۔ "بھئی معاف کرنا میں ذرا بہک گیا تھا۔ ہمارے ملک میں لوگوں کو ناموں کی نفسیات کا اتنا شعور ہی کہاں ہے۔ سچ پوچھو تو اتنا نفسیاتی شعور کہیں نہیں ہوتا ورنہ ایک اچھے بھلے انگریزی کے ادیب کا نام مسٹر ڈرنک واٹر نہ ہوتا۔ ڈرنک واٹر تم جانتے ہو۔ اس کا مطلب ہوا۔ پانی پیو۔ لاحول ولا قوۃ کیا مسخرا پن ہے۔ یہ کبھی بھلا کوئی نام ہوا"

وہ بے تکان بولتا جارہا تھا اور نوشا خاموش بیٹھا اس کا منہ تک رہا تھا۔ پروفیسر کی باتیں اس کی سمجھ میں مشکل سے دس فی صد آ رہی تھیں۔ اس لئے وہ بہت جلد اُکتا گیا۔ اُس نے تھکے ہوئے انداز میں جماہی لے کر انگڑائی لی۔ پروفیسر نے فوراً کہا۔ "اوہو تم کو نیند آرہی ہے۔ تم کو اب سو جانا چاہیئے"۔

نوشا نے فوراً کہا "میں اب جاؤں گا؟"

پروفیسر بولا۔ "رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ کیا اس وقت تمھارا جانا مناسب ہو گا"۔

نوشا کہنے لگا۔ "میں چلا جاؤں گا۔ آپ کوئی فکر نہ کریں"

پروفیسر کہنے لگا "تم مجھ سے آئندہ ضرور ملنا۔ تم ابھی عادی مجرم نہیں بنے ہو۔ میں نے دیکھا تھا کہ جب تم مجھ پر چاقو تانے کھڑے تھے، تو تمھارا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ میں نے اسی وقت بھانپ لیا تھا کہ تم ابھی اناڑی ہو"۔ لمحہ بھر کے لئے وہ رُکا "کیا تم کبھی جیل بھی گئے ہو"؟

نوشا نے بڑی سادگی سے جواب دیا "ہاں"

پروفیسر بڑبڑانے کے سے انداز میں کہنے لگا "تم جیل بھی جا چکے ہو، پھر بھی اناڑی ہو، سلسلے کی کوئی درمیانی کڑی ضرور غائب ہے۔ میرا سارا تجزیہ غلط ہو گیا"۔ پھر اُس نے چونک کر اُس کو دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے بولا "بہرحال تم مجھ سے ضرور ملو۔ آؤ میں تم کو دروازے تک پہنچا دوں"۔

اُس نے موم بتی اُٹھائی اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں زینے سے اُتر کر نیچے آئے اور گیلری کو عبور کر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ نوشا نے دروازے سے نکلتے ہوئے مڑ کر پروفیسر کو دیکھا۔ موم بتی کی

روشنی میں وہ ناٹک کے مسخرے کی طرح نظر آرہا تھا۔ نوشا سوچنے لگا: "یار کس اُول جلول سے سابقہ پڑ گیا تھا۔ سالا نہ جانے کون کون سی ایران توران کی ہانک رہا تھا۔ کہنے لگا یہ کام چھوڑ دو۔ پھر کیا کرو جھک مارو۔ کیا کیا اڑا رہا تھا۔ ڈاکٹر اور قانون داں اور نہ جانے کیا اناپ شناپ بنا رہا تھا۔ یعنی حد ہو گئی۔ بھلا میں ڈاکٹر کیسے بن سکتا ہوں۔ یہ تو تقدیر کی بات ہے۔ اپنی قسمت میں تو ہاتھ کی صفائی دکھانا لکھی تھی۔"

یہ سوچتے سوچتے اُس نے جیب سے پرس نکال کر دیکھا۔ اس میں ۱۰۰ سے کچھ اوپر روپے تھے۔ خوشی کے مارے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا: "یار اپنے کام کی بھی کیا بات ہے۔ منٹوں میں چاندی کٹتی ہے۔ استاد پیڈرو سچ کہتا ہے کہ یہ کچی کیمیا ہے۔ بس ذرا ہاتھ کی صفائی اور تھوڑی سے کاریگری ہے۔"

وہ اسی طرح سوچتا ہوا، آہستہ آہستہ اڈے کی طرف چل دیا۔

●

۴

نوشا جب اڈے پر پہنچا تو رات کے ساڑھے گیارہ کا عمل تھا مگر استاد پیڈرو کی محفل جمی ہوئی تھی۔ وہ دیوار سے پیٹھ لگائے کسی مہنت کی طرح آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ چاروں طرف جیب کترے حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ کمرے کے اندر تمباکو کا دھواں بھرا تھا اور ملی جلی آوازوں کا شور گونج رہا تھا۔ نوشا کو دیکھتے ہی استاد کی تیوری پر بل پڑ گیا۔ کہنے لگا۔

"کیوں بے تو ابھی تک کہاں تھا؟"

نوشا نے آہستہ سے کہا "ذرا سنیما چلا گیا تھا"

استاد پوچھنے لگا "اور تو اُستاد اللہ رکھو کے علاقے میں کیوں گیا تھا۔ میں نے ہزار دفعہ کہا کہ بولٹن مارکٹ کے اس پار کا علاقہ اپنا نہیں ہے۔ پر تم تو سالوں اپنی ماں کے یار ہو۔ ابے تو وہاں اپنی باندگی دکھانے کیوں گیا تھا۔ استاد اللہ رکھو کے کاریگر تم سے پتلا موتتے ہیں سالوں تم خواہ مخواہ دلوں میں پھیر ڈلوادو گے۔" استاد پیڈرو نے اس کو گھور کر دیکھا۔ لا نکال جھکوں کی رانی (گرہ کٹی سے آئی ہوئی رقم کے لئے یہ استاد پیڈرو کی اپنی مخصوص اصطلاح تھی) کو"

نوشا پہلے تو سٹپٹایا کہ ضرور کچھ گول مال ہے۔ اُستاد کو کہیں سے سراغ لگ گیا ہے۔ مگر یہ رقم وہ استاد کو دینا نہ چاہتا تھا۔ ڈھٹائی سے بولا "میں تو اس طرف گیا کبھی نہیں۔ آغا بلیلی ہوگا، یہی اس طرف بہت جاتا ہے۔"

آغا پلپلی ایک کونے میں سکڑا سکڑایا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اُس نے اپنی سوکھی بے ڈول گردن نکال کر نوشا کو دیکھا اور ناک میں منمنانے کے بعد بولا " اماں دیکھ رہے ہو اُستاد، سالا خواہ مخواہ کے لئے مجھ سے فداشیشن کر رہا ہے۔ وہ رانپٹا دوں گا کہ بتیسی نکل پڑے گی۔ میں تو دو پہر سے بخار میں پڑا بھی رہا ہوں اور یہ سالا اپنی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " استاد پیڈرو نے اُس کو ڈانٹ دیا۔

" اچھا بند کر اپنا یہ لکچر، بہت کہہ چکا " پھر وہ دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کی طرف مخاطب ہو کر بولا " کیوں جی تم نے خود اسے دیکھا تھا " اُس نے نوشا کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بولا " ہاں جی، یہی لونڈا تھا۔ شام سے یہ تر کا کے پیچھے منڈلا رہا تھا" نوشا نے اس عرصہ میں پہلی بار اُس کو دیکھا۔ وہ دوہرے بدن کا مضبوط نوجوان تھا اور گردن اونچی کیے بڑی بیباکی سے بول رہا تھا۔ " اُستاد میں نے کئی بار اس کو اشارہ بھی کیا کہ یہ اپنا گاہک ہے۔ ایک بار ٹوپ ٹاپ بھی مارا تو یہ آنکھیں نکال کر کھڑا ہو گیا "

اُستاد پیڈرو مسکرانے لگا " یار تو بھی کیا بات کر رہا ہے۔ اس سالے کو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ یہ سالا سمجھے گا یہ اُستادی کے گُر۔ ابھی تو ۔۔۔ " اُستاد نے ایک گندی سی گالی دی۔

" وہ تو میں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ ابھی اناڑی ہے "

نوشا ہٹ دھرمی پر اُتر آیا۔ کہنے لگا " اماں بے فضول میں میرے اوپر الزام لگا رہے ہو۔ میں نے تو تم کو دیکھا بھی نہیں " وہ خونخوار نظروں سے اس کو گھورنے لگا۔ اسی وقت استاد نے ایک زناٹے کی گالی دے کر کہا۔

" اب چپکا بھی رہے گا کہ حق حق کیے جائے گا۔ تیری ساری کھٹکا شاہی کا ابھی پتہ چلے جاتا ہے "

نوشا نے چوری کا بٹوہ پھینک دیا تھا اور نوٹ پتلون کی موری میں سوراخ کر کے چھپا دیے تھے اُسے اطمینان تھا کہ وہاں تک کسی کی نظر نہ جائے گی۔ لہٰذا اس نے جھک کر کہا " جھوٹ بول رہا ہوں تو میری تلاشی لے لو " اُستاد نے گردن ہلا کر کہا۔

" کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں تجھ کو یوں ہی چھوڑ دوں گا " یہ کہہ کر اُس نے جگرم کو اشارہ کیا۔

"دیکھ بے ناوا اسی کے پاس ہے یا کہیں رکھ آیا۔ ذرا انٹی لگا کے یہ بڑا حرامی دکھے ہے"

چکرم نے دونوں ہاتھ پکڑ کے نوشا کو کھڑا کر دیا۔ استاد نے ڈانٹ کر کہا۔ "ہاتھ اوپر کر" نوشا نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ چکرم تلاشی لینے لگا۔ استاد بلی کی طرح تیز نظروں سے نوشا کو گھورتا رہا۔ چکرم نے ہر جگہ ٹٹولا، جسم کا ایک ایک۔ گوشہ کریدا مگر رقم برآمد نہ ہوئی۔ ایک بار وہ اپنے ہاتھوں کو تھپکی دیتا ہوا اوپر سے نیچے تک آیا تو استاد کی تجربہ کار نظر نے تاڑ لیا کہ جب چکرم کا ہاتھ پیروں پر آیا تو نوشا ذرا سا بدکا تھا اُس نے نوشا سے کہا۔

"ذرا میرے کنے تو آئیو"

نوشا اُس کے پاس آگیا۔ استاد کا ہاتھ سیدھا پتلون کی موری پر پہنچا۔ اُس نے اُنگلی ڈال کر نوٹوں کا خلیتہ نکالا اور اس کو بے نیازی سے اٹھا کر سامنے ڈال دیا۔ سب نے حیرت سے اُس کو دیکھا۔ نوشا کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ اُستاد پیڈرو نے قہر آلود نظروں سے نوشا کو دیکھا اور ڈانٹ کر بولا۔

"ابے میرے سے ٹرکیں کرنے چلا تھا۔ تیرے جیسے نہ جانے کتنے لونڈے اس ٹانگ کے نیچے سے نکل چکے ہیں۔ ہم ۲۰، ۲۵ سال ہو گئے ہیں یہ کام کرتے ہوئے۔ جھک نہیں ماری ہے" اُستاد پیڈرو نے دونوں کانوں کو پکڑ کر گردن ہلائی "پھر ایسے اُستاد کا شاگرد ہوں کہ ولایت تک اُس کی تصویریں کھنچ کر گئیں" اُستاد پیڈرو دیر تک یوں ہی لیکچر دیتا رہا۔ پھر اُس نے چکرم سے کہا۔

"ذرا گن تو کتنی رقم ہے؟"

چکرم نے مڑے تڑے نوٹوں کو اٹھا کر گنا اور اُستاد سے کہنے لگا "ایک سو تراسی ہیں" اُستاد پیڈرو نے اللہ رکھو کے آدمی سے پوچھا "کیوں جی تمہارا حساب کیا کہتا ہے۔ ٹھیک ہے رقم؟"

وہ بولا "ہاں جی بس اتنا ہی ہمارا اندازہ تھا"

"لو یہ سبنھالو اپنی امانت"

اُستاد نے نوٹ چکرم سے لے کر اُس کو دیدیئے۔ اُس نے نوٹ لے کر گنے اور اس میں سے کچھ

نوٹ نکال کر اُستاد کے آگے ڈال دیے اور اس سے کہنے لگا "یہ ۴۸ روپے ہیں۔ ۲۵ فی صدی کے حساب سے تمھارا اتنا ہی حقتانا بنتا ہے۔ اگر تمھارا ریٹ کچھ اور ہو تو وہ بتا دو"

استاد کہنے لگا "نہیں جی! یہی ٹھیک ہے"۔

وہ آدمی اٹھ کر جانے لگا تو پیڈرو نے کہا۔ "استاد اللہ رکھو سے میرا سلام بول دینا اور اُن سے کہہ دیجیو کہ لونڈا ابھی اناڑی ہے۔ قاعدہ قانون نہیں جانتا۔ ویسے میں اس کی اچھی کندی کر دوں گا"

اللہ رکھو کا آدمی چلا گیا تو کمرے کے اندر سناٹا چھا گیا۔ نوشا کی سٹی گم تھی کہ اب اس کی شامت آنے والی ہے۔ وہی ہوا۔ استاد پیڈرو نے اُس کو ذبح کرنے والی تیز نظروں سے گھور کر دیکھا اور گالیاں دے کر اس کی ماں اور بہن کے ساتھ کچھ عجیب و غریب رشتے جوڑے۔ کہنے لگا۔

"سالے تو مجھے چک پھیریاں دیتا ہے۔ حرام کے تخم نے میری ناک کٹوا دی، کیا کہے گا اللہ رکھو کہ سالے پیڈرو نے نہ جانے کیا الم غلم شاگرد رکھ چھوڑے ہیں۔ اس کمنی والے سے ابھی یوں ہی لگتی ہے شہر کے ایک ایک اڈے پر یہ بات پہنچ جائے گی۔ تف ہے سالی ایسی استادی پر۔ ساری عزت کرکری ہو گئی"۔

نوشا ملزموں کی طرح سر جھکائے سہما ہوا بیٹھا رہا۔ استاد غصہ کے عالم میں چیختا رہا۔ پھر اُس نے قادر سے کہا۔ "او قادرا! لگا اس حرام کے جنے کے دو چار ٹھڈ"

قادر نے اٹھ کر نوشا کے ایک ہی ٹھڈ لگایا تھا کہ وہ تکلیف سے بلبلا کر چیخنے لگا۔ اُستاد نے قادر کو ہدایت دی "ابے ذرا دبا کے، کیا نخروں کے سے ہاتھ چلا رہا ہے۔ یہ سالا تو یونہی فیں فیں مچا رہا ہے"۔

قادر نے کودنے کے سے انداز میں دونوں بازوؤں کو تولا۔ پہلے داہنے ہاتھ کو ذرا سا ترچھا کیا اور کہنی کی ہڈی کی بھرپور ضرب لگائی۔ ایک، دو، تین۔ وہ تابڑ توڑ ٹھڈ لگاتا چلا گیا۔ قادر ہٹا کٹا ریل جوان تھا۔ بھاری بھرکم جسم تھا۔ ایک ایک بازو کا وزن پنج سیریوں میں تھا۔

پہلے تو نوشا زور زور سے چلایا، پھر اُس کی آواز حلق سے غیں غیں کر کے نکلنے لگی اُس کا منہ کھلا ہوا تھا اور چہرہ وحشتناک نظر آ رہا تھا۔ وہ مچھلی کی طرح فرش پر لوٹنے لگا۔

نہ جانے، وہ دلیو کا دلیو قادر کب تک اپنے فن کا مظاہرہ کرتا کہ اسی اثنا میں اُستاد کی آواز اُبھری

"بس بے۔ سالے کو ذرا سانس تو لینے دے"

قادر اپنی جگہ پر جاکر بیٹھ گیا اُس کا چہرہ گینڈے کی طرح نظر آرہا تھا اور وہ آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔ کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے سارے جیب کترے دم بخود تھے۔ نوشا ابھی تک فرش پر تڑپ رہا تھا۔ اُستاد پیڈرو نے ایک ٹانگ اٹھاکر دوسری ٹانگ پر رکھ لی اور جسم کو ہولے ہولے حرکت دینے لگا۔ سامنے دیوار پر اُس کا مہیب سایہ، بھوت کی طرح جھوم رہا تھا۔

کئی منٹ اسی عالم میں گذر گئے۔ ہر شخص خاموش تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی، نہ آواز۔ نوشا تڑپتے تڑپتے تھک کر شل ہوگیا تھا اور زور زور سے ہانپتا رہا۔ کمرے کے سکوت میں اُس کی بوجھل سانسوں کی آواز صاف سُنائی پڑ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد استاد کی بھاری بھرکم آواز اُبھری۔ وہ نوشا سے کہہ رہا تھا "اُٹھ کے بیٹھ بہت ہوچکا نخرہ نہیں تو سالے دو چار ہاتھ اور لگواؤں گا، جو کسر رہ گئی ہے، وہ بھی پوری ہو جائے گی"۔

نوشا گھبرا کر اٹھ بیٹھا اُس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ بال بکھر کر منہ پر آگئے تھے وہ منہ بسور بسور کر آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ مگر اُستاد پیڈرو اس کی اس دگرگوں حالت سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ چکرم کو اشارہ کرکے بولا۔

"سالے کو تھوڑا سا زندہ طلسمات پلا۔ پھر اس کو چلتا کیا جائے"۔

چکرم کمرے سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ قارورے کی شیشی لئے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اس میں زرد زرد پیشاب بھرا ہوا تھا۔ شیشی کو دیکھتے ہی نوشا چیخنے لگا۔

"استاد، اللہ کے لئے چھوڑ دو۔ مرجاؤں گا"۔

"اب غلطی کروں تو جان سے ماردینا"۔

وہ دہائی دیتا رہا مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔ اُستاد پیڈرو کی ہدایت پر ایک جیب کترا اُس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو دبوچ لیا۔ دوسرے نے اُس کا منہ چیر دیا۔ چکرم نے قارورے

کے کئی قطرے اس کے حلق میں ڈال دیئے۔ اس کے بعد نوشا کو چھوڑ دیا گیا۔

نوشا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں اور وہ زور زور سے اُبکائیاں لے رہا تھا۔ اُستاد ڈانٹ کر بولا "باہر جا کر الٹی کیجیو۔ سالے یہاں گندگی پھیلائی، تو ابھی اور "زندہ طلسمات" پلواؤں گا۔ اب جا رہا ہے کہ نہیں"۔

نوشا لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ کمرے میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ تھوڑی دیر بعد نوشا کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا تو اُستاد نے کہا۔

"اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ تم ابھی اپنا ٹین پاٹ یہاں سے گول کرو"

نوشا نے مری ہوئی آواز سے کہا "استاد میں خدا قسم تم سے سب کچھ سچ سچ بتائے دیتا ہوں بات یہ ہے۔"

اُستاد چیخ کر بولا "اب تو اپنی بات کو اپنے ہی ساتھ رکھ"

"میری بات تو سن لو اُستاد"

"میں تجھے اچھی طرح جان گیا ہوں، تو ایک نمبر حرام کا تخم ہے" یہ کہہ کر اُستاد پیڈرو نے ایک دس روپے کا نوٹ اُس کی طرف پھینکا اور حقارت سے بولا "لو سالے خاں یہ اپنے کفن کے لئے بھی لیتے جاؤ۔ یہ کام تیرے بس کا نہیں۔ تو تو مجھے بھڑوا دِکھے ہے۔ اُنہی کی طرح پُڑیاں نکالتا ہے اب جا کے اپنی ماں کے لئے کوئی یار ڈھونڈ" اس بات پر نوشا نے اس کو گھور کر دیکھا۔ اُستاد نے ڈانٹ کر کہا "سالے آنکھیں کیا دکھا رہا ہے۔ جا کے تھانے پہ رپٹ لکھا دیجو کہ اُستاد پیڈرو جیب کتروں کا اڈہ چلاتا ہے۔ تجھے کبھی قسم ہے جو جا کے نہ کہیو۔ پر یہ بھی سُن لے کہ دو ہزار روپے مہینہ نقد کھلاتا ہوں۔ سالے کسی اور ہوا میں نہ رہنا، تو یہ سمجھ رہا ہو کہ میں اُستاد کا کچھ بگاڑ سکتا ہوں؟"

نوشا نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ کھڑا رہا۔

اُستاد نے ڈانٹ کر کہا "ابے تو جا رہا ہے یا کچھ اور تیری کُندی کرا دُوں۔ تجھے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون آ رہا ہے۔ بس اب تو چلا ہی جا۔"

نوشا نے دس روپے کا نوٹ اٹھایا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اڈے سے باہر آگیا۔

رات اب آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔ نوشا نے سوچا رات کہاں کاٹے۔ اچانک اس کو راجہ کا خیال آگیا۔ مگر اس کی یاد آتے ہی وہ جھنجھلا گیا۔ اس سالے کی تو تقدیر ہی کھوٹی ہے۔ سوچا تھا کہ اس رقم سے اس کا علاج کرادوں گا۔ اپنا پلپتھن ہو کے رہ گیا۔ نہ رہنے کو ٹھکانہ ہے، نہ کوئی کام کاج۔ وہ اسی طرح سوچتا ہوا، آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ سیدھی سڑک پر وہ دور تک چلا گیا۔ راستہ سنسان پڑا تھا۔ سناٹے میں کہیں زور زور سے کتے بھونک رہے تھے۔ گشت کرنے والا ایک کانسٹبل اس کے قریب سے گذرا تو اس نے بڑی مشتبہ نظروں سے اس کو دیکھا۔ نوشا گھبرا گیا۔ اس طرح سڑکوں پر آوارہ گردی کرنا مناسب نہیں تھا۔ سردی بھی تھی اور وہ بہت تھکا ہوا بھی تھا۔ آخر وہ ایک درخت کے نیچے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔

رات دیو کی طرح سر اٹھائے کھڑی تھی۔ سردی بڑھتی جارہی تھی شبنم کے قطرے درختوں کی پتیوں سے ٹپ، ٹپ، فٹ پاتھ پر گر رہے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک شخص گٹھری کی طرح سکڑا سکڑایا پڑا تھا۔ اس کو کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ مزے سے بے خبر پڑا سو رہا تھا اور نوشا کو سردی کے مارے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے سر کو گھٹنوں پر رکھ لیا اور آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اسی طرح بیٹھے بیٹھے ایک دفعہ اس نے قریب پڑے ہوئے آدمی کو دیکھا۔ اچانک اس کو خیال آیا کہ اس شخص پر ذرا ہاتھ کی صفائی کا تجربہ کرنا چاہیے۔ یہ سوچتے ہی اس کی انگلیاں چلبلانے لگیں۔ وہ کھسک کر اس کے قریب ہو گیا اور ہاتھ بڑھا کر اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ وہ ایک بوسیدہ اونی کوٹ پہنے تھا۔ اس کی ایک جیب سے کاغذوں کے چند پرزے اور ایک ٹوٹا ہوا کنگھا نکلا۔ دوسری جیب بالکل خالی تھی۔ البتہ اندر کی جیب سے ایک روپے کا نوٹ اور چند آنے کی ریزگاری نکلی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی جیب سے ایک پاسپورٹ سائز کی تصویر بھی نکلی۔ تصویر کو اس نے دھندلی روشنی میں دیکھا۔ اس میں گول مٹول سا ایک بچہ بیٹھا ہمک رہا تھا۔ اس تصویر کا مقصد

اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پہلے تو نوشا نے سوچا کہ رقم کو صاف کر دے۔ مگر پھر یہ خیال کر کے اُس کو جیب میں رکھ دیا کہ سالا کبھو کا مر جائے گا۔ خواہ مخواہ کون سے دے گا۔ اُسے اس بات پر خوشی ہوئی کہ اب وہ بہت صفائی سے کام کر لیتا ہے۔ اُس نے اس آدمی کی تمام جیبوں کی تلاشی لے ڈالی مگر اس کے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

شبنم سے اُس کے بال بھیگ گئے تھے اور سردی کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ بار بار اُس کا جسم کانپ اٹھتا۔ نیند آنے کا کوئی امکان معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا اُس نے یہ مناسب سمجھا کہ کوئی نہ کوئی چائے خانہ ابھی کھلا ہوگا، وہاں جا کر چائے پی جائے۔ وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ پھر ایکا ایکی نوشا کو اس آدمی کا خیال آ گیا، جو بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ اُس کو خبردار کر دے، ورنہ کوئی اس کا بھائی بند جیب صاف کر جائے گا اور سویرے اٹھ کر اس کے پاس چائے پینے کو بھی کچھ نہ ہوگا۔

اُس نے جھک کر اُس کو جھنجوڑا اور بے تکلفی سے بولا "اے کبھی نیند کے متوالے" مگر وہ نہ اٹھا۔ ایکا ایکی نوشا کو محسوس ہوا کہ اُس کا ہاتھ برف کی طرح سرد ہے اور جسم لکڑی کی طرح اکڑا ہوا ہے۔ نہ جانے وہ کب کا مرا ہوا پڑا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ خوف سے کانپ اٹھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ لاش اس سے چمٹ گئی ہے۔ وہ تیز تیز قدموں سے فوراً آگے بڑھ گیا اور پیچھے مڑ مڑ کر لاش کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اُسے بار بار ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی دبے دبے قدموں سے اُس کا تعاقب کر رہا ہے۔

اسی گھبراہٹ کے عالم میں وہ ایک ایرانی چائے خانہ میں داخل ہوا۔ وہاں اس وقت خوب چہل پہل تھی۔ شب زندہ داروں کا ہجوم تھا۔ قہقہے لگ رہے تھے، باتیں ہو رہی تھیں۔ ان میں رکشا والے تھے، وکٹوریہ والے تھے، پولیس کے کانسٹبل تھے اور آوارہ گرد لوگ۔ نوشا نے گرم گرم چائے کے دو چار گھونٹ پیئے تو ذرا سکون ملا۔ ایک پیالی چائے ختم کرنے کے بعد اُس نے دو مسکہ بن کھائے اور ایک اور گرم گرم ڈبل چائے چڑھا لی۔ مگر ابھی تک وہ سنبھل نہیں سکا تھا۔ اُسے رہ رہ کر

اس مرے ہوئے آدمی کا خیال آ رہا تھا۔ جس کی جیبوں سے اُس نے ایک روپیہ اور دو آنے نکالے تھے یہ احساس بڑا اذیت ناک تھا۔ وہ بار بار سوچتا کہ "یہ گرہ کٹی کا پیشہ سالا بڑا واہیات ہے۔ یار اس پیشے کو تو چھوڑ ہی دینا چاہیے"۔ مگر سوال یہ تھا کہ وہ پھر کرے گا بھی کیا۔ اچانک کوئی اُس کے وجود کے اندر سے بولا۔ "دنیا میں سب جیب کترے ہی تو نہیں ہیں"۔ اس خیال سے اُسے کسی قدر تقویت پہنچی۔

وہ بہت دیر تک چائے خانہ میں بیٹھا رہا۔ جب صبح کے آثار پیدا ہو گئے اور ہلکی ہلکی سفیدی آسمان کے کناروں پر اُبھرنے لگی تو وہ چائے خانے سے نکل کر باہر آ گیا اور سڑکوں کی آوارہ گردی شروع کر دی۔

دن بھر وہ کام دھندے کے لئے مارا مارا پھرتا رہا۔ مگر وہ دن اُس کا بیکار گیا۔ رات اُس نے ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں گذاری۔ کئی روز تک یہی سلسلہ رہا۔ دن سڑکوں اور چائے خانوں میں گذرتا اور رات مسافر خانے میں لیکن اس کے ۱۰ روپے ختم ہوتے جا رہے تھے اور اس احساس سے وہ گھبرا جاتا۔ آخر ایک ورکشاپ میں اُسے موٹروں کے کلینر کا کام مل گیا۔ ۵۰ روپے مہینہ تنخواہ اور صبح ۸ بجے سے ۶ بجے شام تک کی ڈیوٹی۔ جمعہ کو ورکشاپ بند رہتا اس کی تنخواہ کٹ جاتی۔ یہ سب شرائط اُس نے قبول کر لیں اور کام شروع کر دیا۔

کام تو مل گیا مگر رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اچانک اُسے پروفیسر کلیم اللہ کا خیال آیا اُس نے سوچا، چل کر اس سے ملا تو جائے، باتیں بہت کرتا تھا، شاید کچھ کام بن جائے۔ چنانچہ ایک شام ورکشاپ سے نکل کر سیدھا پروفیسر کے ہاں گیا۔ وہ اس وقت گھر پر موجود تھا۔ اُس کو دیکھتے ہی بولا

"آخر تم آ ہی گئے، مجھے یقین تھا کہ تم میرے پاس ضرور آؤ گے"

نوشا کہنے لگا "میں نے پُرانا دھندا چھوڑ دیا ہے اور موٹروں کے ایک کارخانے میں نوکری کر لی ہے"

پروفیسر ہو، ہو کر کے بڑے بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔ اس خبر سے اُس کو بڑی خوشی ہوئی۔ کہنے لگا "بہت اچھا، بہت اچھا۔ تم تو انجینیر بن سکتے ہو"۔ اُس نے نوشا کے موبل آئل سے داغدار لباس

کو غور سے دیکھا "تم تو ابھی سے انجنیئر لگنے لگے" وہ اُس کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دینے لگا۔

نوشا نے موقعہ غنیمت جان کر مطلب کی بات کہہ دی "کام تو مل گیا۔ مگر رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اسٹیشن جا کر مسافر خانے میں پڑ رہتا ہوں"

پروفیسر ذرا دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر اُس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا "نہیں! میں تم کو رہنے کے لئے جگہ دوں گا۔ ضرور دوں گا" اُس نے فوراً اپنی بیٹی کو بلایا۔ جب نادرہ آ گئی تو وہ اُس سے کہنے لگا۔ "نادرہ ان سے ملو۔ یہ نوشا ہیں۔ ہمارے دوست۔ اگر تم کو دوست کے لفظ پر اعتراض ہے تو میں اس لفظ کو واپس لے لیتا ہوں۔ بہر حال یہ ہمارے مہمان ضرور ہیں۔ یہ ہمارے ساتھ ہی ٹھہریں گے"

وہ بولی:۔ "مگر پاپا، گھر میں جگہ کہاں ہے؟"

"وہ ایک احمقانہ سی مثال ہے۔ جگہ دل میں ہونا چاہیے۔ تو اس وقت جگہ دل ہی میں نکالنا پڑے گی۔ دل نہیں، دماغ! دماغ سے سوچو کہ کہاں جگہ نکل سکتی ہے"

نادرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پروفیسر ذرا دیر تک بے چینی سے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر اُس نے چٹکی بجا کر کہا "یہ ٹھیک رہے گا۔ کھانے کے کمرے سے میز اٹھا کر تم گیلری میں لگا دو۔ کیا مضائقہ ہے کھانا ہی تو کھانا ہے۔ گیلری بھی بُری جگہ نہیں۔ جس شہر میں ایک انسان کو سر چھپانے کے لئے چھت تک میسر نہ آئے، وہاں کسی کو ڈائننگ روم رکھنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ کمینگی ہے۔ میں اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔"

نادرہ پروفیسر کی عادت سے بخوبی واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جو کچھ ایک بار طے کر لیتا ہے اُس کو پورا کئے بغیر نہیں رہتا۔ لہٰذا اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئی اور گھر کے بوڑھے ملازم کی مدد سے کھانے کی میز نکال کر گیلری میں ڈال دی اور کمرہ نوشا کے لئے خالی کر دیا۔

پروفیسر نے اُس کے لئے چارپائی اور بستر کا بھی بندوبست کر دیا۔ اس رات نوشا کئی راتوں کے بعد گہری نیند سویا۔ سویرے ہی سویرے پروفیسر کی آواز سُن کر نوشا جاگ اٹھا۔ پروفیسر اُس کو چائے

کے لئے بلا رہا تھا۔ اُس نے غسل خانے میں جا کر جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور گیلری میں آگیا۔ پروفیسر اور نادرہ میز پر بیٹھے تھے۔ جس پر چائے اور ناشتے کا سامان دھرا تھا۔ وہ وہاں بیٹھتے ہوئے جھجکنے لگا تو پروفیسر نے کہا۔

"تم شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو۔ آؤ آؤ بیٹھو"

نوشا سکڑا سکڑایا کرسی پر بیٹھ گیا۔

پروفیسر نے پھر کوئی بات نہیں کی اور اخبار کے مطالعے میں محو ہو گیا۔ نادرہ نے اُس کو چائے بنا کے دی۔ ٹوسٹ اور ایک انڈا دیا۔ نوشا آہستہ آہستہ چائے پیتا رہا۔ وہ بڑا گھبرایا ہوا نظر آرہا تھا۔ اُس کو ہر چیز اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔

اُس روز وہ ورکشاپ پہنچا تو اس کی طبیعت بڑی ہشاش بشاش تھی۔ کام بھی محنت سے کیا گیا اور پہلی بار اُسے ورکشاپ سے چھٹی ہونے کے وقت خوشی محسوس ہوئی۔ وہ سیدھا گھر آیا اور غسل خانے میں دیر تک نہاتا رہا۔ رات کا کھانا بھی اُس نے پروفیسر ہی کے ساتھ کھایا۔

چند ہی روز کی رہائش کے بعد اُسے یہ محسوس ہونے لگا کہ اُس کی زندگی میں بڑی تیزی سے تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ وہ اب سڑکوں کی آوارہ گردی اور گھٹیا چائے خانوں میں وقت گذارنے کے بجائے زیادہ تر گھر ہی پر رہتا۔ اُس کی زندگی میں کسی قدر باقاعدگی اور نظم و ضبط پیدا ہوتا جا رہا تھا۔

فصل دهم

۱

سلمان کو کراچی آئے ہوئے کئی ماہ کا عرصہ ہوگیا تھا چچیا سسر کے رسوخ کی بدولت اُس کو ایک غیر ملکی فرم میں ملازمت مل گئی تھی۔ چار سو روپے ماہوار تنخواہ تھی کام بھی زیادہ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ پانچ ہزار روپے جو اُس کو سسرال سے سلامی میں ملے تھے اس رقم میں سے ۴ ہزار روپے پگڑی دے کر اُس نے شہر کے ایک بارونق علاقہ میں رہائش کے لئے ایک فلیٹ بھی لے لیا تھا اس میں تین کشادہ کمرے تھے۔ فلیٹ روشن اور ہوادار تھا۔ پاس پڑوس بھی بُرا نہیں تھا اس بلڈنگ میں زیادہ تر پارسی اور عیسائی آباد تھے۔ اُن کے رہن سہن میں نفاست تھی، البتہ ایک پہر رات تک خوب ہنگامہ رہتا تھا۔

آمدنی معقول تھی۔ مزے سے گذر بسر ہو رہی تھی۔ سلمان زیادہ تر گھر ہی پر رہتا اور اپنا بیشتر وقت مطالعہ پر صرف کرتا۔ ان دنوں اُس کا ایک ہی مشغلہ تھا۔ ہر مہینے کی شروع تاریخوں میں وہ نئی نئی کتابیں خرید کر لایا کرتا۔

فلیٹ کا ایک کمرہ اس نے مطالعہ کے لئے وقف کردیا تھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی لائبریری بن گئی تھی۔ کتابوں کی دو الماریاں ایک مطالعہ کی میز اور ایک صوفہ سیٹ لگا کر اُس نے کمرے کو قرینے سے آراستہ کیا تھا۔ کچھ فرنیچر اُس نے خریدا تھا، کچھ وہ کرایہ پر لے آیا تھا۔

شہر میں اُس کا کوئی شناسا نہیں تھا اور نہ کسی کے ساتھ اُس نے مراسم بڑھانے کی کوشش

کی۔ دفتر میں کام کرنے والے ساتھیوں سے اس کو کبھی رغبت پیدا نہ ہوئی۔ یوں وہ حتی الوسع کوشش کرتا تھا کہ کسی کو شکایت کا موقعہ نہ ملے۔ کراچی آ کر اس نے زندگی میں بڑی باقاعدگی پیدا کر لی تھی۔ چند موٹے موٹے اصول وضع کر لئے تھے۔ ان میں ایک اُصول یہ بھی تھا کہ وہ دفتر کے کسی شخص سے بدمزگی پیدا نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ وہاں اس کو روزانہ سات گھنٹے گذارنا پڑتے تھے۔ البتہ دفتر سے باہر آنے کے بعد، وہ اس ماحول کو اس فضا کو یکسر فراموش کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ دفتر کے کسی ساتھی کے ساتھ اُس کے تعلقات دفتر کی چہار دیواری سے آگے نہ بڑھ سکے۔

اتوار کے دن وہ عام طور پر میٹنی شو دیکھا کرتا یا پھر سمندر کے کنارے کسی پُرفضا مقام پر چلا جاتا اور گھنٹوں ریت پر بیٹھا شور مچاتی ہوئی لہروں کو دیکھا کرتا۔ اس کی زندگی میں ایک طرح کا سکون پیدا ہو گیا تھا اور وہ کسی حد تک اُس سے مطمئن بھی تھا۔ کبھی کبھی اس کو کھانے کی دقت کا ضرور احساس ہوتا۔ ہوٹل کے کھانے سے وہ اُکتا گیا تو اُس نے ایک خانساماں رکھ کر گھر پر کھانا پکوانے کا پروگرام بنایا مگر وہ ہفتہ بھر بھی نہ ٹکا۔ ایک روز وہ واپس لوٹا تو ملازم غائب تھا۔ ٹرنک کا تالا ٹوٹا پڑا تھا۔ خیریت یہ ہوئی کہ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں اور اس میں کُل ۴۲ روپے پڑے تھے۔ اِن ۴۲ روپوں کے علاوہ وہ کچھ کپڑے بھی چُرا کر لے گیا۔ نقصان زیادہ نہیں ہوا تھا۔ مگر اسی روز اُس نے طے کر لیا کہ وہ ملازم نہیں رکھے گا۔ دوسرے روز اُس نے بیوی کو بُلانے کے لئے خط لکھا اور ہر خط میں اصرار کرنے لگا۔

جاڑوں کی ایک کہر آلود صبح کو وہ کراچی پہنچ گئی۔ اُس کے ہمراہ ایک بوڑھی خادمہ بھی تھی۔ وہ بیوی کو لینے صبح تڑکے ہی اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔ ٹرین کچھ لیٹ تھی۔ اس انتظار میں اُس نے ایک خاص کیف محسوس کیا۔ یہ ایک ایسی مسرت تھی، جو وہ بہت عرصہ کے بعد محسوس کر رہا تھا۔

گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچی تو اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ انٹر کلاس کے زنانہ ڈبے سے اُس کی بیوی، بوڑھی خادمہ کے ساتھ اُتری۔ وہ سیاہ برقعہ پہنے ہوئے تھی اور بہت شرمائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ گھر آ کر بھی اُس کا یہی انداز رہا۔ بات کرتی تو اُس کی نگاہ نیچے جھکی رہتی اور چہرے پر کچھ عجیب

سی پریشانی نظر آتی۔

اُس روز اُس نے دفتر سے چھٹی نہیں لی تھی۔ لہٰذا وہ فلیٹ میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا اور دفتر روانہ ہو گیا۔ سہ پہر ہونے تک اُس کا دل کام سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ اس دن وہ جلد ہی گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ دفتر سے وہ نکلا تو بہت خوش تھا۔ دفتر کے ایک ساتھی سے اُس نے ۲۵ روپے اُدھار لے لیے تھے۔

دفتر سے نکل کر وہ گھر جانے کے بجائے سیدھا بازار گیا۔ وہاں سے اُس نے حلوہ سوہن خریدا، تازہ پھل لیے اور گل فروش کی دوکان سے پھولوں کا ایک گلدستہ بھی خرید لیا۔ گھر پہنچا تو بیوی چائے کے لیے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے شاید کچھ ہی دیر پہلے غسل کیا تھا۔ اُس کا صندلی چہرہ پھولوں کی طرح شگفتہ نظر آ رہا تھا۔ ہلکے آسمانی لباس میں وہ بڑی دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ سلمان کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اُس کی بیوی حسین ہے۔

چائے پیتے وقت وہ خواہ مخواہ کی باتیں کر کے اُس کو چھیڑتا رہا تاکہ اُس کا حجاب کسی قدر کم ہو جائے۔ وہ اس وقت ایک کھلنڈرے نوجوان کی طرح غیر سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ بات بات پر زوردار قہقہے لگاتا اور پھر اپنی اوٹ پٹانگ باتیں شروع کر دیتا۔ اُس کی یہ شام بڑی خوشگوار گذری۔

سلمان کو جلد ہی اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ اُس کی بیوی بڑی محنتی لڑکی تھی۔ وہ سورج نکلنے سے پہلے ہی بیدار ہو جاتی۔ اُس کے جوتوں پر پالش کرتی، کپڑوں پر استری کرتی، شیو کرنے کا سامان میز پر لگا دیتی۔ جتنی دیر تک وہ غسل کرتا، اس عرصہ میں وہ ناشتہ تیار کر کے میز پر لگا دیتی۔ گو کہ گھر میں خادمہ موجود تھی۔ مگر اُس کا سارا کام وہ خود ہی کرتی تھی اور اس میں اُس کو بڑی مسرت محسوس ہوتی تھی۔ سلمان نے اکثر غور کیا کہ اگر اُس نے کسی کام کے لیے خادمہ سے کہا تو اس کی بیوی خود ہی وہ کام کر دیتی تھی۔

شام کو وہ واپس آتا تو چائے تیار رہتی۔ وہ تھکا ہوا سا کرسی پر بیٹھ جاتا تو وہ اُس کے قدموں پر جھک کر جوتے کا فیتہ کھولنے لگتی۔ اس بات پر سلمان نے بیوی کو منع بھی کیا مگر وہ باز نہ آئی۔ اُس کے

کپڑے وہ خود ہی ہنگر پر ٹانگتی تھی۔ اُس کی ایک ایک چیز قرینے سے لگی ہوتی۔ حالانکہ وہ بیوی کے آنے کے بعد سے خاصا لاپرواہ ہوگیا۔ دفتر جاتا تو سارے کمرے کو کباڑ خانہ بنا کر ڈال دیتا مگر شام کو ہر چیز اپنی جگہ پر آراستہ ہوتی۔

یہ بڑے پُر کیف دن تھے اس کی صحت بہت اچھی ہوگئی۔ چہرے پر تازگی آگئی تھی اور وہ اچھا خاصا سجیلا جوان لگنے لگا تھا۔ لیکن ان دنوں وہ جس قدر باتونی ہوگیا تھا، بیوی اسی قدر خاموشی سے مانوس تھی۔ وہ بہت کم بات چیت کرتی تھی۔ کوئی بات اچھی لگتی تو صرف آہستہ سے مسکرا دیتی۔ اس کے سفید سفید دانت جھلکنے لگتے اور سرخ سرخ لب کپکپا کے رہ جاتے۔ سلمان کو اس کی مسکراہٹ بہت پسند تھی۔

کم گو ہونے کے باوجود وہ بڑی ملنسار لڑکی تھی۔ اُس نے کچھ ہی دنوں میں، پاس پڑوس میں خاصا میل جول پیدا کرلیا تھا۔ بلڈنگ کے عیسائی اور پارسی خاندانوں کی جوان عورتیں زیادہ تر دفتروں میں ٹائپسٹ یا اسٹینوگرافر تھیں۔ وہ تنگ اسکرٹ پہنتیں، مردوں کی طرح سر پر چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے بال رکھتیں اور اپنی تنخواہ کا ۸۰ فی صد حصہ میک اپ پر خرچ کرتی تھیں۔

پڑوس کے فلیٹوں میں رہنے والی یہ لڑکیاں، اب اکثر اس کے گھر میں نظر آتیں۔ وہ اٹھلا اٹھلا کر باتیں کرتیں۔ ان کی مسکراہٹ مصنوعی تھی، ان کی نظروں کا انداز مصنوعی تھا۔ جسم کی ہر حرکت مصنوعی تھی۔ وہ بنی سنوری کٹھ پتلیوں کی طرح نظر آتیں۔ ان کی باتیں عام طور پر لباسوں کے جدید ترین ڈیزائنوں، نئی فلموں، ڈانس پارٹیوں، پکنک اور شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں کے متعلق ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ شہزادی مارگریٹ کے کسی نئے اسکنڈل یا شاہ فاروق اور پرنس علی خاں کے نئے معاشقوں کے بارے میں بات کرلیتیں۔ ان کے تذکرہ میں وہ ایک خاص لذت محسوس کرتی تھیں۔

سلمان نے غور کیا کہ ان لڑکیوں کے ساتھ بڑھتے ہوئے میل جول نے اُس کی بیوی میں بھی بعض تبدیلیاں پیدا کرنا شروع کردی ہیں۔ وہ باتوں کے دوران میں خواہ مخواہ انگریزی کے بھونڈے الفاظ استعمال کرنے لگی تھی۔ اس نے بالوں کا انداز بدل دیا تھا اور چہرے پر ضرورت سے زیادہ میک اپ کرنے لگی تھی۔ اب اس کی یہ بھی خواہش ہوتی کہ وہ اس کے حسن کی تعریف کرے۔ پہلے وہ فلم دیکھنے

سے پرہیز کرتی تھی مگر اب وہ دبے دبے الفاظ میں فلم دیکھنے کا اشتیاق بھی ظاہر کرتی۔

ایک اتوار کو پکنک کا پروگرام بنا، جس کو پڑوس کی لڑکیوں نے بنایا تھا۔ انہی لوگوں نے ایک اسٹیشن ویگن کا بندوبست کیا تھا اور سب لد لدا کر ہاکس بے پہنچ گئے۔ اُس روز سلمان کی بیوی کا برقعہ بھی اُتر گیا۔ پارٹی میں خاصی تفریح رہی۔ انھوں نے سمندر میں غسل کیا۔ ریت پر لیٹ کر سورج کی شعاعوں سے جسم کو سینکا، بہت سی الم غلم چیزیں کھائیں، زور زور قہقہے لگائے اور جب سورج بحیرۂ عرب میں ڈوبنے لگا اور لہروں کا رنگ ارغوانی ہوگیا تو وہ تھکے ہارے واپس لوٹ آئے۔

اس کے بعد اکثر اتوار کو پکنک کی پارٹیاں ہوتی رہیں۔ سلمان ہفتہ کی شام کو بیوی کے ساتھ ایک پکچر ضرور دیکھتا، ہر دوسرے تیسرے دن بیوی کے ساتھ شام کو ٹہلنے نکل جاتا۔۔ دونوں کچھ شاپنگ کرتے اور کسی چائے خانے میں بیٹھکر چائے پیتے۔ مہینے کی شروع تاریخیں ہوتیں تو وہ شہر کے کسی اچھے ہوٹل میں جا کر کبھی کبھار رات کا کھانا بھی کھاتے۔

زندگی بڑے مزے سے گذر رہی تھی۔ البتہ اب اس میں سکون کم ہوگیا تھا اور ہنگامے زیادہ ہوگئے تھے مگر یہ ہنگامے اس طرح دبے قدموں آکر زندگی میں شامل ہوگئے تھے کہ سلمان کو اُن کا مطلق احساس نہ ہوا وہ ان سے رفتہ رفتہ مانوس ہوتا جارہا تھا۔ لیکن جس قدر یہ ہنگامے بڑھ رہے تھے، اس کا مطالعہ کا شوق کم ہوتا جارہا تھا پہلے وہ روزانہ ۴۰، ۵۰ اور کبھی کبھی تو سو، سوا سو صفحات تک پڑھ ڈالتا تھا۔ ان دنوں وہ رات کو دیر تک میز پر جھکا ہوا پڑھتا رہتا تھا۔ اُس کے چہرے پر ٹیبل لیمپ کے شیڈ کا ہلکا سبز عکس لہراتا رہتا۔ بیوی بار بار کروٹ بدلتی۔ خواہ مخواہ بات کرکے اس کو چھیڑتی مگر وہ مطالعہ میں محو رہتا۔ اب یہ محویت کم ہونے لگی تھی۔

بیوی میں شاپنگ کی عادت بڑھتی جارہی تھی۔ جوتوں اور سینڈلوں کی اُس نے درجنوں جوڑیاں خرید ڈالی تھیں۔ ہر فلم دیکھنے کے بعد وہ نیا لباس تیار کرانے کا پروگرام بناتی۔ میک اپ کا خرچ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ نت نئے لوشن خرید کر لاتی۔ کوئی غسل کرنے کے لئے مخصوص ہوتا،

کوئی صرف ہتھیلیوں کی جلد نرم کرنے کے لئے اور کسی سے چہرے کا رنگ نکھارا جاتا۔

جب بھی وہ دونوں بازار جاتے اکوئی شاپنگ نہ بھی ہوتی تو انگریزی کے فیشن میگزین ضرور خریدے جاتے، جن کو پڑھ پڑھ کر وہ روزانہ نئے انداز سے بال سنوارتی۔ ایسے لباس سیتی' جن سے سینے کی جلد زیادہ سے زیادہ عریاں نظر آتی اور اُن کی فٹنگ اس طرح ہوتی کہ جسم کا ایک ایک خم نظر آتا اب وہ کام کرنے سے بھی جی چرانے لگی تھی اور ہر وقت خادمہ کو احکامات دیتی رہتی۔ کام کرنے سے ہاتھوں کی جلد کھُردری پڑ جانے کا اندیشہ تھا اور زیادہ محنت سے رنگت سانولا جانے کا خطرہ تھا۔ البتہ اب وہ یہ فن ضرور جان گئی تھی کہ اپنی دلکشی کی زائد سے زائد کس طرح نمائش کی جائے۔ وہ خوبصورت لڑکی تھی۔ سج سجا کر شام کو چائے کی میز پر بیٹھتی تو کمرے کی ایک ایک بے جان چیز تک میں حرارت محسوس ہوتی۔ سلمان دفتر سے تھکا ماندہ آتا، اس کے دل آویز چہرے کو اور پھڑکتے ہوئے جسم کو دیکھتا تو ساری تھکن بھول جاتا اور اُس کی قربت میں کشش محسوس کرتا۔

آمدنی بنی تلی تھی اور اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ کتابوں کی خریداری کم ہوتے ہوتے صفر رہ گئی۔ مطالعہ بھی بند ہو گیا۔ تنخواہ ملنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔ بلکہ اکثر بلوں کی ادائیگی پھر بھی رہ جاتی۔ جن کو آئندہ ماہ پر ٹالنا پڑتا۔ سلمان اب سگرٹ گن گن کر پینے لگا تھا اور اپنی ضرورت کا سامان خریدنے سے حتی الوسع پرہیز کرتا۔ اب وہ اکثر بغیر استری کیا ہوا سوٹ پہن کر آفس چلا جاتا۔ دفتر میں ہر شخص سے اس کا لین دین ہونے لگا تھا اور کبھی کبھی اس کی ادائیگی میں تاخیر ہو جاتی تو بدمزگی پیدا ہو جاتی۔ پہلے وہ دفتر کے ساتھیوں سے مراسم بڑھانے سے کتراتا تھا۔ مگر اب کم از کم قرض خواہوں سے اُسے زیادہ گھُل مل کر رہنا پڑتا۔

سلمان کے مزاج میں رفتہ رفتہ چڑچڑا پن آتا جا رہا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر بیوی سے اُلجھ پڑتا اور پھر کئی کئی روز تک اس کا سلسلہ چلتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ وہ دفتر سے گھر آنے کے بجائے، کسی چائے خانے میں جا کر بیٹھ جاتا، پکچر چلا جاتا اور رات گئے واپس لوٹتا۔ اُس میں ایک عجیب سا لاابالی پن پیدا ہو گیا تھا۔

یہ انہی دنوں کا ذکر ہے۔ جاڑے جا چکے اور گرمیوں کا موسم آگیا تھا۔ ایک روز دفتر کے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر شب ماہ منانے کا پروگرام بنا۔ وہ ایک ہوٹل کے کھلے ہوئے لان میں رات بھر شراب پیتا رہا اور پورے چاند کی چاندنی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پارٹی میں دفتر کی کچھ ٹائپسٹ اور اسی قبیل کی لڑکیاں بھی تھیں۔ جن کو نشے میں دُھت ہو کر اُس نے بہت ستایا ایک لڑکی کا اُس نے اسکرٹ پھاڑ ڈالا اور وہ نیم برہنہ ہو گئی۔ کئی کے اُس نے گال نوچ لئے اور وہ بلیوں کی طرح غرّا کر اس پر چلّانے لگیں۔ ایک موٹے تگڑے نوجوان کے چہرے پر اُس نے شراب کا پورا گلاس اُنڈیلا اور اُس سے کشتم کشتا ہوتے ہوتے رہ گئی۔

یہ بڑی سہانی رات تھی۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ ہر طرف اُجلی اجلی چاندنی بکھری تھی۔ آرکسٹرا پر تیز گت بج رہی تھی۔ پینے کے لئے اچھی شرابیں تھیں اور آس پاس خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ جو ہلکے ہلکے سرور سے لڑکھڑا رہی تھیں۔ گھنٹیوں کی طرح بجتے ہوئے تیز تیز قہقہے لگا رہی تھیں اور ہر بے تکلفی کو کبھی پیار سے ڈانٹ کر اور کبھی صرف مسکرا کر ٹال دیتیں اس خوبصورت رات میں اُس نے جی بھر کر ہنگامہ کیا اور خوب لطف اندوز ہوا۔

وہ واپس گھر پہنچا تو رات کے تین بجے تھے۔ دروازہ اس کی بیوی نے کھولا۔ وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ سلمان پہلی بار اُس کے سامنے شراب پی کر گیا تھا۔ عالم یہ تھا کہ کہتا کچھ تھا، بات نکلتی کچھ اور تھی۔ جسم بے قابو ہو رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے دھندلی دُھندلی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ اُس نے کپڑے بھی نہیں تبدیل کئے اور جھومتا جھامتا بستر پر جا کر اوندھے منہ گر پڑا اور اسی حالت میں پڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس کو اپنے رخسار پر نمی محسوس ہوئی۔ وہ نشہ سے کچھ کچھ چونکا۔

ذرا دیر بعد چہرے پر ایک اور قطرہ گرا۔

سلمان نے گردن کو خم دے کر دیکھا۔ بیوی اُس پر جُھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ کمرے کی ہلکی نیلگوں روشنی میں اُس کا دلکش چہرہ کملایا ہوا نظر آرہا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔

اُس نے گردن جھکائی اور چپ چاپ سوچنے لگا کہ اُسے یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اُسے اس طرح بیوی کو دُکھ نہیں پہنچانا چاہیے۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی اُسے اس بات پر مسرت بھی ہوئی کہ اُس کی بیوی اُس سے بے تحاشہ پیار کرتی ہے۔ اس مسرت میں رات بھر کے سارے ہنگامہ سے زیادہ لذت تھی۔

۲

ہفتہ کی شام تھی۔ سلمان اس روز دفتر سے دوپہر کو گھر آگیا تھا۔ مہینہ کی شروع تاریخیں تھیں۔ سہ پہر کی چائے پیتے ہوئے دونوں میاں، بیوی نے یہ طے کیا کہ شام گھر سے باہر گذاری جائے۔ پروگرام یہ بنا کہ کسی خوبصورت سے ریستوراں میں بیٹھکر آئس کریم کھائی جائے۔ اس کے بعد فلم دیکھی جائے۔ فلم کے انتخاب پر دونوں کی پسند مختلف تھی، لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ فلم کا انتخاب آئس کریم کھاتے وقت کیا جائے۔ فلم دیکھنے کے بعد رات کا کھانا بھی اُن کو باہر ہی کھانا تھا۔ اس کے لئے یہ طے ہوا تھا کہ کھانا چاہے کسی ہوٹل میں کھایا جائے۔ مگر اس میں سیخ کے کباب ضرور ہوں، خوب گرم ہوں اور خوب چٹپٹے ہوں۔

یہ پروگرام بنا کر دونوں گھر سے باہر آئے۔ گرمیوں کے دن تھے، دن ڈھلتے ہی شہر کی ساری آبادی گھروں سے نکل کر سڑکوں اور بازاروں میں آگئی تھی۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ شور و غل تھا۔ دوکانوں پر بھیڑ لگی تھی۔ وہ دونوں میاں، بیوی تفریح کے موڈ میں تھے اور بڑی بے فکری کے ساتھ بازار سے گذر رہے تھے۔ ایک موڑ پر سلمان نے دیکھا کہ ایک نوجوان اس کو پوری توجہ کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ وہ معمولی سا لباس پہنے ہوئے تھا، سر پر اُلجھے ہوئے، گھونگھریالے بال، کھلتا ہوا رنگ اور چہرے پر ہلکی بھوری مونچھیں۔ سلمان کو پہلے تو اُس کے اس انداز پر غصہ آیا پھر اُسے اچانک محسوس ہوا کہ اس لڑکے کو اُس نے کہیں دیکھا ضرور ہے۔ اس کو کچھ شبہ سا ہوا کہ یہ نوشا تو نہیں ہے۔ وہ واقعی نوشا تھا اور اُس نے سلمان کو پہچان لیا تھا۔ وہ اُس کو دیکھکر رُک گیا تھا۔ اس

سے ملنے کے لئے دو چار قدم آگے بھی بڑھا۔ پھر اُسے یہ سوچ کر شرمندگی کا شدید احساس ہوا کہ وہ اپنے گھر سے بھاگ کر کراچی آیا ہے اور یہ بات سلمان کو ضرور معلوم ہوگی۔ وہ ملے گا تو اس بات کا ذکر ضرور کرے گا اور اس کے متعلق وہ کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ یہی سوچ کر وہ تیزی سے مڑا اور راہگیروں کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔

سلمان کو دیکھنے کے بعد نوشا کو اپنا گھر یاد آ گیا۔ اس نے سوچا نہ جانے اماں کس طرح ہوں گی، سلطانہ کیسی ہوگی، انّو تو اب بڑا ہو گیا ہوگا۔ ٹھاٹھ سے اسکول جاتا ہوگا۔ شاید اماں نے اس کی طرح انّو کو بھی اسکول سے اٹھا کر کہیں کام کاج پر لگا دیا ہو۔ اس کے اس طرح چلے آنے پر اماں ضرور روئی ہوں گی۔ اُسے یاد آیا کہ ایک بار وہ گھر کی کھپریل پر چڑھتے ہوئے گر پڑا تھا۔ اُس کا سر پھٹ گیا اور سارا منہ خون میں ڈوب گیا تھا۔ اماں پہلے تو اُس کو دیکھ کر تھر تھر کانپتی رہیں اور پھر چیخیں مار مار کر زور سے رونے لگی تھیں۔ اماں اُس کے لئے ضرور روئی ہوں گی۔ سلطانہ بھی روئی ہوگی۔ سب اُسے یاد کرتے ہوں گے۔

وہ اُس روز گھر سے بڑا ہشاش بشاش نکلا تھا۔ ایک روز پہلے اس کو تنخواہ ملی تھی اور ابھی تک اُس کی جیب میں کچھ کم ۲۰ روپے پڑے تھے۔ کچھ دیر پہلے اُس نے اپنے لئے دو سوتی لٹھے کی شرٹ اور ایک بنیائن خرید اتھا۔ ٹافیوں کا ایک چھوٹا سا ڈبا اس نے یوں ہی موج میں آ کر لے لیا تھا۔ نادرہ کے لئے اُس نے پلاسٹک کے بنے ہوئے بیضاوی آویزے بھی خرید لئے تھے۔ اُن کو خریدتے وقت اُس نے سوچا تھا "بار اس لڑکی کی بدولت مزے سے دونوں وقت کھانا اور گرما گرم چائے مل جاتی ہے۔ اس کو راضی خوشی رکھنا بہت ضروری ہے" اس خریداری پر اُس کے ۵ ۲ سے زیادہ روپے خرچ ہو گئے تھے۔ مگر وہ خوش بہت تھا اور جھوم جھوم کر چل رہا تھا لیکن سلمان کو دیکھ کر اُس کا دل افسردہ ہو گیا تھا اور اُسے گھر کی یاد ستانے لگی تھی۔ بار بار اُسے خیال آتا کہ وہ تو کراچی میں عیش کرتا پھر رہا ہے۔ نہ جانے وہ سب لوگ کس حال میں ہوں گے۔

اسی افسردگی کے عالم میں وہ پروفیسر کے فلیٹ پر پہنچا۔ بوڑھا ملازم اپنے گھر جانے کے

لئے اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ نوشا نے اُس کو رخصت کر کے دروازے کا بولٹ چڑھایا اور زینہ طے کرتا ہوا اوپر چلا گیا۔ گھر میں سناٹا پڑا تھا۔ پروفیسر کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور پنکھا چلنے کی تیز بھنبھناہٹ خاموشی میں اُبھر رہی تھی۔ وہ اس طرف نہیں گیا۔ کوریڈر سے گذر کر اُس نے نادرہ کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ سامنے میز پر نادرہ سر جھکائے پڑھنے میں محو تھی۔ ٹیبل لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی کے عکس میں اس کے چہرے کے خدوخال پتھر کے مجسموں کی طرح ترشے ترشائے نظر آرہے تھے۔ ایک ایک زاویہ، ایک ایک خم ابھر کر نمایاں ہو گیا تھا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ اور ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے اس کے بال بکھر کر پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

نوشا نے نظر بھر کر اس کو دیکھا اور چپکے سے کمرے کے اندر جا کر اُس کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔ نادرہ کو اُس کے آنے کی ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ نوشا کچھ دیر تو خاموش کھڑا رہا پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر میز کے کونے پر پلاسٹک کا آویزہ رکھ دیا تیز روشنی میں وہ بڑا خوبصورت نظر آنے لگا۔ نادرہ نے حیرت سے آویزے کو دیکھا اور پھر گردن موڑ کر نوشا کو دیکھا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"تم نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا؟"

"تم اتنی دیر تک کہاں غائب رہے؟"

"ورکشاپ سے لوٹ کر تم گھر کیوں نہیں آئے؟"

اُس نے نوشا پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ تابڑ توڑ ایک کے بعد دوسرا سوال کرتی چلی گئی۔ اُس کے لہجے میں تیکھا پن تھا اور چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی۔ نوشا گھبرا گیا۔ اُس سے کچھ کہتے نہ بن پڑی۔ خاموش کھڑا ٹکر ٹکر اُس کا چہرہ تکتا رہا۔ وہ کہنے لگی۔

"پاپا پندرہ مرتبہ تم کو پوچھ چکے ہیں۔ تمھیں اس قدر غیر ذمہ دار نہیں ہونا چاہیے۔"

نوشا نے سوچا "یار یہ تو بلا کی طرح چمٹ گئی۔ سالی بڑی تیز لونڈیا ہے۔ ایسے بات کرتی ہے جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو ڈانٹ رہی ہو۔" مگر اُس نے کچھ کہا نہیں۔ چُپ چاپ احمقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ نادرہ نے آویزے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور تیزی سے بولی

"یہ کیوں لے آئے؟"

نوشا پھر بھی نہ بولا۔

"میں پوچھتی ہوں کہ تم نے یہ ٹاپس کیوں خریدے؟"

نوشا نے گھبرا کر کہا "تمھارے لیے لے آیا تھا"

وہ آنکھیں پھاڑ کر بولی "میرے لیے؟" لمحہ بھر رُک کر اُس نے بڑے طنز کے ساتھ کہا۔

"جناب عالی، میرے پاس ایک درجن سے زیادہ کانوں کے ٹاپس پڑے ہیں اور ذرا آپ اپنی اس قمیص کو دیکھیے۔ موبل آئل کے داغوں نے ہر جگہ افریقہ کے جنگلات اُگا دیے ہیں۔ اور یہ آپ کی اکلوتی قمیص ہے۔"

نوشا نے فوراً کہا "دو بش شرٹیں بھی تو لایا ہوں" یہ کہہ کر اُس نے ہاتھ میں دبا ہوا پیکٹ کھول کر اُس کے سامنے ڈال دیا۔ نادرہ نے بش شرٹوں کو ایک نظر دیکھا اور آویزوں کی ڈبیا اُٹھا کر اُس کے سامنے کر کے بولی۔

"آئندہ کوئی ایسی چیز خرید کر نہ لانا۔ اُسے اپنے پاس رکھو، مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں"

نوشا کو اس کا یہ انداز بڑا برا لگا۔ اُس نے گھور کر اُس کو دیکھا اور آویزوں کی ڈبیا اٹھا لی۔

جب وہ جانے لگا تو نادرہ نے پوچھا "تم نے کھانا کہاں کھایا؟"

نوشا نے رکھی سے بولا "کہیں نہیں"

"تو پھر چلو کھانا کھا لو"

وہ منہ پُھلا کر بولا "میں کھانا نہیں کھاؤں گا" وہ اس وقت کسی ضدی بچّے کی طرح روٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ نادرہ نے خاموشی سے اُس کو دیکھا اور پھر کوئی بات نہیں کی۔ نوشا جھنجھلایا ہوا سا کمرے سے باہر نکلا اور تھکے تھکے قدموں سے زینہ طے کر کے نیچے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

بستر پر لیٹ کر وہ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ نادرہ کے رویّے سے اُس کو تکلیف پہنچی تھی، وہ اس کے لیے خوشی خوشی آویزے خرید کر لایا تھا اور اس نے اس حقارت کے ساتھ اُن کو

واپس کیا کہ وہ تلملا کر رہ گیا۔ نوشا کو اس بات سے یہ بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کو ذلیل سمجھتی ہے وہ فطرتاً بڑا احساس تھا۔ یہ بات کانٹے کی طرح اس کے ذہن میں کھٹکنے لگی۔ بہت دیر تک وہ اس واقعہ پر بڑا غور کرتا رہا۔

نہ جانے رات کتنی گذر چکی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ نوشا پر ہلکی ہلکی غنودگی طاری تھی کہ اچانک کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ ابھری۔ پھر اندھیرے کمرے میں ایک سایہ سا لہرایا اور اس کو اپنے سرہانے کسی کے آہستہ آہستہ سانسیں ابھرنے کی آواز سنائی دی۔

نوشا نے آنکھیں کھول دیں اور اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

اسی وقت ایک نرم نرم سا ہاتھ اس کی پیشانی پر آ کر ٹک گیا۔

اور اس کے ساتھ ہی آواز آئی۔

"نوشا!"

یہ نادرہ تھی اور اس کو آہستہ آہستہ جھنجوڑ کر بیدار کر رہی تھی۔ نوشا دم بخود پڑا رہا۔ اس نے سوچا نادرہ اس وقت اس کے پاس کیوں آئی ہے۔ جب نادرہ نے کئی بار اس کو جھنجوڑا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں ملتا ہوا بولا۔

"نادرہ"

"ہاں" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

وہ پوچھنے لگا "کیا بات ہے؟"

وہ بڑے نرم لہجے میں بولی "لو کھانا کھا لو۔ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا"

نوشا نے چپ چاپ اٹھ کر بجلی کا سوئچ دبا دیا۔ کمرے کے اندر تیز روشنی پھیل گئی۔ اس نے دیکھا کہ نادرہ اس کے لئے کھانا لے کر آئی تھی۔ اس نے کھانے کی پلیٹیں پلنگ پر رکھ دیں اور خود بھی بستر کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی۔

"جاؤ ہاتھ دھو کر آؤ اور کھانا کھا لو۔"

نوشا کسی سدھے ہوئے جانور کی طرح چپ چاپ غسل خانے میں گیا۔ ہاتھ دھوئے اور کمرے میں آکر کھانا کھانے لگا۔ اُس کو خاموش دیکھکر نادرہ کہنے لگی "لاؤ وہ ٹالپس کی ڈبیہ کہاں ہے؟" نوشا نے تکیہ کے نیچے سے ڈبیہ نکال کر اس کو دیدی۔ وہ اُس کو لے کر بولی

"دیکھو اب کوئی ایسی چیز نہ خریدنا۔ تمھیں خود ابھی بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے"

نوشا سر جھکائے کھانا کھاتا رہا۔

وہ کہتی رہی "تم نے میری بات کا بُرا تو بہت مانا ہوگا" وہ آہستہ سے مسکرائی "میں تم کو سزا دینا چاہتی تھی۔ دیکھو نا یہ کتنی بے تُکی سی بات ہے"

نوشا کو اس میں کوئی بے تکا پن نہ معلوم ہوا۔ اُس نے کسی قدر تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر اُس کو دیکھا اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے اس طرح گردن اٹھائے بیٹھی تھی، جیسے کوئی اُستاد اپنے شاگرد کے روبرو بیٹھتا ہے۔

جب نوشا کھانا کھا چکا تو وہ پلیٹیں اُٹھا کر اوپر جانے لگی۔ نوشا نے چاہا کہ وہ ان کو خود اٹھا کر لے جائے تو وہ ڈانٹنے کے سے انداز میں بولی "خواہ مخواہ کا تکلف مت کرو۔ تم کو صبح تڑکے ورکشاپ جانا ہے۔ جلدی سو جانا سمجھے" یہ کہکر وہ کھٹ پٹ کرتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ نوشا خاموش بیٹھا لکڑی کے زینے پر اس کے قدموں کی آہٹ سُنتا رہا۔

یہ پہلا موقعہ نہیں تھا۔ نادرہ ہمیشہ اس سے اسی طرح پیش آتی تھی۔ عمر میں وہ اس سے کچھ چھوٹی ہی تھی مگر اس کا رویہ بزرگانہ تھا۔ وہ بات بات پر اُس کو ڈانٹ دیتی۔ شروع شروع میں تو نوشا نے اُس کے اس انداز کے خلاف خاموش احتجاج کرنے کی کوشش کی مگر رفتہ رفتہ وہ اس کے اس رویہ سے مانوس ہوتا گیا۔ وہ ہر وقت نوشا کو ہدایتیں دیتی رہی۔

"نوشا تم صبح دیر سے کیوں اٹھتے ہو؟"

"نوشا تمھارے دانت بہت گندے ہیں۔ دونوں وقت دانت صاف کیا کرو"

"نوشا تم یہ ایکٹروں کے سے بال مت رکھا کرو۔ بالکل لوفر لگتے ہو"

"لوشا تم نے پھر غلط زبان بولی۔ نکلاشین نہیں قطعی مہمل لفظ ہے"

وہ ہر وقت اس کو ٹوکتی رہتی، "لوشا تم نے یہ نہیں کیا، لوشا تم نے وہ نہیں کیا۔" اس ڈانٹ پھٹکار کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں خاصی شائستگی پیدا ہوگئی۔ اب وہ کھونڈے پن سے قہقہہ نہیں لگاتا تھا۔ بات کرتا تو سنبھل سنبھل کے۔ پہلے اس کی وضع قطع فلمی ایکٹروں کی تھی۔ اب اس نے بال چھوٹے کرا دیئے تھے اور پتلون کی موریاں الٹ کر چڑھانا چھوڑ دی تھیں۔ رات کو مرے میں آکر کبھی کبھی وہ کوئی فلمی دھن گنگنا لیا کرتا تھا۔ اب ایسی کوئی آواز رات کو اس کے کمرے سے نہیں ابھرتی تھی۔

پروفیسر سے لوشا کی ملاقات صرف ناشتہ کی میز پر ہوتی تھی مگر اس وقت وہ اخبار پڑھنے کی دھن میں ہوتا تھا۔ بات چیت کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ کبھی کبھار اتفاق سے اس کا لوشا سے آمنا سامنا ہو جاتا تو اس طرح کھویا کھویا گذر جاتا کہ جیسے اس نے دیکھا ہی نہیں۔

ایک روز پروفیسر کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اچانک لوشا کے کمرے میں آگیا اور آتے کے ساتھ ہی بولا "میں نے ابھی ابھی سوچا کہ تم کو کسی اسکول میں داخلہ لینا چاہیئے"

لوشا نے دبی زبان سے کہا "میں کارخانے جو جاتا ہوں"

"بہت ٹھیک بات کہی تم نے۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا۔ نائٹ اسکول کیسا رہے گا؟ مگر نائٹ اسکول تو یہاں سب واہیات ہیں۔ ایک صاحب کو میں جانتا ہوں جو رات کو نائٹ اسکول چلاتے ہیں اور دن میں قرق امینی کرتے ہیں۔ نائٹ اسکول اور قرق امینی میں قدر مشترک کیا ہے۔ یہ مسئلہ آج تک میں حل نہیں کر سکا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ طلبا کو تعلیم دینے کے بجائے ان کے ذہن قرق کرتے ہوں گے" اپنی اس بات پر وہ خود بھی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

لوشا خاموشی کے ساتھ اس کی باتیں سنتا رہا۔

پروفیسر کہنے لگا "کوئی وجہ نہیں کہ تم انجینیر نہ ہو۔ مگر تعلیم کا مسئلہ، مگر تعلیم کا مسئلہ" وہ بے خیالی میں آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ پھر وہ چونک کر بولا "تم کارخانے کی ملازمت کیوں نہ

چھوڑ دو؟"

نوشا نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے نوشا کو بولنے کا موقعہ نہیں دیا۔ آہستہ سے بولا "تمھیں ضرور کچھ نہ کچھ کماتے رہنا چاہیے ورنہ زندگی بھر احساس کمتری میں مبتلا رہو گے۔ کچھ اور سوچنا پڑے گا۔" یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس کے بعد عرصہ تک نوشا سے پروفیسر کی ملاقات نہیں ہوئی۔

نادرہ بھی اپنے باپ کی طرح کچھ عجیب و غریب سی لڑکی تھی۔ ذرا سی بات پر اُس کی بھویں تن جاتیں اور آنکھوں میں تیز چمک آجاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ نوشا جھنجھلا کر کوئی اُلٹی سیدھی سی بات اُس کو کہہ دیتا تو مسکرا کر چپ ہو جاتی اور ایک دن تو اُس نے کمال کر دیا۔ نوشا نے ایک شوخ رنگ کی بش شرٹ خریدی تھی۔ اُس پر کچھ عورتوں کی نیم برہنہ تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ وہ اُس کو پہن کر نادرہ کے سامنے سے گذرا تو وہ کہنے لگی۔

"نوشا تمھارا مذاق بڑا گھٹیا ہے۔"

نوشا اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ کہنے لگا "کیوں، کیا ہوا؟"

وہ بولی "اس بش شرٹ کو پہن کر تم بوائے سے زیادہ لائف بوائے صابن کا ٹریڈ مارک معلوم ہوتے ہو۔"

نوشا کو تاؤ تو بہت آیا مگر وہ کچھ بولا نہیں مگر وہ اُس کا مذاق اڑاتی رہی "اس لباس میں تم بالکل لوفر معلوم ہوتے ہو اور وہ بھی تیسرے درجہ کے۔"

نوشا کو اس روز وہ کتنی بار اسی طرح ڈانٹ چکی تھی۔ وہ پہلے ہی جھنجھلایا ہوا تھا۔ اس بات پر جل کر بولا "تم جو یہ روزانہ الٹے سیدھے بال بنایا کرتی ہو اور نہ جانے کیسی اُلٹی سیدھی فراکیں پہنتی ہو تو میں نے کبھی یہ نہیں کہا تم بالکل چڑی کی بیگم لگتی ہو۔ ایک دم چڑی کی بیگم" کہنے کو تو غصے میں نوشا نے یہ بات کہہ دی مگر فوراً ہی وہ سہم سا گیا۔ اُس نے سوچا اب شامت آگئی مگر نادرہ کھسیانی ہو کر ہنسنے لگی اور جب نوشا جانے لگا تو اُس کو روک کر بولی۔

"معاف کرنا نوشا، مجھے تم سے ایسی بات نہیں کہنا چاہیئے تھی۔ میں اپنی غلطی کی تم سے معافی چاہتی ہوں۔"

نوشا ہکا بکا ہوکر اُس کا منہ تکنے اور وہ بار بار معذرت کرتی رہی۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی باتیں تھیں، جن کے پیش نظر وہ بالکل اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کس قسم کی لڑکی ہے۔ البتہ اس کی بوڑھی ماں بڑی سیدھی سادھی گھریلو سی عورت تھی۔ اس کو گٹھیا کا عارضہ تھا اور کبھی کبھی درد گردہ کا بھی دورہ پڑتا تھا۔ وہ ہر وقت بستر پہ پڑی رہتی۔ جب نوشا پہلے پہل اس گھر میں آیا تو اُس نے بڑی ناک بھوں چڑھائی۔ اس سے سیدھے منہ بات تک نہیں کی۔ ممکن ہے اس کے خلاف اُس نے شوہر سے شکایت بھی کی ہو۔ مگر وہ جلد ہی نوشا سے مانوس ہو گئی۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ نوشا اُس کی بڑی مستعدی سے خدمت کرتا تھا۔ وہ گھنٹوں بیٹھا اُس کی پنڈلیوں پر مالش کیا کرتا۔ اُس کا سر دباتا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُس کے لئے دوائیں اور انجکشن لاتا۔

نوشا اکثر رات کا کھانا کھانے کے بعد اُس کے کمرے میں پہنچ جاتا۔ سرہانے اسٹول پر بیٹھا اُس کا سر دبایا کرتا اور گھنٹوں اُس سے باتیں کیا کرتا۔ اُس کی باتیں سیدھی سادھی عام گھریلو قسم کی ہوتی تھیں۔ اُن میں کچھ ماضی کی یادیں ہوتیں۔ عزیزوں اور رشتے داروں کا تذکرہ ہوتا کسی کی غیبت اور کسی کی تعریف ہوتی اور شوہر کے خلاف شکوہ و شکایتیں ہوتیں۔ پروفیسر سے اس کو بہت سی شکایتیں تھیں، یہ بڑی معمولی سی باتیں تھیں۔ جن کو نہ کبھی پروفیسر سنتا تھا اور نہ نادرہ ان پر توجہ دیتی تھی۔ نوشا ہی گھر بھر میں ایک ایسا شخص تھا کہ وہ سب کچھ چپ چاپ بیٹھا سُنا کرتا اور اسی لئے نادرہ کی ماں کو اب وہ بڑا اچھا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ جب وہ کمرے سے اٹھکر جاتا تو وہ بڑی بوڑھیوں کی طرح اُس کو دیر تک دعائیں دیتی رہتی۔

نوشا اب پروفیسر کے کنبے کا ایک فرد بن گیا تھا۔ شروع شروع میں نوشا جو جھجک محسوس کرتا تھا وہ اب ختم ہو چکی تھی۔ کبھی کھانے میں دیر ہو جاتی تو وہ بڑی بے تکلفی سے غلام گردش

میں آواز لگاتا نظر آتا" کبھی آج تو شہر بھر کے سب چوہے میرے پیٹ میں گھس گئے ہیں اور خوب اُدھم مچا رہے ہیں" اسی طرح جب اُس کی قمیصوں کے بٹن ٹوٹ جاتے یا کوئی کپڑا پھٹ جاتا تو وہ نادرہ کے سر پر سوار ہو کر اس کو ٹھیک کرواتا۔ کبھی خوشامد کرتا کبھی ناراض ہوتا اور اپنا کام کروائے بغیر نہ ٹلتا۔ البتہ وہ پروفیسر کلیم اللہ کو اب تک نہیں سمجھ سکا تھا، وہ پہلے بھی اُس کے لئے معمہ تھا اور اب بھی معمہ ہی بنا ہوا تھا۔ وہ ہر بات قسطوں میں کہتا تھا، اور نوشا کے لئے گفتگو کی یہ تکنک قطعی اجنبی تھی۔ وہ صرف اُس کے متعلق یہ جانتا تھا کہ وہ بہت بڑا آدمی ہے کم سے کم اس کے لئے تو وہ فرشتۂ رحمت سے کم نہیں تھا۔

وہ اُس کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ محلہ کے ایک شخص نے، جو کسی دفتر میں کلرک تھا، کسی بات پر نوشا کے سامنے پروفیسر کو اُلو کا پٹھا کہدیا۔ نوشا نے ایک لمحہ بھی انتظار نہ کیا، تابڑ توڑ اُس شخص کے جبڑے پر کئی مکّے رسید کر دیئے۔ اُس کے ہونٹوں سے خون رسنے لگا اور وہ چکرا کر گر پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہجوم اکٹھا ہو گیا۔

بات پروفیسر تک پہنچی۔ اُس نے فوراً اس شخص کے پاس جا کر معافی مانگی اور دس روپے اصرار کر کے تاوان دیا۔ نوشا ڈرا کہ اب وہ اس پر ناراض ہوگا۔ مگر اُس نے نوشا سے صرف اس قدر کہا "تمھارے متعلق مجھے اپنی رائے بدلنا پڑے گی تمھیں انجنیر کے بجائے فوجی بننا چاہیئے۔ مجھے تمھاری اسپرٹ پسند آئی" وہ دیر تک اُس کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دیتا رہا۔

۳

موسم گرما کی ایک سنسان دوپہر تھی۔ ہر طرف بگولے منڈلا رہے تھے اور غبار کی دھند میں ڈھکی ہوئی عمارتیں اونگھتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ سلطانہ کمرے کے اندر تھکی ہوئی سی لیٹی تھی۔ دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ بہت ہلکا سا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے برہنہ بازو تکیہ پر جھول رہے تھے۔ اُس کے چہرے پر گہری زردی تھی اور آنکھیں ڈھلی ڈھلی سی معلوم ہو رہی تھیں۔

مہینہ بھر تک اسپتال میں رہنے کے بعد وہ پچھلے ہفتہ کوٹھی پر واپس آئی تھی۔ اس کے برابر ہی پالنے میں ایک ننھا سا بچہ آنکھیں بند کئے سو رہا تھا۔ یہ اس کا بچہ تھا۔ اُس کا چہرہ نیاز کی طرح چوڑا تھا۔ ناک کے نتھنے اُبھرے ہوئے تھے اور دہانہ بڑا تھا۔ اس بچے کی پیدائش میں وہ تین روز تک موت اور زندگی کے درمیان ہچکولے کھاتی رہی تھی۔ وہ رات کے ۲ بجے پیدا ہوا تھا۔ اُس روز شام ہی سے سلطانہ کی حالت غیر تھی۔ اُس پر بار بار غشی کا دورہ پڑ رہا تھا ۱۲ بجے تک اُس کی نبضیں ڈوبنے لگی تھیں۔ جسم پسینے سے شرابور ہو گیا تھا اور چہرے پر سیاہی منڈلانے لگی تھی۔

اُس کی یہ حالت دیکھ کر لیڈی ڈاکٹر نے گھبرا کر نیاز کو ٹیلیفون کیا۔ وہ گہری نیند میں سو رہا تھا۔ اس رات اُس نے شراب زیادہ پی لی تھی۔ مدہوش پڑا تھا۔ بہت دیر بعد اُس نے

ٹیلیفون اٹھایا اور یہ کہکر ریسور رکھدیا کہ وہ صبح سے پہلے اسپتال نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے بعد نرس نے کئی بار نمبر ملایا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہی مگر نیاز ایسا کروٹ بدل کر سویا کہ پھر اُس کی آنکھ ہی نہ کھلی۔

چار بجے تک سلطانہ نزع کی حالت میں رہی۔ بچے کی پیدائش کے بعد بھی اُس کو ہوش نہیں آیا تھا اور اس کے جسم میں ٹیوب کے ذریعہ پلازما داخل کیا جارہا تھا۔ نیاز ۸ بجے صبح اسپتال پہنچا۔ بچے کی پیدائش سے وہ بہت خوش تھا۔ اُس کا اصرار تھا کہ وہ مریضہ کے پاس جاکر بچے کو ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے لئے اُسے گھنٹہ بھر تک انتظار کرنا پڑا اور وہ تمام وقت وارڈ کے باہر کوریڈر میں بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ جب نرس نے بچہ کو لاکر دکھایا تو اُس نے جھک کر بچے کو بے ساختہ چوم لیا۔

جب تک سلطانہ اسپتال میں رہی، وہ پابندی کے ساتھ اُس کو دیکھنے جاتا۔ دن میں کئی کئی بار ٹیلیفون کرتا اور ہر بار بچے کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور پوچھتا۔ اس کو اپنے بچے سے بے حد پیار تھا۔ کوٹھی میں واپس آکر سلطانہ نے دیکھا کہ نیاز نے بچے کے لئے ڈھیروں کھلونے لاکر اکٹھا کردیئے تھے۔ صبح اٹھتے کے ساتھ ہی وہ سلطانہ کے کمرے میں آتا۔ بچے کی پیشانی کو بوسہ دیتا اور دیر تک اُس کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ رات کو واپس آتا تو ایک بار بچے کو ضرور پیار کرتا۔ اگر وہ جاگتا ہوتا تو پالنے کے قریب بیٹھ کر عجیب وغریب آوازیں نکال کر اُس کو ہنسانے کی کوشش کرتا۔

سلطانہ کو اس بات کی خوشی تھی کہ نیاز بچے سے اس قدر پیار کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ خود بھی اس کو بہت چاہتی تھی۔ اُس نے اپنی جان کی بازی لگا کر اُس کو جنم دیا تھا۔ حالانکہ وہ بچے کی پیدائش سے پہلے اکثر سوچا کرتی تھی کہ وہ اُس کو ماں کی ممتا نہ دے سکے گی۔ سلطانہ کو اُس کے احساس ہی سے نفرت شروع ہوگئی تھی۔ ایک روز جب اُس پر یہ راز افشا ہوا کہ وہ حاملہ ہے تو وہ تمام دن روتی رہی تھی۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا اُس کی یہ نفرت

بڑھتی گئی۔ وہ جل کر کبھی کبھی اس کو کوسنے لگتی "یا اللہ یہ حرامی پیدا ہوتے ہی مرجائے" اسی کو فت میں وہ بیمار پڑ گئی۔ جسم لاغر پڑ گیا۔ ان دنوں وہ ذرا ذرا سی بات پر نیاز کو جھڑک دیتی بلیوں کی طرح غرا کر اُس پر آنکھیں نکالتی اور گھنٹوں بند کمرے میں بیٹھی رویا کرتی۔ یوں بھی اس کا بیشتر وقت کمرے کے اندر ہی گذرتا تھا۔ وہ بہت کم باہر نکلتی۔ گھر کے نوکروں تک کے سامنے آتے ہوئے اُس کو خوف معلوم ہوتا۔

اُس نے سوچا تھا کہ پیدائش کے فوراً ہی بعد وہ بچے کا گلا گھونٹ کر چپکے سے اُس کو ختم کردے گی۔ اور اب اُس کی یہ حالت تھی کہ اُس کو دیکھکر جی رہی تھی۔ وہ ہر وقت بچے ہی کے کسی نہ کسی کام میں منہمک رہتی اور اُسی کی بدولت وہ اب نیاز میں بھی دلچسپی لینے لگی تھی۔ ورنہ اس نے ہمیشہ نیاز کی قربت سے بیزاری محسوس کی تھی۔ وہ اس سے بہت کم بات کرتی تھی۔ کبھی بولتی بھی تو اس میں تلخی ہوتی، حقارت ہوتی اور دبی دبی سی نفرت۔ مگر اب یہ ہوتا کہ نیاز جب صبح ہی صبح بچے کو دیکھنے اُس کے کمرے میں آتا تو وہ دیر تک نیاز کے پہلو میں بیٹھی باتیں کیا کرتی۔

سلطانہ، نیاز سے قریب تر ہوتی جارہی تھی اور اُن کے تعلقات کے درمیان بچہ ایک مضبوط کڑی بن گیا تھا۔

گرمیوں کی دوپہر کی تپش اور بڑھ گئی۔ در و دیوار انگاروں کی طرح تپتے اور باہر لان میں خشک پتے دن بھر کھڑکھڑاتے رہتے۔ پھر ایک روز بڑی زور کی آندھی آئی۔ آسمان کا رنگ سرخ پڑ گیا۔ درختوں کی شاخیں چیخ چیخ کر جھولنے لگیں۔ کھڑکیوں کے شیشے چھن چھن کر ٹوٹنے لگے۔ آندھی کا زور ذرا ٹوٹا تو موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

اس طوفان سے بڑا نقصان ہوا۔ بجلی کے تار جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے۔ شام کا وقت تھا۔ سارا شہر تاریکی میں لپٹا ہوا کسی کھنڈر کی طرح ہیبت ناک نظر آتا تھا۔ تیز بارش سے جہاں اور بہت سا نقصان ہوا، ان میں میونسپلٹی کا نیا مارکٹ بھی شامل تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔

نیچے بازار تھا اور اوپر کی منزل میں رہائشی فلیٹ تھے۔ مینہ شروع ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد بڑے زور کا دھماکہ ہوا اور عمارت کے ایک حصہ کی چھت ٹوٹ کر نیچے آ گئی۔ کئی دیواریں شق ہو کر منہدم ہو گئیں۔

ہر طرف کہرام مچ گیا۔ بازار کے اوپر رہنے والوں میں سے کئی خاندان پورے کے پورے زندہ درگور ہو گئے تھے۔ بڑا برا وقت تھا۔ گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ فائر بریگیڈ والے رات بھر ملبے کے نیچے سے زخمیوں کو نکالتے رہے۔ ۱۱۰ افراد اسی وقت ہلاک ہو گئے تھے، جن میں ۹ بچوں اور ۲ عورتوں کی لاشیں شامل تھیں۔ ۵۵ زخمیوں کو نکال کر اسپتال پہنچایا گیا۔ ان میں بعض کی حالت بہت نازک تھی۔

دوسرے دن اخبارات نے سیاہ حاشیوں کے ساتھ اس خبر کو شائع کیا۔ اداریوں میں اس المناک سانحہ کی تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا اور میونسپلٹی کے ذمہ دار اراکین کے خلاف سخت اعتراضات کیے گئے۔

میونسپل بورڈ میں ایک گروپ خان بہادر کے مخالفین کا بھی تھا۔ انھوں نے اس حادثہ کی آڑ لے کر ایسے بیانات جاری کئے، جن میں خان بہادر پر بحیثیت چیئرمین کے بہت سنگین الزامات عائد کیے گئے تھے۔ شام کو شہریوں کی جانب سے ایک جلسہ عام ہوا، جس میں بڑی اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ بعض مقررین نے کھلم کھلا نیاز کا نام لیا۔ اس لئے کہ اس مارکٹ کی تعمیر کا ٹھیکیدار وہی تھا۔

کلکٹر نے اس احتجاج سے مرعوب ہو کر اسپیشل پولیس کے ایک سینیئر آفسر کی نگرانی میں فوراً تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی۔ خان بہادر پہلے ہی کیا کم پریشان تھا اس اطلاع نے اس کو اور پریشان کر دیا۔ اُس نے سوچا معاملہ اب بہت سنگین ہو گیا ہے۔ اس کے مخالفین اس بات پر تُلے ہوئے تھے کہ اُس کو جیل بھجوائے بغیر نہ رہیں گے۔ لہٰذا اُس نے میونسپل بورڈ کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور اس میں ساری ذمہ داری نیاز پر ڈال دی۔ اس طرح عدم اعتماد کی تحریک اُس کے

خلاف کارگر نہ ہو سکی مخالفین کو منہ کی کھانی پڑی۔

بورڈ کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد وہ تحقیقاتی کمیٹی کی جانب متوجہ ہوا۔ جو پولس افسر اس کا نگراں مقرر ہوا تھا، اس کے متعلق چھان بین شروع کی۔ معلوم ہوا کہ وہ عنقریب ریٹائر ہونے والا ہے۔ خان بہادر نے یہ بات سُنی تو ہاتھ اونچا کر کے بولا۔

"بس اب کام بن گیا"

دوسرے ہی دن خان بہادر اس افسر کے داماد کے توسط سے اُس سے ملا۔ آدمی تجربہ کار تھا۔ اس کی باتوں سے تھوڑی ہی دیر میں اس کو اندازہ ہوگیا کہ معاملہ بن سکتا ہے۔ اُس نے ۲۰ ہزار روپے مخمل کی ڈبیا میں رکھکر اُس کو نذرانہ (رشوت) دیا اور بقول شخصے مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔

تحقیقات ہوتی رہی۔ خان بہادر حسبِ معمول روزانہ شام کو وہسکی کے ۴ پگ چڑھاتا اور رات گئے تک رمی کھیلا کرتا۔ البتہ نیاز کی آمد و رفت اُس نے اپنے یہاں بالکل بند کرادی اور اُس کو مشورہ یہ دیا کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے شہر سے باہر چلا جائے۔ نیاز پہلے تو اس کے لئے تیار ہوگیا۔ اُس نے لاہور جانے کے لئے سامان بھی بندھوا لیا تھا۔ مگر پھر اُس کی سمجھ میں خود ہی یہ بات آگئی کہ اُس کی غیر حاضری سے خواہ مخواہ شبہ پیدا ہوگا۔ لہٰذا اُس نے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

نیاز کے لئے یہ بڑی پریشانی کے دن تھے۔ وہ گھر میں بہت کم رہتا۔ دوڑ دوڑ کے اُن ٹھیکیداروں کے پاس جاتا، جن کے ذریعہ اُس نے مارکٹ بنوایا تھا۔ گھر میں وہ جتنی دیر رہتا، کھویا کھویا سا بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہتا۔ اکثر رات گئے بستر سے اُٹھ کر سلطانہ کے پاس آتا اور اس سے اوٹ پٹانگ باتیں شروع کر دیتا۔

ایک روز رات کے وقت وہ سلطانہ کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور بادل زور زور سے گرج رہے تھے۔ بچہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ ہمک ہمک کر نیاز کی جانب دیکھ رہا تھا۔ لیکن نیاز بڑا افسردہ ہو رہا تھا۔ سلطانہ کہنے لگی۔

"اپنی پریشانی میں آپ نے ننھے کو بھی بھلا دیا۔ دیکھیے تو آپ کو کس طرح دیکھ رہا ہے۔"

نیاز نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور اس کا رخسار چوم کر بولا "بیٹیا تمھارے باپ کو سزا ہو گئی تو پھر تم کس کے ساتھ کھیلو گے" سلطانہ نے فوراً کہا۔

"آپ پر تو آج کل یہی بھوت سوار ہے۔"

نیاز مسکرا کر چپ ہو گیا۔

سلطانہ اُس سے کچھ اور کہنے ہی جا رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ نیاز نے بچہ کو سلطانہ کی گود میں دیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ برساتی میں پولیس کی لاری کھڑی تھی۔ ایک انسپکٹر اور کئی مسلح کانسٹبل دروازے پر موجود تھے۔ وہ نیاز کا وارنٹ لے کر آئے تھے۔ انھوں نے اُس کو اسی وقت حراست میں لیا اور لاری میں بٹھا کر اپنے ہمراہ لے گئے۔

اس بات کی اطلاع خان بہادر کو ملی تو وہ گھبرا گیا۔ اُس نے جو اسکیم تیار کی تھی۔ اس میں نیاز کی گرفتاری کے متعلق بالکل نہیں غور کیا گیا تھا۔ خطرہ اس کو اس لئے درپیش تھا کہ مارکٹ کے ٹھیکے میں جو منافع ہوا تھا، اس میں سے ۸۰ ہزار روپے خان بہادر کے حصے میں بھی آئے تھے۔ اس کے علاوہ اُس نے شیشہ کا جو کارخانہ تعمیر کرایا تھا اُس کے لئے سمنٹ اور لوہا بھی مارکٹ کے کوٹے میں سے گیا تھا۔ یہ سارا کام نیاز ہی کے ذریعہ ہوا تھا۔ اُس نے سوچا نیاز کہیں گھبرا کر سب کچھ صاف صاف نہ کہدے۔ ایسی صورت میں اُس کے پھنس جانے کے قطعی امکانات تھے۔

پہلی بار خان بہادر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دراصل نیاز سے کترانے کے بجائے، اُسے نیاز کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہیے تھا۔ بہرحال اب جو کچھ ہو چکا تھا، اس کا تدارک ضروری تھا چنانچہ اسی روز اُس نے دوڑ دھوپ کر کے نیاز کو ضمانت پر رہا کرا لیا۔

چند ہی روز بعد تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ گورنمنٹ کو دیدی۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ مارکٹ کی تعمیر میں جو سامان استعمال کیا گیا ہے۔ وہ بہت گھٹیا قسم کا ہے۔ دیواروں کی چنائی میں سمنٹ کا جز بہت کم ہے۔ اس کمی کو ریت اور زرد مٹی سے پورا کیا گیا ہے۔ چھتوں میں کنکریٹ برائے

نام ڈالی گئی اور پوری عمارت کی بنیادیں بہت کمزور اور کم گہری رکھی گئی تھیں۔ یہ سارے الزامات نیاز کے خلاف تھے۔

تحقیقاتی کمیٹی نے حکومت سے پُرزور سفارش کی تھی کہ ٹھیکیدار کو سخت سزا دی جائے۔ اس کی بدعنوانیوں کے باعث ۸ اشخاص کی جانیں تلف ہوئی تھیں۔ ۷ افراد اپنے جسموں کے اکثر اعضا ضائع کر کے اپاہج ہو گئے اور لاکھوں روپے کا حکومت کو نقصان ہوا۔

رپورٹ میں جگہ جگہ نیاز کے خلاف ٹھیکیدار کی حیثیت سے، سخت جملے تحریر کئے گئے تھے اس کو ہر طرح ایک خطرناک مجرم ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

گو کہ یہ رپورٹ ابھی ریلیز نہیں کی گئی تھی مگر خان بہادر کو اُس کی نقل مل گئی تھی۔ نقل کے ملتے ہی وہ بدحواس ہو گیا۔ اب نیاز اُس کو بے حد خطرناک آدمی معلوم ہونے لگا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ معاملہ عدالت کے روبرو بھی جائے گا اور وہاں نیاز کا بیان بھی لیا جائے گا۔

بہت کچھ سوچنے کے بعد خان بہادر کے ذہن میں ایک ہی تجویز آئی اور وہ تھی نیاز کے قتل کی سازش۔ نیاز کو ختم کئے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔ اس کی موجودگی میں خان بہادر کو ہر وقت خطرہ درپیش تھا۔ وہ اُس کے خلاف سارے ثبوت مہیا کر سکتا تھا۔

اس سازش کا وہ پورا خاکہ تیار کر چکا تھا۔ اُسے صرف ایک شخص کا انتظار تھا، جو ان دنوں راولپنڈی میں تھا اور اُس کے آنے میں ابھی ہفتہ بھر کا عرصہ تھا۔

●

۴

ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ کمرے کے اندر ہوا کے نرم نرم بھیگے ہوئے جھونکے آ رہے تھے، جن میں برسات کے پہلے چھینٹے کی مہک تھی۔ نادرہ گردن جھکائے آہستہ آہستہ لکھ رہی تھی۔ اُس کے برابر ہی نوشا بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے ابتدائی کلاسوں کی کھلی ہوئی کتاب رکھی تھی۔ گذشتہ چند ہفتوں سے وہ باقاعدگی کے ساتھ نادرہ کی نگرانی میں پڑھ رہا تھا۔

نادرہ نے لکھتے لکھتے فاؤنٹین پن اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور ایک تھکی ہوئی سی انگڑائی لی ٹیبل لیمپ کی گہری نیلگوں روشنی میں اُس کے جسم پر لہروں کا مدوجزر پھیلتا چلا گیا۔ نادرہ ذرا دیر خاموش بیٹھی رہی، پھر دریچے پر اٹھکر چلی گئی۔

نوشا مکتب کے کسی طالب علم کی طرح جھوم جھوم کر پڑھ رہا تھا۔ اُس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے اور نگاہیں کتاب پر جمی ہوئی تھیں۔ ذرا دیر بعد نادرہ کی آواز آئی۔

"نوشا یہاں آؤ"

وہ چپ چاپ دریچہ پر جا کر اُس کے برابر کھڑا ہو گیا۔ نادرہ نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔ سامنے حد نظر تک روشنیوں کا جال پھیلا تھا۔ اونچی اونچی عمارتوں کے جھلکتے ہوئے دریچوں نے چراغاں کر دیا تھا۔ رم جھم، رم جھم مینہ برس رہا تھا اور دور اُفق میں بار بار بجلی کڑک رہی تھی، ہوا

کے ہلکے پھلکے جھونکوں سے نادرہ کے بالوں کی ایک لٹ بکھر کر رخسار پر لہرا رہی تھی۔

چند منٹ بعد نادرہ نے کہا "معلوم ہوتا ہے آج رات بھر بارش ہوگی"

نوشا نے مختصر سا جواب دیا "ہاں"

اچانک نادرہ نے بڑا بے تکا سا سوال کیا "نوشا تم نے کسی لڑکی سے محبت کی ہے"

"نہیں"

"تم سخت بور معلوم ہوتے ہو"

نوشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ ننھی ننھی بوندوں کی جھالر روشنی کے پس منظر میں لہراتی رہی۔ ہوا میں ہکی ہلکی خنکی تھی۔ نادرہ کا جسم بار بار ٹھٹھر ٹھٹھرا کے رہ جاتا۔ وہ کچھ بے چین نظر آ رہی تھی۔ اس نے نوشا کی جانب دیکھے بغیر پوچھا۔

"تم نے کسی لڑکی کے ہونٹوں کو چوما ہے؟"

اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ نوشا کو اس کی بات عجیب معلوم ہوئی۔ وہ شرما کر بولا۔

"نہیں"

اس دفعہ نادرہ نے گھوم کر اس کی جانب دیکھا اور آہستہ سے بولی "سچ؟"

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں"

نادرہ کی نظریں نوشا کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں شہر کی تمام روشنیوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔ اس نے الجھی ہوئی آواز سے کہا "نوشا" اور نوشا نے بے اختیار اس کے لبوں کو چوم لیا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا بوسہ تھا۔ گرم اور طویل۔ اس کی لذت بڑی ہولناک تھی۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ اس کا دل خوف سے ریل کے انجن کی طرح دھڑک رہا تھا۔

عین اس وقت کمرے کے اندر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ نوشا نے گردن پیچھے ہٹائی اور پلٹ کر دیکھا۔ سامنے پروفیسر کھڑا تھا۔ عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے اس کی گول گول

آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے اور وہ گردن اونچی کئے باوقار انداز میں کھڑا تھا۔ نوشا اُس کو دیکھکر خوف زدہ ہوگیا۔ اُس نے نظریں نیچی کرلیں۔ پروفیسر نے انگلی کے اشارے سے نوشا کو اپنے قریب بلایا اور کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"آؤ میرے ساتھ آؤ"

نوشا اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں نے زینہ کی سیڑھیاں طے کیں اور نیچے آگئے۔ پروفیسر نوشا کے کمرے کا دروازہ تھام کر کھڑا ہوگیا۔ اب وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا "قطعی ناقابل برداشت۔ ہرگز ہرگز نہیں۔ یہ انسانی ہمدردی کا بے جا استعمال ہے" ایک بارگی وہ زور سے چیخا۔

"کیا سمجھے تم ؟"

نوشا سر جھکائے ملزموں کی طرح کھڑا رہا۔

پروفیسر کہنے لگا "مسٹر تم اس کمرے کو فوراً خالی کردو۔ میں پانچ منٹ سے زیادہ تم کو وقت نہیں دے سکتا" یہ کہکر وہ دہلیز کے بیچوں بیچ ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہوگیا۔

نوشا ہکا بکا کھڑا اس کا منہ تک رہا تھا اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔

پروفیسر بڑی سنجیدگی سے بولا "مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تم ابھی تک جرائم پیشہ ہو۔ اپنی بربادی کا انتقام تم معاشرے سے لو۔ تم مجھ سے اس کا بدلہ نہیں لے سکتے۔ ہرگز نہیں۔ تم سزا یافتہ ہو، جیب کترے ہو، اُٹھائی گیرے ہو، میں تم کو اس بات کا ہرگز حق نہیں دے سکتا کہ تم میری لڑکی کے ساتھ فلرٹ کرو۔ تم اور نادرہ مل کر کبھی مکمل اکائی نہیں بن سکتے۔ وہ خطِ مستقیم ہے اور تم خطِ منحنی۔ دو غیر مساوی مقداریں۔ تم مسئلہ فی الحال سب سمجھتے ہو ؟"

نوشا ہونق کی طرح خاموش کھڑا اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

پروفیسر زور سے چیخا "میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ تین منٹ ختم ہو چکے ہیں۔ پانچویں منٹ پر تمھارا ایک قدم اس گھر کے باہر ہونا چاہئیے۔ اپنا سامان پیک کرو اور فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

نوشا نے گھبرا کر جلدی جلدی اپنا سامان ایک چادر میں باندھا اور گٹھری اٹھا کر بغل

میں دبالی۔ پروفیسر نے معائنہ کرنے والے انسپکٹر کی طرح نوشا کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اونچی آواز سے بولا "بالکل ٹھیک۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

نوشا کمرے سے باہر نکلا۔ پروفیسر اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اُس نے خاموشی کے ساتھ گھر کا صدر دروازہ کھولا اور نوشا سہما ہوا سا باہر چلا گیا۔ پھر اُس نے دروازے کا بولٹ چڑھانے کی آواز سُنی۔ اندر گیلری میں قدموں کی آواز آہستہ آہستہ اُبھری۔ پھر چوبی زینہ پر ٹھپ ٹھپ کا شور ہوا۔ پروفیسر اوپر جا رہا تھا۔ نوشا دروازے کے باہر کھڑا ایک ایک آواز ایک ایک آہٹ کو سنتا رہا۔ ابھی تک بونداباندی ہو رہی تھی اور آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اُسے رہ رہ کر پروفیسر پر غصہ آرہا تھا۔ سالا بالکل اُلّو کا پٹھا ہے۔ نہ جانے کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔ لیکن اس گھر سے نکلنے کا اُسے بہت افسوس تھا۔ کئی سال بعد اُسے گھریلو ماحول ملا تھا۔ جہاں وہ خوش تھا، مطمئن تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ اسکول میں پڑھنا شروع کر دیگا۔ بغل میں موٹی موٹی کتابیں دبا کر ٹھاٹھ سے پڑھنے جایا کرے گا۔ پھر وہ میٹرک کا امتحان پاس کرے گا۔ نادرہ نے یہی کہا تھا۔ مگر اس سالی نے تو اپنا ڈبا ہی گول کر دیا۔ وہ اس پر جھنجھلایا بھی اور وہ اُس کو یاد بھی آئی۔ وہ چھریرے جسم کی نازک سی لڑکی، جو اس کو بات بات پر ڈانٹتی تھی اور جس کے ناراض ہونے میں اُس کو بڑا مزا آتا تھا۔ اب تو وہ اُس کو دیکھ بھی نہ سکے گا۔ یہ سوچتے سوچتے اُس کا دل بوجھل ہوگیا۔ پھر بڑی بےچارگی کے عالم میں اُس نے سوچا کہ وہ کراچی چھوڑ دے گا اور سیدھا اماں کے پاس جائے گا۔ سب سالا کھڑاگ ہے۔ بس چلنا چاہیئے اسی وقت اُس نے طے کیا کہ وہ سویرے کی ٹرین سے کراچی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے گا۔

بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور رات سر پر لدی کھڑی تھی۔ نوشا نے اسٹیشن کے مسافر خانے میں رات بسر کرنے کا پروگرام بنایا۔ اچانک اُس کو راجہ یاد آگیا۔ اُس نے سوچا چلتے چلتے اس سے بھی مل لینا چاہیئے۔ جانے اب اس سے کبھی ملاقات ہو بھی کہ نہیں۔

پروفیسر کے دروازے پر کھڑے ہونے سے اس کو وحشت ہو رہی تھی۔ لہٰذا کپڑوں کی

گٹھری کو سر پر رکھکر وہ بارش میں سڑک پہ چل دیا۔

جب وہ راجہ کے پاس پہنچا تو رات سنسان پڑ چکی تھی۔ وہ ایک کونے میں سکڑا سکڑایا پڑا تھا۔ قریب ہی ایک کتا لیٹا تھا۔ ترپال سے بارش کا پانی ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ اندر کیچڑ تھی سڑاند تھی اور گہرا اندھیرا تھا۔ نوشا ٹھٹک کر باہر ہی رُک گیا۔ اندھیرے میں اُس کو کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کتا غرا کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ اُس کے ساتھ ہی راجہ کی آواز اُبھری۔

"کون ہے؟"

نوشا نے بے تکلفی سے کہا "ارے یار میں ہوں نوشا۔ پر یہاں تو بڑا اندھیرا ہے"۔

راجہ بوجھل لہجے کے ساتھ بولا "ابے اپنی تو قسمت ہی میں اندھیرا ہے۔ آ، اندر آجا"

نوشا گردن جھکا کر اندر داخل ہوا تو اُس کے نتھنوں پر تیز بو نے اچانک حملہ کر دیا۔ وہ چپ چاپ جا کر راجہ کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ پوچھنے لگا "اس وقت بارش میں تم کیسے نکل آئے؟"

نوشا نے جواب دیا۔ "میں صبح کی ٹرین سے گھر جا رہا ہوں"۔

"سچ؟" راجہ کو یقین نہ آیا۔ اصرار کر کے پوچھنے لگا "یار ٹھیک ٹھیک بتا"

"ابے میں کوئی جھوٹ بول رہا ہوں"

"مگر تو تو کہتا تھا کہ میں نے پڑھائی شروع کر دی ہے۔ اسکول میں نام لکھوانے والا ہوں۔ میٹرک کا امتحان دوں گا۔ یہ کروں گا، وہ کروں گا، وہ سارا پروگرام کیا ہو گیا"۔

"بات تو کچھ ایسی ہی تھی۔ پر یار وا اپنی سالی تقدیر ہی کچھ کھوٹی ہے"۔

راجہ کو اس بات سے جیسے خوشی ہوئی۔ موج میں آکر گنگنانے لگا۔

کھوٹی چونی چاندی کی

جے بولو مہاتما گاندھی کی

نوشا بگڑ کر بولا "ابے بند کر اپنی یہ بھیروی۔ میں بات کر رہا ہوں اور تجھے گلے بازی کی سوجھی ہے۔ سالے تجھے کبھی عقل نہ آئی" راجہ کھسیانا ہو کر کہنے لگا۔

"یار یوں ہی دل خوش کر لیتے ہیں۔ تو آگیا تو ذرا بات چیت بھی کر لی۔ ورنہ شام سے اکیلا پڑا ہوں۔ بخار بھی معلوم ہو رہا ہے" راجہ یہ کہکر زور زور سے کھانسنے لگا۔ نوشا نے اس کے ماتھے کو چھوکر دیکھا تو وہ بخار سے تپ رہا تھا۔ راجہ کے سارے کپڑے بوچھاڑ سے بھیگ گئے تھے اور وہ دھوبی کی ناند میں پڑے ہوئے گیلے کپڑوں کی پوٹ معلوم ہو رہا تھا۔ نوشا کہنے لگا۔

"ابے تو نے کچھ کھایا پیا بھی ؟"

راجہ نے جواب دیا "نہیں۔ بھوک ہی نہیں لگی"

"اچھا لے ایک سگرٹ تو پی"

"یار نوشا کیا بات کہی تو نے۔ خدا قسم دل خوش کر دیا"

دونوں نے سگرٹیں سلگائیں اور لمبے لمبے کش لگانے لگے۔ بارش کے قطرے ترپال پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ ہوا سرد تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر نوشا نے دیوار سے پیٹھ لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ راجہ پر بھی نیند کی غنودگی طاری ہو گئی۔ دونوں تھک کر سو گئے تھے۔

رات کے پچھلے پہر نوشا کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ کتا مینہ کی بوچھاڑ سے بھیگ کر کوں کوں کرتا ہوا اس کی ٹانگوں کے اندر گھس گیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور کتے کو گالیاں دینے لگا۔

"مار دیا سالے نے" راجہ بھی اس کی آواز سن کر جاگ اٹھا۔ پوچھنے لگا۔

"اماں کیا ہو گیا ؟"

نوشا جل کر بولا "ہو کیا گیا۔ یہ سالا تیرا کتا ہے۔ حرامی پن کر رہا ہے۔ تو نے بھی کیا کھٹراگ رکھ چھوڑا ہے"

راجہ بڑے افسردہ لہجے میں بولا "ارے یار آدمیوں کا ساتھ چھوٹ گیا تو اب جانوروں سے بھی دوستی نہ کروں" اس کے لہجہ میں بلا کا کرب تھا۔ نوشا کانپ اٹھا۔

مینہ برسنا اب بند ہو گیا تھا آسمان شفاف نظر آرہا تھا اور ہلکی ہلکی کافوری روشنی پھیلنے

لگی تھی۔ نوشا کہنے لگا "اب سویرا ہونے والا ہے۔ میں اسٹیشن چلوں گا" راجہ نے فوراً کہا۔

"ابے چلا جانا۔ تھوڑی دیر تو اور بیٹھ"

نوشا کے پاس ۲۰ روپے اور کچھ ریزگاری موجود تھی۔ اس نے خاموشی کے ساتھ جیب سے ۵ روپے کا ایک نوٹ نکالا اور راجہ کو دیتے ہوئے بولا "لے یہ ۵ روپے رکھ لے"

"نہیں یار۔ میں تیرے روپے نہیں لوں گا۔ میرا تو کسی نہ کسی طرح کام چل ہی جاتا ہے۔ تو اتنے دنوں بعد گھر جا رہا ہے۔ خالی ہاتھ جائے گا تو سب کیا کہیں گے؟"

نوشا اصرار کرنے لگا مگر راجہ نے نوٹ نہیں لیا۔ کہنے لگا "تو مجھے بس ایک سگرٹ پلا دے سالا گلا سوکھ رہا ہے۔"

دونوں نے پھر ایک ایک سگرٹ سلگائی اور تمباکو کا دھواں اندر گھٹنے لگا۔ راجہ نے سرہانے سے ٹٹول کر ایک بڑا سا چاقو نکالا اور نوشا کی طرف بڑھا کر بولا "لے تو اسے رکھ لے۔ کچھ کام ہی دے جائے گا۔ میرے لئے تو اب یہ بیکار ہوگیا ہے" نوشا نے فوراً کہا۔

"میں نے چاقو واقو رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ اس کو تو تو اپنے ہی پاس رکھ"

"اچھا تو تو اس کو میری نشانی ہی سمجھ کر رکھ لے" پھر اُس کی آواز دردناک ہوگئی۔ آہستہ سے بولا "میرے پاس رہے گا تو ڈر ہے کہ کسی دن اپنے ہی ہاتھوں اپنا سینہ نہ چیر ڈالوں۔ یار سالی اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ تُف ہے ایسے جینے پر"

نوشا نے چاقو لے کر چپ چاپ اپنے پاس رکھ لیا اور راجہ کے چہرے کو دیکھنے لگا، جو صبح کاذب کی دھندلی روشنی میں بڑا خوفناک نظر آرہا تھا۔ راجہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا اور بار بار زخموں کی تکلیف سے کراہنے لگتا۔ آخر جب وہ اُٹھ کر جانے لگا تو راجہ نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"تھوڑی دیر اور ٹھہر جا۔ ایک تیرا ہی تو سہارا رہ گیا تھا۔ اس دنیا میں اب اپنا کوئی نہیں رہا۔"

یہ کہتے کہتے اُس کی آواز بھرّا گئی اور وہ سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ اُس نے نوشا کے ہاتھ کو مضبوطی سے دبوچ لیا اور اُس پر اپنا منہ رکھکر کہنے لگا "نوشا خدا کے لئے مجھے چھوڑ کر نہ جا۔ میرا کوئی نہیں۔ ہائے اللہ میرا کوئی نہیں رہا"۔ وہ چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ نوشا کا دل بھر آیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر راجہ کے چہرے پر گرنے لگے۔

دونوں کچھ دیر اسی طرح روتے رہے۔ ان کی سسکیاں گہری خاموشی میں اُبھرتی رہیں۔ پھر راجہ نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اُس نے نوشا سے کہا "جا یار تجھے دیر ہو رہی ہے۔ ماں تیرا انتظار کر رہی ہو گی"۔

نوشا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی کے ساتھ جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالا اور راجہ کو دیدیا۔ پھر اُس نے اپنی گٹھری اٹھائی اور باہر جانے لگا۔ ترپال کی جھکی ہوئی چھت سے باہر آکر اُس نے مڑکر راجہ کو دیکھا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں اُس کو رکتے دیکھکر وہ بولا "یار اب تو جا۔ کیوں خواہ مخواہ دیر کر رہا ہے" یہ کہتے کہتے اُس کو کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔

نوشا بڑھ کر سڑک پر آگیا۔ دُور تک راجہ کے کھانسنے کی آواز اُس کے کانوں میں پہنچتی رہی —

جب وہ اسٹیشن پہنچا تو گاڑی پلیٹ فارم پر آچکی تھی۔ اُس نے ٹکٹ خریدا اور تیسرے درجے کے ایک ڈبّے میں جا کر بیٹھ گیا۔ ابھی گاڑی چھوٹنے میں دیر تھی۔ مگر مسافروں کی ریل پیل شروع ہو گئی تھی۔

گھنٹہ بھر بعد ٹرین روانہ ہو گئی۔ ڈبہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ لوگ ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے اور نوشا ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا۔ اُسے اپنا شہر یاد آرہا تھا۔ اپنا محلہ اور محلہ کی وہ گلی، جس کے نکڑ پر میونسپلٹی کی لالٹین لگی تھی۔ جہاں راتوں کو سب لڑکے مل کر اودھم مچایا کرتے تھے۔ محلہ کی وہ نیچی نیچی دیواروں والے مکان، جن میں اس کا بھی گھر تھا اور پھر اماں، سلطانہ اور

اللہ۔ نہ جانے سب لوگ اب کیسے ہوں گے۔ اس کو دیکھکر کیا کہیں گے۔ ایک کے بعد دوسرا خیال، ایک یاد کے بعد دوسری یاد۔ خیالات کا ایک سلسلہ تھا جو پھیلتا جارہا تھا۔ ٹرین آہنی پٹریوں پر تیزی سے بھاگ رہی تھی اور نوشا یادوں کی بھول بھلیوں میں الجھا ہوا تھا۔

جس وقت وہ ٹرین سے اپنے شہر کے اسٹیشن پر اُترا رات ایک پہر گذر چکی تھی۔ اُس نے خاموشی کے ساتھ پلیٹ فارم کو طے کیا اور اسٹیشن کی عمارت سے باہر آگیا۔ ایک رکشا والے کی جانب بڑھتے ہوئے اُسے شبہ ہوا کہ اُس نے کہیں اُس کو دیکھا ضرور ہے۔ وہ دُبلا پتلا نوجوان تھا۔ سر پر بڑے بڑے بال۔ لمبے لمبے ہاتھ پاؤں اور اندر کی جانب دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں رکشا والے نے بھی اُس کو غور سے دیکھا اور چیخ مار کر بے اختیار اُس کے گلے سے چمٹ گیا۔

"ابے نوشا تو آگیا"

وہ شامی تھا۔ اُس سے مل کر نوشا کو بڑی خوشی ہوئی۔ پوچھنے لگا "ابے یہ دھندا تو نے کب سے شروع کر دیا؟"

وہ مری ہوئی آواز سے بولا "یار آبا کے مرنے کے بعد تو سالی مصیبتوں نے اپنا گھر دیکھ لیا۔"

"ابے تیرے آبا کا انتقال ہوگیا۔ کب؟"

"یاران کو مرے ہوئے یہ تیسرا سال ہے"

نوشا نے پوچھا "دکان بھی تو تھی تمھاری؟"

"وہ تو آبا کی بیماری کے زمانے ہی میں بیچ دی تھی" شامی اپنی پریشانیاں سنانے لگا۔ وہ صبح کے وقت اب بھی اخبار بیچتا تھا اور رات کو رکشا چلاتا تھا۔ گھر میں سات کھانے والے تھے اور ان سب کا بوجھ تنہا اُس کے دم پر تھا۔ اُس کی صحت خراب ہوگئی تھی۔ بات کرتے ہوئے بار بار کھانستا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک اُس نے نوشا سے پوچھا "مگر اس وقت تم جاؤ گے کہاں؟"

نوشا کو اُس کے سوال پر کسی قدر حیرت ہوئی۔ کہنے لگا "گھر جاؤں گا اور کہاں؟"

اُس نے جلدی سے پوچھا "گھر۔ کون سا گھر؟"

نوشا گھبرا گیا "ابے کیا اُڑا رہا ہے۔ اپنے گھر جاؤں گا۔ وہی گلی والا گھر اور میرا کون سا گھر ہے۔"

شامی نے گردن نیچی کرلی اور آہستہ سے بولا "تو یار تجھکو کچھ بھی پتہ نہیں؟"

نوشا کا دل زور زور دھڑکنے لگا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے صرف ایک لفظ کہا "کیا؟"

شامی بولا "اس گھر میں تو حاجی رحیم بخش رہتے ہیں"

نوشا نے گھبرا کر کہا "اور میری اماں؟"

شامی نے جھجکتے ہوئے کہا "اُن کا تو دو سال ہوئے انتقال ہو گیا"

نوشا کے سینہ پر زبردست گھونسا لگا اور وہ شامی کے گلے سے لپٹ کر رونے لگا۔ دیر تک اس کی سسکیاں اُبھرتی رہیں۔ پھر اُس نے بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا "میری بڑی بہن اور انو کہاں ہیں؟" شامی نے چاہا کہ وہ اس موضوع کو ٹال دے کہنے لگا "تمھارے جانے کے بعد تو تمھارے گھر میں بڑی عجیب عجیب باتیں ہوئیں۔ اب تم میرے ساتھ گھر چل کر بیٹھو تو اطمینان سے سب کچھ بتاؤں گا۔ بڑی لمبی داستان ہے۔" نوشا نے ضد کر کے پوچھا۔ "یار کچھ تو بتا دے۔ تو نے تو مجھے یہ خبر بتا کر بے موت مار دیا۔ ہائے اماں تم کو دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا"

نوشا پھر منہ لبور کر رونے لگا۔ شامی نے کہا "اچھا اب تم رکشا پر بیٹھ جاؤ۔ میں تم کو راستے میں بتا دوں گا۔ بادل گھرے ہوئے ہیں۔ مینہ برسنے لگا تو گھر پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔"

نوشا رکشا پر سوار ہو گیا۔ شامی نے پیڈل پر پیر مارا اور رکشا آگے روانہ ہو گئی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد نوشا نے اپنا سوال دہرایا "یار یہ تو بتا دے کہ سلطانہ اور انو کہاں ہیں؟"

"انو کی یار نہ پوچھ۔ اس سالے نے تو ناک کٹوا دی۔"

"کیوں ـــ؟"

" سالا ہیجڑوں کے ساتھ رہتا ہے۔ روزانہ شام کو خوب پوڈر دوڈر لگا کر ان کے ساتھ بازار میں گھومتا پھرتا ہے۔ پھٹا پھٹ تالیاں پٹخارتا ہے۔ عورتوں کی طرح اٹھلا اٹھلا کر کمر لچکاتا ہے۔ اس کو ذرا بھی تو غیرت نہیں آتی۔ یار بُرا نہ ماننا میرا بھائی ہوتا تو سالے کے چار ٹکڑے کر کے ڈال دیتا۔ اس نے ذلالت کی حد کر دی "۔

یہ بات سُن کر نوشا کا خون کھول اٹھا۔ پوچھنے لگا " وہ رہتا کہاں ہے ؟ "

" نہ جانے کہاں رہتا ہے۔ پر شام کو روز بازار میں ضرور نظر آتا ہے "

نوشا نے ایک لمبی ہوں کی اور اس سے پوچھنے لگا " سلطانہ کا بھی کچھ پتہ ہے کہ وہ آج کل کہاں ہے " ؟

شامی اس وقت سڑک کی ایک چڑھائی پر رکشا لئے جا رہا تھا۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس لئے اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ نوشا نے ذرا دیر بعد اپنی بات دُہرائی تو وہ کہنے لگا " وہ تو نیاز کے ساتھ رہتی ہے "۔

" نیاز کے ساتھ ؟ "

" ہاں جی وہی نیاز جس کی بازار میں کباڑ خانے کی دوکان تھی۔ اب تو وہ بڑا آدمی بن گیا ہے۔ کوٹھی میں رہتا ہے۔ ایک دم صاحب بہادر بن گیا ہے۔ کوٹ پتلون پہنتا ہے اور موٹر سے کم بات نہیں کرتا۔ یار اُس کے تو بڑے ٹھاٹھ باٹھ ہیں۔ تو اُس کو دیکھے گا تو پہچان بھی نہیں سکے گا "۔

" مگر سلطانہ اُس کے یہاں کیوں چلی گئی "

" ارے یار بات یہ ہے نا کہ تیری اماں نے نیاز سے نکاح پڑھوا لیا تھا۔ تو ناراض نہ ہو تو ایک بات بتاؤں، میں نے سُنا ہے کہ سلطانہ کی اور اس کی کچھ لگ سٹ ہو گئی تھی۔ اسی لئے نیاز نے تیری اماں کو مروا دیا۔ سارے محلے والے یہی کہتے ہیں " وہ رکشا چلاتا جا رہا تھا اور رُک رُک کر بول رہا تھا " سالے نے بہت حرامی پن کیا ہے۔ ایک نمبر بدمعاش ہے "۔

نوشا خاموش بیٹھا اُس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اُس نے شامی سے کہا۔ "تجھے نیاز کا گھر معلوم ہے؟"

"ہاں معلوم تو ہے"

"تو پھر تو مجھے وہیں لے چل"

"یار اب اس وقت وہاں جا کر کیا کرے گا۔ وہ تو یہاں سے بہت دور جگہ ہے"

نوشا نیاز کی کوٹھی پر چلنے کے لئے اصرار کرنے لگا تو شامی نے مجبوراً رکشا اس طرف موڑ دی۔ اب نوشا بہت کم بول رہا تھا۔ کبھی کبھار ہوں، ہاں کر دیتا۔ شامی رُک رُک کر محلے کے اور لوگوں کی باتیں سُناتا رہا۔

جب وہ دونوں نیاز کی کوٹھی کے پھاٹک پر پہنچے تو رات کے ۱۱ بجے تھے۔ نوشا نے رکشا سے اُتر کر شامی کو کرائے کا ایک روپیہ دینا چاہا تو اُس نے نوشا کو ایک گندی سی گالی دی اور منہ بگاڑ کر بولا۔ "یار تو کراچی سے چند ٹکے کما لایا تو مجھ پر رعب جھاڑ رہا ہے۔ صبح گھر آنا۔ دونوں ساتھ کھانا کھائیں گے۔ اور دیکھ نیاز کے ہاں تیرا زیادہ ٹھہرنا ٹھیک نہیں"۔ یہ کہہ کر وہ اُچک کے رکشا پر سوار ہوا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

نوشا کوٹھی کے پھاٹک پر خاموش کھڑا رہا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ کوٹھی کے ایک دریچے سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس کے علاوہ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ نوشا نے آہستہ سے پھاٹک کھولا اور لان کے اندر چلا گیا۔ مگر کوٹھی کی طرف جانے کے بجائے وہ درختوں کی طرف چلا گیا۔ وہاں گہرا اندھیرا تھا۔ وہ دبے قدموں سے چلنے لگا۔ خشک پتے بار بار اس کے جوتوں کے نیچے آ کر آہٹ پیدا کرتے اور وہ چونک پڑتا۔

اس نے کوٹھی کا ایک چکر لگا کر ہر طرف سے معائنہ کیا۔ پھر ایک جھاڑی کے نیچے اُس نے کپڑوں کی گٹھری رکھی۔ اس میں سے چاقو نکال کر کھولا اور اُس کو دانتوں میں دبا کر صحن کی چہار دیواری پر چڑھ گیا۔ کوٹھی گہری خاموشی میں کھنڈر کی طرح سنسان نظر آ رہی تھی۔ وہ آہستہ سے

نیچے اُترا اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا اس کمرے پر پہنچا، جہاں روشنی ہو رہی تھی۔

اُس نے دالان کے ایک ستون کی آڑ لے کر کمرے کے اندر نظر ڈالی۔ نیاز اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر جھکا ہوا غور سے دیکھ رہا تھا۔ نوشا آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ نیاز کو ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ وہ خاموشی کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ اُس کا سایہ دیوار پر لہرایا۔ نیاز نے چونک کر اس کو دیکھا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ کچھ کہے۔ نوشا جھپٹ کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ کھلا ہوا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اُس نے پہلا ہی وار بھرپور کیا۔ تین پسلیاں چیر ڈالیں۔ نیاز زور سے چیخا۔

"ہائے مار ڈالا"

اور کرسی پر سے لڑھک کر فرش پر گر پڑا۔ نوشا ایک ٹانگ کے بل جھک کر بیٹھ گیا اور پے بہ پے وار کرنا شروع کر دیئے۔ اُس نے نیاز کے سینے کو، پیٹ کو، گردن کو، بازوؤں کو، ہر ہر حصّہ کو چیر ڈالا۔ نیاز کا جیتا جیتا خون کمرے میں ہر طرف پھیل گیا۔ وہ ذرا دیر تک تڑپتا رہا۔ کراہتا رہا اور پھر اُس نے دم توڑ دیا۔

نوشا اُس کے سرہانے بیٹھا بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ خون میں بھرا ہوا چاقو ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اچانک کمرے کے باہر آہٹ اُبھری۔ نوشا نے دیکھا سلطانہ کمرے کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اُس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر نوشا کو دیکھا۔ پھر نیاز کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش دیکھی۔ اُس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ اُس نے چیخ کر کہا۔

"ہائے نوشا تو نے یہ کیا کر دیا؟"

نوشا خاموشی کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ سُلطانہ جنگلی کبوتر کی سی اُس کی سُرخ آنکھوں کو دیکھ کر سہم گئی۔ اُس نے آہستہ سے پوچھا "اب تو کہاں جا رہا ہے؟"

نوشا نے خونخوار نظروں سے اُس کو دیکھا اور گردن ہلا کر بولا "تھانے" اُس کی آواز ڈھول

کی طرح گرج دار تھی۔

سلطانہ فوراً دروازے کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی "میں تجھے نہیں جانے دوں گی"

نوشا غرا کر چیخا "ہٹ جا حرامزادی میرے سامنے سے ٹکڑے کر کے ڈال دوں گا"

وہ پاگلوں کی طرح بولتی چلی گئی "تو مجھے بھی مار دے۔ تو مجھے بھی مار دے" نوشا نے قریب پہنچ کر اس زور سے اُس کو دھکا دیا کہ وہ دروازے سے ٹکرا کر گر پڑی۔ نوشا کمرے سے باہر نکل گیا۔ سلطانہ دوڑ کر اُس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"نوشا، میرے بھائی۔ اللہ کے لئے رُک جا، میری بات تو سُن لے"

وہ گڑگڑا کر رونے لگی۔ نوشا کے سر پر خون سوار تھا۔ اُس نے پیر کو زور سے جھٹکا دیا۔ سلطانہ لڑھک کر دور جا گری اور وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ سلطانہ فرش پر پڑی ہوئی چیخ رہی تھی "نوشا خدا کے لئے رُک جا نوشا، نوشا" اُس کی آواز دیر تک اُبھرتی رہی۔

نوشا کوٹھی سے نکل کر باہر آ گیا۔ درختوں کے خشک پتوں پر اُس کے قدموں کی آہٹ سنائی پڑ رہی تھی اور کوٹھی کے اندر بڈھی خادمہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔ نوشا نے پھاٹک کھولا اور باہر سڑک پر آکر بوجھل قدموں سے چلنے لگا۔ اُس کے ہاتھ میں خون سے لتھڑا ہوا چاقو تھا اور وہ پولس اسٹیشن جا رہا تھا۔

کھٹ کھٹ کھٹ۔ سنسان سڑک پر اُس کے قدموں کی آواز آہستہ آہستہ اُبھرتی رہی۔

فصل یازدهم

۱

قدموں کی چاپ سُن کر، سلمان نے گردن موڑ کر دیکھا، اُس کی پُشت پر لمبے قد کا ایک گورا چٹا نوجوان کھڑا بڑی بے تکلفی سے مسکرا رہا تھا۔ سلمان لمحہ بھر تک خاموش بیٹھا اُس کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ کرسی پر سے اٹھکر کھڑا ہو گیا اجنبی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام انیس اے جیفرے ہے"

اُس نے ہاتھ بڑھا کر اس گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا کہ سلمان کی اُنگلیوں کا کچومر نکل گیا۔ اُس نے فوراً پہچان لیا کہ وہ کون ہے۔ وہ اس کے سکشن کا انچارج، انیس احمد جعفری تھا۔ وہ کمپنی کا سنیئر آفیسر تھا اور سال بھر تک ریاست ہائے متحدہ میں ٹریننگ لینے کے بعد اسی ہفتے واپس لوٹا تھا لیکن دفتر میں وہ اُس روز پہلی بار آیا تھا اور اپنے سیکشن کے ہر ماتحت سے ذاتی طور پر ملاقات کرتا پھر رہا تھا۔

اُس کی پیشانی تنگ تھی، ناک ستواں تھی اور سر پر بھورے بھورے خشخشی بال تھے، وہ ٹخنوں سے اونچی ڈھیلی ڈھالی پتلون اور نائیلون کی جھلکتی ہوئی سفید قمیص پہنے تھا کالر میں شوخ رنگ کی ٹائی بندھی تھی۔ باتیں کرتے وقت وہ بار بار اپنے کندھے اُچکاتا جا رہا تھا۔ اُس کا لہجہ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ وہ خالص امریکی لہجے کے ساتھ بڑی روانی سے انگریزی بول رہا تھا۔ دورانِ

گفتگو میں جتنی بار اُس نے سلمان کو مخاطب کیا۔ ہر بار وہ اس کو مسٹر سالومن کہتا رہا۔ سلمان کو اُس کا یہ انداز تخاطب بڑا عجیب سا لگا۔ مگر پہلی ہی ملاقات میں اُس کو یہ اندازہ ہو گیا کہ انیس احمد جعفری بڑا دلچسپ نوجوان تھا۔

اس کے بعد دفتری امور کے سلسلہ میں سلمان کو بارہا اس سے ملنا پڑا اور ہر بار اُس نے محسوس کیا کہ جعفری میں افسروں والا روایتی کھُردرا پن نام کو نہیں تھا۔ وہ بڑی نرمی سے مُسکرا مسکرا کر بات کرتا تھا۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ اُس کا انداز بڑا مشفقانہ ہوتا۔ اپنے اسی رویّہ کی بدولت وہ اُن کو ناراض کئے بغیر زیادہ سے زیادہ کام کراتا تھا۔ یہ ٹکنک اُس نے سال بھر کی ٹریننگ میں بڑی مہارت کے ساتھ سیکھی تھی۔ دفتر کے مقررہ اوقات کے علاوہ اگر وہ سلمان کو روکنا چاہتا تو اُس سے پوچھتا۔

"مسٹر سالومن، کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ آج شام کے لئے آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

سلمان فوراً سمجھ جاتا کہ اس استفسار کا کیا مطلب ہے۔ اگر اس کا کوئی پروگرام کبھی ہوتا تو وہ اس کا اظہار نہ کرتا۔ اس لئے کہ وہ اس کو ناخوش کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ بلا جھجک کہہ دیا کرتا

"جی نہیں، آج شام میرا کوئی خاص پروگرام نہیں۔"

جعفری بڑے رسمی انداز سے کہتا "کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں آپ کی اس شام کا کچھ وقت لے لوں"۔ اس کے بعد وُہ کوئی کام سلمان کے سپرد کر دیتا۔

اکثر وہ سکشن کے دوسرے ملازمین کی طرح سلمان کو بھی اتوار اور دوسری تعطیلوں پر بُلا لیتا۔ جب کبھی ایسا موقعہ ہوتا تو وہ گھنٹی بجا کر پہلے چپراسی کو بلاتا۔ کینٹین بھیج کر اُس سے چائے منگواتا اور اپنا امریکی سگرٹ (وہ ہمیشہ امریکن سگرٹ پیتا تھا)، پیش کر کے کہتا۔

"مسٹر سالومن کیا آپ اپنی ڈائری دیکھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔ میں یہ دریافت کرنا چاہوں گا کہ اتوار کے لئے آپ کے کیا کیا انگیجمنٹ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ آؤٹنگ کے موڈ میں تو ہرگز نہیں ہیں اور پکنک کے لئے موسم بڑا ارف (نامناسب) ہے۔"

اور سلمان بغیر اپنی ڈائری دیکھے ہوئے کہہ دیتا "میری ڈائری میں اس اتوار کا صفحہ بالکل خالی ہے"۔

جعفری بڑے سرپرستانہ انداز میں اس کی پیٹھ تھپتھپاتا اور مسکرا کر کہنے لگتا "اس عمر میں لڑکوں کو اتنا صوفی نہیں بننا چاہیے" لمحہ بھر توقف کرکے وہ حرف مطلب پر آجاتا اور حسب معمول بڑے تکلف کے ساتھ کہتا۔

"اگر آپ ہالی ڈے کے موڈ میں نہیں ہیں تو کیا میں آپ سے یہ توقع رکھ سکتا ہوں کہ آپ اپنا قیمتی وقت تبنر پر صرف کرنے کے بجائے دفتر کو دیدیں۔ اگر یہ ممکن ہوسکتا ہے تو آپ مجھے ذاتی طور پر ممنون ہونے کا موقعہ دیں گے"۔

جب کوئی سینیئر افسر اپنے ماتحت سے اس قدر نرمی کے ساتھ مطالبہ کرے تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سلمان بھی سکشن کے دوسرے ملازمین کی طرح اُس کی بات مان لیتا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ سلمان نے پہلے ہی ارادہ کرلیا کہ وہ جعفری کے ایسے بے جا مطالبوں کو ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ مگر جب وہ اُس کے روبرو گیا تو وہ انکار نہ کرسکا۔

ان ہی خدمات کے صلہ میں کمپنی نے جعفری کو ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ کے علاوہ اور بھی بہت سی مراعات دے رکھی تھیں۔ جعفری جس کوٹھی میں رہتا تھا۔ وہ اُس کو کمپنی کی جانب سے ملی تھی۔ اس کے پاس جو نئی شیورلٹ تھی۔ وہ کمپنی ہی نے خرید کر دی تھی۔ ہر ماہ تین سو روپیہ اُس کو مختلف الاؤنسوں کی صورت میں مل جاتا تھا۔ وہ بڑے ٹھاٹھ باٹ سے رہتا تھا۔ اعلیٰ درجے کا رہن سہن تھا اور اعلیٰ حلقوں میں اُس کا اٹھنا بیٹھنا رہتا تھا۔

سلمان پر یا تو وہ زیادہ مہربان تھا یا سلمان کو یہ گمان تھا کہ وہ اس کو زیادہ مانتا تھا۔ البتہ اتنی بات ضرور تھی کہ وہ اُس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتا تھا۔ اگر کبھی دفتری امور میں سلمان سے کوئی غلطی سرزد ہوجاتی تو وہ ناراضگی کا اظہار نہ کرتا۔ اُس کو بلا کر نرمی سے سمجھا دیتا۔ کبھی کبھار تنبیہ بھی کرتا تو ہمیشہ براہِ راست نہ کہتا۔ مسکرا کر کہہ دیا کرتا۔

"میں سوچتا ہوں کہ آج کل آپ ذہنی طور پر پریشان ہیں۔ کیا آپ مجھے اس بات کا حق دیں گے کہ میں ان کے بارے میں کچھ پوچھ سکوں۔ مجھے خوشی ہو گی کہ میں آپ کی کچھ مدد کروں۔" سلمان انکار کرتا کہ وہ کسی ذہنی اُلجھن میں مبتلا نہیں ہے تو وہ پوچھتا "کیا آپ نے فائل پر میرا نوٹ دیکھا۔ میں معلوم کرنا چاہوں گا کہ آپ اُس سے کس حد تک اتفاق رائے رکھتے ہیں؟" اور پھر اپنے سوالوں کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ کہتا "کیا میں آئندہ آپ سے یہ اُمید رکھوں کہ آپ مجھے فائلوں پر سُرخ پنسل چلانے کا موقعہ نہیں دیں گے۔"

وہ اُردو اسی طرح بولتا تھا۔ پہلے وہ اپنی بات انگریزی میں سوچتا اور پھر اُس کا ترجمہ کر دیا کرتا۔ یہ اندازِ گفتگو اُس نے اپنی انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ ویسے وہ علی گڑھ یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا اور بی۔ اے میں اُس کے جو مضامین تھے اُن میں اُردو بھی شامل تھی۔ بلکہ طالب علمی کے زمانے میں وہ شاعری بھی کرتا تھا اور کچھ اس ماپ کی نظمیں کہا کرتا۔

تم مرے واسطے یوں اشک بہایا نہ کرو
محفلِ حسن میں یوں دیپ جلایا نہ کرو
میری تصویر کو سینے سے لگایا نہ کرو

میری محبوب مجھے بھول بھی جا، بھول بھی جا

حالانکہ لڑکیاں اُس کو نرا اُلّو کا پٹھا سمجھتی تھیں۔ چہرے مہرے سے وہ یتیم لگتا تھا اور وضع قطع سے کانجی ہاؤس کا محرر۔ مگر اب لڑکیاں اس کو ڈان ژوان کہتی تھیں۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ جب وہ بن سنور کر شام کو اپنی نئی شیورلٹ پر نکلتا تھا تو بڑا بجیلا جوان معلوم ہوتا تھا۔

جعفری کی شخصیت میں سلمان کے لئے روز بروز کشش پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ اس کشش میں ایک عقیدت مندانہ جذبہ کارفرما تھا۔ وہ اس کے روبرو جاتا تو اس انداز سے بات کرتا جیسے منوں بوجھ سے دبا ہوا ہے۔

ان ہی دنوں کا ذکر ہے ایک روز وہ دفتر سے نکلا تو بس اسٹینڈ پر بہت بھیڑ تھی۔ دیر تک انتظار کرنے

کے بعد بھی اس کو کسی بس میں جگہ نہ ملی تو وہ پیدل چل دیا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک ایک جھلکتی ہوئی کار اُس کے قریب آکر رُکی۔ سلمان نے دیکھا جعفری اسٹرنگ پر بیٹھا تھا۔ اُس نے اشارے سے سلمان کو قریب بلایا۔

"اگر آپ چہل قدمی کے موڈ میں نہ ہوں تو میں آپ کو گھر تک لفٹ دینے میں خوشی محسوس کروں گا۔"

یہ کہکر اُس نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ سلمان چپ چاپ اگلی نشست پر اُس کے برابر بیٹھ گیا۔ راستے میں دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ جعفری نے اُس سے صرف مکان کا پتہ دریافت کیا اور آہستہ آہستہ کسی نئی انگریزی فلم کی دُھن گنگنانے لگا۔

کار جب سلمان کے فلیٹ کے سامنے جا کر رُکی تو اس میں سے اُترتے ہوئے سلمان نے سوچا کہ کیوں نہ جعفری کو چائے پر مدعو کر لیا جائے۔ اُس نے جھجکتے ہوئے یہ بات اُس سے کہہ دی۔ جعفری ذرا دیر تو کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ کار سے نکل کر باہر آگیا۔

دونوں زینہ کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچے۔ دروازہ بوڑھی خادمہ نے کھولا تھا۔ وہ اِس وقت بڑا گندا لباس پہنے ہوئے تھی۔ سلمان کو اس پر سخت غصہ آیا اور کچھ شرمندگی بھی محسوس ہوئی کمرے میں اُس کی بیوی موجود نہیں تھی۔ اُس نے جعفری سے اجازت لی اور پچھلے کمرے میں چلا گیا۔ بیوی بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ سلمان نے جاتے کے ساتھ ہی کہا۔

"رخشی میرے آفس کے جعفری صاحب آئے ہوئے ہیں۔ چائے ہم ڈرائنگ روم میں پئیں گے۔"

وہ اُٹھکر بیٹھ گئی۔ "اچھا میں بھجوائے دیتی ہوں۔"

سلمان نے فوراً کہا "خدا کے لئے بڑی بی کے ہاتھ چائے نہ بھجوانا۔ اس سے کہو کہ کبھی کبھار تو نہا لیا کرے۔ کپڑوں سے ایسی بو آرہی ہے کہ اب تم سے کیا بتاؤں۔ جعفری بڑا نفاست پسند آدمی ہے۔ وہ چائے لے کر گئی تو پینے سے بھی انکار کر دے گا۔"

رخشندہ نے کہا "اچھا تو پھر میں ہی لے آؤں گی۔"

سلمان نے بیوی کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا، وہ اس وقت عام گھریلو لباس پہنے ہوئے تھی،

اور یہ بات سلمان کو مناسب نہ معلوم ہوئی۔ کہنے لگا "تم ذرا اپنا حلیہ تو ٹھیک کرلو۔ بخت واہیات لباس پہن رکھا ہے۔ دیکھو جلدی چائے لے کر آنا" یہ کہتا ہوا وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈرائنگ روم میں جا کر سلمان نے دیکھا کہ جعفری ایک میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سلمان نے اُس سے کوئی بات نہیں کی۔ چُپ چاپ اُس کے قریب ہی ایک صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔

خاموش بیٹھے بیٹھے ایکا ایکی سلمان کی نظر اس کُشن پر پہنچ گئی جو جعفری کے پہلو میں رکھا تھا۔ اس کا غلاف خاصا میلا ہو گیا تھا۔ اُس نے سوچا۔ اس گندے کشن کو دیکھ کر جعفری نے جانے کیا سوچا ہوگا۔ اس کا جی چاہا کہ کسی طرح کشن کو اٹھا کر صوفے کے پیچھے ڈال دے تاکہ جعفری کی اس پر نظر نہ پڑ سکے۔ ابھی وہ کشن ہی کے متعلق غور کر رہا تھا کہ ہوا کے جھونکے سے کھڑکی کا پردہ لہرانے لگا۔ سلمان نے دیکھا کہ پردے کے کناروں پر جگہ جگہ تیل کے دھبے لگے تھے۔ اُس نے دل ہی دل میں بوڑھی خادمہ کو کوسا، جس کے پھوہڑپن کے باعث پردے اس قدر بدنما ہو گئے تھے۔ آخر اُس نے اُٹھ کر پردے کو اس طرح سمیٹ دیا کہ داغ کسی حد تک چھپ گئے۔

چائے آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ جعفری نے میگزین کا مطالعہ کرتے کرتے کئی بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھا مگر سلمان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ کچھ بے چین معلوم ہو رہا تھا۔ اُس سے زیادہ بے چین سلمان تھا۔ اُسے رہ رہ کر بیوی پر غصہ آ رہا تھا۔

کوئی ۲۰ منٹ بعد بوڑھی خادمہ چائے کا سامان لے کر آئی۔ اب اُس نے کپڑے تبدیل کر لئے تھے اور وہ کسی حد تک صاف ستھری نظر آ رہی تھی۔ اس بات سے سلمان کو کسی قدر اطمینان ہوا۔ چائے کا سامان رکھا ہی جا رہا تھا کہ اسی دوران میں رخشندہ پردہ ہٹا کر کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔ اس وقت وہ ہلکا گلابی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اُس نے میک اپ میں خاصا اہتمام کیا تھا۔ سلمان نے بیوی کو دیکھا، وہ اس وقت بڑی خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اُس نے جعفری سے رخشندہ کا تعارف کراتے وقت خوشی محسوس کی۔ یہ خوشی ایسی ہی تھی، جیسے جدید ترین ماڈل کی کار، شاندار کوٹھی یا اعلیٰ النسل کا کتا

رکھکر لوگ محسوس کرتے ہیں۔

جعفری نے رخشندہ سے بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس قدر حجاب محسوس کررہی تھی کہ جعفری زیادہ بات نہ کر سکا۔ وہ تمام عرصہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ البتہ سلمان بہت چہک چہک کر بول رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ بیوی سے چھیڑ چھیڑ کر باتیں کر رہا تھا اور بات بات پر ہنس رہا تھا۔ اس کی مسرت میں بچوں کی سی سادگی تھی۔

چائے پینے کے بعد جعفری زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اس کو کسی سے ملنے کے لئے جانا تھا۔ لہٰذا وہ سلمان اور رخشندہ کا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ سلمان اس کو کار تک رخصت کرنے گیا۔

چند ہی روز بعد کا ذکر ہے۔ دفتر میں چھٹی ہونے سے کچھ دیر قبل جعفری سلمان کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا: "سالومن وہ اس روز چائے پر تمھارے یہاں کیا چیز تھی"۔ لمحہ بھر کے لئے وہ رکا "میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو شاید وہ پکوڑے تھے۔ کیا تم میرے خیال کی تائید کروگے؟"

سلمان نے ہنس کر کہا "جی ہاں وہ پکوڑے ہی تھے۔ کیا آپ کو پسند آئے تھے"۔

"میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ان کا ذائقہ پسند آیا تھا۔ کیا تم آج شام مجھے چائے کی دعوت دے رہے ہو۔ لیکن پکوڑے کا آئیٹم ضرور ہو۔ میں اُن کے لئے شام کا بہترین پروگرام بھی قربان کرسکتا ہوں"

سلمان اُس کو چائے پلانے کے لئے خوشی سے تیار ہو گیا۔

دفتر سے نکلنے کے بعد سلمان، جعفری کے ساتھ کار میں بیٹھکر گھر پہنچا۔ چائے کے ساتھ خاص طور پر پکوڑے تیار کئے گئے۔ جعفری نے ان کو بڑے شوق کے ساتھ کھایا۔ اُس روز وہ بہت بے تکلفی کے موڈ میں معلوم ہو رہا تھا۔ چائے کے دوران میں اُس نے بڑے دلچسپ لطیفے سُنائے اور سلمان اور رخشندہ کو خوب ہنسایا۔

چائے سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے پکچر دیکھنے کا پروگرام بنایا اور اصرار کرکے دونوں کو اپنے ہمراہ لے گیا۔

سنیما ہال میں بھی وہ بڑا ہنس مکھ نظر آرہا تھا۔ پکچر دیکھکر باہر نکلے تو جعفری اُن کو چھوڑنے

گھر تک گیا۔ سلمان نے کھانے کے لئے کہا تو وہ مزید اصرار کے بغیر آمادہ ہو گیا۔ کھانا کھا کر بھی وہ رات گئے تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔

جس وقت وہ سلمان کے فلیٹ سے نکلا، اُس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

۲

نیاز کے قتل ہونے کے کچھ ہی دیر بعد ایک سب انسپکٹر کئی کانسٹبلوں کے ساتھ تفتیش کے لئے کوٹھی پر آیا۔ اُس نے نیاز کے کمرے میں جاکر موقعِ واردات کا معائنہ کیا۔ نیاز کی لاش ابھی تک خون میں ڈوبی ہوئی کمرے کے فرش پر پڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں خوفناک طریقے پر پھٹی ہوئی تھیں۔ سر کے بال بکھر کر پیشانی پر آگئے تھے، چہرہ سیاہ پڑگیا تھا۔ وہ دیوار کے قریب چت پڑا تھا۔ لاش سے کچھ فاصلہ پر سلطانہ سر جھکائے، چپ چاپ بیٹھی تھی۔ نہ وہ رو رہی تھی، نہ جسم کو حرکت دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی خانساماں اور بوڑھی خادمہ، سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ فرش پر، دیواروں پر خون کے لال لال لوتھڑے بکھرے ہوئے تھے۔ کمرے کا ماحول بڑا ہیبت ناک تھا۔

سب انسپکٹر کمرے کے اندر تفتیش کے لئے داخل ہوا تو سلطانہ نے دیکھا نوشا بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ وہ کانسٹبلوں کی حراست میں سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی تھیں۔ کپڑوں پر خون کے بڑے بڑے نشان تھے، آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح خوفناک ہو رہی تھیں۔ سلطانہ لمحہ بھر تک ٹکٹکی باندھے نوشا کو دیکھتی رہی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بے اختیار رونے لگی۔

کمرے پر ہولناک سکوت طاری تھا اور اس سکوت میں سلطانہ کی سسکیاں آہستہ آہستہ اُبھر رہی تھیں۔ ایکا ایکی کوٹھی کے پچھواڑے، درختوں تلے گیدڑوں کے رونے کی آواز اُبھری۔ آدھی

رات کا سناٹا ان خوفناک چیخوں سے درہم برہم ہو گیا ۔ لاش کی کھلی ہوئی آنکھیں ہر شخص کو گھور رہی تھیں ۔

سب انسپکٹر جھک کر لاش کا معائنہ کرنے لگا ۔ وہ ایک ایک زخم کو دیکھ رہا تھا اور ہیڈ کانسٹبل کو ہدایتیں دیتا جا رہا تھا ۔ جوائس کی ہر بات کا ڈائری میں اندراج کر رہا تھا ۔ سب انسپکٹر نے تقریباً آدھ گھنٹے میں لاش کے معائنے کی رپورٹ مکمل کی اور اس کے بعد نیاز کے مُردہ جسم کو سفید چادر سے ڈھک دیا گیا ۔

موقعہ واردات کا معائنہ کرنے کے بعد سب انسپکٹر نے سب سے پہلے سلطانہ کا بیان لیا ۔ اُس نے رُک رک کر، سسکیاں بھرتے ہوئے سب انسپکٹر کو بتایا کہ نوشا اُس کا چھوٹا بھائی ہے اور کئی سال بعد اُس کے پاس آیا تھا ۔ نیاز کا اور اس کا کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا جس وقت دونوں کا جھگڑا ہوا ، وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی ۔ وہ نیاز کی چیخیں سُن کر وہاں آئی تھی ۔ نیاز اُس وقت دم توڑ چکا تھا ۔ اُس کا جسم خون میں ڈوبا ہوا تھا اور جگہ جگہ زخموں کے نشانات تھے ۔

انسپکٹر نے دریافت کیا ۔" جس وقت آپ موقعہ واردات پر پہنچی تھیں ۔ کیا اس وقت ملزم کمرے کے اندر موجود تھا ؟ "

وہ لمحہ بھر کے لئے جھجکی، پھر نہ معلوم کیا سوچ کر وہ صاف جھوٹ بول گئی " نہیں ۔ وہ یہاں سے جا چکا تھا " نوشا نے حیرت سے سلطانہ کو دیکھا ، جو سر جھکائے آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہی تھی ۔

سب انسپکٹر نے پوچھا " پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ملزم یہاں آیا تھا اور مقتول سے اس کا جھگڑا ہوا تھا ؟ "

" میں نے پہلی بار اس کو آپ کے ساتھ دیکھا ہے ۔"

" اگر ملزم کو آپ یہاں پولس کی حراست میں نہ دیکھتیں تو آپ کو اس پر کوئی شبہ نہ ہوتا ؟ "

" جی نہیں "

" تو پھر آپ نے قتل ہونے کی اطلاع اب تک پولیس کو کیوں نہ دی ؟ "

"میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ اب تک میرے ہوش و حواس غائب ہیں"

وہ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق سب انسپکٹر کے ہر سوال کا رُک رُک کر جواب دے رہی تھی۔ جو کچھ اس وقت اُس کی سمجھ میں آیا، وہ کہتی چلی گئی۔ مگر اس کی آواز سے اُس کے چہرے کے اطمینان سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خوف اور گھبراہٹ پر قابو پاتی جا رہی تھی۔ اُس نے رونا بند کر دیا تھا اور سب انسپکٹر کے ہر استفسار کے لئے خود کو تیار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

لیکن جب سب انسپکٹر نے پوچھا۔ "مقتول نیاز سے آپ کی کب شادی ہوئی تھی؟"

تو سلطانہ ایک بارگی گھبرا گئی۔ اُس نے نیاز کے خلاف اپنے دل میں شدید نفرت کا جذبہ محسوس کیا۔ وہ نیاز سے بارہا کہہ چکی تھی کہ وہ اس سے نکاح کرے مگر وہ برابر اُس کے مطالبے کو ٹالتا جا رہا تھا۔ اُس نے انتہائی دُکھ کے ساتھ سوچا اگر نیاز کے ساتھ اُس کا بیاہ ہو گیا ہوتا تو آج ان سب لوگوں کے سامنے اُس کو یہ ذلّت برداشت کرنا نہ پڑتی۔ سب انسپکٹر کے سوال کا وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلک رہے تھے۔ اس وقت وہ شدید اذیت محسوس کر رہی تھی۔

سب انسپکٹر نے اپنے سوال پر زور دیتے ہوئے دریافت کیا "کیا وہ آپ کے شوہر نہیں تھے؟"

سلطانہ نے گردن جھکا کر کہا "وہ رشتے میں میرے سوتیلے باپ تھے" اُس کی آواز لرز رہی تھی۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ نیاز کی لاش پر تھوک دے اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے۔ اُس نے نظریں نیچی کر لیں اور اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے ایک بارگی برہنہ ہو گئی ہے۔

اس کے بعد سب انسپکٹر نے سلطانہ سے اور بہت سے سوالات کئے مگر وہ اب قوتِ مدافعت کھو چکی تھی۔ اُس نے گھبراہٹ میں نہ جانے کیا کیا اُلٹے سیدھے جوابات دیئے۔

سب انسپکٹر نے بوڑھے خانساماں اور خادمہ کے بیانات لئے اور پھر نوشا کے ساتھ

کوٹھی سے باہر چلا گیا۔ سلطانہ دروازہ پر کھڑی نوشا کو جاتے ہوئے دُور تک دیکھتی رہی۔ جس کے ہاتھوں میں آہنی ہتکڑیاں پڑی تھیں اور جو سر جھکائے کانسٹبلوں کے نرغے میں خاموش جا رہا تھا۔

رات بھر ایک پولیس کانسٹبل نیاز کی لاش پر پہرہ دیتا رہا۔ سویرے سورج نکلنے سے پہلے مُردہ گاڑی آئی اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے اسپتال بھیج دیا گیا۔

سب انسپکٹر کئی بار تفتیش کے سلسلہ میں کوٹھی پر آیا اور سلطانہ کے علاوہ، خادمہ اور بوڑھے خانساماں سے نیاز کے قتل کے متعلق طرح طرح کی باتیں پوچھتا۔ سلطانہ کو اُس کے سوالات سے بڑی دحشت ہوتی، مگر اس سے بھی زیادہ وحشت اس کو اس کوٹھی سے ہونے لگی تھی، جواب مرگھٹ کی طرح ڈراؤنی معلوم ہوتی تھی۔ کوٹھی پر ہر وقت ہو کا عالم طاری رہتا۔ در و دیوار پر مردنی چھائی رہتی خالی کمرے بھائیں بھائیں کرتے۔ تمام دن ایک اُکتا دینے والا سناٹا چھایا رہتا اور شام ہوتے ہی ہر طرف دھندلی دُھندلی پرچھائیاں رینگتی ہوئی نظر آتیں۔ باہر لان میں گھنے درختوں تلے خشک پتّے کھڑکھڑاتے اور دبی دبی آہٹیں اُبھرتیں۔ پھر رات سنسان ہو جاتی اور دبی دبی آہٹیں بار بار اُبھرتیں۔

رات کو اکثر سوتے سوتے سلطانہ کی آنکھ کھُل جاتی۔ اُس کو ایسا محسوس ہوتا کہ نیاز خون میں ڈوبا ہوا اُس کے سامنے کھڑا ہے۔ اُس کی آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح سُرخ ہوتیں اور وہ گھور گھور کر اُس کو دیکھتا، وہ گھبرا کر بستر پر اُٹھ کر بیٹھ جاتی اور گھنٹوں جاگتی رہتی۔ نیاز کا کمرہ عین اُس کے کمرے کے سامنے تھا۔ ہر شام وہ اس کمرے میں جا کر خود چراغ روشن کرتی تھی۔ عود و لوبان سُلگاتی تھی۔ اِس لئے کہ نیاز کی روح خراب ہو کر بھٹکتی نہ پھرے۔ مگر رات گئے جب وہ اس کمرے کی جانب دیکھتی تو چراغ کی دھندلی روشنی میں اس کو کمرے کے اندر کوئی آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا معلوم ہوتا۔ ہوا زور سے چلتی۔ درختوں کے نیچے سوکھے پتے کھڑکھڑاتے اور سنسان رات میں کسی کے تیز تیز بھاگنے کی آہٹیں اُبھرتیں۔ وہ خوف سے آنکھیں بند کر لیتی۔ پھر تمام رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔

مسلسل شب بیداری اور پے بہ پے دُکھوں نے اُس کی صحت خراب کر دی تھی۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ ان دنوں شدت سے اُس کو کسی کے سہارے کی ضرورت

تھی ۔ مگر اُس کو کوئی بھی ایسا نظر نہ آیا جو اس کو ڈھارس دے سکتا ، غمگساری کر سکتا ۔ کوٹھی میں لے دے کے خادمہ اور خانساماں تھے جو خود ہر وقت سہمے سہمے رہتے تھے ۔ بلکہ خادمہ تو ملازمت چھوڑنے کا ارادہ کر چکی تھی ۔ مگر سلطانہ نے خوشامد کر کے اُس کو روک لیا تھا ۔ لیکن اب وہ رات کو کوٹھی پر رہنے کے بجائے اپنی بیٹی کے گھر پر جا کر سوتی تھی ۔ اس کو سلطانہ سے بھی زیادہ خوف معلوم ہوتا تھا ۔

ان ہی دنوں ایک شام ، خان بہادر کوٹھی پر آیا ۔ اُس کے ہمراہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا ۔ اُس کا جسم بھرا تھا ۔ سانولا رنگ ، بڑی بڑی بے رونق آنکھیں اور کنپٹی کے پاس زخم کا گہرا نشان ۔ وہ دیکھنے میں خاصا اول جلول معلوم ہوتا تھا اور چہرے کی کرختگی کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا ۔ مگر خان بہادر نے اُس کو سلطانہ سے یہ کہہ کر ملایا کہ وہ نیاز کا بڑا بھائی ہے ۔ اُس نے بتایا کہ وہ راولپنڈی میں رہتا ہے اور نیاز کے مرنے کی اطلاع پاکر آج ہی آیا ہے ۔ حالانکہ نیاز نے سلطانہ سے اس کا کبھی تذکرہ نہیں کیا اور نیاز سے اس کی شباہت بھی نہیں ملتی تھی ۔ مگر پھر بھی سلطانہ نے اُس کے متعلق کسی شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا ۔ خان بہادر فرزند علی کو وہ معزز آدمی سمجھتی تھی ۔ اُس کو خان بہادر کی باتوں پر فوراً اعتبار آگیا ۔

خان بہادر کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا ۔ البتہ وہ شخص کوٹھی ہی پر ٹھہر گیا ۔ اُس کا نام فیاض تھا ۔ راولپنڈی میں اُس کی کپڑے کی دوکان تھی ۔ نیاز کے قتل کی اطلاع اُس کو نیاز کے ایک دوست کے خط سے ملی تھی اور وہ فوراً چلا آیا تھا ۔ اُس کے بال بچے ابھی تک راولپنڈی ہی میں تھے ۔ اُس نے اپنے متعلق سلطانہ کو یہی بتایا تھا ۔

مگر نہ تو اُس نے نیاز کی موت پر آنسو بہائے اور نہ اُس کے چہرے پر کسی گہرے غم کا تاثر تھا ۔ سلطانہ سے اُس نے بات چیت بھی کم کی اور اُس کے بچے کو دیکھ کر بھی کسی خوشنودی کا اظہار نہ کیا ۔ رات کا کھانا اُس نے وہیں کھایا ۔ وہ جبڑے ہلا ہلا کر بدتمیزی سے کھانا کھاتا رہا ۔ کھانے سے فارغ ہو کر اُس نے زور زور سے ڈکاریں لیں ، جس سے اُس کا اجڈ پن ظاہر ہوتا تھا ۔ یوں بھی اس کا لہجہ عامیانہ سا تھا

مگر سلطانہ کو اس کے آجانے سے تھوڑا سا اطمینان ہوگیا۔ کوٹھی پر رات بھر جو ہولناک سناٹا طاری رہتا تھا، وہ اُس روز کچھ کم ہو گیا تھا۔

سلطانہ نے اس کی رہائش کے لیے کوٹھی کے ایک کمرے میں بندوبست کرا دیا تھا۔ وہ شام ہی سونے کے لیے بستر پر چلا گیا۔ اس رات سلطانہ کئی راتوں کے بعد گہری نیند سوئی۔ سویرے اٹھ کر اُس نے فیاض کے لیے ناشتہ اپنی نگرانی میں تیار کرایا اور اس میں خاصا اہتمام کیا۔ وہ اس کے سامنے جب بھی جاتی۔ دوپٹے کے آنچل سے سر کو ڈھک لیتی۔ بات کرتی تو نظریں نیچی کر کے۔ وہ اس کا احترام بالکل اپنے جیٹھ کی طرح کر رہی تھی۔

فیاض سہ پہر تک تو اپنے کمرے میں رہا، اس کے بعد وہ کوٹھی سے باہر چلا گیا اور رات کو واپس آیا۔ اب اُس کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ شام کو باہر رہتا۔ سلطانہ کے ساتھ پہلے ہی دن سے اس کا جو رویّہ تھا، وہ برقرار رہا۔ وہ اُس سے بہت کم بات چیت کرتا۔ اُس کا زیادہ تر وقت کمرے کے اندر ہی گذرتا۔

فیاض کو آئے ہوئے چوتھا یا پانچواں دن تھا۔ دوپہر کا وقت تھا، سلطانہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ اچانک شور سُن کر اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اُس نے سُنا فیاض خادمہ کو ڈانٹ رہا تھا۔ اُس کی آواز اونچی تھی اور وہ بڑی گندی گندی گالیاں بک رہا تھا۔ سلطانہ سکتے کے سے عالم میں خاموش بیٹھی تھی اسی اثنا میں بوڑھی خادمہ روتی ہوئی دروازے پر نمودار ہوئی۔ اُس نے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔

"بیگم صاحبہ میرا آج تک کا حساب صاف کر دیجیے، میں اب آپ کی نوکری نہیں کروں گی"

سلطانہ نے اُس کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ سخت ناراض معلوم ہوتی تھی۔ چیخ کر بولی "میں آپ کی ٹہل چاکری کرتی ہوں، پر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں نے عزت بھی بیچ دی ہے۔ میں اس طرح گالیاں نہیں سن سکتی۔"

خادمہ برابر بڑبڑاتی جا رہی تھی اور سلطانہ اُس کو روک رہی تھی کہ وہ اس طرح کوٹھی چھوڑ کر

نہ جائے۔ ایکاایکی سامنے سے فیاض آتا ہوا نظر آیا۔ اُس کی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور پیشانی پہ بل تھے۔ اُس کا کرخت چہرہ جھلسا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ آتے ہی گرج کر بولا۔

"یہ حرامزادی یہاں بیٹھی کیا فیل مچا رہی ہے"۔

خادمہ نے فوراً کہا "دیکھئے بیگم صاحب، پھر انھوں نے گالی دی۔ میں اگر کچھ کہہ سُن دوں گی تو پھر مجھے نہ کہئے گا"۔ فیاض نے گھور کر اُس کو دیکھا اور ڈانٹ کر کہا۔

"ابھی یہاں سے نکل جا۔ میں تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ سُور کی بچی، حرامزادی"۔

فیاض گالیاں دینے لگا۔ خادمہ بھی بڑی تیز عورت تھی۔ اُس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا فیاض اُس کو مارنے کے لئے جھپٹا۔ سلطانہ اگر اُس کو نہ روکتی تو شاید وہ خادمہ کو مارتا بھی۔ وہ پاگلوں کی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ خادمہ روتی پیٹتی کوٹھی سے باہر چلی گئی۔

سلطانہ کو خادمہ کے چلے جانے کا بہت افسوس تھا۔ وہ کام بھی مستعدی سے کرتی تھی اور اُس کی غمگسار بھی تھی۔ جب سے نیاز مرا تھا، اس وقت سے سُلطانہ کے لئے اُس کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔ وہ ہر معاملہ میں اس سے مشورہ کرلیتی۔ دل گھبراتا تو گھنٹوں اُس کے ساتھ بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کیا کرتی۔ اس طرح اُس کا خاصا دل بہل جاتا تھا۔ اُس کو فیاض کا یہ رویہ بہت بُرا معلوم ہوا۔

شام کو خانساماں پر بھی نزلہ گرا۔ فیاض خواہ مخواہ اُس پر برسنے لگا۔ اُس کو بھی اُس نے چیخ چیخ کر گالیاں دیں۔ مگر بوڑھا خانساماں ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ اُس نے زبان سے اُف تک نہ کی۔ سر جھکائے چپ چاپ فیاض کی گالیاں سُنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد سلطانہ اُس کے پاس گئی تو اُس نے دیکھا خانساماں باورچی خانہ کے ایک کمرے میں چُپ چاپ بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ بہت افسردہ نظر آرہا تھا۔ سلطانہ نے اُس کو تسلی دینے کی کوشش کی تو وہ رو پڑا۔ کہنے لگا۔

"بیگم صاحب اپنی قسمت ہی میں در بدر کی ٹھوکریں کھانا لکھی ہیں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ آپ ہی کے قدموں پہ اب ساری زندگی گذار دوں گا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے اب یہاں سے میرا آب و دانا

اُٹھ گیا ہے۔"

سلطانہ دیر تک خانساماں کو سمجھاتی رہی۔

جب وہ خانساماں کو سمجھا بجھا کر باورچی خانہ سے نکلی تو اُس نے دیکھا کہ فیاض اُس کے کمرے کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ اُس کو دیکھتے ہی بولا "دیکھو جی، تمہاری یہ عادتیں مجھکو بالکل پسند نہیں۔ تم نے نوکروں کو بہت سر چڑھا لیا ہے۔ سالے ایک نمبر کام چور ہو گئے ہیں۔" سلطانہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ننھا ایاز رو رہا تھا وہ اس کو گود میں لے کر کمرے کے اندر ٹہلنے لگی۔

فیاض کا رویہ خانساماں کے ساتھ روز بروز خراب ہوتا گیا۔ وہ بات بات پر اُس پر برس پڑتا اور گندی گندی گالیاں دیتا۔ سلطانہ اگر بات کو رفع دفع کرنے کی غرض سے کچھ کہتی تو وہ آنکھیں نکال کر اس پر بھی غرّانے لگتا۔ اب وہ گھر کے ہر معاملہ میں ٹانگ اڑانے لگا تھا۔ ایک ایک بات کی چھان بین کرتا۔ یہ کیوں ہوا ہے۔ یہ کس لئے کیا گیا۔ یہ کیا ہے، وہ کیا ہے۔ اُس کی ان حرکتوں نے چند ہی روز میں سلطانہ کو پریشان کر دیا۔

پھر اور نئی نئی باتیں سامنے آئیں۔ فیاض نے ڈرائیور کو علیحدہ کر دیا اور کار کو گیراج سے نکال کر نہ جانے کہاں لے گیا۔ سلطانہ نے پوچھا تو فیاض نے بڑی بے رخی سے کہا "مرمت ہونے گئی ہے۔" حالانکہ کار بالکل ٹھیک طرح کام کر رہی تھی۔ مگر فیاض نے اس طرح تیوری پر بل ڈال کر اس کی بات کا جواب دیا کہ وہ مزید استفسار نہ کر سکی۔

انہی دنوں وہ ایک موٹے تگڑے سے آدمی کو کوٹھی پر لے آیا۔ وہ ۲۴، ۲۵ سال کا نوجوان تھا اور صورت شکل سے لوفر معلوم ہوتا تھا۔ وہ تمام دن ڈرائنگ روم میں پڑا رہتا اور لہک لہک کر فلمی گیت گاتا۔ گھٹیا قسم کے سگرٹ پیتا اور جلی ہوئی ماچسوں کی تیلیاں اور سگرٹ کے ٹکڑے کمرے کے اندر بکھیرا کرتا۔ صوفوں پر اُس نے جگہ جگہ تیل کے داغ ڈال دیئے تھے۔ وہ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردوں سے تولیا کا کام لیتا تھا۔ دونوں وقت ڈھیر بھر کھانا کھاتا اور چائے

کے کئی کئی کپ، ایک ہی وقت میں پی جاتا۔ وہ کام کاج کچھ نہیں کرتا تھا۔ بس ہر وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہتا۔ رات ہوتی تو فیاض کے کمرے میں جاکر سو جاتا۔ کہیں آتا جاتا بھی نہیں تھا۔ ہر وقت کوٹھی میں موجود رہتا۔ سلطانہ جب اُس کے سامنے جاتی تو گھور گھور کر دیکھتا۔ لفنگوں کی طرح جھوٹ موٹ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتا اور کوئی گھٹیا سا فلمی گانا گنگنا شروع کر دیتا۔ اس کا نام کرم الٰہی تھا مگر وہ چند ہی روز میں سلطانہ کے لئے قہرِ الٰہی بن گیا تھا۔

سلطانہ گھر کی ان تبدیلیوں پر غور کر ہی رہی تھی کہ فیاض نے ایک روز بڑی عجیب سی حرکت کی۔ اُس نے نیاز کا سارا سامان اٹھوا کر ایک کمرے میں بند کر دیا اور ہر کمرے کی تلاشی لینے لگا۔ ہر الماری اور ٹرنک کو کھول کر دیکھا۔ پھر اُس نے سلطانہ کے زیورات اور کپڑے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اس سے ٹرنکوں کی کنجیاں لینے کا مطالبہ کیا۔ سلطانہ نے پہلے تو اس کو ٹالنا چاہا مگر جب وہ بار بار اصرار کرنے لگا تو اُس نے صاف صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ وہ بگڑ کر بولا۔

"اگر تم نے کنجیاں نہ دیں تو میں سارے بکس اٹھوا کر دوسرے کمرے میں بند کر دوں گا۔"

اُس کی اس بات پر سلطانہ بھی جھنجھلا اٹھی "دیکھئے میں آپ کی ہر بات خاموشی سے اب تک برداشت کرتی رہی ہوں۔ اب آپ حد سے زیادہ گزرتے جا رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میں نہ اپنے صندوقوں کی آپ کو کنجیاں دوں گی اور نہ اس میں کسی کو ہاتھ لگانے دوں گی۔"

"تو پھر پچھتاؤ گی" فیاض نے دھمکی دی۔ سلطانہ جل کر بولی "جائیے جو کچھ آپ سے کیا جائے کر لیجئے۔"

فیاض آنکھیں نکال کر بولا "میں تم کو کھڑے کھڑے اس کوٹھی سے نکال سکتا ہوں۔"

"تم کون ہوتے ہو مجھکو اس گھر سے نکالنے والے۔"

"اچھا تو تم کو اب تک یہ بھی پتہ نہیں کہ اس گھر کا مالک کون ہے؟"

سلطانہ نے چیخ کر کہا "اس گھر کی مالک میں ہوں، میں ہوں۔ کان کھول کر سُن لو"

فیاض بڑے بے ڈھنگے پن سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ "کہیں اس گمان میں بھی نہ رہنا۔ جس وقت

چاہوں گا ہاتھ پکڑ کر کوٹھی سے باہر کھڑا کردوں گا ۔بھیک مانگتی پھرو گی"

سلطانہ غصہ سے ہونٹ چبانے لگی ۔پھر اُس نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا "ذرا نکال کے تو دیکھو" وہ غصہ سے بڑبڑانے لگی "نہ جانے کہاں سے آگئے مرنے والے کے بڑے بھائی بن کر۔زندگی میں تو اس کی کبھی یہ بھی نہ پوچھا کہ زندہ ہے یا مرگیا ۔اب مرنے کے بعد اُس کے مال پر کفن کھسوٹوں کی طرح قبضہ کرنے آگئے ۔اگر خان بہادر صاحب نہ کہتے تو میں تم کو یہاں گھسنے بھی نہ دیتی" ابھی وہ غصہ میں نہ جانے اور کیا کچھ کہتی، کہ فیاض نے چیخ کر کہا ۔

"بس اب تم اپنی زبان بند کرلو ورنہ اچھا نہ ہوگا"

سلطانہ اُس کی لال لال آنکھیں دیکھ کر چپ ہوگئی ۔شور سن کر کرم الٰہی اور بوڑھا خانساماں بھی وہاں آگئے ۔فیاض خاموش کھڑا گھور گھور کر سلطانہ کو دیکھتا رہا اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کوٹھی سے باہر چلا گیا ۔

سلطانہ تھکی ہوئی سی اپنے کمرے میں آگئی ۔رات سے ننھے ایاز کی طبیعت خراب تھی ۔وہ برابر روئے جارہا تھا ۔اس وقت بھی وہ رونے لگا تو جھنجھلا کر سلطانہ نے بچے کی کمر پر اس زور کا تھپڑ مارا کہ وہ بلبلا اٹھا اور چیخ چیخ کر رونے لگا ۔سلطانہ نڈھال ہوکر بستر پر گر پڑی ۔بچہ بلک بلک کر روتا رہا ۔آخر خانساماں آکر اُس کو کمرے سے باہر لے گیا اور اُس کو چمکار کر تسلی دینے لگا ۔

تمام دن وہ کمرے کے اندر نڈھال پڑی رہی ۔شام کو خان بہادر فیاض کے ہمراہ کوٹھی پر آیا ۔اُس نے سلطانہ کو ڈرائنگ روم میں بلوایا اور اس سے گفتگو کرنے سے قبل اُس نے فیاض اور کرم الٰہی کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا ۔جب وہ چلے گئے تو خان بہادر نے بڑے سرپرستانہ انداز میں سلطانہ سے کہا ۔

"میں تم کو بہت سمجھدار لڑکی سمجھتا تھا مگر آج تم نے بڑی ناسمجھی کا ثبوت دیا ۔تم کو فیاض سے اس طرح جھگڑا نہیں کرنا چاہیے تھا"

وہ بولی ۔"آپ کو کیا پتہ کہ وہ کس کس طرح مجھ کو پریشان کررہے ہیں"

وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا "کبھی نیاض تو مجھ کو بڑا بھلا آدمی معلوم ہوتا ہے" لمحہ بھر رُک کر اُس نے کہا "بہرحال میں اس کو سمجھا دوں گا کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے تم کو تکلیف پہنچے۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں تم سے بھی یہ کہوں گا کہ تم زیادہ غصہ وصہ کرنا چھوڑ دو۔ بات یہ ہے کہ تمھاری قانونی پوزیشن بہت نازک ہے۔" سلطانہ چپ چاپ بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔

خان بہادر کہنے لگا "مصیبت یہ ہے کہ نیاز کے ساتھ تمھاری باقاعدہ شادی کبھی نہیں ہوئی ایسی صورت میں تمھاری قانونی حیثیت نیاز کی داشتہ سے زیادہ نہیں ہے" سلطانہ کے دل پر سخت چرکہ لگا۔ وہ غم و غصہ سے تلملا کر رہ گئی۔ خان بہادر کہتا رہا "میں تم کو یہی مشورہ دوں گا کہ تم فیاض سے نہ بگاڑو۔ وہ جو کچھ کہتا ہے۔ اس کو مان لو۔ کبھی کیا کیا جائے۔ خدا نے تم پر وقت ہی ایسا ڈالا ہے۔"

سلطانہ کہنے لگی "انھوں نے ہر چیز پر قبضہ کر لیا ہے۔ اب وہ میرے زیورات اور کپڑے بھی ہتیا لینا چاہتے ہیں۔ آخر میرا ابھی تو کوئی حق ہے۔ پھر یہ بچہ ہے۔ یہ کس کی اولاد ہے۔ اس کا باپ کی جائداد میں کوئی حصہ نہیں؟"

خان بہادر نے فوراً کہا "یہ تو ٹھیک ہے کہ یہ نیاز ہی کا بچہ ہے۔ مگر تم قانونی حیثیت سے اس کو نیاز کا بچہ کس طرح ثابت کرو گی۔ جبکہ تم نیاز کی منکوحہ کبھی نہیں تھیں۔"

سلطانہ نے جواب دیا "باپ کی حیثیت سے تو ہر جگہ انھی کا نام لکھا گیا ہے۔"

خان بہادر مسکرا کر بولا "تم کسی کا نام لکھوا دو مگر قانون تو یہ نہیں مانے گا کہ اس بچہ کا باپ نیاز ہی تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے تو لکھا نہیں کہ یہ میرا بچہ ہے۔"

سلطانہ نے جھٹ سے کہا "اسپتال کے رجسٹر میں انھوں نے خود دستخط کئے ہیں۔ آپ جا کر دریافت کر لیں۔"

یہ بات سُن کر خان بہادر لمحہ بھر کے لئے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اُس نے کہا "اگر ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ عدالت میں اور بھی بہت سے ثبوت مہیا کرنا پڑیں گے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ایسی بات کی نوبت ہی نہ آئے۔ تم اطمینان سے یہاں

رہو۔ میں فیاض کو سمجھا دوں گا۔ اب وہ گھر پر بھی کم رہے گا۔ نیاز کے کاروبار کی فی الحال میں دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ مگر جلد ہی سب کچھ اُس کے سپرد کر دوں گا۔ وہ اس میں پھنس جائے گا۔ تو اس کو تم سے اُلجھنے کی فرصت ہی کب ملے گی۔ تم کو جو کچھ گھر کے خرچ کے لئے ہر ماہ ملتا تھا' وہ ملتا رہے گا۔ اب تم کنجیاں فیاض کو دے دینا۔ تاکہ بنک میں اور دوسری جگہ جو روپیہ پڑا ہے' وہ نکال کر کاروبار چلایا جائے"۔

مگر سلطانہ کنجیاں دینے پر رضا مند نہیں ہوئی۔ خان بہادر نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ کہنے لگا "تم فیاض کی جانب سے بہت بدگمان معلوم ہوتی ہو۔ خیر اس کی بات چھوڑو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' اس پر دو چار روز غور کرلو' پھر اطمینان سے جواب دینا"۔

خان بہادر نے اس کے بعد دو چار باتیں اور کیں اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔

سلطانہ کو خان بہادر کی باتوں سے کسی قدر اطمینان ہو گیا تھا۔ اُس نے سوچا اگر خان بہادر نے زیادہ اصرار کیا تو وہ تمام کنجیاں اسی کے ہاتھ میں دے دیگی۔ وہ شریف اور معقول آدمی ہے۔ اُس کے ساتھ دھوکا نہیں کرے گا۔ وہ رات گئے تک انہی باتوں پر غور کرتی رہی۔

اُس روز وہ خلاف معمول دیر سے سوئی۔ نامعلوم کتنی رات گذر چکی تھی۔ اچانک آہٹ سے اس کی آنکھ کھُل گئی۔ کمرے کی وہ کھڑکی جو باغیچہ کے رُخ پر تھی۔ اس پر ایک سایہ سا نظر آیا۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد سایہ غائب ہو گیا۔ باہر دھندلی دھندلی چاندنی پھیلی تھی۔ ہوا سنکی ہوئی تھی۔ درختوں کے نیچے خشک پتوں پر قدموں کی آہٹیں ابھر رہی تھیں۔ کوئی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ سلطانہ خوف سے تھرّا کر رہ گئی۔ نیاز کے کمرے میں چراغ کی زرد زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسی طرف دیکھتی رہی۔

نیند اب آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ سہمی ہوئی خاموش پڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد کھڑکی کے قریب آہٹ ہوئی۔ سلطانہ نے گھبرا کر دیکھا' کوئی گردن نکالے جھانک رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھڑکی پر چڑھ کر دھم سے کمرے کے اندر کود پڑا۔ سلطانہ کی گھگھی بندھ گئی۔ اُس نے چیخنے کے لئے منہ پھاڑا' اسی وقت کسی نے اپنا چوڑا چکلا ہاتھ اُس کے منہ پر رکھ دیا۔ کمرے کے اندر اندھیرا تھا۔ دھندلی

دھندلی چاندنی کے عکس میں اُس نے دیکھا، فیاض اُس کے سینے پر جھکا ہوا کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں تیزی سے چمک رہی تھیں۔

سلطانہ نے مزاحمت کی تو فیاض نے اُس کے منہ پر ایک بھرپور ہاتھ مارا اور سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولا "پڑی رہ حرامزادی" یہ کہہ کر اُس نے دوسرا تھپڑ مارا۔ فیاض بھاری بھرکم جسم کا آدمی تھا۔ سلطانہ کے منہ پر دونوں بھرپور ہاتھ پڑے تو اُس کی بتیسی ہل گئی۔ فیاض پاگلوں کی طرح اُس کے لباس کو نوچنے لگا۔ اُس نے جھنجھوڑ کر کے سلطانہ کے سارے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اُس کے نیم برہنہ جسم کو کھسوٹنے لگا۔

سلطانہ برابر مزاحمت کرتی رہی اور فیاض اس کو بے دردی سے مارتا رہا۔ آخر وہ تھک کر شل ہو گئی۔ اُس نے بے بسی سے فیاض کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ مگر فیاض دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے وحشیوں کی طرح، اس کے ہونٹوں کو، رخساروں کو، سینے کو اپنے گندے دانتوں سے چبا ڈالا۔

باہر پھیکی پھیکی چاندنی پھیلی تھی۔ درختوں کے نیچے سوکھے پتے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ نیاز کے کمرے میں چراغ کی لو بار بار بھڑک رہی تھی۔ فیاض کھڑکی سے کود کر باہر چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی کرم الٰہی اسی راستے سے کمرے کے اندر آ گیا۔ سلطانہ نے جل کر اُس کے منہ پر تھوک دیا مگر وہ بے حیائی سے ہنستا رہا اور رنڈی بازوں کی طرح بازاری پن کا مظاہرہ کرنے لگا۔ سلطانہ نے ایک بار کچکچا کے اُس کے بازو میں کاٹ لیا۔ وہ پھر بھی ناراض نہ ہوا۔ نہ اُس نے سلطانہ کو مارا، نہ گالی دی۔ اُس کے جسم پر تھوڑا بہت جو لباس رہ گیا تھا، کرم الٰہی نے اُس کو بھی نوچ کھسوٹ کے پھینک دیا۔

کرم الٰہی کے جانے کے بعد وہ صبح تک بستر پر مادر زاد برہنہ پڑی رہی۔ اُس کا جسم مردے کی طرح بے جان ہو گیا تھا۔ روتے روتے آنکھیں سوج گئی تھیں اور گلا خشک پڑ گیا تھا۔ قریب ہی پالنے میں اس کا بچہ پڑا گہری نیند سو رہا تھا۔ بہت دیر بعد وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی۔ بچہ کو لمحہ بھر تک جھک کر دیکھتی رہی اور پھر اس کو سینے سے لگا کر رونے لگی۔

باہر صبح کا اُجالا پھیل رہا تھا۔ اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے کپڑے پہنے اور تھکی ہوئی سی بستر پر گر پڑی۔ اُس روز اُس نے ناشتہ بھی کمرے ہی میں کیا اور دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ دالان میں فیاض اور کرم الٰہی کے زور زور سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ اُن کے سامنے جاتے ہوئے اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک بارگی ننگی ہو جائے گی۔

شام ہونے سے کچھ دیر پہلے دونوں کوٹھی سے باہر چلے گئے۔ اُن کے جانے کے ذرا ہی دیر بعد بوڑھا خانساماں گھبرایا ہوا سلطانہ کے پاس آیا۔ وہ بڑا خوف زدہ معلوم ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "بیگم صاحب۔ آپ کوٹھی کو فوراً چھوڑ دیجئے۔ یہ دونوں ننھے کو مار ڈالنے کا پروگرام بنا رہے ہیں میں نے خود اپنے کانوں سے سُنا ہے۔"

سلطانہ اس وقت بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اُس نے جھٹ سے ننھے ایاز کو سینے سے چمٹا لیا اور گھبرا کر بولی "یا اللہ کیا ہونے والا ہے۔ تم مجھے خان بہادر صاحب کے پاس لے چلو۔"

وہ بولا "وہی تو یہ سب کچھ کرا رہے ہیں۔ آپ کو یہ بھی پتہ نہیں۔"

اس انکشاف پر وہ چونک پڑی۔ یقین نہ آنے کے سے انداز میں بولی "نہیں خانساماں وہ اس قدر بے رحم نہیں ہو سکتے۔"

وہ کہنے لگا "آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ کرم الٰہی نے مجھ سے خود بتایا ہے۔ یہ فیاض نیاز میاں کا بھائی وائی کہاں ہے۔ خان بہادر نے خواہ مخواہ کا ڈھونگ رچایا ہے یہ تو جائداد پر قبضہ کرنے کا چکر ہے۔"

وہ انتہائی بے بسی سے بولی "تو اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں کس کے پاس جاؤں؟"

اُس کی آواز بھرّا گئی۔ اور وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

خانساماں ذرا دیر خاموش رہ کر بولا "میرا بھائی یہاں شہر میں رہتا ہے۔ آپ میرے ساتھ وہاں چلی چلیں۔ مجھے ان لوگوں سے خود خوف آتا ہے۔ کرم الٰہی مجھکو کئی بار دھمکا چکا ہے۔ اُن کے ڈر کے مارے تو میں آپ کے پاس اب تک نہ آیا۔" لمحہ بھر رُک کر وہ بولا۔ "میں تو خدا قسم کب کا یہاں

سے کام چھوڑ کر چلا جاتا ۔مگر آپ کی وجہ سے اب تک پڑا ہوں"

دونوں اس کے بعد ذرا دیر تک باتیں کرتے رہے کہ اب کیا کیا جائے۔ آخر یہی طے ہوا کہ وہ دونوں فوراً کوٹھی چھوڑ دیں ۔ یہ اسکیم بنانے کے بعد سلطانہ نے سوچا کہ وہ اپنے زیورات، قیمتی کپڑے اور نیاز کی دستاویزیں لے کر ان دونوں کے واپس لوٹنے سے قبل کوٹھی سے چلی جائے ۔مگر اُس نے جب اس کمرے میں جس کے اندر سارا قیمتی سامان رکھا تھا، جاکر دیکھا تو اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔فیاض نے راتوں رات سارے ٹرنک کمرے کے اندر سے نکال کر غائب کر دیئے تھے ۔اُس کی آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔

وہ دیر تک دروازے کا پٹ پکڑے افسردہ سی کھڑی رہی ۔بوڑھے خانساماں نے اُس کو تسلی دی تو وہ کسی قدر سنبھلی ۔اس وقت اُس کے پاس کچھ اوپر سو روپے موجود تھے ۔اُس نے ایک ٹرنک میں ضروری سامان رکھا اور خانساماں کو ٹیکسی لانے کے لئے بھیج دیا۔

ذرا دیر بعد ٹیکسی آگئی ۔ٹرنک اور سامان اس میں رکھ دیا گیا ۔سلطانہ جب کوٹھی سے باہر جانے لگی تو ایک بار گی اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اُس نے سوچا وہ کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی بھرے گی ۔اس سے تو اچھا یہی ہے کہ وہ کوٹھی میں رہ کر آنے والی مصیبتوں کا مقابلہ کرے ۔مگر اس کو فوراً ہی نھا ایاز یاد آگیا ۔اب وہی اس کا سہارا رہ گیا تھا۔ اور وہ اُس کی جان کو خطرے میں ڈالنے کے لئے کسی طرح بھی تیار نہ تھی۔

اُس نے حسرت بھری نظروں سے کوٹھی کے درودیوار کو دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر سڑک پر آگئی ۔ٹیکسی کے اندر بیٹھ کر ایک بار پھر اُس نے کوٹھی کو دیکھا اور اُس کی آنکھیں بھر آئیں ٹیکسی آگے روانہ ہو گئی ۔

۳

ایک شام سلمان دفتر سے دیر میں لوٹا، اُس نے دیکھا فلیٹ کے نیچے، سڑک پر جعفری کی کار کھڑی تھی۔ سلمان کو کسی قدر حیرت ہوئی، اس لئے کہ جعفری کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ وہ ۶ بجے سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ اُس نے خود ہی تو سلمان سے ۶ بجے شام تک دفتر میں کام کرنے کے لئے کہا تھا۔ اور جب یہ بات تھی تو اس کی غیر موجودگی میں وہ یہاں کیوں آیا۔ جعفری جب کبھی بھی اُس کے فلیٹ پر آتا تھا، ہمیشہ دفتر سے سلمان کو اپنے ہمراہ لے لیتا تھا۔ ان تین ماہ کے عرصہ میں، جب سے جعفری کی اُس کے مکان پر آمد و رفت شروع ہوئی تھی، صرف ایک بار ایسا ہوا کہ جعفری اُس کے ساتھ آنے کے بجائے اکیلا آیا تھا مگر آنے سے قبل اُس نے سلمان سے بتا دیا تھا کہ وہ کس وقت اُس کے فلیٹ پر پہنچے گا۔

سلمان نے نئی جھلکتی ہوئی کار کو غور سے دیکھا، جو سڑک کے کنارے راج ہنس کی طرح پر پھیلائے کھڑی تھی۔ بلڈنگ کے دریچوں سے دو پارسی لڑکیاں جھانک جھانک کر کار کو تک رہی تھیں سلمان نے سوچا جھلکتی ہوئی شان دار کار دروازے پر کھڑی ہو تو لڑکیوں پر رعب تو خوب پڑتا ہے۔ اُس نے غور کیا دونوں لڑکیاں اُس کو دیکھ کر مسکرائی بھی تھیں۔ سلمان نے کئی بار اپنی ٹائی کی گرہ درست کی، اُنگلیوں سے سر کے بالوں میں کنگھی کی اور گردن اونچی کر کے زینے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔

کمرے کے اندر جا کر اُس نے دیکھا، جعفری صوفے کی پشت سے گردن ٹکائے ٹانگوں کو بے تکلفی

سے پھیلا کر اطمینان سے سگرٹ پی رہا تھا۔ اس وقت وہ ہلکا سلیٹی رنگ کا سوٹ پہنے تھا۔ ٹائی بڑی شوخ رنگ کی تھی۔ اُس کے قریب ہی دوسرے صوفے پر رخشندہ بیٹھی تھی۔ سامنے میز پر ابھی تک چائے کے برتن بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں فلموں کے بارے میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ سلمان کو دیکھتے ہی جعفری نے زوردار نعرہ لگایا۔

"ہلو سالومن! میرا خیال ہے تمھیں اتنی دیر نہیں ہونا چاہیے تھی۔" اُس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "میں ۲۷ منٹ ۱۰ سکنڈ سے بیٹھا تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔ سخت بوریت میں مبتلا رہتا اگر مسز سالومن میری مدد کو نہ آتیں۔ تمھیں میری طرف سے پہلے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے"

یہ کہہ کر جعفری نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ اس وقت بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس نے سلمان کو کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھاتے ہوئے بولا "تم بہت تھکے ہوئے معلوم ہو رہے ہو۔ میرا خیال ہے تمھیں فوراً ایک گرم گرم پیالہ چائے کا پینا چاہیے۔ چائے بہت خوش ذائقہ ہے۔ کیا تم آج کل اورنج پیکو استعمال کر رہے ہو؟ یقیناً وہی ہے۔ اس کی مہک مجھے دھوکا نہیں دے سکتی" وہ بڑی روانی سے بولتا چلا جا رہا تھا۔

رخشندہ نے چائے بنا کر دی۔ سلمان آہستہ آہستہ چائے پینے لگا۔ چائے ٹھنڈی پڑ چکی تھی اور نہ اس میں اورنج پیکو کی مہک تھی اور نہ خوش ذائقہ تھی۔ جعفری پر اُس روز باتیں کرنے کا دورہ پڑا تھا۔ وہ بے تکان بول رہا تھا اور بڑی بے تکلفی سے زوردار قہقہے لگا رہا تھا۔

رات کا کھانا بھی اُس نے سلمان کے ساتھ ہی کھایا۔ اس کے بعد کلفٹن جانے کا پروگرام بنا۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ روپہلی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ہوا سنکی ہوئی تھی۔ رخشندہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ بڑی مسرور نظر آ رہی تھی۔ اور بچوں کی طرح ہنس ہنس کر سادگی کے ساتھ اپنی مسرت کا اظہار کر رہی تھی۔ کھلی ہوئی گاڑی میں اس وقت بیٹھنا بڑا دلچسپ معلوم ہو رہا تھا۔ شہر سے نکل کر جب وہ کلفٹن جانے والی سڑک پر آ گئے تو راستہ اور بھی رومینٹک ہو گیا۔ سڑک پر حدِ نگاہ تک دُو رُویہ روشنیوں کی قطار جھلملاتی چلی گئی تھی۔

وہ سمندر کے کنارے پہنچے تو فضا اور بھی زیادہ حسین ہو گئی۔ ہلکی ہلکی چاندنی میلوں تک بکھری ہوئی ریت پر افشاں کی طرح جھلک رہی تھی۔ سمندر کی لہریں شور کرتی ہوئی اٹھتیں اور دُور تک ساحل پر بکھر جاتیں۔ تینوں ریت کے ایک ٹیلے پر جاکر بیٹھ گئے اور لہروں کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھنے لگے۔ ٹھیک اس مقام پر جہاں زمین اور آسمان کی سرحدیں مل رہی تھیں۔ چند بادبانی کشتیاں آبی پرندوں کی طرح اپنے سفید سفید بادبان لہرا رہی تھیں۔ فضا بڑی سہانی تھی اور اس سہانی فضا میں جعفری کی موجودگی بڑی دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ہلکے پھلکے مزیدار لطیفے سُنا کر خود بھی ہنس رہا تھا۔ ان دونوں کو بھی ہنسا رہا تھا۔

تینوں جب کلفٹن سے واپس لوٹے تو رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ سڑکیں شبنم سے پُرنم ہو گئی تھیں اور رخشندہ کا جسم سرد ہوا سے کپکپا رہا تھا۔

سلمان کے ہاں جعفری کی آمد و رفت جاری رہی۔ اب وہ اکثر سلمان کی غیر موجودگی میں بھی آ جاتا اور گھنٹوں بیٹھا بے تکلفی کے ساتھ رخشندہ سے باتیں کیا کرتا۔ ایک بار وہ اُس کے لئے ایک بڑی قیمتی گھڑی لے آیا۔ کہنے لگا "لندن سے میرا ایک دوست لایا تھا۔ اُس کو یہ بھی پتہ نہیں کہ میں نے ابھی شادی نہیں کی ہے۔ جب گھر میں بیوی موجود نہ ہو تو لیڈیز واچ کا کیا کیا جائے"

یہ کہکر اُس نے خود اپنے ہاتھ سے رخشندہ کی کلائی میں گھڑی باندھ دی۔ گھڑی واقعی بڑی خوبصورت تھی اور رخشندہ کی گوری گوری کلائی پر سج رہی تھی۔ اس کے بعد بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ جعفری، رخشندہ کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر چلا آتا۔ سلمان نے ایک دفعہ دبی زبان سے اس کو منع بھی کیا مگر جعفری نے اس کی بات کو قہقہوں میں اڑا دیا۔ کہنے لگا۔

"اگر میرے پاس ایک عدد بیوی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کوئی خوبصورت چیز بھی نہیں خرید سکتا۔ سالومن تم مجھ پر اس طرح ظلم نہیں کر سکتے۔ شاپنگ میرا محبوب مشغلہ ہے۔ اور کسی خوبصورت چیز کو خرید کر الماری میں سجانے کا میں قائل نہیں۔ میں اپنے گھر کو میوزیم بنانا نہیں چاہتا اور اب تو یہ گھر بھی میرے ہی گھر کا ایک حصہ بن گیا ہے۔"

بات کچھ ایسی ہی تھی۔ اب وہ سلمان کے یہاں بڑی بے باکی سے مسکراتا ہوا آتا تھا۔ آتے کے ساتھ ہی لاابالی پن سے کوٹ اتار کر صوفے پر ڈال دیتا۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتا اور سلمان کی بیوی سے کہتا۔

"کیا آج رات کے کھانے پر مچھلی کے کباب ممکن ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آج مچھلی کے کباب ضرور کھائے جائیں"۔

وہ اپنی فرمائش بے دھڑک سُنا دیتا تھا۔ ذرا بھی تکلف سے کام نہ لیتا۔

سلمان سے اُس کے مراسم روز بروز گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ دفتر میں بھی وہ اس سے اسی طرح پیش آتا تھا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ دفتر والوں پر سلمان کا بھی رعب پڑنے لگا۔ اب اس کی خوب خوب خوشامدیں ہوتیں۔ طرح طرح سے اُس کو خوش کرنے کی کوشش کی جاتی۔ کسی کا جعفری سے کوئی کام ہوتا تو وہ سفارش کے لئے سلمان کو پکڑتا۔ بات بھی کچھ ایسی تھی کہ سلمان اگر جعفری سے کسی کی سفارش کر دیتا تو اُس کا کام بن جاتا۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود سلمان ان دنوں کچھ پریشان پریشان رہتا تھا۔ اُس کو اپنے گھر پر جعفری کا روز روز کا آنا جانا پسند نہیں تھا۔ جب سے جعفری کی آمد و رفت شروع ہوئی تھی۔ رخشندہ اس کی طرف سے بے نیازی برتنے لگی تھی۔ اُس کی حیثیت جعفری کے مقابلے میں گھٹ کر دوسرے درجے پر آگئی تھی۔ جعفری کی موجودگی میں ہمیشہ اُس کو احساس کمتری رہتا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے، ایک روز وہ دفتر سے واپس آیا تو بیوی گھر پر موجود نہیں تھی۔ خادمہ نے بتایا کہ وہ جعفری کے ساتھ کار میں بیٹھ کر کہیں گئی ہے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ اس طرح جعفری کے ساتھ تنہا گئی تھی۔ سلمان کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گذری۔ جھنجھلاہٹ میں اُس نے چائے بھی نہ پی۔

شام ہو گئی مگر دونوں واپس نہ لوٹے۔

سلمان بے چینی سے کمرے کے اندر ٹہلنے لگا۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ رات ہو گئی۔

اُس نے گھڑی دیکھی آٹھ بج رہے تھے۔ پھر نو بجے، دس بجے، رات سنسان ہوتی گئی۔ سناٹا پھیلنے لگا۔ سلمان تھک کر بستر پر لیٹ گیا۔ ۱۱ بجنے کے کچھ دیر بعد دونوں واپس لوٹے۔ دروازہ سلمان ہی نے اٹھکر کھولا۔

جعفری نے اس کو دیکھتے ہی کہا "ارے تم ابھی تک سوئے نہیں۔ تم یقیناً جاگ رہے تھے۔ میں شرط بدنے کو تیار ہوں" وہ بے تکلفی سے ہنس رہا تھا۔ رخشندہ البتہ خاموش تھی۔ وہ سلمان کی نظر بچاکر جھٹ سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

وہ دونوں فلم دیکھکر آئے تھے۔ جعفری کچھ دیر تک فلم کی تعریف کرتا رہا۔

اس کے بعد وہ اٹھکر چلاگیا۔ مگر چلتے چلتے وہ سلمان سے کہتا گیا۔

"سالومن آر۔ ڈی برانچ سے تمھارے خلاف بڑا سخت نوٹ آیا ہے۔ تم کام سے غفلت برت رہے ہو۔ یہ درست نہیں۔ کل صبح دفتر میں مجھ سے مل لینا"

سلمان کا نصف غصہ تو اس اطلاع سے رخصت ہوگیا۔ وہ سوچنے لگا۔ آر۔ ڈی۔ برانچ والوں نے اس کے خلاف کیوں شکایت کی ہے۔ ضرور اس سے کچھ گڑبڑ ہوگئی۔ ان دنوں وہ کام کی طرف سے لاپرواہی بھی بہت برت رہا تھا۔ وہ اسی سوچ میں بیٹھا تھا کہ بیوی نے آکر کہا۔

"آپ نے کھانا نہیں کھایا؟"

سلمان نے روکھے پن سے کہا "نہیں"

رخشندہ پہلے ہی سہمی ہوئی تھی۔ اُس نے جلدی سے کہا۔ "میں ابھی کھانا گرم کرکے لاتی ہوں" اور وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سلمان نے اس کو منع بھی کیا۔ مگر وہ باز نہ آئی۔ باورچی خانے میں برابر برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں اُبھرتی رہیں۔

ذرا دیر بعد رخشندہ کھانا لے کر آگئی۔ وہ ابھی ابھی آگ کے سامنے سے اٹھکر آئی تھی۔ اس کے رخسار شعلوں کی تپش سے دہک رہے تھے۔ آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ اس کے سنہری بالوں کی ایک لٹ بکھر کر ماتھے پر آگئی تھی۔ اس آب و تاب نے اُس کی دل کشی اور بڑھا دی

تھی۔ وہ اس وقت بڑی خوبصورت نظر آرہی تھی ۔ وہ جلدی سے میز اُٹھا کر لائی اس پر کھانا لگایا اور قریب بیٹھ کر اس بات کا انتظار کرنے لگی کہ وہ کھانا شروع کرے مگر سلمان روٹھے ہوئے بچے کی طرح منھ پُھلائے ہوئے خاموش بیٹھا تھا۔

آخر بیوی نے نوالہ بنایا اور اُس کے منھ کے قریب لے جا کر بولی "آپ کو میری قسم تھوڑا سا کھا لیجیے" لیکن سلمان نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور بگڑ کر بولا۔

"ایک بار کہہ دیا کہ مجھکو بھوک نہیں۔ پھر تم مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو۔ میں اس وقت کھانا نہیں کھاؤں گا"

یہ کہتا ہوا وہ دوسرے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ رخشندہ دیر تک کھانے کے قریب سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر وہ برتن اٹھا کر باورچی خانے میں لے گئی۔ رات کے سناٹے میں ذرا دیر تک برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوتی رہی۔ وہاں سے نکل کر وہ سڑک پر کھلنے والی کھڑکی پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر آہستہ آہستہ کمرے کے فرش پر ٹہلنے لگی۔ وہ بڑی بے چین نظر آرہی تھی۔ سلمان بستر پر چپ چاپ لیٹا بیوی کی ہر حرکت کو دیکھتا رہا۔ ہر آواز کو، ہر آہٹ کو سنتا رہا۔

چند منٹ بعد وہ کمرے کے اندر آئی اور آہستہ سے اُس کے سرہانے آکر کھڑی ہو گئی۔ پھر وہ اُس کے چہرے پر جھکی۔ سلمان نے آنکھیں بند کر لیں اور رخشندہ کی تیز تیز سانسوں کے لمس کو محسوس کرنے لگا۔ پھر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ ذرا دیر بعد وہ پھر اندر آئی۔ کئی بار وہ کمرے میں آئی اور چند لمحے رُک کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

وہ اس وقت بڑی بے چین معلوم ہو رہی تھی۔ سلمان نے بستر پر لیٹے لیٹے سوچا کہ اُسے اس طرح اپنی بیوی کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ وہ خواہ مخواہ جذباتی ہو گیا ہے۔ اُسے اپنی بیوی پر اس طرح شبہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جعفری کے ساتھ تنہا پکچر ہی تو دیکھنے چلی گئی تھی۔ کون سا ایسا بڑا جرم ہو گیا جس کی وہ یہ سزا دے رہا ہے اُسے رخشندہ پر اعتماد کرنا چاہیے۔ آخر وہ اُس کی شریک حیات ہے۔ اور اس سے پیار بھی کرتی ہے ورنہ وہ اس قدر بے قرار نہ ہوتی۔ یہ یقیناً اُس کے

گھریلو ماحول کا اثر ہے، جو وہ اس طرح اُس کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اُس کے باپ میں اور اُس کی عمر میں پوری ایک چوتھائی صدی کا فرق ہے اور اس چوتھائی صدی میں زندگی کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ اُسے زندگی کو اپنے باپ کی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ وہ سخت قدامت پسندی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

سلمان چُپ چاپ بستر چھوڑ کر نیچے اُترا آیا، ذرا آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا۔ اُس کی بیوی سونے پر تھک کر سو گئی تھی۔ تیز روشنی میں اُس کا چہرہ بڑا معصوم نظر آ رہا تھا۔ اُس کے جسم کا ایک حصہ صوفے کے نیچے جھول رہا تھا۔ کھڑکی کی راہ سے ہوا کے سرد جھونکے آ رہے تھے، اور وہ بے خبر سو رہی تھی۔ سلمان نے آہستہ سے اُس کو جھنجھوڑا اور بڑے پیار سے بولا۔

"یہاں کھلی ہوا میں کیوں لیٹی ہو۔ طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

رخشندہ نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اُس کے بازو کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھی۔

چند روز بعد وہ پھر جعفری کے ساتھ سلمان کی غیر موجودگی میں باہر چلی گئی۔ اب وہ اکثر اس طرح جعفری کے ساتھ گھومنے چلی جاتی۔ مگر نہ تو کبھی سلمان نے اس بات پر کوئی پرسش کی اور نہ رخشندہ نے پشیمانی کا اظہار کیا۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ وہ موجود بھی ہوتا تو جعفری تکلفاً اس سے پوچھتا۔

"کیا تم پکچر جانے کے موڈ میں ہو؟" اور پھر فوراً کہتا "تم یقیناً تھکے ہوئے ہو۔ تم کو آرام کرنا چاہیئے"

پھر وہ گھڑی دیکھ کر اُس کی بیوی کو آواز دیتا "تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں رخشی" وہ اب رخشندہ کو رخشی ہی کہنے لگا تھا۔ ذرا دیر بعد رخشندہ کی آواز آتی "ابھی آئی" اور پھر وہ بڑی سج دھج کے ساتھ وہاں آ جاتی۔ اس وقت وہ ہالی وڈ کی اصطلاح میں "اِٹ گرل" معلوم ہوتی تھی۔

اس کے بعد جعفری نے سلمان سے تکلفاً پوچھنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ روزانہ شام کو سلمان کے گھر آتا اور پھر دونوں مسکراتے ہوئے باہر چلے جاتے اور سلمان کمرے میں تنہا بیٹھا سوچا کرتا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ کیا اُسے ان دونوں کا حد سے بڑھا ہوا یہ میل جول روک دینا چاہیئے۔ وہ الٹرا ماڈرن بننے کی کوشش کے باوجود ماڈرن بھی نہیں بن سکا تھا۔ اُسے اس بات سے تکلیف ہوتی تھی۔ وہ اندر

ہی اندر گھٹ رہا تھا۔ اس کی صحت پر ان باتوں کا بڑا اثر پڑ رہا تھا۔ اس نے بارہا سوچا کہ اُسے ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ ورنہ یہ مستقل آزار بن جائے گا۔

ایک روز اس نے سنجیدگی کے ساتھ طے کیا کہ اس کو جعفری کی آمد و رفت بند کر دینا چاہیئے۔ لیکن اس طرح جعفری ناراض ہو جائے گا اور جعفری کی ناراضگی کا مطلب تھا کہ اس کی ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی۔ لہٰذا ایسا قدم اٹھانے سے پیشتر اس کو پہلے دوسری ملازمت تلاش کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے ملازمت کی تلاش میں دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ مگر کئی ہفتوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اُسے چار سو کے بجائے کہیں دو سو روپے کی بھی نوکری نہ ملی۔

دوسری ملازمت نہ ملی، لہٰذا وہ جعفری کو ناراض کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ سلمان نے سوچا کہ اب ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ وہ رخشندہ کو جعفری کے ساتھ تنہا نہیں جانے دے گا۔ خود بھی اُس کے ہمراہ جایا کرے گا۔ اس طرح وہ اس تکلیف سے تو بچ جائے گا جو وہ ان دونوں کے جانے کے بعد محسوس کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک روز جب وہ باہر جانے لگے تو سلمان بھی ان کے ہمراہ چلا گیا۔

مگر اس روز اس کو اور بھی زیادہ اذیت پہنچی۔ شام کی چائے انھوں نے "شیزان" میں پی۔ وہاں جعفری کے کچھ دوست بھی آگئے۔ اور جب اس نے رخشندہ کا تعارف مسز سلمان کہہ کر کرایا تو ہر ایک نے چونک کر اس طرح اس کو دیکھا کہ جیسے ان کو جعفری کی بات پہ یقین نہیں آیا تھا۔ اور سلمان نے ہر بار سوچا کہ کیا وہ واقعی بدصورت ہو گیا ہے یا اپنی وضع قطع سے اس قابل نہیں معلوم ہوتا کہ اس کو رخشندہ کا شوہر سمجھا جائے۔ یہ تکلیف کیا کم تھی۔ اس پر مستزاد جعفری کے دوستوں کی معنی خیز مسکراہٹ اور ان کے جملوں کا طنز تھا۔ بلکہ ایک بار تو وہ بلبلا اٹھا۔ جعفری نے اپنے ایک دوست سے اس کا تعارف کرایا تو وہ فوراً بولا۔

"تو آپ ہیں مسٹر سلمان" اس کے لہجے میں غضب کا طنز تھا۔ "آپ کی بیگم صاحبہ سے تو جعفری کے ساتھ اکثر ملاقات ہوئی۔ مگر آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ آپ تو بڑے دلچسپ آدمی

معلوم ہوتے ہیں۔"

سلمان نے پوچھا۔ "آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں بہت دلچسپ آدمی ہوں؟"

وہ کہنے لگا۔ "کسی دن بیگم صاحبہ کے ساتھ میرے یہاں آکر چائے پیجئے تو میں بتاؤں کہ آپ کتنے دلچسپ ہیں۔ اطمینان سے باتیں ہوں گی۔" پھر اس نے اپنا ٹیلیفون نمبر اور کوٹھی کا پتہ بتایا اور اُس سے پوچھنے لگا "تو آپ دونوں کب آ رہے ہیں؟ ٹیلیفون کر دیجئے گا۔ میں اپنی کار بھیج دوں گا"

سلمان اُس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ اُس نے جھنجھلا کر دل ہی دل میں کہا۔ یہ سالا موٹے موٹے ہونٹوں والا ایم۔ اے۔ ریاض، کیا مجھکو بھڑوا سمجھ رہا ہے یا محض اُلو کا پٹھا جو اس طرح رخشندہ کو اپنی کوٹھی پر لانے کے لئے مجھ سے بے باکی سے بات کر رہا ہے۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ ریاض کے منہ پر کس کے ایک تھپڑ رسید کرے۔

جعفری فوراً بھانپ گیا کہ سلمان کو ریاض کی بات ناگوار گذری ہے۔ وہ اُس سے کہنے لگا "ریاض، میرا مشورہ ہے تم ڈیل کارنگی کو ضرور پڑھو۔ میری مراد اس کی کتاب How to win friends سے ہے۔"

ریاض کو بھی سلمان کی ناراضگی کا اندازہ ہو گیا تھا، لہٰذا وہ ڈیل کارنگی کے بارے میں جعفری سے باتیں کرنے لگا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

اُس دن کے بعد سلمان پھر ان دونوں کے ہمراہ نہ گیا اور اندر ہی اندر گھٹتا رہا۔ اُس کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ رخشندہ بڑی بے باکی کے ساتھ جعفری کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی اور جعفری کا زیادہ تر وقت سلمان ہی کے ہاں گذرتا تھا۔

ایک اتوار کو جعفری نے سلمان کی ڈیوٹی دفتر میں لگا دی۔ وہ خود بھی دفتر آیا تھا۔ مگر وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرا اور سلمان سے یہ کہکر چلا گیا کہ وہ کچھ دوستوں کے ساتھ دعا جہ جی آ دننگ کے لئے جا رہا ہے۔ جنرل مینجر کا شاید فون آئے تو اُس سے کہدے کہ وہ کسی رشتہ دار کو رخصت کرنے ایرپورٹ

گیا ہے۔

سلمان ۳ بجے تک دفتر میں کام کرتا رہا۔ اُس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا اس نے وہ جلد ہی دفتر سے اٹھ گیا۔ واپس گھر آیا تو اس نے دیکھا جعفری کی کار اُس کے فلیٹ کے نیچے کھڑی تھی۔ کار کو دیکھتے ہی اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

سلمان غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ اسی دیوانگی کے عالم میں اُس نے بازار سے جاکر ایک بڑا سا شکاری چاقو خریدا اور یہ طے کر کے گھر میں گھسا کہ وہ آج جعفری اور رخشندہ دونوں کو ٹھکانے سے لگا دے گا۔ اس کے سر پہ خون کھیل رہا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور کوٹ کی جیب میں پڑے ہوئے چاقو کو وہ داہنے ہاتھ سے مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے تھا۔ اُس کی سمجھ میں اپنی ذلت کا انتقام لینے کا یہی طریقہ آیا۔ روز روز کی تکلیفوں نے زندگی اُس کے لئے عذاب بنا دی تھی۔

اُس نے تیز تیز قدموں سے زینے کی سیڑھیاں طے کیں۔ دروازہ جھنجلا کر زور سے دھکا دیکر کھولا۔ ڈرائنگ روم خالی پڑا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا۔ سامنے مسہری پر جعفری لیٹا تھا اور اُس کی بیوی سرہانے بیٹھی جعفری کا سر دبا رہی تھی۔ سلمان کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ وہ دہلیز پر سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ چاقو مضبوطی سے انگلیوں میں بھینچ لیا اور چیخ کر بولا۔

"رخشی"

اُس کی بیوی نے گھبرا کر اس کو دیکھا اور فوراً اُس کے قریب آ گئی۔ اُس نے سرگوشی کرتے ہوئے اُس سے کہا۔ "آہستہ بولئے۔ جعفری صاحب کی طبیعت خراب ہے" سلمان نے خونخوار نظروں سے گھور کر رخشندہ کو دیکھا۔ اُسی وقت جعفری کی آواز اُبھری۔

"سالومن کیا بات ہے میرے پاس آؤ"

جعفری اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ سلمان کو خاموش دیکھ کر اُس نے کہا "تم روٹھے بچے کی طرح وہاں کیوں کھڑے ہو۔ یہاں تو آؤ۔ آؤ بھئی" اُس کا لہجہ سرپرستانہ بھی تھا اور تحکمانہ

بھی تھا۔ سلمان آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے قریب پہنچ گیا۔

جعفری کہنے لگا۔ کیا تم مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو گے۔ میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔

وہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ سلمان نے خاموشی کے ساتھ اُس کی پیشانی کو چھوا۔ وہ پسینے سے شرابور تھی۔ اُس نے گھبرا کر جعفری سے کہا۔

"ارے آپ کو تو بڑا تیز بخار ہے"

جعفری نے کراہتے ہوئے کہا۔ "بہت خراب ہو رہی ہے طبیعت"

"میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں"

"نہیں میں خود چلوں گا"

سلمان نے سہارا دے کر اس کو نیچے اُتارا اور اُس کو سنبھالے ہوئے موٹر تک لے گیا۔ رخشندہ بھی ساتھ تھی۔ کار وہی چلا رہی تھی۔ سلمان کو پہلی بار اس بات کا علم ہوا کہ وہ کار بھی چلانا سیکھ گئی تھی۔

تینوں ڈاکٹر کے کلینک پر پہنچے۔ واپسی پہ سلمان جعفری کو اس کی کوٹھی پر چھوڑنے گیا اور رات گئے تک وہاں رہا۔ رخشندہ بڑی مستعدی کے ساتھ جعفری کی تیمارداری کرتی رہی۔ سلمان خاموش بیٹھا اُس کو دیکھتا رہا۔ جب وہ واپس گھر لوٹا تو چاقو اُس کی جیب میں پڑا تھا اور رخشندہ جعفری کی دیکھ بھال کے لئے وہیں ٹھہر گئی تھی۔

●

۴

سلطانہ کو بوڑھے خانساماں کے بھائی کے ساتھ رہتے ہوئے کئی ہفتے ہوگئے۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا مزاج میں نرمی تھی اور اپنے بڑے بھائی کی طرح کم سخن تھا۔ بازار میں اُس کی چھوٹی سی پرچون کی دوکان تھی۔ وہ صبح کا نکلا ہوا رات گئے گھر میں داخل ہوتا تھا۔ تمام دن دوکان پر بیٹھا رہتا۔ وہ سلطانہ کی بڑی عزت کرتا تھا اور ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا کہ اس کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ مگر اس کی بیوی بڑی نک چڑھی عورت تھی۔ ذرا سی بات پر آنکھیں نکال کر کھڑی ہو جاتی۔ ہر سال اُس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تھا۔ اور اب تک ۱۱ بچوں کی پلٹن تیار کر چکی تھی۔ درجن کا آخری بچہ اُس کے پیٹ میں تھا۔ وہ دن بھر بچوں کو چیخ چیخ کر گالیاں دیا کرتی۔ ہر وقت اس کی ناک پر غصہ رہتا تھا۔ ذرا کوئی بات اُس کے مزاج کے خلاف ہوئی اور اُس نے دہاڑنا شروع کر دیا۔ اس کا قد ٹھگنا تھا اور نچلا دھڑ خوب پھیلا ہوا تھا۔ دیکھنے میں اچھی خاصی بھوری بھینس معلوم ہوتی تھی۔

سلطانہ کو وہ عورت پہلے ہی دن سے اچھی نہیں لگی تھی۔ اس لئے وہ اُس سے بہت کم بات چیت کرتی تھی۔ سلطانہ نے کبھی اس سے میل جول بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ جس میں کل دو کمرے تھے مگر اس کو رہائش کے لئے ایک کمرہ مل گیا تھا۔ وہ زیادہ تر اپنا وقت کمرے کے اندر گذارتی۔ ننھے ایاز کی ان دنوں طبیعت خراب تھی۔ دانت نکل رہے تھے۔ وہ ہر وقت ماں کی گود پر چڑھا رہتا۔ ماں لمحہ بھر کو جدا ہوتی تو وہ ریں ریں کرنا شروع کر دیتا۔

بوڑھا خانساماں ابھی تک بے روزگار تھا اور ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ سلطانہ اپنے ساتھ جو روپے لائی تھی وہ خرچ ہو چکے تھے۔ دونوں وقت کا کھانا وہ گھر میں کھاتی تھی۔ البتہ بچے کا دودھ اور اوپر کی دوسری ضروریات پر وہ اپنے پاس سے خرچ کر رہی تھی۔ جب سارے روپے خرچ ہو گئے تو ایک روز اُس نے خانساماں کو بلایا اور کانوں میں پہنے ہوئے سونے کے آویزے نکال کر خانساماں کو دیئے کہ وہ اس کو فروخت کر ڈالے۔ خانساماں نے فوراً کہا۔

"بیگم صاحبہ یہ آپ کیا کر رہی ہیں"

سلطانہ نے فوراً کہا "دیکھو بابا تم مجھکو بیگم صاحب نہ کہا کرو۔ مجھے بڑی شرم معلوم ہوتی ہے" (وہ اب اس کو خانساماں کے بجائے بابا کہنے لگی تھی)۔ وہ مسکرا کر بولا۔

"تو پھر کیا کہا کروں؟"

"جو آپ کا جی چاہے۔ ویسے آپ میرا نام تو جانتے ہی ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "چلو بھائی اللہ میاں نے مجھکو اتنی بڑی پالی پوسی بیٹی دیدی" یہ کہکر اُس نے سلطانہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اُس سے کہنے لگا "اچھا اب تم یہ بندے پہن لو۔ میرے پاس ابھی کچھ رقم پڑی ہے۔ فی الحال تم اس سے کام چلاؤ۔ جب تک اللہ میرا کام لگا دے گا۔"

سلطانہ نے بہت اصرار کیا مگر وہ آویزوں کو فروخت کرنے پر رضامند نہ ہوا۔ اُسی وقت جا کر اُس نے اپنا صندوق کھولا اور اُس میں سے پچاس روپے لا کر سلطانہ کو دیدیئے۔

سلطانہ نے روپے تو لے لئے مگر اس کو بڑی شرم معلوم ہوئی۔ اُس نے سوچا اس طرح کب تک کام چلے گا۔ کب تک اس طرح وہ دوسروں کے سر کھاتی رہے گی۔ کب تک وہ بوڑھے خانساماں سے روپے لیتی رہے گی۔ وہ ان دنوں اسی اُدھیڑ بن میں تھی کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اسی دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے اُس کو بہت پریشان کر دیا۔

شاید جمعہ کا دن تھا۔ اُس روز خانساماں کا چھوٹا بھائی دکان سے سرِ شام ہی واپس آ گیا تھا۔ جمعہ کو وہ عام طور پر جلدی ہی گھر آ جاتا تھا۔ اُس روز وہ بازار سے مٹھائی لایا تھا۔ اُس نے

سلطانہ کو بھی مٹھائی بھجوانا چاہی تو اُس کی بیوی بگڑ کر بولی۔

"بس رہنے دو، بہت ہو چکیں خاطر داریاں۔ اپنے گھر میں کھانے والے کچھ کم ہیں۔ جو تم کو مجھ کو کھلاتے پھر رہے ہو۔ خواہ مخواہ کے لئے بڑے بھیا نے ایک مصیبت لا کر ہمارے سر پر ڈال دی۔ بیگم ہوں گی اُن کے لئے۔ انھوں نے نمک کھایا ہے۔ ہمارے ساتھ کیا کر دیا جو دونوں وقت پلنگ پر بٹھا کر دستر خوان لگائیں۔"

وہ بڑی تیز و طرار عورت تھی۔ ایک زبان میں دس باتیں کہتی تھی۔ تڑاق پڑاق بولتی چلی گئی۔ سلطانہ اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھی۔ درمیان میں دیوار تھی۔ مگر آواز صاف سُنائی پڑ رہی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی اس عورت کے منہ سے ایسی جلی کٹی باتیں کئی بار سُن چکی تھی۔ ذرا دیر بعد اُس کے شوہر کی آواز اُبھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"نیک بخت تو کیوں ایسی باتیں کر رہی ہے۔ خدا کسی پر بُرا وقت نہ ڈالے بے چاری مصیبت کی ماری ہوئی ہے۔ ہمارا کیا لیتی ہے۔ دو وقت کا کھانا کھا لیتی ہے، تو اس میں کیا جاتا ہے۔ اللہ نہ جانے کس کے نصیب سے دیتا ہے۔"

بیوی اس کے سمجھانے پر اور بھڑک اٹھی۔ چیخ کر بولی۔ "بس بس رہنے دو اپنی خدا ترسی۔ ہم کون سے بڑے دھنی سیٹھ ہیں۔ نہ جانے کس طرح روکھا سوکھا کھا کر گذارہ ہو رہا ہے۔ اوپر سے یہ مصیبت اور سر پر آ گئی۔ یہ بڑے بھیا اچھے خاصے دفعان ہو گئے تھے۔ اب آئے ہیں تو اپنے ساتھ یہ دم چھلا لگا کے لے آئے۔ خود بھی ٹھونس رہے ہیں اور اپنے الفتوں کو بھی ٹھنسوا رہے ہیں۔"

وہ اونچی آواز سے بول رہی تھی۔ سارے گھر میں اُس کی آواز گونجنے لگی تھی۔ اُس کے شوہر نے فوراً کہا۔ "آہستہ بولو۔ وہ بے چاری سُنے گی تو کیا کہے گی۔؟"

وہ اور زور سے چلّا کر کہنے لگی۔ "سُن رہی ہے تو سننے دو۔ میں کسی کے لئے اپنے منہ میں قفل نہیں ڈال لوں گی۔ میرا گھر ہے چاہے جس طرح بات کروں۔ دیکھو میں نے تم سے کہہ دیا کہ مجھ سے اب نہیں کھلایا جائے گا۔ تم بڑے بھیا سے کہہ دو کہ وہ اپنی مصیبت اپنے ساتھ لے جائیں۔ یہ سر لئے

یا ہوٹل نہیں ہے۔ جس کا جی چاہا آکر ٹھہر گیا۔ واہ واہ یہ بھی خوب رہی۔ خود مزے سے اینڈتے پھرتے ہیں۔ کبھی نوکری نہیں لگتی۔ اے نوکری ملے تو کیسے۔ کوئی تلاش بھی کرے۔ اللہ دے کھانے کو تو بلا جائے کمانے کو۔"

شوہر مری ہوئی آواز سے بولا "اچھا اچھا میں اُن سے بات کروں گا۔ اب تو تم چپ ہو جاؤ"

مگر وہ باز نہ آئی۔ کہتی رہی۔ "اگر تم نے ان سے نہ کہا تو خدا قسم میں سامان باہر پھکوادوں گی اور دونوں سے کہوں گی کہ بھائی بڑھاؤ اپنا ٹٹو یہاں سے۔ بہت ہو چکی مہمان داری۔"

وہ زچ ہو کر بولا "خدا کے لئے تم اب چپ ہو جاؤ۔ بس بہت کہہ چکیں"

وہ بجائے چپ ہونے کے اور زیادہ زور زور سے چیخنے لگی۔ جو اُس کے جی میں آیا کہتی چلی گئی۔ اور اُس کے ساتھ اُس نے رونا بھی شروع کر دیا۔ شوہر سیدھا سادھا آدمی تھا۔ ہنگاموں سے جلد گھبرا جانے والا۔ بجائے اس کے کہ وہ بیوی کو ڈانٹتا، اُلٹا اس کی خوشامد کرنے لگا۔

سلطانہ چپ چاپ بیٹھی ایک ایک بات، ایک ایک آواز سنتی رہی۔ اُس نے سوچا اب اس گھر میں وہ زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتی۔ اس بات کو وہ رات گئے تک بستر پہ پڑی سوچتی رہی۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ کس کے پاس جائے۔ کہاں جائے۔ کئی بار اُس نے انتہائی ناامیدی کے عالم میں سوچا کہ اس زندگی سے تو موت بھلی۔ پھر اس رات ایک ایسا لمحہ بھی آیا کہ اُس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ خودکشی کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔

بہت دنوں کی بات ہے، ایک بار سلطانہ کی ماں نے اُس سے بتایا تھا کہ محلہ کی ایک عورت نے ٹنکچر آیوڈین پی کر خودکشی کر لی تھی۔ سلطانہ کو تھوڑے سے آیوڈین کی ضرورت تھی۔ اُس نے سوچا جب رات سنسان ہو جائے گی اور گھر میں سب لوگ سو جائیں گے تو پہلے وہ ننھے ایاز کو آیوڈین پلائے گی اور پھر خود پی لے گی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ صبح کو بستر پر صرف لاشیں ہی ملیں گی۔

رات بھر وہ یہی سب کچھ سوچتی رہی اور چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔

صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ بستر سے اٹھنے کے ساتھ ہی اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ ترکاری

کاٹنے والی چھری سے اپنی پنڈلی کو چیر ڈالا۔ چھری کند تھی۔ سلطانہ کو زخم لگانے میں بڑی تکلیف ہوئی۔ بار بار اس کا ہاتھ کانپ جاتا مگر پنڈلی کو زخمی کرنا ضروری تھا۔ ورنہ وہ ایوڈین کیا کہکر منگواتی۔

پنڈلی کو زخمی کرنے کے بعد سلطانہ خانساماں کا انتظار کرنے لگی۔ وہ سویرے بہت تڑکے اٹھکر کہیں چلا گیا تھا اور اب تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ دن خاصا چڑھ گیا تھا۔ ہر طرف زرد زرد دھوپ پھیل گئی تھی۔ سلطانہ نڈھال سی بیٹھی تھی۔ بچہ اس کی گود میں سو رہا تھا۔ اسی اثنا میں صغرا آگئی۔ وہ چھریرے جسم کی زرد رو عورت تھی۔ دو چار مکان چھوڑ کر اس کا گھر تھا۔ اکثر آیا کرتی تھی۔ سلطانہ سے بھی اس کی تھوڑی بہت یاد اللہ ہوگئی تھی۔ صغرا ان دنوں بڑی مصیبت میں تھی۔ اس کے شوہر نے ایک طوائف کو گھر میں بٹھا لیا تھا اور اب اسی کے ساتھ رہتا تھا۔ شروع شروع میں وہ صغرا اور اس کے بچوں کے اخراجات کے لئے کچھ نہ کچھ دے جایا کرتا تھا۔ مگر پچھلے ایک ماہ سے خرچ دینا تو ایک طرف وہ اس طرف آکر جھانکا تک نہیں تھا۔ صغرا پر کئی کئی وقت کے فاقے پڑ رہے تھے۔ سلطانہ خود مصیبت کی ماری ہوئی تھی، اسی لئے اس کو صغرا سے ہمدردی تھی۔

صغرا گھر میں داخل ہوتے ہی سیدھی اس کے پاس آئی۔ اس روز خلاف توقع اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ سلطانہ کا اس وقت کسی سے بات چیت کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ تنہائی چاہتی تھی اور اس تنہائی میں بیٹھکر وہ ان باتوں کو سوچنا چاہتی تھی جو پچھلی رات سے اس کے دماغ میں منڈلا رہی تھیں۔ جن کو دہرانے میں اس کو مزا آرہا تھا۔ یہ موت کا ذائقہ تھا مر جانے کی حسرت تھی۔ یہ عجیب سی لذت تھی۔ ایسی لذت جس کے لئے غالب نے کہا تھا۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

وہ ناامیدی کی اسی حد پہ پہنچ گئی تھی، جہاں موت، موت نہیں رہتی، زندگی بن جاتی ہے۔ اس کے چاروں طرف گہری تاریکی کا جال پھیلا ہوا تھا اور اس جال میں الجھی ہوئی وہ اپنی اکھڑتی ہوئی سانسوں کو محسوس کر رہی تھی۔ ان لمحوں کو دیکھ رہی تھی، جب وہ اپنے بچہ کو تیز بودار تیزابی ایوڈین

پلائے گی۔ بچہ پہلے گھبرا کر روئے گا۔ پھر وہ تڑپے گا۔ اُس کی آنکھیں اُبل پڑیں گی اور پھر اُس کا منکا ڈھلک جائے گا۔ وہ مر جائے گا۔ وہ اُس کی لاش کو اٹھا کر اپنے سینے سے چمٹائے گی' اُس کی ٹھنڈی ٹھنڈی پیشانی کو چومے گی۔ دوسرے لمحہ آیوڈین کی شیشی اُس کے ہاتھ میں ہو گی اور تیزابی مادہ اُس کے حلق سے نیچے اُتر رہا ہو گا۔ پھر اُس کا دل کٹنے لگے گا۔ وہ تڑپنے لگے گی۔ آنکھوں کے سامنے ہر چیز دھندلی پڑتی جائے گی۔ ایک ہچکی' دوسری ہچکی اور پھر قصہ ختم۔ صبح بستر پر اُس کی لاش پڑی ہو گی۔ اُس کے برابر ننھے ایاز کا مُردہ پڑا ہو گا۔ سب سے پہلے کمرے میں بابا رحمان (ماں) آئے گا۔ اور اُس کی لاش کو دیکھ کر رو پڑے گا۔ وہ ضرور روئے گا۔ اس کو ضرور دُکھ ہو گا۔ اور اس کی بھاوج ضرور اُس کو کوسنے دے گی' "حرامزادی کو یہیں آکر مرنا رہ گیا تھا" وہ زور زور سے چیخے گی اور اُس کا زن مرید شوہر اُس کو چپ کرانے کے لئے منت کرے گا اور بستر پہ لاش سرد پڑ چکی ہو گی۔ اُسے کچھ بھی خبر نہ ہو گی۔

ان تمام باتوں کو وہ سوچ چکی تھی۔ سوچ رہی تھی اور ابھی اُن کو دیر تک سوچنا چاہتی تھی۔ بار بار اُس کا دل بھر آتا اور وہ رو پڑتی اور رونے میں اُس کو تسکین مل رہی تھی۔ اس لذت کا نام ہے "قنوطیت" ۔ بندھکھاؤ۔ کریدتے جاؤ اور لطف اٹھاتے جاؤ۔ شکست خوردہ انسان کا آخری حربہ۔ ایک پناہ گاہ اور اُس پناہ گاہ میں سلطانہ سب کی نظریں بچا کر روپوش ہو جانا چاہتی تھی۔

مگر صغرا اُس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت وہ کسی قدر ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ اُس نے خود ہی بات چھیڑی۔ کہنے لگی۔ "اللہ میاں نے میری تو سُن لی" لیکن سلطانہ نے اُس کی بات بالکل نہ سُنی۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح خاموش بیٹھی تھی۔ صغرا کہتی رہی۔ "اب اس حرامزادے (شوہر) کے آگے ہاتھ پھیلانے کی مجھے ضرورت ہے نہ تیرے میرے احسان کی ضرورت۔ اپنے ہاتھ پاؤں سلامت اب تو دو چار کو بٹھا کر کھلانے کا دم ہے۔"

سلطانہ نے اُس کی باتوں پر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔

صغرا لمحہ بھر رُک کر بولی۔ "اے کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

سلطانہ نے بے نیازی سے کہا "اچھی ہے۔"

"بڑی چپ چپ نظر آرہی ہو۔ کیا بات کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں"

صغرا مسکرا کر کہنے لگی۔ "میں تو آج کل ٹھاٹھ سے کام پر جا رہی ہوں۔ اسی لئے آج کل کہیں آنا جانا نہیں ہوتا۔" اس دفعہ سلطانہ نے چونک کر اُس کو دیکھا اور بے ساختہ اُس کی زبان سے نکل گیا۔

"کہاں مل گیا کام؟"

"اے وہ کیا نام ہے اس کا۔ انڈسٹریل ہوم۔ انگریزی میں نام رکھا ہے۔ یاد بھی تو نہیں آتا۔"

سلطانہ کی دلچسپی بڑھنے لگی "کیا کام ہوتا ہے وہاں؟"

وہ بتانے لگی "فی الحال تو میں سلائی کا کام کرتی ہوں۔ ویسے کام سیکھ بھی رہی ہوں۔ وہاں تو نہ جانے کتنی طرح کے کام ہوتے ہیں۔ بہت سی عورتیں کام کرتی ہیں۔ خدا قسم بڑے اچھے اچھے گھروں کی لڑکیاں وہاں آتی ہیں۔"

"تمھیں تنخواہ ملتی ہے؟"

"جتنا کام کرو، اُتنی ہی آمدنی۔ ہفتے کے ہفتے حساب مل جاتا ہے"

سلطانہ نے جلدی سے پوچھا "مجھے بھی وہاں کام مل جائے گا؟" مرنے کی تمنا پر زندہ رہنے کی تمنا حاوی ہو گئی۔ سلطانہ بالکل یہ بھول گئی کہ گذشتہ شب سے اب تک وہ کیا کیا سوچتی رہی ہے۔ اُس نے کس کس طرح اپنا گلا گھونٹا تھا اور کس کس طرح خود کو مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر زندگی پھر زندگی ہے۔ حرکت اور حرارت۔ جدوجہد۔ مسلسل جدوجہد۔ آگے، اور آگے، اور آگے!

صغرا نے حیرت سے سلطانہ کو دیکھا "تم کام کرو گی؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"تو پھر کسی دن میرے ساتھ وہاں چلو۔"

سلطانہ بولی "آج ہی سے چلو"

صغرا نے کہا "میں ابھی جاؤں گی۔ تم تیار ہو جاؤ۔ میں آ کر تم کو اپنے ساتھ لے چلوں گی۔"

سلطانہ آمادہ ہو گئی۔

صغرا چلی گئی تو اُس نے اُٹھ کر جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے اور خالہ نامی کی بڑی بھتیجی کی منت سماجت کر کے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں ننھے ایاز کی دیکھ بھال کرے۔

دس بجے سے کچھ دیر پہلے ہی صغرا آ گئی۔ سلطانہ اس وقت تک تیار ہو چکی تھی۔ دونوں فوراً گھر سے باہر آ گئیں۔ صغرا اس کو انڈسٹریل ہوم لے جانے کے بجائے، پہلے فلک پیما کے ہیڈ کوارٹر پر لے گئی۔ انڈسٹریل ہوم میں داخلے کی اجازت وہیں سے ملتی تھی۔

دونوں جب وہاں پہنچیں تو دس بج چکے تھے۔ ہیڈ کوارٹر کی عمارت کو دیکھ کر سلطانہ کو شبہ سا ہوا کہ وہ اس عمارت کو پہلے بھی کبھی دیکھ چکی ہے۔ مگر وہ اس بات پر زیادہ توجہ نہ دے سکی۔ شبہ صرف شبہ ہی کی حد تک رہا۔ اس لئے کہ اس عمارت کو جب پہلی بار اُس نے دیکھا تھا۔ اس وقت اندھیری رات تھی۔ اور پھر اُس کی زندگی میں اس وقت سے اب تک اتنی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں کہ بہت سی باتوں کی یاد تک دُھندلا گئی تھی۔

ہیڈ کوارٹر کے دفتر میں اس وقت علی احمد ڈیوٹی پر تھا۔ صغرا نے سلطانہ کو اُس سے ملایا۔ وہ سلطانہ کو انڈسٹریل ہوم میں داخل کرنے پر رضامند ہو گیا۔ اُس نے اسی وقت سلطانہ کا نام رجسٹر میں درج کیا اور داخلہ کا ٹکٹ بنا کر دے دیا۔ سلطانہ چاہتی تھی کہ انڈسٹریل ہوم ہی میں اُس کی رہائش کا بھی بندوبست کر دیا جائے۔ اس کی اس بات کو سُن کر علی احمد نے کہا۔

"دیکھئے ہم آپ کو رہنے کی جگہ نہ دے سکیں گے اس کا بندوبست تو آپ کو خود ہی کرنا پڑیگا"

سلطانہ نے بڑی عاجزی سے کہا "میں جہاں رہتی ہوں وہ لوگ مجھے زیادہ عرصہ وہاں ٹھہرانا نہیں چاہتے۔ اور میرا یہاں کوئی نہیں جس کے پاس جا کر ٹھہر جاؤں۔"

"کوئی نہ کوئی تو ضرور ہو گا۔ میرا مطلب ہے کوئی عزیز، کوئی رشتہ دار۔"

وہ بولی "اگر اتنا ہی سہارا ہوتا تو میں آپ سے اس طرح کیوں کہتی"

علی احمد ذرا دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا "آپ کل اس وقت آئیے گا تو میں کچھ بتا سکوں گا۔ فی الحال میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا"

سلطانہ کے لئے زیادہ اصرار کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ صغرا کے ساتھ واپس گھر آگئی۔

دوسرے روز وہ پھر ہیڈ کوارٹر پہنچی۔ علی احمد دفتر میں موجود تھا سلطانہ کو دیکھ کر بولا "انڈسٹریل ہوم میں تو ہمارے پاس جگہ نہیں۔ آپ وہاں جائیں گی تو آپ کو خود اس بات کا اندازہ ہو جائے گا۔ سردست یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ہیڈ کوارٹر میں ٹھہر جائیں۔ یہاں آپ کو رہنے کے لئے ایک کمرہ مل جائے گا۔ مگر یہ آپ کی عارضی رہائش گاہ ہوگی۔ اسکائی لارک کوشش کر رہے ہیں کہ بستی میں آپ کے لئے کوئی مکان تلاش کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ آپ کے رہنے کا 'فلک پیما' کوئی اور انتظام نہیں کر سکتی"

علی احمد نے تفصیل سے ایک ایک بات سمجھا دی۔ سلطانہ نے خاموشی کے ساتھ اس کی بات مان لی۔ وہ اسی روز اپنا سامان لے کر وہاں آ گئی۔ اسکائی لارکوں نے سلطانہ کے لئے کمرہ خالی کر دیا تھا۔ کمرہ بہت مختصر تھا مگر صاف ستھرا تھا۔

چند روز تک تو سلطانہ کو ہیڈ کوارٹر میں بڑی وحشت معلوم ہوئی۔ اس لئے کہ وہاں سب مرد ہی مرد تھے۔ وہ انڈسٹریل ہوم سے شام کو لوٹتی تو زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی۔ کبھی کبھار کسی کام سے باہر نکلنا پڑتا تو اس کو بڑی شرم معلوم ہوتی۔ لیکن ننھا ایاز بہت جلد اسکائی لارکوں میں مقبول ہو گیا۔ وہ گھنٹوں ان کے پاس کھیلا کرتا۔

سلطانہ اب کے انڈسٹریل ہوم چلی جاتی۔ سینے پرونے کے علاوہ اس کو تھوڑی بہت کشیدہ کاری بھی آتی تھی۔ اس کو اسی کام پر لگا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ زردوزی اور لکڑی کے کھلونے بنانے کا کورس بھی مکمل کر رہی تھی۔ کام میں سب سے بڑی مشکل ننھا ایاز تھا۔ جس نے شروع شروع میں رو رو کر اس کو بہت پریشان کیا۔ انڈسٹریل ہوم میں کام کرنے والی عورتوں میں بہت کم ایسی تھیں،

جو ننھے ننھے بچوں کو اپنے ساتھ لے کر آتی تھیں۔ بچوں سے چونکہ کام میں گڑبڑ پیدا ہوتی تھی، اس لئے عام طور پر انڈسٹریل ہوم میں بچوں والی عورتوں کو بہت کم داخلہ ملتا تھا۔ ویسے بچوں کے لئے انڈسٹریل ہوم میں ایک لمبا سا دالان تھا۔ جس میں کئی پالنے پڑے تھے، جو بچے گھٹنوں چلنے والے تھے، اُن کے واسطے لکڑی کی باڑھ لگا کر چھوٹا سا احاطہ بنا دیا گیا تھا، یہاں وہ کھیلتے رہتے۔ اُن کی دیکھ بھال کے لئے ایک آیا بھی مقرر تھی۔

سلطانہ رفتہ رفتہ ہیڈ کوارٹر کے ماحول کی اجنبیت سے مانوس ہوتی گئی۔ علی احمد سے وہ ایک بار بات چیت کر چکی تھی۔ اس لئے وہ کبھی کبھار اس سے بات کر لیا کرتی۔ ننھا ایاز علی احمد سے بہت ہل گیا تھا، لہذا گفتگو کرنے کا روزانہ کوئی نہ کوئی سلسلہ نکل ہی آتا تھا۔ اب ذرا اُس کو اطمینان نصیب ہوا تو اُسے نوشا کا خیال ستانے لگا۔ جوان دنوں جیل میں تھا اور عدالت میں اس کا مقدمہ زیرِ سماعت تھا۔ وہ اس کے بارے میں علی احمد سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر اُس کی ہمت نہ پڑتی۔ اُسے ڈر تھا کہ اگر اُس نے نوشا کے متعلق کچھ کہا تو اُسے اور بھی ایسی باتیں بتانا پڑیں گی، جن کو وہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ ممکن ہے ان باتوں کو سُن کر علی احمد اُس کے بارے میں کوئی اُلٹی سیدھی رائے قائم کرے اور اُسے ہیڈ کوارٹر سے بھی نکلنا پڑے۔ ویسے اسکاؤٹ لڑکوں کو بھی اُس سے خاصی مدد ملتی تھی۔ وہ اُن کے پھٹے ہوئے کپڑوں کی مرمت کر دیا کرتی، قمیصوں میں بٹن ٹانک دیتی۔ ہفتہ کی رات کو فلک پیما کی میٹنگ ہوتی تو وہ اسکاؤٹ لڑکوں کے لئے چائے تیار کر دیتی۔ سارے اسکاؤٹ لڑکے اُس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ اُس سے بات کرتے تو نظریں نیچی کر کے کبھی بلاوجہ اس سے بات چیت کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ اگر وہ ان کا کوئی چھوٹا موٹا کام کر دیتی تو وہ بار بار اُس کا شکریہ ادا کرتے۔

سلطانہ کو اسکاؤٹ لڑکے بڑے عجیب و غریب لوگ معلوم ہوتے۔ وہ بلا کسی غرض کے سب کی خدمت کرتے تھے اور خوش رہتے تھے۔ وہ اپنا سارا کام خود ہی کرتے تھے۔ موٹا جھوٹا کھاتے، موٹا جھوٹا پہنتے اور بڑے مطمئن نظر آتے۔ بات کرتے وقت ان کا لہجہ نرم ہوتا۔ وہ ننھے ایاز کے ساتھ کھلنڈرے نوجوانوں کی طرح قہقہے لگا کر کھیلتے تھے۔ اور وہ بھی اُن سے اس قدر مانوس ہو گیا

تھا کہ ہمک ہمک کے اُن کے پاس جاتا اور گھنٹوں ماں کے پاس آنے کا نام نہ لیتا۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ علی احمد اُس کے پاس اپنی قمیص میں رفو کرانے کے لئے آیا۔ اُس نے بلا کسی تمہید کے سلطانہ سے کہا "آپ پڑھائی کیوں نہیں شروع کر دیتیں؟"

سلطانہ نے فوراً کہا۔ "آپ مجھے پڑھا دیا کریں گے؟"

علی احمد ذرا دیر تک خاموش رہا۔ پھر اُس نے کہا "میں شام کو صرف آدھ گھنٹہ آپ کو دے سکوں گا۔"

اسی وقت پروگرام طے ہو گیا۔ دوسرے روز شام ہوتے ہی علی احمد اس کو پڑھانے آ گیا۔ سلطانہ علی احمد کی توقع سے زیادہ ذہین نکلی۔ پڑھنے سے اُس کو دلچسپی بھی تھی۔ مقررہ وقت سے پہلے ہی اُس نے تعلیم بالغاں کا پہلا کورس ختم کر دیا۔ اس کی تن دہی کو دیکھ کر علی احمد نے پڑھائی کے وقت میں پندرہ منٹ کا اور اضافہ کر دیا۔ وہ وقت کا سختی سے پابند تھا۔ پڑھائی شروع کرنے سے پہلے گھڑی دیکھ لیتا اور جیسے ہی ۴۵ منٹ پورے ہو جاتے فوراً اٹھ جاتا۔ پڑھائی کے دوران میں وہ کبھی غیر متعلق بات نہیں کرتا تھا۔ کئی بار سلطانہ نے سوچا کہ وہ نوشا کے بارے میں علی احمد سے بات کرے مگر علی احمد کا سنجیدہ چہرہ اور سوچتی ہوئی تیز آنکھوں کو دیکھ کر اُس کی ہمت جواب دے جاتی۔

لیکن وہ نوشا کے لئے بڑی بے چین تھی۔ ایک روز اُس نے ہمت کر کے آخر علی احمد سے کہہ ہی دیا "میرا ایک چھوٹا بھائی جیل خانہ میں ہے، اُس پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے" علی احمد نے چونک کر سلطانہ کو دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"کس کو قتل کیا تھا اُس نے؟"

سلطانہ نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس کے باپ کو"

علی احمد اور زیادہ حیرت زدہ ہو گیا۔ کہنے لگا "اپنے سگے بہنوئی کو قتل کر دیا۔ بڑا بے رحم نوجوان ہے" سلطانہ نے فوراً کہا۔

"وہ اتنا برا نہیں ہے۔ جتنا آپ سمجھ رہے ہیں"

"کیوں؟"

اس 'کیوں' کا وہ کیا جواب دیتی۔ اسی بات کے طشت از بام ہو جانے سے تو وہ ڈر رہی تھی۔ پھر علی احمد نے خود ہی کہا "میری سمجھ میں تمھاری بات کا مطلب نہیں آیا۔ ٹھیک ہے کہ وہ تمھارا بھائی ہے اور تمھیں اُس سے محبت بھی ہے۔ مگر تمھاری ساری تباہی تو اُسی کے ہاتھوں ہوئی۔ کم از کم میرا تو یہی اندازہ ہے۔"

سلطانہ نے سوچا کہ اگر علی احمد نے نوشا کے متعلق یہی رائے قائم کی تو وہ اُس کے مقدمے کی پیروی نہ کر سکے گا اور نوشا کو پھانسی ہو جائے گی۔ اُس کا بھائی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس سے جدا ہو جائے گا۔ اُس نے یہی سوچ کر دبی زبان سے رک رک کر علی احمد کو ساری باتیں بتا دیں۔ اور جب وہ سب کچھ بتا چکی تو اُس نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا "میں واقعی بہت بری ہوں۔ آپ مجھ کو جتنا چاہیں ذلیل سمجھ لیں مگر اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں" یہ کہکر اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔

کمرے کی فضا اچانک بڑی غمناک ہو گئی تھی۔ باہر رات کی تاریکی تھی اور کمرے کے اندر سلطانہ کی سسکیوں کی آواز اُبھر رہی تھی۔ علی احمد سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ واقعی یہ لڑکی بڑی مصیبت زدہ ہے۔ وہ ربر کی گیند کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر گر رہی تھی اور ہر جگہ اُس پر ٹھوکر لگائی جا رہی تھی۔ یہ عجیب سوسائٹی ہے، جہاں عورت ربر کی گیند اور خوبصورتی تباہی بن جاتی ہے۔

لیمپ کی زرد زرد روشنی میں سلطانہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُس کا چہرہ بجھتی ہوئی موم بتی کی طرح آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بڑی مظلوم نظر آ رہی تھی۔ علی احمد نے اُس سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

"تم پریشان نہ ہو۔ میں تمھارے بھائی کی رہائی کے لیے ہر طرح کوشش کروں گا۔"

سلطانہ نے بھیگی ہوئی پلکوں سے علی احمد کی جانب دیکھا اور سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔
"آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔ مجھے ایک سہارا مل جائے گا۔ میرا کوئی بھی تو سہارا نہیں"
وہ پھر رونے لگی۔

علی احمد اُس کے رونے سے پریشان ہوگیا، وہ بے چین ہوکر کھڑا ہوگیا لمحہ بھر تک سلطانہ کے چہرے کو تکتا رہا۔ پھر آگے بڑھ کر اُس نے سلطانہ کے سر پر آہستہ آہستہ تھپتھپا کر کہا: "رو و مت رونے سے کچھ نہیں ہوتا:" لمحہ بھر وہ خاموش رہا۔ پھر اُس سے کہنے لگا۔

"چلو اٹھ کر منہ دھو۔ تم بہت دیر تک رو چکی ہو"

سلطانہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اُس نے نظریں اٹھا کر علی احمد کو دیکھا۔ وہ اُس کے عین مقابل کھڑی تھی۔ پھر ایک لمحہ ایسا آیا جب علی احمد نے بڑے جذباتی انداز سے سوچا کہ سلطانہ واقعی بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ اُس نے بڑی گہری سانس بھری اور اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ سلطانہ کے شانے پر رکھ دیا۔

۵

سنسان رات میں دروازے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سلمان ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اُس نے چپ چاپ اٹھکر دروازہ کھول دیا۔ رخشندہ اور جعفری دروازے پر کھڑے تھے۔ جعفری دروازے ہی پر سے واپس لوٹ گیا۔ سلمان سے اُس کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ زینے کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ ذرا دیر بعد کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری۔ جعفری جا چکا تھا۔

سلمان دروازہ بند کرکے لوٹا۔ سامنے صوفے پر اُس کی بیوی تھکی ہوئی سی لیٹی تھی۔ روشنی کے ساتھ دوسرے کمرے میں گیا۔ مگر فوراً ہی واپس آگیا۔ وہ اسی طرح لیٹی تھی اُس کے بال بکھر کر ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ ہونٹوں کی لپ اسٹک دھندلا گئی تھی اور آنکھوں میں کاجل پھیلا ہوا تھا۔ سلمان نے اُس کے چہرے پر اُچٹتی سی نظر ڈالی اور چپ چاپ اُس کے روبرو جاکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ رخشندہ نے اُس کو دیکھکر بڑے ناز سے کہا۔

"اُو نو، کبھی آج تو میں بہت تھک گئی"

سلمان نے نہ تو اُس کی بات کا کوئی جواب دیا اور نہ اُس کی طرف دیکھا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ وہ روشنی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا تھا کہ

وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ کمرے کے اندر اکتا دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد رخشندہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں جانے لگی تو سلمان نے کہا "بیٹھ جاؤ۔" اُس کی آواز خلافِ معمول بہت بھاری لگ رہی تھی۔

وہ بے نیازی سے بولی "کیوں؟"

"مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔"

"صبح بات کریئے گا۔ مجھے نیند معلوم ہو رہی ہے" وہ بدستور لاپرواہی سے بات کر رہی تھی۔ اُس نے جماہی لینے کے لئے منہ کھولا اور ملحقہ کمرے کی جانب جانے کا ارادہ کیا۔ سلمان نے اُس کو روک کر کہا "میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ" اُس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

وہ دھم سے صوفے پر گر پڑی اور تیزی سے کہنے لگی "لیجئے بیٹھ گئی۔ کہیئے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ" سلمان محہ بھر تک اُس کے چہرے کو تکتا رہا پھر بڑے اطمینان سے بولا۔

"مجھے تمہاری یہ حرکتیں قطعی پسند نہیں۔ میں ان باتوں کو اب زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"آپ کی طبیعت کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔ کل میرے ساتھ ڈاکٹر منوچہر کے پاس چلیئے گا۔"

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے اس وقت آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ چلئے چل کر بستر پر لیٹئے۔ دو خواب آور گولیاں کھا لیجئے گا۔ اچھی نیند آجائے گی۔ دراصل بات۔" وہ اپنی بات پوری بھی نہ کر سکی تھی کہ سلمان نے ڈانٹ کر کہا "رخشی زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہ کرو۔"

وہ بے ساختہ مسکرا دی "لیجئے اس میں اسمارٹ بننے کی کونسی بات ہے۔ آپ تو خواہ مخواہ الٹی سیدھی باتیں سوچا کرتے ہیں۔"

وہ تیزی سے بولا "میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے یہ الٹی سیدھی باتیں سوچنے کا موقعہ نہ دو۔ ورنہ۔" اُس نے ایک بارگی اپنا داہنا ہاتھ نکال کر سامنے کر دیا۔ ریوالور کی نال دار چاقو کڑ کڑ

کرتا ہوا کھل گیا۔ روشنی میں اُس کا ہیولا اس طرح جھلملایا کہ رخشندہ کی آنکھیں جھپک گئیں۔ اُس نے وحشت زدہ نظروں سے سلمان کو دیکھا۔ اُس کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سُرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر اس قدر دیوانگی تھی کہ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر رخشندہ کی سہمی ہوئی آواز ابھری۔ "یہ آپ سب کیا کر رہے ہیں۔؟"

"یہ اب تمھارے سوچنے کی بات ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں اور اب مجھے کیا کرنا ہے۔"

"آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم جعفری سے ملنا جلنا بند کر دو۔"

وہ فوراً بولی۔ "مگر یہ تو بہت بُری بات ہوگی۔"

سلمان اونچی آواز سے بولا۔ "اگر تم کو اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا تو تم ہمیشہ کے لیے اپنے میکے چلی جاؤ۔" اس دفعہ رخشندہ نے اس کو غضبناک نظروں سے دیکھا۔ سلمان کی بات سے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ چیخ کر کہنے لگی۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں یہیں رہوں گی۔"

"مگر بات پھر بھی صاف نہیں ہوئی۔" وہ اس روز دو ٹوک بات کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ کئی بار وہ یہی بات پہلے اشاروں میں اور پھر نرمی سے کہہ چکا تھا۔ رخشندہ نادم سی ہو کر زرد ہو گئی۔

"جو آپ چاہتے ہیں، وہی ہوگا۔" یہ کہتی ہوئی وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

سلمان ذرا دیر صوفے پر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر سونے کے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔

دوسرے دن معمول کے مطابق شام کو جعفری آیا۔ سلمان اس وقت گھر ہی پر موجود تھا۔ البتہ اُس کی بیوی جعفری کے آنے سے پہلے ہی برابر والے فلیٹ میں چلی گئی تھی۔ جعفری سیٹی بجاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور بڑی بے تکلفی سے پکارنے لگا۔

"رخشی"

کوئی جواب نہ ملا۔

اس دفعہ اُس نے اونچی آواز سے کہا "رخشی جھٹ پٹ تیار ہو جاؤ۔ ایسی خوبصورت شام کو صرف بوڑھے لوگ گھر پر رہتے ہیں یا بچوں کی آیائیں۔ مجھے اس وقت کمرے میں زیادہ دیر قید نہ رکھنا" وہ تیزی سے بولتا چلا گیا۔

خلاف توقع جب اُس کو رخشندہ کی آواز نہ سنائی دی تو وہ سامنے والے کمرے میں گھس گیا اور زور زور سے بولنے لگا "یہاں تو اندھیرا ہے۔ کوئی بھی نظر نہیں آرہا ہے" وہ رخشندہ کو تلاش کرتا رہا اور اُس کو پکارتا رہا۔ سلمان چپ چاپ اُس کی آوازیں سنتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد جعفری واپس لوٹ آیا۔ "سالومن کیا تم بتا سکتے ہو کہ رخشی اس وقت کہاں گئی ہے؟"

سلمان نے آہستہ سے جواب دیا۔ "مجھے کچھ پتہ نہیں"

جعفری نے لحہ بھڑک کر کہا "تمھارے خیال میں وہ اس وقت کہاں ہو سکتی ہے"

"میں جب گھر آیا تو وہ موجود نہیں تھی" وہ صاف جھوٹ بول گیا۔ جعفری پوچھنے لگا۔ "تو گویا تمھیں اُس کے پروگرام کا کوئی پتہ نہیں۔ تم عجیب شوہر ہو یعنی تم کو یہ نہیں معلوم کہ تمھاری بیوی اس وقت کہاں ہوگی؟"

سلمان نے جعفری کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔ واقعی میں عجیب شوہر ہوں۔ عجیب نہ ہوتا تو جعفری، تم مجھ سے میری بیوی کے متعلق اس طرح بات نہ کرتے۔ مجھکو اتنا اُلو کا پٹھا نہ سمجھتے۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ جعفری کے منہ پر ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کرے اور اُس کو دھکے دے کر باہر نکال دے۔ مگر یہ تھپڑ اس کو بہت مہنگا پڑتا۔ اس میں چار سَو روپے ماہانہ کا نقصان تھا اور اتنا بڑا نقصان جھیلنے کے لئے وہ فی الحال آمادہ نہیں تھا۔

جعفری اٹھکر کمرے کے اندر ٹہلنے لگا۔ پھر کھڑکی پر جاکر کھڑا ہو گیا اور دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ آخر تھکا ہوا سا صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ بڑا بے چین نظر آرہا تھا اور اُس کی بے چینی میں سلمان

کو لطف آ رہا تھا۔ گھنٹہ بھر تک وہ اسی بے چینی کے عالم میں رخشندہ کا انتظار کرتا رہا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت اُس کے چہرے پر تازہ پھلوں کی سی جو تازگی تھی وہ دھندلا گئی تھی۔ وہ اب تھکا ہوا سا نظر آ رہا تھا اور اسی عالم میں اٹھکر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سلمان نے غور کیا کہ جاتے وقت وہ جھنجھلایا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ سلمان نے کھڑکی پر سے جا کر دیکھا، جعفری نے تیزی کے ساتھ سڑک کو عبور کیا، اپنی کار کے پاس پہنچا، اسٹرینگ پر اُچھل کر بیٹھا، زور سے کار کا دروازہ بند کیا اور بہت تیز رفتار سے کار دوڑاتا ہوا آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اُس کی یہ تمام حرکتیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ چوٹ کھا کے گیا ہے۔ کم از کم اب ہفتہ بھر تک تو وہ یہاں نہیں آئے گا۔

مگر سلمان کو یہ دیکھکر حیرت ہوئی کہ ۹ بجے کے قریب وہ پھر موجود تھا۔ اُس کا چہرہ ابھی تک پریشان تھا۔ وہ کمرے میں اس وقت جس انداز سے داخل ہوا تھا، اُس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس گھر میں خوشی سے نہیں آیا ہے۔ وہ چپ چاپ صوفے پر جا کر بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر اُس نے سلمان سے پوچھا۔

"رخشی واپس آگئی؟"

"ہاں"

"تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کہاں گئی تھی؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

"وہ کچھ ناراض معلوم ہوتی ہے۔ میری ہمت نہ پڑی" سلمان جھوٹ پر جھوٹ بولتا چلا گیا۔ اس لئے کہ کچھ ہی دیر پہلے اُس نے رخشندہ کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ ذرا دیر تک اِدھر اُدھر کی کچھ باتیں بھی ہوتی تھیں۔ پھر وہ بستر پر سونے چلی گئی اور اب شاید وہ انگریزی کا کوئی جاسوسی ناول پڑھ رہی تھی۔ جعفری نے سلمان کی بات سُن کر بڑی حقارت سے اُس کو گھور کر دیکھا اور اُس

سے کہنے لگا۔ تو تم نے اُس سے کچھ بھی نہیں پوچھا ؟

سلمان نے آہستہ سے کہا "نہیں"

جعفری نے پھر کوئی بات نہیں کی اور بے چینی سے اپنی ہتھیلیاں رگڑنے لگا۔ پھر اٹھکر اس کمرے میں چلا گیا۔ جس میں رخشندہ موجود تھی۔ وہ بستر پر خاموش لیٹی تھی۔ کمرے میں دُھندلی دھندلی روشنی تھی اور اس روشنی میں رخشندہ کا چہرہ تھکا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ جعفری جا کر اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور شکوہ کرنے کے سے انداز میں اُس سے کہنے لگا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں کہ شام کو تم کہاں تھیں۔ میں نے تمہارا مکمل ایک گھنٹہ تک انتظار کیا۔ تم نے میری آج کی پوری شام خراب کر دی"

وہ خاموش پڑی رہی۔ اُس نے جعفری کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

جعفری نے اس دفعہ نرمی سے کہا "کیا بات ہے تم کچھ اُداس معلوم ہو رہی ہو"

وہ بیزاری سے بولی "میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے"

"اوہو تو تم نے یہ بات پہلے کیوں نہ کہی۔ میں ڈاکٹر کو لے آؤں"

وہ تیوری پر بل ڈال کر کہنے لگی "جی نہیں شکریہ" لمحہ بھر خاموش رہ کر اُس نے بڑے تیکھے لہجہ میں کہا "جعفری صاحب آپ آئندہ میرے کمرے میں اس طرح بغیر پوچھے نہ آیا کریں۔ یہ میرا بیڈروم ہے۔ ڈرائنگ روم نہیں ہے"

جعفری سناٹے میں آگیا۔ گھبرا کر بولا "تم تو بہت ناراض معلوم ہوتی ہو"

وہ اسی طرح تیز لہجے میں بولی "بہتر ہوگا کہ آپ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھیں"

اس دفعہ جعفری تلملا کے رہ گیا۔ اس لیئے کہ رخشندہ کی یہ ساری باتیں اس کے لیئے بالکل انوکھی تھیں اور اُن سے حقارت ٹپک رہی تھی۔ اُس نے گھور کر رخشندہ کو دیکھا اور جھنجھلایا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

سلمان دروازے سے لگا چوروں کی طرح ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ جعفری کو واپس آتے

دیکھ کر وہ صوفے پر جا کر بیٹھ گیا جعفری کمرے میں آیا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جعفری نے اُس سے کوئی بات نہیں کی وہ سیدھا دروازے کی جانب چل دیا۔ سلمان بھی اُس کے ساتھ ساتھ دروازے پر گیا۔ جب وہ دروازے سے باہر نکلنے لگا تو سلمان نے بڑی نرمی کے ساتھ کہا۔

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ بہت ناراض معلوم ہوتی ہے۔"

جعفری نے اُس کو مشتبہ نظروں سے گھور کر دیکھا اور چپ چاپ باہر چلا گیا۔

صبح جب سلمان دفتر پہنچا تو تھوڑی ہی دیر بعد جعفری کا چپراسی اُس کو بلانے آیا۔ سلمان نے اُس کے آفس میں جا کر دیکھا جعفری خاموش بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا۔ سلمان پر نظر پڑتے ہی اُس کے چہرے پر کرختگی برسنے لگی۔ کہنے لگا۔

"آپ کے خلاف آر۔ ڈی سکشن سے بڑی سخت شکایت آئی ہے۔ آپ بالکل لاپرواہ ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ میں آپ کو آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ اس کے بعد آپ کو اگر اس دفتر کو چھوڑنا پڑے تو آپ کو اس پر حیرت نہ ہونا چاہیئے۔"

یہ سیدھی سادھی دھمکی تھی۔ جس کو سلمان نے خاموشی کے ساتھ سُن لیا اور آئندہ کام میں پوری احتیاط برتنے کا وعدہ کر کے جعفری کے کمرے سے باہر آگیا لیکن اس دھمکی نے اس کو پریشان ضرور کر دیا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا کہ اگر ملازمت چلی گئی تو وہ کیا کرے گا۔ تنخواہ سے اُس نے اتنا بھی پس انداز نہیں کیا تھا کہ ایک مہینہ بھی بے روزگاری کا گذار سکے اور فوری ملازمت ملنے کی کوئی امید بھی نہیں تھی۔

وہ اسی پریشانی میں بیٹھا تھا کہ جعفری نے اس کو پھر بلوایا۔ اس دفعہ اُس نے بالکل براہِ راست بات کی "کیا تمھارا رخشی سے کچھ جھگڑا ہوا تھا؟"

"نہیں۔"

"تم مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ ضرور ایسی بات ہے"

سلمان نے اُس کو یقین دلانے کی کوشش کی "آپ یقین مانئے ایسی کوئی بات نہیں"

"کیا تمھیں مجھ سے کوئی شکایت ہے؟" جعفری کے دل کا چور بول پڑا۔ وہ سلمان سے صاف صاف بات کرنا چاہتا تھا مگر سلمان نے اُس کو اس بات کا موقعہ نہ دیا۔ بڑی سادگی سے بولا۔ "آپ سے مجھے کیا شکایت ہو سکتی ہے؟"

"تو پھر رخشی کل اس قدر ناراض کیوں تھی؟"

"ناراض تو وہ مجھ سے بھی ہے۔ آج صبح اُس نے میرے ساتھ ناشتہ بھی نہیں کیا۔ آپ ہی اس سے کچھ پوچھئے۔ میری تو بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی" سلمان اس وقت بڑا سادہ لوح معلوم ہو رہا تھا۔ اور اُس کی اس سادہ لوحی پر جعفری مسکرا دیا۔ کہنے لگا "میرا خیال ہے کہ وہ ضرور تمھاری کسی بات سے ناراض ہو گئی ہے۔ وہ بڑی جذباتی لڑکی ہے۔ تم اُسے ابھی سمجھ نہیں سکے"

اس کے بعد وہ دیر تک بڑے سرپرستانہ انداز میں اُس سے باتیں کرتا رہا۔

شام کو جعفری، سلمان کے گھر آیا۔ رخشندہ اس وقت گھر پر موجود تھی۔ سلمان بھی دفتر سے ذرا دیر پہلے واپس آیا تھا۔ وہ اور جعفری باہر والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ رخشندہ اس کمرے میں آئی۔ نہ تو اُس نے جعفری سے بات کی، نہ اُس کی جانب دیکھا اور چُپ چاپ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی وہ اس وقت عام گھریلو لباس پہنے تھی جس سے یہ بات صاف واضح ہو رہی تھی کہ وہ پڑوس کے کسی فلیٹ میں گئی ہے۔ کم از کم اس لباس میں بازار نہیں جا سکتی تھی۔

جعفری بہت دیر رخشندہ کی واپسی کا بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ آخر جب شام گہری ہو گئی اور رات شہر میں اُتر آئی تو جعفری چُپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔

کئی روز تک یہی ہوتا رہا۔ جعفری آتا تو رخشندہ یا تو گھر میں موجود ہی نہ ہوتی یا جعفری کے آتے ہی اٹھ کر پڑوس میں چلی جاتی اور جب تک وہ گھر میں موجود رہتا، واپس نہ لوٹتی۔ کبھی آمنا سامنا ہو گیا اور جعفری نے زبردستی اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ بڑی بے رخی سے جواب دیتی۔

جعفری تلملا کے رہ جاتا۔ وہ ان دنوں پریشان سا رہتا۔ دفتر میں بھی وہ کھویا کھویا نظر آتا۔ سلمان کے گھر آتا تو بے چینی سے کمرے میں ٹہلتا رہتا۔ گھنٹوں صوفے سے گردن لٹکائے خلا میں گھو

کرتا۔ تھک جاتا تو کارے کر کہیں چلا جاتا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد پھر واپس آجاتا۔

اُس کا تروتازہ چہرہ چند ہی روز میں جُھلس کر رہ گیا۔ آنکھوں کی چمک دمک بجھ گئی تھی اور تیز لہجے کے ساتھ جلدی جلدی بات کرنے کے بجائے وہ اب رُک رُک کر آہستہ آہستہ بات کرنے لگا تھا۔

رخشندہ بھی ان دنوں اجڑی اُجڑی نظر آرہی تھی۔ اُس نے لباس میں اہتمام برتنا چھوڑ دیا تھا۔ میک اپ کی طرف سے بھی وہ لاپرواہ ہوگئی تھی۔ ہر وقت عام گھریلو لباس میں رہتی۔ کئی کئی روز تک کپڑے نہ بدلتی۔ بال بکھرے ہیں تو شام تک بکھرے رہتے۔ بہت ہوا تو لمبے لمبے سنہری بالوں کا بے تکا سا جوڑا باندھ لیا۔ اُس کے حُسن کا سارا جادو اُس کی دلکشی کی ساری سج دھج ماند پڑ گئی تھی۔ وہ بالکل ایک معمولی لڑکی معلوم ہوتی۔ وہ رخشندہ جو ہر شام کو قدم قدم پر جادو جگاتی ہوئی گھر سے نکلتی تھی۔ نہ جانے کہاں روپوش ہوگئی تھی۔ اُس کی آواز میں جو لوچ اور لچک تھی، وہ بھی نہ رہی۔ وہ اب چڑچڑی ہوگئی تھی۔ بات بات پر اُس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے اور روٹھی روٹھی سی معلوم ہوتی۔

سلمان چُپ چاپ ان دونوں کی اس حالت کو دیکھتا رہا۔ اُن کی بے چینی سے، اُن کی پریشانی سے اُس کو تسکین ملتی۔ اس تسکین میں ان ذہنی اذیتوں کے انتقام کا جذبہ شامل تھا، جو جعفری اور رخشندہ سے اُس کو پہنچا تھا اور جن کی تکلیف سے وہ دل ہی دل میں کُڑھتا رہتا تھا۔

لیکن اس کا جذبۂ انتقام جلد ہی آسودہ ہوگیا۔ اُس کو کچھ ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ ان دونوں کے درمیان ایک آہنی دیوار بن کر کھڑا ہوگیا ہے۔ وہ دونوں بے چین تھے، بے قرار تھے اور خود اپنی آگ میں جل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے ملنا چاہتے تھے، مگر مل نہ سکتے تھے۔ اس سارے ڈرامے میں اُس کا کردار بالکل وِلن کا سا تھا اور جب وہ اس بات پر غور کرتا تو وہ خود اپنی نظروں میں حقیر ہو جاتا۔ اُس کو ایک عجیب سی ذلت کا احساس ہوتا۔ جو خود بڑا اذیت ناک تھا۔

کچھ یہی سوچ کر اُس نے ایک روز رخشندہ سے کہا۔ "رخشی تم کو جعفری کی اس طرح بے عزتی نہیں کرنا چاہیے۔ تم اس سے بات چیت تو کرلیا کرو۔"

وہ بگڑ کر بولی "آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔ خود ہی تو اُن۔ سے ملنے جلنے پر منع کیا اور اب خود ہی سفارش بھی کر رہے ہیں۔"

وہ کھسیانا ہو کر کہنے لگا۔ "مگر میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم اتنا سخت رویہ اختیار کر لو۔ یہ تو اس بے چارے کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی" بڑی مشکل سے اُس نے رخشندہ کو سمجھا بجھا کر راضی کیا۔

اُس شام رخشندہ نے جعفری کے ساتھ چائے بھی پی۔ تھوڑی بہت بات چیت بھی کی۔ اور پھر تینوں مل کر پکچر دیکھنے گئے۔ وہ دونوں بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ رخشندہ نے اُس روز عرصے کے بعد بڑی نفاست سے میک اپ کیا تھا۔ بالوں کو ایک خاص انداز سے آراستہ کیا تھا۔ لباس میں بھی اُس کی خوش ذوقی صاف جھلک رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر بڑی دل کش نظر آ رہی تھی۔ اور اُس کی اس دل کشی کو دیکھ کر سلمان کو بھی مسرت ہوئی۔ بہرحال وہ اُس کی بیوی تھی۔ وہ اُس کو چھو سکتا تھا۔ اُس کو چوم سکتا تھا اور اُس کی گداز بانہوں پر سر رکھ کر سو سکتا تھا۔

اب پھر وہ دونوں شام کو سیر سپاٹے کے لئے نکل جاتے۔ سلمان گھر میں بیٹھا کڑھا کرتا اور رخشندہ رات گئے جعفری کے ساتھ مسکراتی ہوئی آتی۔ اور اُس کی یہ مسکراہٹ سلمان کے ذہن میں زہر بن کر سرایت کر جاتی۔ وہ اس درد سے، اس کرب سے بلبلا اٹھتا۔ آخر اس تکلیف سے بچنے کا اُس نے یہ طریقہ نکالا کہ اپنا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گذارتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ صبح دفتر کے لئے گھر سے نکلتا اور آدھی رات کے بعد واپس لوٹتا۔

ایک شام وہ اپنے دفتر کے ایک ساتھی کے ساتھ فلم دیکھنے چلا گیا۔ گیارہ بجے دونوں سینما ہاؤس سے نکلے تو پینے پلانے کا پروگرام بن گیا۔ اس وقت اُس کے ہمراہ عنایت تھا۔ اُس کو تنخواہ معقول ملتی تھی اور ابھی تک وہ کنوارا تھا۔ اس لئے بڑی بے فکری سے خرچ کرتا تھا۔ اُسی کی تحریک پر وہ شہر کے ایک مشہور ہوٹل میں شراب پینے گئے۔

ہال میں اس وقت بڑی چہل پہل تھی۔ زیادہ تر غیر ملکی نظر آ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی تھے۔ نوجوان بھی اور بوڑھے بھی۔ فضا بڑی رومینٹک تھی۔ یہ جاڑوں کی ایک سرد رات تھی۔

برف پوش کوہستانوں سے آنے والی خنک ہوائیں چل رہی تھیں۔ لوگ موٹے موٹے اونی لبادوں میں ملبوس تھے اور اُن کے چہرے سُرخ پڑ گئے تھے۔ وہ دونوں ایک ٹیبل پر جا کر بیٹھ گئے۔ سلمان اس وقت صرف برانڈی پینا چاہتا تھا۔ اس کے لئے ڈیڑھ برانڈی لے آیا۔ دونوں آہستہ آہستہ شراب پینے لگے۔ عنایت خاصا باتونی نوجوان تھا۔ وہ اپنا ایک تازہ معاشقہ سنانے لگا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ بڑا اونچا فلرٹ ہے سلمان اُس کی باتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ وہ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی مضحکہ خیز حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک ہال کے ایک گوشہ میں اُس کی نظر گئی تو وہ دم بخود رہ گیا۔

سامنے جعفری اور رخشندہ بیٹھے تھے اور اُن کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا تنومند آدمی بیٹھا تھا۔ وضع قطع سے وہ امریکن نظر آتا تھا۔ وہ بڑی چھچھوری حرکتیں کر رہا تھا اور منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنس رہا تھا۔ غالباً وہ بہت زیادہ پی چکا تھا اور اب بہکنے لگا تھا۔ سلمان نے دیکھا رخشندہ نے جام اٹھایا اور اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ہاں وہ شراب پی رہی تھی۔ سلمان کا سارا جسم لرز کر رہ گیا۔

وہ اپنی آنکھوں سے رخشندہ کو شراب پیتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ رُک رُک کر آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ وہ بار بار اپنا داہنا ہاتھ بلند کرتی۔ اور انگشتِ شہادت کو لہرا کر بڑی مصنوعی سی ہنسی ہنس رہی تھی۔ وہ اُس کی ایک ایک حرکت اور ہر ہر انداز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ عنایت نے ایک بار اُس کو ٹوکا بھی۔

"کہاں کھو گئے تم؟ یہ پگ تو ختم کرو"

اور سلمان نے چونک کر اپنا گلاس اٹھایا اور اس کو ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی سانس میں غٹاغٹ خالی کر گیا۔ یہ اس کا تیسرا پگ تھا۔ ایک بڑا ڈبل پگ، اُس نے اور منگوایا اور بظاہر عنایت کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا۔ مگر اُس کی پوری توجہ جنوبی دیوار کے قریب پڑی ہوئی اُس ٹیبل کی جانب تھی۔ جہاں وہ تینوں بیٹھے تھے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ تینوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ رخشندہ کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ تنومند

امریکن نے اپنا بازو آگے کردیا اور رخشندہ اُس کے بازو میں جھولتی ہوئی آگے بڑھ گئی ۔ وہ دونوں آگے آگے چل رہے تھے اور جعفری ان سے دو قدم پیچھے ہٹ کر چل رہا تھا ۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں کئی پیکیٹ اٹھائے ہوئے تھا ۔ وہ اپنی جھکی ہوئی گردن اور چال ڈھال سے اس وقت کسی بڑے آدمی کا مصاحب معلوم ہو رہا تھا ۔ سلمان پوری توجہ کے ساتھ ان تینوں کو دیکھ رہا تھا ۔ عین اس وقت عنایت کی آواز اُبھری ۔

"ادہو ہو! تو تم جعفری کو دیکھ رہے تھے ۔ یار وہ آج کل اپنے پروموشن کے چکر میں لگا ہوا ہے"

سلمان نے حیرت سے عنایت کو دیکھا ، مگر وہ کچھ نہ کہہ سکا ۔

عنایت جھوم کر بولا "یار بڑی زوردار لونڈیا ڈائرکٹر کو پیش کی ہے ۔ دیکھو تو سالا کیسا چمٹائے ہوئے چل رہا ہے ۔ رات تو آج اس سالے کی گذرے گی ۔ ہائے ہائے کیا غضب کا دانا ہے" اور اس کے بعد اُس نے رخشندہ کے گداز جسم کے بارے میں ایک ایسی گندی سی بات کہی کہ سلمان کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے عنایت نے اُس کے منہ پر تھوک دیا ہے ۔ گھبرا کر پوچھنے لگا ۔

"کیا یہی کمپنی کا وہ ڈائرکٹر ہے ، جو پچھلے ہفتہ نیویارک سے آیا ہے"

وہ بولا "مسٹر براءت کو کیا تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ۔ پچھلے سال بھی انہی دنوں دورے پر آیا تھا ۔ مگر اُس وقت تک تو تم کمپنی میں ملازم نہیں ہوئے تھے ۔ سالا اس عمر میں بھی بڑا شوقین مزاج ہے ۔ جعفری کا پروموشن تو پکا ہو گیا"

سلمان کو یقین نہ آیا ۔ کہنے لگا "اماں نہیں ، ایسا کیسے ہو سکتا ہے"

وہ بولا "شرط بدلو ۔ اسی ہفتہ تم سن لینا کہ جعفری کو پروموشن مل گیا ۔ اتنی بڑی رشوت پر تو جاگیر مل سکتی ہے تم پروموشن کی بات کر رہے ہو ۔ اُستاد بڑے آدمی بننا چاہتے ہو تو یہ ٹکنک سیکھ لو ۔ سب سے آسان نسخہ ہے" عنایت نے ایک زوردار قہقہہ لگایا "ریاست بھوپال کے لئے مشہور ہے کہ وہاں کی دوشیزائیں ایک زمانہ میں بڑے سچے خواب دیکھا کرتی تھیں ۔ اگر کوئی نوجوان لڑکی صبح ہی صبح اپنے بھائی سے یہ کہہ دیتی تھی کہ رات اُس نے خواب میں دیکھا ہے کہ وہ فوج میں کپتان بن گیا ہے تو وہ اُسی روز کپتان بن جاتا تھا ۔

سرکاری ہرکارہ خود آ کر دے کر گھر آتا تھا۔ کیا سمجھے ؟" وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "دلیسی رجواڑوں کے والیانِ ریاست کی بھی کیا بات تھی۔ سب ہی سالے شاہ فاروق بنے پھرتے تھے"

وہ نشہ کی دُھن میں بولتا جارہا تھا۔ اور سلمان کو اُس کی باتوں سے اُلجھن ہو رہی تھی —

وہ تھوڑی ہی دیر بعد جانے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ عنایت ابھی کچھ دیر اور ٹھہرنا چاہتا تھا۔ مگر سلمان نے جب زیادہ اصرار کیا تو وہ بھی چلنے کے لئے آمادہ ہوگیا۔ واپس لوٹتے ہوئے سلمان نے دیکھا کہ جعفری اکیلا بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ سلمان کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ تو گویا عنایت سچ کہہ رہا تھا۔ جعفری، رخشندہ کو برائے کے سپرد کر کے چلا آیا۔ اُس کو یقین نہ آیا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا رخشندہ گھر پہ ہوگی۔

مگر جب وہ واپس اپنے فلیٹ پر پہنچا تو رخشندہ وہاں نہیں تھی۔ وہ رات گئے تک جاگتا رہا۔ پھر تھک کر سو گیا۔ سویرے جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو رخشندہ بستر پہ بے خبر سو رہی تھی۔ نہ جانے وہ رات کو کس وقت واپس لوٹی تھی۔ خادمہ نے دروازہ کھولا تھا اور اسی کی زبانی سلمان کو معلوم ہوا کہ رخشندہ جس وقت آئی تھی، اس وقت پڑوس کی مسجد میں فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

سلمان نے ایک بار پھر اپنا شکاری چاقو نکالا اُس کو کھولا۔ چاقو کی کمانی زور سے کڑکڑاتی ہوئی چیخی۔ اب تنہائی میں اکثر وہ چاقو کھولتا۔ اُس کی کمانی چیختی اور سلمان اُس کی دھار پر انگوٹھا پھیر کر تیزی اور جلا کا اندازہ لگاتا۔ اوّل شب جب رخشندہ جعفری کے ساتھ گھر سے باہر چلی جاتی تو سلمان کمرہ بند کرتا۔ چاقو کھولتا اور ڈمی کو نکال کر پلنگ کی پٹی پر رکھ دیتا۔ یہ ڈمی اُس نے کرتے کے ایک بڑے سے تھیلے میں روئی بھر کر تیار کی تھی۔

وہ ہونٹوں کو زور سے بھینچ کر ڈمی پر چاقو سے وار پر وار کرتا چلا جاتا۔ پھر تھک کر بیٹھ جاتا اور دیر تک ہانپتا رہتا۔ کبھی یہ ڈمی جعفری کا روپ اختیار کر لیتی کبھی رخشندہ بن جاتی۔ سردی کی ٹھٹھرتی ہوئی سنسان راتوں میں اُس نے اپنے ذہن میں نہ جانے کتنی بار جعفری اور رخشندہ کو قتل کیا تھا۔

اُن کے خون میں ڈوبے ہوئے جسموں کو پھڑکتے ہوئے دیکھا تھا اور خوف سے اپنے بدن میں جھرجھری محسوس کی تھی۔

وہ ان دونوں کو ہلاک کرنے کا ہر رات ایک نیا منصوبہ تیار کرتا اور دوسرے دن اس منصوبے میں اُس کو کوئی نہ کوئی خامی نظر آتی۔ ابھی اس کا منصوبہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ایک شام جعفری حسب معمول مسکراتا ہوا کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اُس وقت رخشندہ اور سلمان بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جعفری اس وقت بڑا مسرور نظر آرہا تھا۔ ان دونوں کے قریب پہنچ کر وہ سینہ تان کر کھڑا ہوگیا اور بڑے کھلنڈرے انداز میں بولا۔

"آپ لوگ چاہیں تو مجھ سے بڑی شاندار پارٹی لے سکتے ہیں۔"

رخشندہ نے بے تکلفی سے کہا "آج تو آپ بڑے جوویل موڈ میں نظر آرہے ہیں۔ بات کیا ہے؟"

"پہلے تم مجھے ایک گرما گرم مبارک باد دو۔"

رخشندہ کہنے لگی "کوئی بہت اونچی بات معلوم ہوتی ہے۔ جو آپ پیشگی مبارک باد کا مطالبہ کر رہے ہیں؟"

وہ گردن کو خم دے کر ایکٹروں کی طرح لمحہ بھر تک اُس کو تکتا رہا اور پھر اُس نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر اور کسی قدر گردن جھکا کر کہا۔ "آپ کا یہ خاکسار کمپنی کا برانچ منیجر مقرر ہوگیا ہے۔ دو ہزار تنخواہ ملے گی اور اُس کے ساتھ اور بھی بہت سے ٹھاٹھ ہوں گے۔ کیوں ہے نا بڑی بات؟"

سلمان کا جی چاہا کہ وہ جعفری کے منہ پر تھوک دے۔ سالا بھڑوا کس ڈھٹائی سے اپنا کارنامہ بیان کر رہا ہے۔ کم از کم رخشندہ کے سامنے تو اُسے اپنی اس ترقی کا اس طرح اعلان نہیں کرنا چاہیے اس لئے کہ اس عہدے کی بلندی پر پہنچنے کے واسطے زینہ تو وہی بنی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے سلمان کو ایک بارگی اپنا خیال آگیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ جعفری سے بڑا بھڑوا ہے۔ جس کی بیوی رات رات بھر دوسروں کے پہلو گرم کرتی پھرتی ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور پھر بھی کچھ نہیں کہہ سکتا

کتنی ذلت کی بات ہے۔ اُسے ڈوب مرنا چاہیے۔ نفرت، حقارت، غم اور غصے کے ملے جلے احساسات نے اچانک اُس پر حملہ کردیا اور وہ بوکھلا کر رہ گیا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد بھی وہ اسی طرح خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر انتہائی جھنجھلاہٹ کے عالم میں اُس نے سوچا کہ وہ دونوں کو جس قدر جلد ہو سکے ٹھکانے لگا دے! اپنی تذلیل کا وہ اسی طرح بدلہ لے سکتا تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد ایک دوسرے خیال نے اُس کے ذہن میں سر اُبھارا جو بالکل مختلف تھا۔ اُس نے سوچا وہ ان دونوں کے لئے کیوں اپنی جان سے ہاتھ دھونا چاہتا ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوتی جیسے کوئی سور کا شکار کرتے ہوئے مارا جائے۔

اسی وقت اُس نے ایک نیا منصوبہ بنایا۔ اور اُس کا آغاز دوسرے دن دفتر میں ہوا۔ جب اُس نے جعفری کے سامنے اپنا استعفےٰ جاکر ڈال دیا۔ جعفری ہکا بکا ہو کر اُس کا منہ تکنے لگا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"تم ملازمت چھوڑ رہے ہو۔ تم کو ہو کیا گیا؟"

سلمان بڑی سنجیدگی سے بولا "ابھی میں ایک استعفےٰ اور دینا چاہتا ہوں اور اس کے لئے میں آپ کی امداد چاہتا ہوں" لمحہ بھر کے لئے وہ خاموش رہا اور پھر اُس نے بلا جھجک کہدیا۔ "میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں"

"میں اس سلسلہ میں تمھاری کیا مدد کر سکتا ہوں"

"میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے مہر وغیرہ نہ طلب کرے"

"تم نے اس کے بارے میں رخشندہ سے گفتگو کی؟ میرے خیال میں تمھیں پہلے اُس سے بات کرنا چاہیے"

"میں چاہتا ہوں کہ میری جانب سے یہ تمام باتیں آپ کرلیں"؟

جعفری ذرا دیر تک خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے سلمان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ کہنے لگا۔ "میرا مشورہ ہے کہ تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ رخشندہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اُس کو

[stamp]

چھوڑتے ہوئے تمھیں دکھ نہیں ہوگا!"

سلمان نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ہرگز نہیں لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد اُس نے پوچھا۔ تو پھر آج آپ رخشندہ سے اس سلسلہ میں بات کریں گے؟

جعفری کو اس معاملہ میں سلمان سے قطعی ہمدردی نہیں تھی۔ مگر وہ خواہ مخواہ ہمدرد بننے کی کوشش کرنے لگا۔ "میں رخشندہ سے بات تو کرلوں گا مگر میرا خیال ہے کہ تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے"

سلمان نے جل کر کہا "جعفری صاحب آپ کیوں مجھے خواہ مخواہ مشورہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دو ہزار روپیہ تنخواہ پانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کی سمجھ بھی مجھ سے پانچ گنا زیادہ قیمتی ہے"

جعفری ناراض ہونے کے بجائے نرم پڑ گیا۔ اُس نے سوچا اس وقت سلمان کا پارہ چڑھا ہوا ہے۔ اُس نے کچھ بھی کہا تو برس پڑے گا۔ آہستہ سے بولا "اچھی بات ہے میں رخشندہ سے آج ہی بات کرلوں گا۔"

سلمان نے مزید گفتگو نہ کی اور خاموشی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ اس کے بعد اُس نے دفتر میں بھی بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور شام تک آوارہ گردی کرتا رہا۔ جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا تو جعفری وہاں موجود تھا۔ رخشندہ بھی اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ سلمان نے کسی سے کوئی بات نہیں کی اور چپ چاپ ایک صوفہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ رخشندہ کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ کسی قدر پریشان نظر آ رہی تھی۔

کمرے کے اندر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تینوں چپ چاپ بیٹھے تھے اور تینوں اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے۔ اوائل دسمبر کی یہ سرد شام بڑی اداس معلوم ہو رہی تھی۔ کمرے کے سکوت کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہاں کوئی مر گیا ہے اور وہ تینوں لاش کے سرہانے بیٹھے ہوئے سوگ منا رہے ہیں۔ بہت دیر بعد جعفری کی آواز ابھری۔

"میں نے ابھی ابھی تمھارے آنے سے ذرا دیر پہلے رخشندہ سے بات کی تھی۔ اس بات

سے اُس کو بڑا دکھ پہنچا ہے۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ تم بہت غلط قدم اٹھا رہے ہو۔"

جعفری کی بات سن کر رخشندہ کی گردن جھک گئی۔ اُس کے چہرے پر دکھ کا سایہ منڈلانے لگا۔ لیکن سلمان نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا اپنا شکاری چاقو نکالا اور فوراً واپس آ گیا۔ اور ان دونوں کے درمیان ٹانگیں پھیلا کر اس طرح سینہ تان کر کھڑا ہو گیا کہ وہ دونوں اُس کے سامنے بہت حقیر معلوم ہونے لگے۔

سلمان نے گھور کر جعفری کو دیکھا اور اُس سے کہنے لگا "ہاں تو مسٹر جعفری تم کیا کہہ رہے تھے" اُس نے چاقو کو ایک بارگی تیزی سے کھول ڈالا۔ اُس کی کمانی کڑکڑاتی ہوئی زور سے تنی۔ جعفری اور رخشندہ کی خوف سے آنکھیں پھٹ گئیں۔ دونوں سہمی سہمی نظروں سے سلمان کو دیکھنے لگے۔ سلمان نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا۔

"میرے فیصلے سے اس عورت کو دکھ ہوا ہے۔ یہ عورت جو اتفاق سے میری بیوی ہے اور جس کو بیوی کہتے ہوئے مجھے شرم معلوم ہوتی ہے۔" لمحہ بھر کے لیے وہ رکا اور بڑی تیزی کے ساتھ بولنے لگا۔ "میرا پہلا فیصلہ یہ تھا کہ میں تم دونوں کے پیٹ میں یہ چاقو پیوست کر دوں۔ مجھے صرف اسی طرح تسکین مل سکتی تھی۔ تم دونوں نے مل کر میرے سکون کو، میری خوشیوں کو لوٹا ہے۔ دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دی۔ تم نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میں اب قلاش آدمی ہوں۔ ایک ہارا ہوا جواری۔ تم دونوں نے مجھ کو پاگل بنا دیا۔ مجھ کو کتوں سے زیادہ ذلیل کر دیا۔"

سلمان کی آواز بھرا گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ جعفری اور رخشندہ خوف سے سہمے ہوئے دم بخود بیٹھے تھے۔ اُن کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہروں پر وحشت برس رہی تھی۔ سلمان نے ذرا دیر رک کر کہا "تو دوست۔ میں تم کو قتل نہیں کروں گا۔ میری زندگی اتنی ناکارہ نہیں ہے کہ تم دونوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر پھانسی کے تختے پر لٹک جاؤں۔ میرے لیے یہ گھٹ گھٹ کر مرنے سے زیادہ ذلیل موت ہوگی۔" ذرا دیر کے لیے وہ رکا اور پھر کہنے لگا "جعفری تم رنڈی کے بھڑوے ہو میں بھی بھڑوا ہوں اور یہ سامنے وہ رنڈی بیٹھی ہے۔" اُس نے رخشندہ کی جانب انگلی اٹھا کر اشارہ کیا

"مگر اب میں اس رنڈی کا کھڑا اپنا نہیں چاہتا۔ تم اپنی اس امانت کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ورنہ میں سچ کہتا ہوں کہ مجھکو وہ ذلیل موت اختیار کرنا پڑے گی۔ جو میں کسی قیمت پر گوارا نہیں کر سکتا۔ بولو کیا کہتے ہو۔ میرے سر پر اس وقت خون کھیل رہا ہے۔ میں ساری باتیں ابھی اور اسی وقت طے کرنا چاہتا ہوں۔"

جعفری نے مری ہوئی آواز سے کہا "مجھے تمھاری بات منظور ہے۔ میں رخشندہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

اس کے بعد کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ سلمان نے خود اپنے ہاتھوں سے رخشندہ کا سارا سامان اٹھا اٹھا کر جعفری کی کار میں بھرا۔ اور جب وہ دونوں چلے گئے تو نڈھال ہو کر دھم سے صوفے پر گر پڑا اور دیر تک لمبی لمبی سانسیں بھرتا رہا۔

دوسرے روز عدالت میں حاضر ہو کر مجسٹریٹ کے روبرو دونوں نے طلاق نامہ پر دستخط کر دیئے۔ رخشندہ نے مہر معاف کر دیا تھا۔ جعفری گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوا تھا۔ دوسرا گواہ اُن کا وکیل تھا۔ جس نے طلاق نامہ کی دستاویز تیار کی تھی۔

عدالت سے نکلتے وقت رخشندہ رو رہی تھی اور جعفری اُس کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلمان نے دونوں کو دیکھا اور تیزی کے ساتھ اُن کے قریب سے گذر گیا۔

سلمان شام تک کمرے میں مردے کی طرح خاموش پڑا رہا۔ اُس روز نہ اُس نے کھانا کھایا تھا اور نہ سہ پہر کی چائے پی تھی۔ جو کچھ اُس نے کیا تھا اس بات کا اس کو دکھ تھا۔ رخشندہ کے ساتھ اُس نے اس گھر میں ایک طویل عرصہ گذارا تھا۔ ہر چیز سے اُس کی یاد وابستہ تھی۔ در و دیوار سے اُس کی آواز اُبھر رہی تھی۔ ہر طرف اُس کا سایہ منڈلا رہا تھا۔

بہت دنوں کی بات ہے جب ایک رات رخشندہ دلہن بن کر آئی تھی وہ حجلۂ عروسی میں نشہ ہی کی طرح جھومتا ہوا داخل ہوا تھا۔ سامنے پھولوں سے ڈھکی ہوئی مسہری پر وہ سرخ لباس میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ اُس کا جسم تیز خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اُس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

پھر کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے رخشندہ کا مہندی سے رچا ہوا گورا گورا نازک ہاتھ تھام کر کہا تھا "ہاتھ تو بہت خوبصورت ہے" وہ سمٹ کر دوہری ہو گئی تھی۔ اُس نے مسکرا کر کہا تھا۔

"میری شہزادی"

وہ شرم سے سمٹی سمٹائی بیٹھی رہی۔ اُس نے بڑے پیار سے اصرار کیا تھا "بولو میری شہزادی"

"جی" بڑا مختصر سا جواب ملا تھا اور اُس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر دلہن کا گھونگھٹ کھول دیا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اور سلمان نے اُس کا کنول کی طرح دل آویز چہرہ دیکھ کر دل میں کہا تھا۔ یہ تو بڑی خوبصورت لڑکی ہے اور پھر اس خوبصورت لڑکی کے ساتھ مل جُل کر اُس نے ایک خوبصورت سی زندگی کا خواب دیکھا تھا۔ اپنی ایک پرسکون سی دنیا بسانے کا تہیہ کیا تھا لو آج وہ خوبصورت خواب بکھر گئے تھے اور پرسکون دنیا "جہنم" بن کر اجڑ گئی تھی۔ سلمان کو ایک ایک بات یاد آرہی تھی اور اُن کو یاد کرتے کرتے وہ تکیہ میں منہ چھپا کر رونے لگا۔

جب رونے سے دل ذرا ہلکا ہو گیا تو اُس نے سوچا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیے۔ اچانک اُس کو علی احمد یاد آگیا۔ پھر فلک پیما اور اُس کے اسکائی لارک۔ اب علی احمد ہی اُس کو سہارا دے سکتا تھا اور فلک پیما کے ساتھ ہی اُس کی مجہول زندگی میں حرارت پیدا ہو سکتی تھی۔

اُس نے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے تبدیل کئے اور گھر سے باہر چلا گیا۔ ہوٹل میں جا کر کھانا کھایا رات کے شو میں فلم دیکھی اور واپس آکر اطمینان سے سو گیا۔

چند ہی روز میں اُس نے گھر کا سارا سامان فروخت کر دیا۔ دفتر سے تنخواہ لی۔ فلیٹ اُس نے ساڑھے چار ہزار روپے لے کر پگڑی پہ دیدیا۔

اور دسمبر کی ایک سرد رات کو ایک ٹرنک اور بستر لے کر سفر کے ارادے سے اسٹیشن پہنچ گیا۔

●

۶

سلمان جس وقت فلک پیما کے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوا دوپہر کا وقت تھا۔ گنجی کی بے ترتیب آبادی کے چھوٹے چھوٹے بوسیدہ مکانوں کے بیچوں بیچ ہیڈ کوارٹر کی سفید دیواروں والی عمارت مینارہ روشنی کی طرح سر اونچا کئے کھڑی تھی۔ جاڑوں کی ہلکی ہلکی سنہتی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ گلیوں میں ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے اور عورتیں دروازوں کی دہلیز پر بیٹھی اونچی اونچی آوازوں سے بول رہی تھیں۔

سلمان خاموشی کے ساتھ اندر چلا گیا۔ ہیڈ کوارٹر میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی اسکائی لاوک نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ادھر اُدھر جھانکتا ہوا لائبریری کی طرف مڑ گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ لائبریری کی لمبی میز پر ایک عورت جھکی ہوئی بڑے انہاک کے ساتھ اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس کی پیٹھ سلمان کی جانب تھی اور اس کا لباس بہت صاف ستھرا تھا۔

عورت نے دروازے پر قدموں کی چاپ سن کر گردن موڑی اور اس طرف ایک نظر ڈالی۔ سلمان ششدر رہ گیا۔ وہ سلطانہ تھی۔ لمحہ بھر تک وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کو تکتا رہا۔ پھر اس نے بڑے تعجب سے کہا۔

سلطانہ تم؟

جی۔

سلطانہ اُس کو وہاں دیکھ کر خود بھی حیرت زدہ ہو گئی تھی۔ اُس نے سوچا سلمان یہاں کیسے آگیا اور یہی بات وہ سلطانہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہنے لگا "تم یہاں کس طرح آگئیں؟" وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

سلطانہ نے آہستہ سے جواب دیا "میں یہاں بہت عرصہ سے ہوں۔"

"یعنی تم ہیڈ کوارٹر ہی میں رہتی ہو؟"

"جی ہاں"

سلمان کو سخت تعجب ہوا۔ پوچھنے لگا "تو کیا تم بھی اسکاؤٹ لڑکوں میں شامل ہو گئی ہو؟"

"جی ہاں۔ پچھلے ہی مہینے مجھے فلک بیما کی رکنیت ملی ہے"

وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ سلمان نے دیکھا۔ سلطانہ کے چہرے پر ابھی تک ویسی ہی معصومیت تھی اور وہ ہمیشہ کی طرح نظریں نیچی کئے شرما شرما کے بول رہی تھی۔ وہی سادگی وہی آنکھوں پر جھکی ہوئی گھنی پلکوں کے سائے۔ وہی گردن کا ہلکا سا خم۔ سلطانہ ذرا بھی تو نہیں بدلی تھی۔ وہ ابھی تک ویسی ہی خوبصورت اور دل آویز تھی۔

وہ زندگی کا ایک طویل سفر کر کے واپس لوٹا تھا۔ راستہ ناہموار تھا اس لئے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی تھیں۔ اذیت ترین دُکھ جھیلے تھے۔ وہ بہت تھک چکا تھا اُسے بہت خوشی ہوئی کہ سلطانہ اُس کو اس طرح اچانک مل گئی۔ وہ بھی اس قدر قریب۔ کیا وہ دونوں ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کے دوش بدوش چل سکیں گے۔ اب تو سلطانہ اُس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ دونوں کی ایک ہی راہ تھی، ایک ہی مقصد، ایک ہی منزل۔ یہ سوچتے سوچتے اُس کو اچانک نیاز یاد آگیا اور اُس کا خیال آتے ہی سلمان کو ایسا محسوس ہوا جیسے ابھی کوئی اُس کا راستہ روکے کھڑا ہے! اُس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سلطانہ سے پوچھا۔

"نیاز کہاں ہے؟"

سلطانہ نے اُس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا "کئی ماہ ہوئے اُن کا انتقال ہو گیا۔"

سلمان نے اطمینان کی سانس لی۔ اسی وقت علی احمد لائبریری کے اندر داخل ہوا۔ اُس کی گود میں سُرخ سُرخ گالوں والا ایک تندرست بچّہ تھا۔ یہ ایاز تھا۔ علی احمد نے حیرت سے سلمان کو دیکھا اور خوشی سے چیخ پڑا۔

"سلمان تم آگئے"؟

دونوں بانہیں پھیلا کر بڑے جوش وخروش کے ساتھ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے علی احمد اُس کی پیٹھ تھپتھپا کر بولا "مجھے یقین تھا کہ سلمان ایک دن تم ضرور لوٹ کر آؤ گے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم واپس آگئے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں بہت خوش ہوں"۔

سلمان معذرت کرنے لگا "میں ایسی پریشانیوں میں گھرا رہا کہ آپ کو خط بھی نہ لکھ سکا۔ فرصت سے بتاؤں گا کہ مجھ پر اس عرصہ میں کیا کیا بیت گئی؟"

علی احمد نے زور سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا اور مسکرا کر کہنے لگا "تم اُس زندگی کی چمک دمک پر ریجھ گئے ہوگے، جو دور سے بہت خوبصورت نظر آتی ہے۔ بڑی دل کش۔ مگر یہ سونے کا پہاڑ صرف دیکھنے کے لئے ہے، جتنا اُس کے قریب جانے کی کوشش کرو، اُتنا ہی دور ہٹتا جاتا ہے۔ یہ عجیب گورکھ دھندا ہے۔ ایک تار سلجھاؤ دس تار اُلجھتے ہیں۔ ساری زندگی تانا بانا ہی سلجھاتے گذار دو، سرا کبھی ہاتھ میں نہ آئے گا" علی احمد پر فلسفیانہ موڈ طاری تھا، وہ ابھی نہ جانے کتنی دیر تک مسائلِ حیات پر گفتگو کرتا۔ اسی اثنا میں ننھا ایاز، علی احمد کے کرتے کا دامن پکڑ کر زور زور سے رونے لگا۔

علی احمد نے بچّے کو گود میں اُٹھا لیا۔ اُس کے سُرخ سرخ گالوں کا بوسہ لیا اور سلمان سے بولا "سلمان یہ فلک پیما کا سب سے چھوٹا اسکاتی لارک ہے ایاز"۔

سلمان نے بچّے کے گول مٹول سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "یہ کس کا بچّہ ہے؟"

علی احمد نے مسکرا کر کہا "فی الحال تو یہ میرا ہی بچّہ ہے"۔ مگر بچّہ کو شاید اُس کی یہ بات ناگوار گذری وہ ایک بارگی منہ پھاڑ کر رونے لگا۔ پیچھے سے سلطانہ کی آواز آئی۔

"لائیے اس کو مجھے دیجئے"۔

علی احمد نے گھوم کر سلطانہ کی جانب دیکھا اور اُس سے کہنے لگا "سلطانہ تم ان سے نہیں ملیں۔ یہ فلک پیما کے بہت سینیئر اسکائی لارک ہیں۔ سلمان" سلطانہ نے نظریں اٹھائیں۔ سلمان نے دیکھا۔ وہی جھلکتی ہوئی شفاف آنکھیں، وہی سینے میں اُتر جانے والی نظریں، وہی گھبرایا گھبرایا سا معصوم چہرہ۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ سلطانہ میں مرکر بھی تم کو نہیں بھول سکتا۔ یہ آنکھیں، یہ عارض، یہ لب۔ سلمان لمحہ بھر کے لئے بالکل یہ بھول گیا کہ سلطانہ اور اُس کے علاوہ وہاں اور کوئی بھی موجود ہے۔

یہ علی احمد تھا۔ اُس نے سلمان سے کہا "سلمان یہ سلطانہ ہے، میری بیوی"

اڑاڑا دھم، در و دیوار تک لرز کر رہ گئے۔ سلمان لڑکھڑا کر رہ گیا، پل بھر کے لئے اُس کے دل کی حرکت رُک گئی۔ اُس نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے علی احمد کو دیکھا۔ اُس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ علی احمد کسی قدر شرما کر بولا "ہاں بھئی میں نے پچھلے ماہ شادی کرلی" یہ کہتے کہتے اُس کی نظریں جُھک گئیں۔ اُس کی کشادہ پیشانی جھلک رہی تھی اور چہرے پر ہلکی سی سرخی لہرانے لگی تھی۔ ہمیشہ سنجیدہ رہنے والا علی احمد کھلنڈرے نوجوانوں کی طرح معصوم لگ رہا تھا۔

سلمان پر لمحہ بھر تک سکتہ کا سا عالم طاری رہا۔ پھر اُس نے چونک کر کہا "مبارک ہو" اس سے زیادہ وہ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ یہ کہتے ہوئے اُس کی آواز لرز رہی تھی۔

علی احمد کہنے لگا "تم سفر سے تھکے ہارے آرہے ہو۔ جاؤ کسی کمرے میں جاکر آرام کرو۔ رات کو تم سے اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ اس وقت مجھے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں کورٹ جانا ہے"۔

سلمان نے پوچھا "کیا اُس رات کے ہنگامے والا مقدمہ ابھی تک چل رہا ہے؟"

"نہیں، وہ تو کب کا ختم ہوگیا۔ اُس مقدمہ میں جان ہی کب تھی۔ وہ تو زبردستی الکشن جیتنے کے لئے اسکائی لارکوں کے خلاف تیار کیا گیا تھا۔ یہ ایک دوسرا مقدمہ ہے" اس کے بعد علی احمد نے سلطانہ کو مخاطب کرکے کہا "تم بھی کورٹ چلوگی؟"

"جی ہاں۔ میں تو بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

علی احمد معذرت کرنے لگا۔ "بھئی معاف کرنا سلطانہ مجھے دیر ہو گئی۔"

سلطانہ کہنے لگی۔ "آپ تھکے ہوئے آئے ہیں۔ ذرا دیر آرام تو کر لیجئے۔ کہئے تو چائے بنا دوں آپ کے لئے۔" لمحہ بھر رک کر اُس نے کہا۔ "مگر آپ زیادہ چائے پینا بند کر دیں۔ آپ بہت چائے پینے لگے ہیں۔"

علی احمد مسکرا کر بولا "اچھا بھئی اب چائے کم پیا کروں گا۔"

وہ دونوں بڑے گھریلو انداز سے گفتگو کر رہے تھے۔ اُن کے لب و لہجہ میں ایک دوسرے کے لئے خلوص تھا، پیار تھا۔ اور سلمان سے یہ سب کچھ نہ دیکھا گیا۔ اُن کی ایک ایک بات اُس کو ناگن کی طرح ڈس رہی تھی۔ اُس کے لئے وہاں ٹھہرنا عذاب ہو گیا۔ علی احمد سے کہنے لگا۔

"اچھا تو میں آپ سے شام کو ملوں گا۔"

علی احمد نے کہا۔ "تم اسکاؤٹ لارک افضل کے کمرے میں جا کر ٹھہر جاؤ۔ اُن کا کمرہ سب سے آخر میں ہے۔"

سلمان نے خاموشی کے ساتھ اپنا بستر اور ٹرنک اٹھایا اور لائبریری سے باہر جانے لگا۔ علی احمد نے فوراً کہا۔ "سلمان میں تمہاری کچھ مدد کروں۔"

سلمان کہنے لگا۔ "جی نہیں شکریہ۔ ان دونوں چیزوں کا وزن زیادہ نہیں ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔ افضل کے کمرے میں جا کر اُس نے اپنا بستر بچھایا اور ایک سگرٹ سلگا کر بستر پر تھکا ہوا سا لیٹ گیا۔ اُس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ اور ذہن پر برف کی تہیں سی جمتی جا رہی تھیں۔ وہ بار بار سوچتا۔ یہ کیا ہو گیا؟ اس لڑکی (سلطانہ) کے باعث ایک بار اُس نے ٹلک پیا کو چھوڑا تھا اور گھر جا کر گورکھ دھندوں میں پھنس گیا تھا۔ کیا پھر اس کے لئے وہ ٹلک پیا کو چھوڑ دے۔ یہاں رہ کر وہ اُس کو علی احمد سے اس طرح باتیں کرتے ہوئے پیار کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ اُس کے لئے مستقل آزار بن جائے گا۔

انتہائی بے بسی کے عالم میں اُس نے سوچا۔ خدایا وہ اب کیا کرے، زندگی ہے کہ اُس سے روٹھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ حالات ہیں کہ بگڑتے ہی جا رہے ہیں جینے کا ہر سہارا، ہر اُمید اُس کو ٹھکرا کر آگے نکل

جاتی ہے۔ وہ یہاں آیا تھا کہ زندگی کے اس دکھ بھرے دور میں علی احمد اُس کی رہنمائی کرے گا۔ اُس کو سہارا دے گا مگر علی احمد نے ملتے ہی اس کے سینے میں خنجر اُتار دیا۔ کیا وہ یہاں سے چلا جائے۔ ابھی اس کے پاس پانچ ہزار روپیہ موجود تھا۔ جس سے سال بھر تک وہ گذارا کر سکتا تھا۔ اور اتنی طویل مدت میں کوئی نہ کوئی ملازمت تلاش کر لینا ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ پھر وہی ملازمت، وہی گھر اور اس گھر کو آباد کرنے کے لئے ایک بیوی کی ضرورت۔ پھر وہی پرانا چکر اور وہی دن رات۔ اور ان دن راتوں کو خوش گوار بنانے کے لئے وہی باسی ہنگامے، ان ہنگاموں سے اُسے نفرت تھی۔ شدید نفرت، ایک بارگی اُس نے ذہنی قلابازی کھائی۔ نہیں، نہیں، نہیں۔ وہ زندہ رہے گا اور ایک اسکائی لارک کی طرح زندہ رہے گا۔ اس زندگی میں، اس جدوجہد میں حرکت تھی، مسرت تھی اور یہ مسرت بڑی منظم اور پاک صاف تھی۔ پہلے پورے معاشرے کو خوبصورت بناؤ۔ اُس کے چہرے سے غلاظت اور گندگی صاف کرو پھر خوبصورت چیزوں کی خواہش کرو۔ زندگی حسین عورت کا ایک تبسم، شراب کا ایک جام نہیں ہے۔ زندگی عمل اور حرکت کا نام ہے۔ انقلاب اور تغیر کا نام ہے۔ اس تغیر سے تم منہ نہیں موڑ سکتے۔ تمہارے ذہن میں وہ کانٹا چبھ گیا ہے، جو تمہارے ضمیر کو کبھی خودکشی کرنے نہ دیگا۔ سلمان نے فلک پیما چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

سہ پہر تک وہ کمرے میں بڑا گہری نیند سوتا رہا۔ شام کو وہ لائبریری میں گیا تو تمام اسکائی لارک وہاں موجود تھے۔ سب نے اُس کا پُر جوش خیر مقدم کیا۔ وہ ایک ایک سے گلے ملا۔ خوب زندہ زندہ کے قہقہے لگائے۔ اُس کی آمد کی خوشی میں اسکائی لارکوں نے ایک چھوٹی سی پارٹی دی۔ اس میں چائے تھی، پھل تھے اور گرم گرم سموسے تھے جو سلطانہ نے تیار کئے تھے۔ چائے کی میز پر اُس نے خوب باتیں کیں کھلنڈرے نوجوانوں کی طرح لطیفے سنا سنا کر سب کو خوب ہنسایا۔

بہت عرصہ بعد اس کی ایک دلچسپ شام گذری تھی۔

رات کو فلک پیما کا اجلاس ہوا۔ جس میں اتفاق رائے سے سلمان کو اسکائی لارک بنانے کی تجویز کو قبول کر لیا گیا مگر اس کے ساتھ ہی اس کو سخت تنبیہ کی گئی کہ آئندہ وہ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہ کرے۔ اس اجلاس میں ایجنڈے کی دوسری شق 'امداد باہمی بنک' کو از سر نو جاری کرنے کی تجویز تھی۔

اس کے لئے سرمائے کی ضرورت تھی۔ وہ ابھی تک مہیا نہ ہوسکا تھا۔ فلک پیما کا کام اپنے ہمدردوں کے چندے سے اور انڈسٹریل ہوم کی آمدنی سے چل رہا تھا۔ مگر اس سے صرف اخراجات پورے ہوتے تھے۔ کوئی سرمایہ اکٹھا نہ ہوسکا۔ مسئلہ یہ درپیش تھا کہ بنک کے لئے روپیہ کس طرح اکٹھا کیا جائے۔

سلمان نے جب یہ بات سُنی تو وہ صدر سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں گیا۔ ٹرنک کھولا، پانچ ہزار روپے نکالے اور اجلاس میں آکر خاموشی کے ساتھ صدر کے سامنے نوٹوں کی گڈی رکھ دی اور کھڑے ہو کر کہنے لگا۔

"امداد باہمی بنک کے لئے یہ میری پیش کش ہے"

اسکائی لارکوں نے زور زور سے تالیاں بجا بجا کر "اسکائی لارک سلمان زندہ باد" کے نعرے لگائے ذرا دیر کے لئے اجلاس کی سنجیدگی درہم برہم ہوگئی۔ اسکائی لارکوں میں جوش و خروش پیدا ہوگیا۔ وہ بہت خوش تھے اور اونچی آوازوں سے بول رہے تھے۔ سلمان کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ زندگی میں اتنی بہت سی خوشی اُس نے آج تک محسوس نہیں کی تھی۔

دوسرے روز سلمان کی ڈیوٹی مقرر کردی گئی۔ وہ پہلے کی طرح تن دہی سے فلک پیما کا کام کرنے لگا۔ اب وہ عمداً خود کو بے حد مصروف رکھنے کی کوشش کرتا تاکہ سلطانہ کے بارے میں اُس کو سوچنے کا موقعہ ہی نہ ملے۔ وہ ایک ہی وقت میں کئی کئی محاذوں پر کام کر رہا تھا۔ اِس جاں فشانی اور مستعدی سے کام کرنے میں اُس کو خوشی مل رہی تھی۔ ذہنی آسودگی حاصل ہو رہی تھی۔

وہ تعلیم بالغان کے اسکول سے واپس آتا تو کھانا کھاتے ہی لائبریری میں گھس جاتا اور رات گئے تک مطالعہ میں غرق رہتا۔ اسٹیڈی سرکل کے مباحثوں کے لئے نوٹ تیار کرتا اور آدھی رات کو تھکا ہوا سا اس طرح بستر پر جا کر سوتا کہ صبح ہونے سے پہلے اُس کی آنکھ نہ کھلتی۔

یہ اس کی زندگی کے بڑے طوفانی لمحات تھے۔ کام، اور کام، اور کام۔ ان دنوں اُس پر یہی دُھن سوار تھی۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو روز بروز بڑھاتا جا رہا تھا اور کبھی بھی اس کے خلاف غیر ذمہ داری کا چارج نہ لگا۔ جب تک وہ ہیڈ کوارٹر میں رہتا بیٹھا مطالعہ کیا کرتا، یا اپنی ڈائری کو بار بار دیکھتا رہتا کہ

کہ کس وقت اُس کو کہاں جانا ہے اور کیا کام کرنا ہے۔ کبھی کبھار سلطانہ سے اُس کا آمنا سامنا ہو جاتا تو وہ بے خیالی میں صرف اتنا سوچ کے رہ جاتا۔ یہ سلطانہ تھی۔ ہاں سلطانہ ہی تھی۔ وہی ہوگی علی احمد کی بیوی، ننھے ایاز کی ماں۔ اب وہ اس کو سلطانہ سے زیادہ علی احمد کی بیوی اور ننھے ایاز کی ماں کی حیثیت سے پہچاننے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کوشش میں وہ اُس سلطانہ کو بھولتا جا رہا تھا، جو دل کش خدوخال والی ایک خوبصورت لڑکی تھی، اور جس سے اُس کو محبت تھی۔

سلمان کے دن رات اسی طرح گذرتے رہے۔ مصروف دن، مصروف راتیں، مویشیوں کی سی زندگی بسر کرنے والے عوام کو انسان بنانے کی جدوجہد۔ اُن کے لیے تعلیم، ترقی اور خوش حالی کی تمنا اس جدوجہد کی کوئی سرحد نہیں تھی۔ یہ رواں دواں اور ہر آن آگے بڑھنے کا عمل تھا۔ حرکت اور رفتار جس پر کائنات کا سارا نظام قائم ہے اور زندگی نت نئی منزلوں کی جانب جادہ پیما ہے۔ جو دریاؤں کا منہ بند کر دیتی ہے، سمندروں کا سینہ روندتی، ریگ زاروں کے جھلسے ہوئے چہروں کو بدلتی، کوہساروں کو پھلانگتی، چاند ستاروں کی جانب پرواز کر رہی ہے۔ فطرت کے ہر پُراسرار راز کو افشا کر رہی ہے۔ اُس کو تسخیر کر رہی ہے۔ انسانی زندگی کا ارتقا۔

ہیڈ کوارٹر میں آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد سلمان کو معلوم ہو گیا تھا کہ علی احمد ان دنوں جس مقدمہ کی پیروی میں دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ وہ نوشا کا مقدمہ تھا۔ جس نے نیاز کو قتل کیا تھا اور اب جیل میں قیدی تھا۔ اس کی ضمانت نہیں ہو سکی تھی۔ پھر اُس کو اور بھی بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ یہی کہ ننھا ایاز، نیاز کا بچہ تھا، جس کو علی احمد اپنی اولاد کی طرح پال رہا تھا۔ نیاز کے قتل ہونے کے بعد خان بہادر نے نیاز کے مکان پر اپنے غنڈے بٹھا کر سلطانہ کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب خان بہادر نیاز کی تمام جائداد پر قابض تھا۔ وہ میونسپلٹی کا چیئرمین تھا۔ کئی کارخانوں کا مالک تھا۔۔۔ اسمبلی کا ممبر بننے کی تیاری کر رہا تھا اور وزیر ہونے کے لیے سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف تھا۔ اُس کے تعلقات کا دائرہ ملک سے نکل کر غیر ممالک تک پھیل چکا تھا۔ اس کا ایک لڑکا کولمبو پلان کے تحت لندن میں ٹریننگ لے رہا تھا۔ اور دوسرا فورڈ فاؤنڈیشن کے اسکالرشپ پر مینی سوٹا

یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ ملک اور قوم کا بہی خواہ تھا اور اسکا ئی لارک قوم کے دشمن تھے۔ اسی لئے وہ اسکائی لارکوں کو کھلم کھلا دھمکی دیا کرتا تھا کہ وہ اُن کو سیکیورٹی ایکٹ کے تحت جیل خانے بھجوا دے گا۔

نوشا جیل میں تھا اور خان بہادر فرزند علی کے فرزند ارجمند بیرِ ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اپنی اپنی قسمت۔ شہید وزارت الحاج خواجہ ناظم الدین نے اپنی وزارت عظمیٰ کے عہد میں یوم آزادی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے یہی بات کہی تھی۔ اُن کے اور بھائی بند بھی یہی بات کہتے ہیں اور عوام کے غم میں آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں۔ اور عوام نوشا، راجہ، شامی اور انو کو جنم دیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی قتل کر کے جیل چلا جاتا ہے۔ کوئی کوڑھی بن کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کا انتظار کرتا ہے۔ کوئی خون تھوکتا ہے اور دم گھٹتا چلا جاتا ہے اور کوئی پنجروں کے سامنے رہ کر کوئے ہنستا ہے۔

نعرۂ تکبیر

اللہ اکبر۔

نوشا کے مقدمے کی پیشیاں پڑتی رہیں۔ پھر وہ دن آگیا جس روز اس کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ اس روز صبح ہی سے سلطانہ بے حد پریشان تھی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ شاید وہ رات بھر جاگتی رہی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی سی بے چینی کے عالم میں اِدھر اُدھر گھومتی پھر رہی تھی۔

فیصلہ سننے علی احمد اور سلطانہ کے علاوہ اور بھی اسکائی لارک گئے تھے۔ ان میں سلمان بھی موجود تھا۔ نوشا ملزموں کے کٹہرے میں سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اس کے رخساروں پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی تھی۔ ڈاڑھی کے ان بھورے بھورے بالوں میں اس کا چہرہ بحیرہ کے نوعمر ملاحوں کی طرح خوبصورت نظر آرہا تھا۔ اس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی معصوم بچہ اپنی ماں سے روٹھ کر کھڑا ہو گیا ہے۔

عدالت کے اندر موت کی سی خاموشی چھائی تھی۔ پھر اس خاموشی میں ایک بھاری آواز ابھری۔ یہ جج کی آواز تھی۔ جو نوشا کے مقدمہ کا فیصلہ سنا رہا تھا۔ نوشا قاتل تھا۔ قانون کا یہی فیصلہ تھا۔ پولس نے اس کے خلاف پورا پورا ثبوت فراہم کر دیا تھا اور انصاف نے اس کو حبس دوام کی سزا دی تھی۔

نوشا کو ملزموں کے کٹہرے سے نکالا گیا۔ اور جن ہاتھوں کو قلم کی ضرورت تھی' اُن میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ ہتھکڑیاں پہن کر نوشا ایک بارگی پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

"مجھے پھانسی دے دو' مجھے گولی مار دو۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ میں اب جینا نہیں چاہتا۔ خدا کے لئے مجھے پھانسی دے دو۔ جج صاحب اللہ کے لئے مجھے پھانسی دے دو۔"

نوشا کی آواز عدالت کے اندر گونجتی رہی۔ وہ بلک بلک کر پھانسی کے لئے درخواست کرتا رہا۔ مگر عدالت اُس کو پھانسی دینے سے مجبور تھی' اس لئے کہ وہ ابھی نابالغ تھا۔

پولیس کے کانسٹیبل اُس کو کھینچ کر عدالت سے باہر گھسیٹنے لگے۔ نوشا نے ایک بار اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے اور دیوانوں کی طرح آہنی ہتھکڑیوں سے اپنا سر ٹکرانے لگا۔ آن کی آن میں اُس کی پیشانی پر گوشت کے لوتھڑے نظر آنے لگے اور اُس کا تمام چہرہ خون میں لت پت ہو گیا۔

کانسٹیبلوں نے لپک کر اُس کی مشکیں کس لیں اور گھسیٹتے ہوئے عدالت سے باہر لے گئے۔

سلطانہ چیخیں مار کر روتی ہوئی اُس کے پیچھے دوڑی "نوشا' میرا بھیا۔ خدا کے لئے مجھے چھوڑ کر نہ جا۔ نہ جا نوشا' نہ جا۔ میں مر جاؤں گی۔ نوشا' نوشا۔"

علی احمد نے آگے بڑھ کر اُس کا بازو تھام لیا۔ سلطانہ اُس کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ علی احمد پیار سے اُس کی پیٹھ تھپتھپا کر تسلی دینے لگا۔ اُس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ پڑ گیا تھا۔

سلمان لمحہ بھر تک ان دونوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر ایک بارگی اُس کی آنکھیں آب دیدہ ہو گئیں اور آنسوؤں کے گرم گرم قطرے اُس کی پلکوں سے ڈھلک کر ٹپ ٹپ فرش پہ گرنے لگے۔

اُس نے منہ پھیر کر آنسو پونچھے اور چُپ چاپ کمرۂ عدالت سے باہر چلا گیا۔

شوکت صدیقی

۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۷ء

اچھی کتابوں کا امتیازی نشان

اوس اور کرنیں (گیت نظمیں) ع۔س۔مسلم زیر طبع

جمہوریت کے سائے میں (ڈرامے) عزیز علوی زیر طبع

پری خانہ	(داستان ہوس)	واجد علی شاہ اختر	۴—۰—۰
خدا کی بستی	(ناول)	شوکت صدیقی	۱۰—۰—۰
قید فرنگ	(جیل کی ڈائری)	مولانا حسرت موہانی	۳—۸—۰
قلعہ مضبوط تھا	(زوال حیدرآباد پر رپورتاژ)	انور عنایت اللہ	۴—۸—۰
یک ٹہنی کے پھول	(افسانے)	ع۔س۔مسلم	۳—۴—۰
نادر نامہ غالب	(ایک نایاب کتاب)	مرزا غالب	۱—۸—۰

ماہنامہ نیا راہی — ایڈیٹر ع۔س۔مسلم

- ایک ماہ نامہ ——— ایک تحریک
  جس کا مقصد اس پاکستان کی تعمیر ہے جس کا آپ نے اور ہم نے خواب دیکھا تھا۔
- پاکستانیوں کی حب وطنی کا مظہر
- اچھے افسانوں، سیاسی، سماجی اور مفید معلوماتی مضامین اور نظموں کا ذخیرہ

قیمت: سالانہ چھ روپے | فی پرچہ بارہ آنے | تقریباً سو صفحات

مکتبۂ نیا راہی

۲۶ - اورینٹل چیمبرز، ساؤتھ نیپیر روڈ، کراچی ۲